پیش لفظ

قارئین کرام!

السلام علیکم!

اللہ سے یہ دُعا کرتے ہوئے کہ یہ آپ کے انتظار کا بہترین بدل ثابت ہو، ''عشق کا شین'' کا تیسرا اور چوتھا حصہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اور اللہ سے اُمید اور دُعا ہے کہ بہ شرطِ صحت و زندگی 2012ء میں مکمل ''عشق کا شین'' آپ تک پہنچ جائے گی۔

اس کہانی پر کام کرتے ہوئے مجھے گیارہ سال ہو گئے اور بارہواں سال شروع ہو چکا ہے۔ میرے اختیار میں ہوتا تو یہ اس سے بہت کم ضخامت میں اس سے بہت پہلے مکمل ہو چکی ہوتی۔ لیکن میرا کمٹ منٹ اللہ سے اور اس کے بعد آپ سے ہے۔ کہانی کا گلا گھونٹ کر، اپنی ضرورتوں کی وجہ سے اسے جیسے تیسے مکمل کر دینا میرے نزدیک بددیانتی ہوتی۔

یہ صبر آزما کام میرے لئے کسی بھی طرح آسان نہیں تھا۔ اس عرصے میں ذہن میں کئی کہانیوں کے خاکے آئے، جن میں سے کچھ کاغذ پر لکھ لئے گئے اور کچھ ذہن میں موجود ہیں۔ چار نامکمل کہانیاں اس کے علاوہ ہیں، جو میری توجہ کی منتظر ہیں۔ لیکن اس عرصے میں میں نے کسی طبع زاد کہانی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ تراجم البتہ کرتا رہا اور کر رہا ہوں۔ مگر ''عشق کا شین'' کا ارتکاز الحمدللہ اپنی جگہ۔

آپ سب نے ''عشق'' کی جس طرح پذیرائی کی اور جس بے تابی سے اس کے لئے انتظار کیا، وہ پبلشرز کے لئے آزمائش بن گیا۔ وہ تو جلد از جلد ''ہاٹ کیک'' سے پیسہ کما کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ اور آپ بھی جلد از جلد پڑھنا چاہتے ہیں۔ لیکن کہانی لکھنا مشینی کام نہیں، فیکٹری ورک نہیں۔ یہ تو تخلیقی عمل ہے، جو کبھی تیزی سے چلتا ہے اور کبھی بہت آہستگی سے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ نامکمل ''عشق کا شین'' کمپیوٹر کو دے دی جائے اور وہ اسے مکمل کر کے پرنٹ آؤٹ نکال دے۔ البتہ انسانی مشین سے کام چل سکتا ہے۔

سو میرے لکھے ہوئے تقریباً سو صفحات جو میرے پبلشر کے پاس میری امانت تھے، میرے پبلشر نے ایک انسانی مشین کے سپرد کر کے اسے ''عشق کا شین''، مکمل کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ نتیجتاً چند ماہ میں ''عشق کا شین'' انہوں نے مکمل کر دی، اس وعدے کے ساتھ کہ وہ پوری کتاب ان کی لکھی ہوئی ہے۔ اخلاقی قدروں کی پامالی، جھوٹ اور بددیانتی آج کل بہت چھوٹی اور غیر اہم باتیں ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلا کہ یہ بہت طویل کہانی ہے تو غالباً انہوں نے ایک اور حصہ لکھ مارا۔ (حالانکہ کہانی وہ مکمل کر چکے تھے) ''عشق کا قاف'' اس سے پہلے

ایک اور صاحب تصنیف فرما چکے تھے۔ بعد میں ''عشق کا شین'' مکمل کرنے والی ''انسانی مشین'' قاف سے نمٹنے میں مصروف ہوگئی۔

اس ''انسانی مشین'' نے کراچی میں کتابوں کے ایک میلے میں میری ایک عزیزہ کے استفسار پر کہ انہوں نے ''عشق کا شین'' تصنیف کرنے کی زحمت کیوں کی؟ یہ انکشاف فرمایا کہ علیم الحق حقی کا انتقال ہو چکا ہے، اس لئے یہ ذمہ داری ان کے نازک کندھوں پر آپڑی، جس سے وہ بہ ہزار حسن و بہ ہزار خوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ میری عزیزہ کی برہمی اپنی جگہ، مجھے تو وہ ان کی طرف سے اپنے لئے درازیٔ عمر کی دُعا ہی لگی۔

دُشواری یہ ہے کہ عشق محض سہ حرفی لفظ ہے۔ اگر ہمارے لسانیات کے علماء اس طرف توجہ فرماتے اور عشق کے لئے ایک ایسا متبادل لفظ تخلیق فرماتے، جس میں اُردو زبان کے ''ا'' تا ''ی'' تمام حروفِ تہجی موجود ہوتے تو ملک وقوم کو بڑا فائدہ ہوتا۔ بے روزگاری میں کمی ہوتی، پبلشنگ میں ترقی ہوتی اور ملکی معیشت کافی بہتر ہوگئی ہوتی۔ کوئی انسانی مشین ''عشق کا ڑے'' ٹائپ کر رہی ہوتی تو کوئی ''عشق کا ڈال'' ہر طرف عشق ہی عشق ہوتا۔ عشق کے سوا کہیں کچھ نہ ہوتا۔ ویسے اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اس پر کام کیا جا سکتا ہے۔

میں بہرحال اپنی رفتار سے ''عشق کا شین'' لکھتا رہا اور لکھ رہا ہوں۔

چار سال بعد پہلا حصہ آپ تک پہنچا، پانچ سال بعد دوسرا اور دو سال بعد تیسرا اور چوتھا۔ اور انشاء اللہ ایک سال بعد آخری حصہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ بہ شرطِ زندگی اور تن درستی۔

کئی پبلشرز نے پیش کش کی، بلکہ اصرار کیا کہ ''عشق کا شین'' اپنی جگہ، میں ''عشق کا قاف'' مکمل کر کے انہیں دے دوں۔ پُرکشش معاوضے کی پیش کش ہوئی۔ بڑی آفرز تھیں۔ ''عشق کا قاف'' کی تھیم بھی میرے پاس موجود تھی۔ لیکن ایک کام مکمل کئے بغیر میں دوسرا شروع نہیں کرنا چاہتا۔

میرے لئے یہ گیارہ سال بڑی آزمائش کے تھے۔ اللہ نے اپنی تائید اور فضل سے مجھے سرخ روئی عطا فرمائی۔ میں ایک ایسا شخص ہوں کہ میری کہانیاں میرے لئے وسیلۂ رزق ہیں۔ پہلے حصے کے معاملے میں رائلٹی میں بددیانتی ہوئی اور دو نمبر دوسرا حصہ چھاپا گیا۔ میرا لکھا ہوا دوسرا حصہ جو ایچ اینڈ ایچ پبلشرز کے نام سے شائع ہوا، وہ سراسر بے ایمانی اور فراڈ کا کیس تھا۔ تیسرا اور چوتھا حصہ میں نے اپنی خوشی سے خزینہ علم و ادب کو دے کر اپنی کچھ ضرورتیں پوری کیں۔ الحمدللہ! میں نے معیار پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہ میرے اللہ کا فضل ہے کہ وہ میری ضرورتیں پوری فرماتا ہے۔ رزق اس کا وعدہ ہے، کم ہو یا زیادہ۔ اور وہ جب چاہے گا، اپنے فضل سے بے حساب عطا فرمائے گا۔ اسی سے اُمید رکھتا اور دُعا کرتا ہوں۔ اسی کے حکم پر بے ایمان، غاصب اور چور اپنے کئے کی سزا بھگتیں گے۔ یہ یہاں نہ ہوا تو انشاء اللہ آخرت میں ہوگا۔ اور آخرت میں ہوا تو زیادہ بہتر ہوگا کہ سب سے زیادہ ضرورت مند ہم وہیں تو ہوں گے۔ جنہوں نے یہاں بے ایمانی کی، میرے حقوق غصب کئے، بددیانتی کی، جھوٹ بولے، متعدد جرم کئے اور مجھ پر وہاں الزام لگائے، جہاں میں اپنی تردید بھی نہیں کر سکتا تھا، یقیناً اللہ کے حضور جواب دہ ہیں، خواہ یہ بات سمجھیں یا نہ سمجھیں۔

آپ کے اور میرے درمیان رشتہ سچائی اور محبت کا ہے۔ اللہ کی رحمت سے جو کچھ اچھا سیکھتا ہوں، بڑے خلوص اور محبت سے آپ کی طرف بڑھا دیتا ہوں۔ ساتھ ہی آپ سب کے لئے دُعا بھی کرتا ہوں۔ اور جانتا ہوں کہ اللہ کے فضل سے میں بڑے پاک اور مقدس مقامات پر بھی آپ لوگوں کی دُعاؤں میں رہتا ہوں۔ اللہ آپ سب کو جزائے عظیم عطا فرمائے۔

آپ سے اِلتجا ہے کہ میرے اور اہل خانہ کے لئے ایمان و مغفرت، رزق کی فراخی اور آسانیوں کی اور صحت و تن درستی اور درازیٔ عمر بالخیر کی دُعا فرمائیں۔ دُعا کریں کہ میں آپ کے لئے اسی طرح لکھتا رہوں۔

والسلام

آپ کا اپنا

علیم الحق حقی

•••

کتاب چہارم

کسوف

(سورج گرہن)
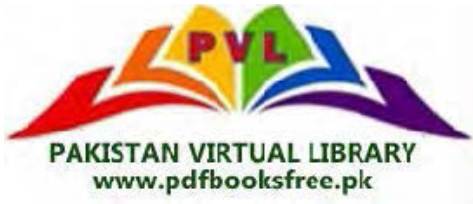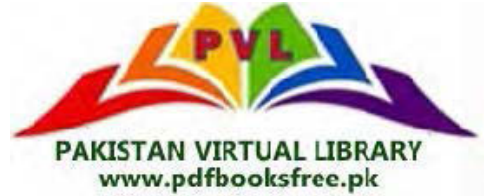
وہ بہت محدود پیمانے پر ہونے والی ایک نجی محفلِ عیش تھی، جو ایک ایسے افسر کے اعزاز میں برپا کی گئی تھی جس کا تقریباً چار سال پہلے کراچی میں تبادلہ کر دیا گیا تھا اور تب سے وہ اب پہلی بار لاہور آیا تھا۔

اُس افسر کا نام عارف تھا۔ وہ یقیناً اُدھیڑ عمر ہوگا، لیکن دیکھنے میں جوان ہی لگتا تھا۔ خوش شکل بھی تھا اور خوش گفتار بھی اور افسر ہوتے تو پڑھے لکھے ہی ہیں۔

سب کچھ تھا، مگر عارف تماش بین کہیں سے نہیں لگتا تھا۔ اس کے انداز میں شائستگی اور رکھ رکھاؤ تھا۔ اس کے میزبان اسے پروفیسر کہتے تھے۔ سمن کو وہ حیرت انگیز لگا۔

پہلے دور میں دورِ شراب چلا اور ساتھ میں رقص و موسیقی کی محفل بھی۔ پھر جب آوازیں قدرے لڑکھڑانے لگیں تو بھٹی صاحب نے کہا۔

''بھئی......! اب تو یا شیخ ہو جائے۔''

''یا شیخ......! اپنی اپنی دیکھ......!'' عارف نے گنگناتے ہوئے کہا۔

''سب سے پہلے تو ہی دیکھ لے میرے یار......! تیرے نخرے بہت ہیں۔'' شفاعت بھٹی نے عارف سے کہا۔

چاند جب رستہ کاٹ جائے تو
جلتا سورج بھی بجھ سا جاتا ہے

وہاں وہ چھ مرد تھے اور چھ ہی عورتیں۔ ان کے علاوہ جو تھے، وہ یا تو سازندے تھے یا بھٹی کے خدمت گار۔

"تمہیں تو معلوم ہے کہ میں بڑا افسر ہوں۔" عارف نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں......! پتا ہے مجھے۔ انٹرویو لینے کی عادت ہوگئی ہے تجھے......!" ملک صاحب بولے۔

"عجیب آدمی ہے یار......!" چیمہ صاحب بولے۔

"طوائفوں کو بھی انٹرویو کے بغیر اپائنٹ منٹ لیٹر نہیں دیتا تو......!"

"نا......! بری بات ......! ایسے نہیں کہتے۔" عارف نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"اس لفظ کو تم ایسے ادا کرتے ہو، جیسے یہ گالی ہو۔"

"ابے پروفیسر......! گالی ہی تو ہے یہ...... یہ لفظ ہی برا ہے۔ اپنی بیوی کو کہہ کر دیکھ، پھر پتا چلے گا۔"

"بیوی کو اسی لفظ کے قابل نہیں سمجھتا ورنہ ضرور کہتا۔" عارف نے کہا۔

"اور سنو......! لفظ برے نہیں ہوتے۔ ان کی ادائیگی اور لہجے انہیں برا بناتے ہیں۔ اسی لفظ کو اچھی طرح بھی تو ادا کیا جا سکتا ہے۔ طوائف!" اس نے گویا کہہ کر دکھایا۔

"تجھے تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔" نواز بولا۔

"اس کے لئے احساس کا زندہ ہونا ضروری ہے۔"

"ہم کیا یہاں فلسفیانہ گفتگو کے لئے جمع ہوئے ہیں......؟" نواز نے احتجاج کیا۔

"تم مجھے میرا کمرہ دکھا دو۔" عارف نے کہا۔

شفاعت بھٹی نے سکون کی سانس لی۔

"یہ سامنے والا کمرہ تیرا ہے۔" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"بس تو میں چلا......!"

"بوتل تو لے لے......!"

"تمہیں پتا ہے، میں ایک ساتھ دو نشے بھی نہیں کرتا۔ دونوں ایک دوسرے کو مائنس کر دیتے ہیں۔" عارف نے اُنگلی نچاتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں! اُمیدواروں کو ایک ایک کر کے بھیج دینا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلا گیا۔

"ہم تیرے چپڑاسی ہیں سالے......!" مقصود نے چیخ کر کہا۔

"مہمان نہ ہوتا تو بتاتا سالے کو۔"

"چپ ہو جا!" بھٹی نے اسے ڈپٹا۔

"پیتے ہوئے یہ خیال تو رکھا کر کہ چڑھ نہ جائے۔"

"چڑھے گی نہیں تو مزہ کیا......؟"

شفاعت بھٹی نے ایک لڑکی کو اشارہ کیا۔ وہ عارف کے کمرے میں گئی۔ لیکن وہ چند ہی منٹ میں واپس آ گئی۔ اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"یہ سالا ایک گھنٹہ تو ہمیں لٹکائے رکھے گا۔" نواز نے کہا۔

"یہ نہ بھولو کہ وہ ہمارا خاص مہمان ہے۔" شفاعت بھٹی نے تنبیہ لہجے میں کہا۔ پھر اس نے ثمن کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔

کمرے میں داخل ہوتے وقت ثمن کا دل عجیب طرح سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اس شخص سے مرعوب ہوگئی تھی اور سچی بات یہ کہ وہ اسے اچھا بھی لگا تھا۔ وہ اسی بات سے ڈر رہی تھی۔ کیونکہ اس پیشے میں کسی کو پسند کرنا نقصان کا ہی سودا ہوتا ہے۔

ثمن اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے منتخب کر لے۔

"کیا نام ہے تمہارا......؟"

"ثمن......!"

"خوب صورت، تمہیں تو سونگنا ہوگا۔" عارف نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

ثمن کو عجیب سا لیکن بہت اچھا لگا۔ کسی نے کبھی اس کی ایسی تعریف

نہیں کی تھی۔

''ہاتھ بڑھاؤ اپنا۔''

ثمن نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے تھام لیا۔ ایسے جیسے اس کی نبض دیکھ رہا ہو۔ چہرے پر کسی ڈاکٹر ہی کی طرح کا غور وفکر کا تاثر بھی تھا۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''حدت بھی ہے اور نبض بھی تیز ہوگئی ہے۔ یعنی دل بہ وقت ضرورت زیادہ دھڑکنا ہی جانتا ہے۔'' اس نے ڈاکٹر ہی کے انداز میں تبصرہ کیا۔

اس کے لمس میں ثمن کو شرافت اور تہذیب محسوس ہوئی۔ اسے بہت اچھا لگا۔ یہ انداز اس کے لئے بالکل نیا اور اچھوتا تھا۔

''ارے......! گردن پر، نیچے کی طرف یہ خوب صورت براؤن تل بھی ہے۔'' عارف نے ہاتھ بڑھا کر اس تل کو اُنگلی سے چھولیا۔

اس بار ثمن اپنے چہرے پر اچانک تیزی سے لپکنے والی سرخی اور تمتماہٹ کو روک نہیں سکی۔

''بہت خوب......! اب پلیز! ایک زحمت کرو۔ جا کر دروازہ بند کر دو۔'' عارف نے کہا۔

ثمن اُٹھی تو اس کے جسم میں خفیف سی لرزش تھی۔ یہ کیسا شخص ہے؟ جس نے صرف چند لمحوں میں اسے طوائف سے عورت بنا دیا ہے۔ اس نے جا کر دروازہ بند کیا اور چٹخنی چڑھا دی۔

باہر موجود تمام لوگوں نے سکون کی سانس لی۔

''چلو جان چھٹی۔'' مقصود نے بلند آواز میں کہا۔

ثمن پھر وہیں جا بیٹھی۔ اس نے اپنے دامن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو عارف نے اسے روک دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح باتیں کریں گے۔ رات بہت پڑی ہے۔''

ثمن نے چند لمحے سوچا، پھر بولی۔

''ایک بات پوچھوں؟ برا تو نہیں لگے گا آپ کو؟''

''جب ہم اچھے دوست ہیں تو برا لگنے کا کیا سوال؟ ابھی تم نے میرے دوستوں کو نہیں دیکھا۔ کیسے برداشت کر رہے تھے مجھے، اور میں بھی ایسے ہی انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہوں۔ تم جو چاہو پوچھ سکتی ہو۔ مگر پہلے آرام سے بیٹھ جاؤ۔ تھکن ہو تو بلا تکلف لیٹ بھی سکتی ہو تم۔''

''جی نہیں......! شکریہ!''

''اچھا تو یہ تکیہ لو اور آرام سے پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاؤ۔'' عارف نے اس کی طرف تکیہ بڑھایا۔

ثمن نے تعمیل کی اور آرام سے نیم دراز ہوگئی۔ ناچنے کی وجہ سے واقعی تھکن ہوگئی تھی۔

''ہاں! اب پوچھو، کیا پوچھ رہی تھیں تم؟''

''اب آپ مجھ سے میری کہانی سننا چاہیں گے؟''

عارف ہنسنے لگا۔

''غلط سمجھیں تم! میں نے کہا نا، ہم اچھے دوستوں کی طرح باتیں کریں گے اور جہاں تک کہانی کا تعلق ہے تو اس دُنیا میں ہر شخص کی ایک کہانی ہے، یہاں تو کہانیاں ہی کہانیاں ہیں، کسی حد تک ایک جیسی، اور کہیں کہیں مختلف، تم اس وقت یہاں ہو تو یہ بھی ایک کہانی ہے۔ میں اس وقت یہاں ہو تو یہ بھی ایک کہانی ہے۔''

''واقعی؟'' ثمن نے بے تکلفی سے کہا۔

''ہاں! اور جب ہم دوست بن کر باتیں کریں گے تو کہانی بے ترتیبی کے ساتھ کہیں کہیں سے کھلے گی۔ یہ اچھا بھی لگے گا۔''

''عجیب آدمی ہیں آپ!''

''یہ بات نہیں۔ ایب نارمل لوگوں کے درمیان میں ایک نارمل آدمی ہوں۔ عجیب کیا لگا تمہیں مجھ میں؟''

''ایک تل کی بنیاد پر مجھے پسند کر لیا۔''

عارف پھر ہنسنے لگا۔

"ارے نہیں......! تل تو ایڈیشنل کوالی فکیشن تھا۔ میرا مطلب ہے، اضافی قابلیت، میں نے تو تمہیں نبض چیک کر کے منتخب کیا تھا۔"

"نبض سے کیا چیک کیا تھا آپ نے؟"

"کیمسٹری، اپنے لمس پر تمہارا ردِعمل۔ میرے چھوتے ہی تمہارے دل کی رفتار بڑھی، جسم میں حدت پیدا ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ تم نے مجھے قبول کر لیا ہے۔ تمہیں میں اچھا لگا ہوں۔ تمہارے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی ہے۔"

"اس کی پرواہ کون کرتا ہے۔" ثمن نے اُداسی سے کہا۔

"یہ تو ضرورت پوری کرنے کی بات ہے۔"

"میں اس بات کی پرواہ کرتا ہوں۔ میرے لئے اس کی اہمیت ہے اور اس کی وجہ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے، رات ختم ہونے سے پہلے تمہیں معلوم بھی ہو جائے۔ دیکھو ثمن......!" اس نے یوں سانس کھینچی، جیسے اس کی خوشبو وجود میں اُتار رہا ہو۔

"تمہارا نام بھی اچھا لگا تھا مجھے، اور تمہارے لئے مناسب بھی ہے۔ تم نازک بھی ہو اور تم میں مہکار بھی ہے۔"

ثمن بے خودی سی ہوگئی۔ اس کے سامنے گاہک نہیں، عاشق بیٹھا تھا۔

"اتنے نخرے کیوں کرتے ہیں آپ؟"

"اس لئے کہ میں انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ انجوائے کرنے کا مطلب سمجھتی ہو تم؟"

ثمن نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"لطف اندوز ہونا۔"

"وہ تو آپ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔"

"نہیں......! یہی تو مسئلہ ہے۔ دیکھو! میں جانتا ہوں کہ میں گناہ کر رہا ہوں، اللہ کو ناراض کر رہا ہوں، مگر بہت بڑی مجبوری ہے، اس لئے کر رہا ہوں۔ اب گناہ کر رہا ہوں تو لذت تو ملنی چاہئے نا مجھے، اسی کی خاطر تو کر رہا ہوں۔

گناہِ بے لذت کا کیا حاصل؟ مجھے بھی کچھ فائدہ نہیں، اور اللہ بھی ناراض ہوگا۔ یہ تو دُہرا خسارہ ہوگیا۔ یہ تو میں کبھی گوارہ نہیں کر سکتا۔"

"تو وہ لذت تو کسی کے بھی ساتھ مل سکتی ہے آپ کو۔" ثمن کو اب اس گفتگو میں لطف آ رہا تھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک طوائف ہے۔

"نہیں مل سکتی نا......! میں دراصل سوچنے والا حساس جانور ہوں۔ میں صرف اپنے احساسات کی فکر نہیں کرتا، دوسروں کے احساسات کی پرواہ بھی کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ جسمانی اختلاط ایک کھیل ہے۔ دو افراد کے درمیان انفرادی کھیل۔ ٹیم گیم نہیں ہے۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ بیڈمنٹن کے بارے میں جانتی ہو تم؟"

"نہیں!"

"خیر......! یہ ایک کھیل ہوتا ہے۔ اُونچا سا نیٹ ہوتا ہے، دونوں طرف ایک ایک کھلاڑی، دونوں کے ہاتھ میں ریکٹ ہوتے ہیں اور ایک چڑیا ہوتی ہے۔"

"ارے......! یہ تو میں نے دیکھا ہے۔ ہاں کھیلا کبھی نہیں۔"

"اب سوچو! ایک کھلاڑی سرو کرتا ہے۔ دوسرا جھپٹ کر چڑیا کو نیٹ کے دوسری طرف اُچھالتا ہے۔ پہلا اسے گرنے سے پہلے ہی ریکٹ کی مدد سے واپس کر دیتا ہے۔ چڑیا اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر آتی جاتی ہے۔ زمین پر نہیں گرتی۔ ہے نا سنسنی اس میں۔ جتنی طویل ریلی ہو، دونوں کھلاڑی اتنا ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہار جیت کی حیثیت تو ثانوی ہے۔ اصل چیز ہے لطف اندوز ہونا۔"

"اب سوچو کہ میں نے سروس کی، نیٹ کے اس طرف کھڑے دوسرے کھلاڑی نے ہلنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ وہ اپنی جگہ بُت بنا کھڑا ہے۔ ریکٹ ہلاتا تک نہیں تو اسے سروس کیسے ملے گی؟ کوئی پوائنٹ جیتے، تب ملے گی نا......! اور پوائنٹ اسے جیتنا ہی نہیں بلکہ اسے تو کھیلنا ہی نہیں ہے۔ دو منٹ میں کھیل ختم۔ میں 15-0 سے جیت گیا۔ مگر لطف کیسا؟ مجھے تو شدید کوفت ہوگی۔ کھیل کا

مزہ مقابلے میں، جدوجہد اور کشمکش میں ہے۔ لمبی ریلیز میں ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا تم؟"

"جی......! سمجھ رہی ہوں۔"

"اور میں نے تو ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں نیٹ کے دوسری طرف، جن کے ہاتھ میں ریکٹ بھی نہیں ہوتا۔ کھیلنے کا ارادہ ہی نہیں ہوتا ان کا۔ بس جیسے مروّت میں آ کر کھڑے ہوگئے ہوں۔ بس میں اسی طرح کھیلنا نہیں چاہتا۔ گناہِ بے لذت کا قائل نہیں ہوں میں۔ اس لئے اتنے نخرے کرتا ہوں۔"

سمن نے چپکے سے اسے دیکھا۔ بہت عجیب، بہت پرُکشش آدمی تھا وہ۔

"یہ بتاؤ! تم کہاں سے آئی ہو؟" عارف نے اچانک پوچھا۔

"وہی کہانی شروع؟"

"غلط سمجھیں تم! میں تمہارے ماضی کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہوں۔ میں حال کی بات کر رہا ہوں۔ کس کوٹھے سے آئی ہو؟"

"اوہ......! میں نرگس بائی کے کوٹھے سے آئی ہوں۔"

"نرگس بائی......؟ یہ کون سا کوٹھا ہے؟ کوئی نیا......"

"آپ نیلم بائی سمجھ لیجئے۔"

"ہاں......! یہ ہوئی نا بات، مگر تم نے اسے نرگس بائی کا کوٹھا کیوں کہا؟"

"اس لئے کہ اب وہ نرگس بائی کا ہی ہے۔ نیلم بائی کو تو مرے ہوئے بھی سال سے اُوپر ہوگیا۔"

"اوہ......! اب تو مجھے نرگس بھی یاد آگئی۔ تو اب وہ کوٹھا اس کا ہے۔"

"آپ اتنا کچھ کیسے جانتے ہیں؟"

"ارے......! میں یہیں کا ہوں۔ چار سال پہلے تبادلہ ہوگیا تھا میرا اور ان بازاروں کی خاک تو برسوں سے چھان رہا ہوں۔ کس کو نہیں جانتا میں، تم البتہ نئی ہو۔"

"مجھے ڈھائی سال ہوگئے، اسی کوٹھے پر۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم نیلم بائی کی زندگی میں ہی وہاں پہنچی تھیں۔ پھر تم نے اسے نرگس بائی کا کوٹھا کیوں کہا؟"

"اس لئے کہ وہ اس وقت بھی نرگس بائی کا کوٹھا ہی تھا۔ نیلم بائی زندہ ضرور تھیں لیکن اس سے پہلے ہی وہ سب کچھ نرگس بائی کے نام کر چکی تھی۔ میں نے تو وہاں نرگس بائی کی حکومت ہی دیکھی۔"

"ہائے ہائے......! زخم محرومی ہرا ہوگیا۔" عارف نے آہ بھر کے کہا۔

"کیسی ہے نرگس؟ مجھے یقین ہے کہ وہ ویسی ہی حسین ہوگی اور اسی طرح کسی نہ آنے والے کی آمد کی منتظر۔"

سمن نے غور سے اسے دیکھا۔

"ان سے کوئی خاص تعلق ہے آپ کا؟"

"خاص الخاص سمجھو سمن......!" عارف نے پھر گہری سانس لی اور جیسے اس کی خوشبو اپنے اندر اُتار لی۔

"تم ادھر قریب آؤ نا! میرے سینے پر سر رکھ کر لیٹ جاؤ۔ کسی بیوی کی طرح۔"

سمن نے تعمیل کی۔

"آپ نرگس بائی سے اپنے تعلق کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"ہاں! مجھے اسم با مسمّٰی لوگ بہت اپیل کرتے ہیں۔" عارف نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تم اپنی ہی مثال لو۔ نام سمن ہے، دیکھنے میں بھی سمن ہو، چھونے میں بھی اور سونگھنے میں بھی۔ ایسے ہی نرگس تھی۔ کھوئی کھوئی سی، اور کسی کی منتظر، حسین اور نازک، مگر نادستیاب۔"

"آپ ان سے ملے کبھی؟"

"صرف ایک بار، مجھے پاگل کر دیا تھا اس کی خوب صورتی نے۔ مگر کھیلنے کے لئے کھڑا ہوا تو پتا چلا ایک وہی تو ہے، جسے میں نے نیٹ کی دوسری

طرف خالی ہاتھ کھڑے دیکھا، ورنہ دوسرے کم از کم دکھاوے کی خاطر تو ریکٹ تھام لیتے ہیں، بس پھر میں پلٹ کر اس کی طرف نہیں گیا۔ اب کیا حال ہے اس کا؟ اب بھی ویسی ہی ہے؟''

''یہ تو کوئی بھی نہیں بتا سکتا آپ کو۔ دھندا تو وہ چھوڑ چکی ہے۔''

''ناممکن! مشکل سے پچیس چھبیس کی ہوگی وہ۔ یہ تو اس کے عروج کا وقت ہے۔''

''کہتے ہیں، انہیں کوئی خوف ناک بیماری لگ گئی ہے۔''

''ناممکن تو نہیں۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ دیکھنے میں کیسی ہے وہ؟''

''کوٹھے پر سب سے حسین!''

''تو اب کرتی کیا ہے وہ؟''

''آپ یقین نہیں کریں گے۔ کوٹھے پر بیٹھ کر اللہ اللہ کرتی ہیں وہ۔''

''یہ کوئی ناقابل یقین بات نہیں۔ مجھے تو لگا تھا کہ وہ مردوں کی قربت میں بھی اللہ اللہ ہی کرتی ہے۔ وہ کوٹھے کی شئے تھی ہی نہیں۔ وہ تعلیم یافتہ بھی تھی۔ اس جیسا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے کبھی خود کو کسی کے حوالے نہیں کیا ہوگا۔''

''میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ سب لڑکیوں پر بہت مہربان ہیں۔ سب کی فکر کرتی ہیں۔ ہفتے میں چار دن سے زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا کسی کو۔''

''اچھا چھوڑو اسے۔ میرے سر میں تیل لگا دو۔ کسی اچھی بیوی کی طرح۔''

''تیل؟ تیل یہاں کہاں؟'' ثمن نے کہا اور حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''چلو...... یوں ہی مالش کر دو سر کی۔''

ثمن اس کے سینے پر سر رکھے رکھے اس کے بالوں میں اُنگلیاں لہرانے لگی۔

''ایک بات پوچھوں؟ یہ ہر بات میں آپ بیوی بیوی کرتے ہیں۔ تو

اب تک شادی کیوں نہیں کی آپ نے؟''

''یہ کس نے کہا کہ شادی نہیں ہوئی میری۔ ارے بیوی ہی کی وجہ سے تو اس حال کو پہنچا ہوں میں۔''

ثمن کے لئے وہ بہت بڑا شاک تھا۔

''وہ کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

''دراصل میری بیوی طوائف ہے۔ لیکن بہت بری طوائف۔'' عارف نے سادگی سے کہا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''میں اس لفظ کو مروّجہ مفہوم میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرے نزدیک طوائف گالی نہیں، مظلومیت کا مترادف ہے، جس عورت سے قسمت اس کے سہارے چھین لے اور معاشرہ اس کے وسائل محدود کر دے اور ضروریات اس کے سامنے منہ کھولے کھڑی ہوں، اور اس کے پاس اپنے وجود کے سوا کوئی اثاثہ نہ ہو، اور لوگ اس کے وجود کے ایک حصے یعنی جسم میں دلچسپی رکھتے ہوں، اپنے وجود کی بقاء قائم رکھنے کے لئے اس کے پاس جسم فروشی کے سوا کوئی راستہ نہ ہو، وہ طوائف ہے۔ اپنی ضرورتوں کی خاطر جسم فروخت کر کے ایک طرف تو وہ رُسوائی کماتی ہے، دوسری طرف زندگی کی اور نفس کی بہت بڑی خوشی سے محروم ہو جاتی ہے۔''

''واقعی......! اتنا صحیح کہہ رہے ہیں آپ! میں یہ سب سوچتی تھی، کہہ نہیں سکتی تھی۔ عجیب آدمی ہیں آپ! کیسے آدمی ہیں آپ؟''

''تم اب بھی نہیں سمجھیں؟'' عارف نے تاسف سے کہا۔

''میں بہت محروم آدمی ہوں۔''

''آپ نے یہ کیوں کہا کہ آپ کی بیوی بری طوائف ہے؟''

''اس لئے کہ ایسا ہی ہے۔ دیکھو نا! وہ طوائف نہیں۔ میری عزت دار بیوی ہے۔ میرے بچوں کی ماں ہے۔ وہ مجبور اور بے سہارا نہیں۔ میں اس کا مضبوط سہارا ہوں۔ گھر کی، بچوں کی، اور اس کی ساری ضرورتیں پوری کرتا ہوں

میں۔ لیکن جب میں اپنی ضرورت کی خاطر اس کی طرف ہاتھ بڑھاؤں تو وہ جھٹک دیتی ہے مجھے۔ دن بھر کی مصروفیات گنواتی ہے اور تھکن کا رونا روتی ہے۔ وہ مجھے وہ آسائش نہیں دیتی جو میرا حق ہے۔ تو وہ بیوی تو نہیں رہی نا؟"

"مگر ان کا عذر تو سچا ہوگا نا؟ گھر کی دیکھ بھال اور بچے سنبھالنے میں تھکن تو ہوتی ہوگی نا؟"

"پھر یہ عذر جائز ہوتا تو اللہ نے بیوی پر سوہر کے حق کو منسوخ کر دیا ہوتا۔ کیونکہ دُنیا میں ہر عورت کا یہی حال ہے۔ یہ سب ان کے فرائض میں شامل ہے۔ میں پڑھا لکھا ہوں۔ میں نے دین کی کتابوں میں دیکھا۔ اللہ کا حکم ہے کہ عورت کو خواہش نہ بھی ہو تو وہ شوہر کی خوشی کی خاطر خود پر مصنوعی خواہش اور رغبت طاری کر لے اسے کسی صورت بھی منع نہ کرے۔ اسی حکم کی حکمت بھی سمجھتا ہوں میں۔ دیکھو نا، نکاح زنا کو روکنے کا راستہ ہے، عورت کا یہ عمل تو مرد کو زنا کی طرف دھکیلنے کا مترادف ہوا نا؟"

"تو آپ کو یہ بات انہیں بتانی چاہئے۔"

"میں نے بتائی تو وہ بولی۔ میں کب منع کرتی ہوں آپ کو؟ میں نے کب روکا ہے آپ کو؟ اب بتاؤ! ہے کوئی جواب اس بات کا؟ میں اکیلا تو بیڈ منٹن نہیں کھیل سکتا نا؟ پھر میں کیا کروں؟ یہ تو کسی مردے کے ساتھ سونے کے برابر ہے۔"

ثمن جھرجھری لے کر رہ گئی۔

"بہت سخت باتیں بھی کرتے ہیں آپ! اور اتنے نازک آدمی کے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

"ایک نازک اور حساس آدمی ہی تو ایسی باتیں کر سکتا ہے۔"

"پھر بھی آپ کو اپنی بیوی کو طوائف کہنے کا کوئی حق نہیں۔ جبکہ آپ تو بری طوائف کہہ رہے ہیں انہیں۔"

"میں ابھی ثابت کر دیتا ہوں کہ میں غلط نہیں ہوں۔ اچانک کسی رات میری بیوی آتش فشاں بن جاتی ہے۔ پہلے تو میں ایسے موقعوں پر خوش ہوتا تھا،

پھر اصل بات میری سمجھ میں آ گئی۔ جب اسے کوئی ضرورت ہوتی ہے تو وہ میری مرضی کے مطابق بننے کی، میں جو چاہتا ہوں، وہ مجھے دینے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔ اب بولو! وہ طوائف ہے کہ نہیں؟ ہے نا! اور بری طوائف اس لئے کہ وہ مجبور نہیں، بے سہارا نہیں۔ میں اسے ضرورت کی ہر چیز فراہم کرتا ہوں تو جب اسے کچھ ایسا چاہئے ہوتا ہے، جو وہ سمجھتی ہے کہ میں ہرگز نہیں دلاؤں گا، تو وہ مجھ پر یہ جال پھینکتی ہے، لطیف جذبوں کے نام پر بلیک میلنگ تو میں قبول نہیں کر سکتا۔ اب بھی ایسا ہوتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں، مجھے فریب مت دو۔ سیدھی سیدھی بات کرو۔ کیا چاہئے تمہیں۔ وہ بتاتی ہے، اور میں کہتا ہوں کہ ٹھیک ہے۔ کل دلا دوں گا۔ تم اس طرف کروٹ لے کر سکون سے سو جاؤ۔ مجھے پریشان نہ کرو اور وہ فوراً یہ بات مان لیتی ہے۔ نہ مانے تو میں بھی اسے ویسے ہی جھٹک دیتا ہوں جیسے اور دنوں میں وہ جھٹکتی ہے۔ میں کہتا ہوں، میں دن بھر کا تھکا ہوا ہوں، چین سے سونے دو مجھے۔ تمہاری ضرورت کل پوری ہو جائے گی۔"

"ایسا کیوں کرتے ہیں آپ؟"

"یہ عزت کی بات ہے۔ وہ میری عزت نہیں کرتی، نہ کرے۔ مجھے تو اس کی عزت رکھنی ہے۔ اس کی ضرورت پوری کرنا میرا فرض ہے۔ اس کے بدلے میں اپنی ضرورت پوری کر کے اسے طوائف بنا دوں میں۔ اپنے گھر کا تقدس کیوں پامال کروں؟ میں بیوی کاروبار نہیں کر سکتا۔ کاروبار کے لئے بازار موجود ہے۔ میں اپنے گھر میں جہاں اپنے بچوں کا باپ ہوں، عیاش تماش بین نہیں بننا چاہتا۔"

"تو خود کو کیوں خراب کرتے ہیں؟" ثمن نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

"دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ مذہب بھی اجازت دیتا ہے اس کی اور میرا خیال ہے، آپ حیثیت میں بھی کم نہیں۔"

"ڈرتا ہوں کہ دوسری بھی ایسی ہی نکلی تو کیا کروں گا۔ چھان پھٹک کے بغیر نہیں کر سکتا دوسری شادی؟" عارف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اچھا.....! اب اجازت ہو تو لائٹ آف کر دوں؟"

''عجیب آدمی ہیں آپ! مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟'' سمن نے حیرت سے کہا۔

''یہ ضروری ہے۔ دوسرے کھلاڑی کی مرضی، آمادگی اور دل سے شمولیت میرے لئے بہت ضروری ہے۔ تم انجوائے نہیں کرو گی تو میں بھی انجوائے نہیں کرسکوں گا۔''

''آپ واقعی عجیب آدمی ہیں اور یہ میں تعریف کر رہی ہوں آپ کی۔'' سمن نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''بس...... بتی میں بجھا دیتی ہوں۔''

وہ سمن کے لئے بے معالف کا تجربہ تھا۔ وہ خود کو ہواؤں کی طرح آزاد محسوس کر رہی تھی۔ وہ تو جیسے اُڑ رہی تھی۔

بہت...... بہت دیر بعد سمن نے کہا۔

''آپ واقعی بہت اچھے دوست ہیں۔ میں آپ کو کبھی بھول نہیں سکوں گی۔''

''یہ تم اپنے حق میں بہت برا کرو گی۔'' عارف نے سنجیدگی سے کہا۔

''بہت دُکھی رہو گی تم۔ میں تمہیں اس کا فائدہ بتاتا ہوں۔ جب کبھی کوئی برا توہین آمیز تجربہ ہو تو ان لمحوں کو یاد کر لینا، تازہ دم ہو جاؤ گی۔''

''شکریہ!''

چند لمحے خاموش رہی پھر عارف نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم میرا ایک کام کر دو۔''

''میرے بس میں ہوا تو ضرور کروں گی۔''

''یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں استعمال کر رہا ہوں۔ کیونکہ یہ سچ نہیں ہوگا۔ میں یہ کام دوسری طرح بھی کرسکتا ہوں۔ لیکن اسے مناسب نہیں سمجھتا۔ اس میں اسے ہتک کا احساس ہوگا۔''

''دوست دوستوں کے کام آتے ہیں۔ اس میں استعمال کرنے اور استعمال ہونے کی کوئی بات نہیں۔''

عارف چند لمحے خاموش رہ کر کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''میں نرگس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''یہ...... یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔''

''یہ ممکن ہے۔'' عارف نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''اس لئے کہ میں گاہک یا تماش بین کی حیثیت سے نہیں، ایک عزت کرنے والے دوست کی حیثیت سے اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''میں وعدہ نہیں کرتی۔ کوشش کروں گی۔'' سمن نے کہا۔

''میں ناکام ہو جاؤں تو آپ دوسری طرح سے کوشش کر لیجئے گا۔''

''نہیں......! وہ میں نہیں کروں گا۔ وہ اس جذبے کے شایانِ شان نہیں۔ جو میں نرگس کے لئے اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔''

''مجھے بتائیں اس کے بارے میں۔''

''نہیں......! میں تمہیں بتاؤں، اور پھر تم نرگس کو قائل کرنے کے لئے اسے بتاؤ تو یہ بلیک میلنگ لگے گی۔''

''اچھی بات ہے۔ میں کوشش کروں گی۔''

''بس......! اب سکون سے سو جاؤ۔''

✿ ✿ ✿

عبدالحق اس روز بہت بے چین اور اندر سے بہت مضطرب تھا۔

ویسے تو اس کی تین سالہ ازدواجی زندگی ایک مستقل سرشاری تھی۔ نور بانو کا سحراب بھی ویسا ہی تھا۔ بلکہ اور بڑھ گیا تھا۔ وہ اس سے پہلے سے بھی زیادہ محبت کرتا تھا اور وہ بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ اس کی محبت زیادہ بڑی ہے یا نور بانو کی۔ لیکن چند منٹ میں ہی اسے اندازہ ہو جاتا کہ دونوں محبتوں کا موازنہ ممکن نہیں تھا۔ اس لئے انہیں تولا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اس کی روح میں رچی ہوئی، بسی ہوئی بے پایاں محبت تھی۔ وہ نور بانو کے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتا تھا۔

دوسری طرف نور بانو کی محبت کسی پہاڑی دریا کی طرح تند، تیز رفتار اور

پرشور تھی۔ اس محبت کی فطرت اس کے قدم اُکھاڑ کر اسے اس طرح بہا کر لے
جاتا تھی کہ کسی اور سے اس کا تعلق یہ نہ رہے۔ اس کی زندگی میں جو دوسرے لوگ
تھے، اور ان کی محبتیں تھیں، وہ جیسے نور بانو کی محبت کے دریا کی گزرگاہ میں پڑے
بہت بڑے بڑے پتھر تھے۔ ان میں سے ہر پتھر دریا کے لئے ایک چیلنج تھا۔ وہ
دریا کو مہمیز کرتا تھا۔ دریا جس پتھر سے ٹکراتا، اس کی تندی میں، اس کے غضب اور
اس کے شور میں اضافہ ہو جاتا۔ دریا کے بس میں ہوتا تو ایسے ہر پتھر کو لڑھکا کر
بہاتا ہوا لے جاتا، اور کہیں دور چھوڑ آتا۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں تھا۔ پتھر اپنی جگہ
رہتے تھے، اور دریا کی تندی اور غیض وغضب اور بڑھ جاتا تھا۔

بنیادی طور پر نور بانو کی محبت جسمانی تھی۔ یا یوں کہا جائے گا کہ اس کا
غالب عنصر جسم تھا۔ اس اعتبار سے وہ رات کی رانی تھی۔ رات کو اس کی خوشبو سر
چڑھ کر بولتی۔ وہ تند پہاڑی دریا کی طرح ایک پتے کی مثال اسے بہائے
پھرتی۔ رات کے ہر لمحے میں وہ اس کا اسیر ہوتا۔ ایسا اسیر، جس کے لئے وہ
اسیری ہی کائنات کی سب سے بڑی نعمت ہو۔

اور نور بانو کو ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کہ اس کا اسیر اس کے سحر سے آزاد نہ
ہو جائے اور وہ اس کے لئے صرف فکر نہیں کرتی تھی، وہ اس کے لئے حکمت عملی
ترتیب دیتی رہتی۔ اس کے ہاں سب کچھ دماغ سے ہوتا تھا، دل سے نہیں۔

''آپ مجھ سے اُکتا تو نہیں گئے؟'' کبھی وہ سوچتی۔

''کیسی باتیں کرتی ہو۔ یہ کہاں ممکن ہے۔''

''ممکن ہے کیا؟ یہی تو ہوتا ہے دُنیا میں۔ لیکن میرے ساتھ نہیں ہو
سکتا۔ میرے پاس کائنات کے تمام پھولوں کی خوشبو ہے۔ میرے اتنے رنگ ہیں
کہ نہ کسی نے دیکھے، نہ ان کے نام کسی کو معلوم ہیں۔''

اور یہ سچ تھا۔ اس کی کوئی ایک رات دوسری رات جیسی نہیں تھی۔ رات
کا نام تنوع تھا۔

لیکن زندگی میں دن کی بھی تو بہت اہمیت ہے اور دن کو اپنی مصروفیات
ہوتی ہیں۔ بے شمار رابطے ہوتے ہیں، فرائض ہوتے ہیں۔ رات کی طمانیت

عبدالحق کو تازہ دم کر دیتی تھی۔ لیکن نور بانو چڑچڑی اور بدمزاج ہو جاتی تھی۔
بات بات پر اُلجھنا، جھنجلانا، مگر اس کے پاس سے گزرتی تو وہ ضرور اس سے ٹکراتی
یا جسم مس کرتی۔ بہانے بہانے سے وہ اسے چھوتی۔ ایسے میں اس کے چہرے پر
نرمی ہوتی اور آنکھوں میں بلاوے۔

وجہ عبدالحق کو معلوم تھی۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ مضبوط دلائل کے
باوجود اسے سمجھانے کی اس کی ہر کوشش ناکام ہوگئی تھی۔

نور بانو چاہتی تھی کہ اس کے اور عبدالحق کے درمیان کوئی نہ ہو۔ اور یہ
ممکن نہیں تھا۔

شادی کی پہلی صبح ساجد معمول کے مطابق اس کے کمرے میں آیا تو وہ
چڑ گئی۔

''اب یہ بچپنا چھوڑیں آپ! آپ اب شادی شدہ مرد ہیں، کوئی کم عمر
لڑکے نہیں۔''

''تقسیم مردوں ہی کا وقت ہوتا ہے۔ لڑکے تو آزاد ہوتے ہیں۔ جو
چاہے کریں اور میں تو کبھی لڑکا رہا ہی نہیں۔'' عبدالحق نے بغیر کسی تلخی کے کہا۔

''میرا یہ وقت ساجد کا ہے۔ میں سب کے حقوق ادا نہیں کروں گا تو
اچھا انسان کیسے بنوں گا؟'' عبدالحق نے کہا تھا اور یہ کہتے ہوئے اسے خیال آتا
تھا کہ اس نے شکر کے نفل بھی نہیں ادا کئے اور اس کی فجر بھی قضاء ہوگئی۔

پھر دن میں زرینہ، رابعہ اور زبیر کو وقت دینا اور رات کو اس کا حمیدہ
کے پاس جا کر بیٹھنا بھی نور بانو کو برا لگا۔ لیکن عبدالحق نے اس پر واضح کر دیا کہ
وہ اس سے محبت کرتا ہے، اور اس کی محبت میں اپنا کچھ بھی قربان کر سکتا ہے۔ ہر
ذاتی قربانی دے سکتا ہے۔ لیکن کسی دوسرے کا فن غضب نہیں کر سکتا۔

زرینہ کی شادی ہوئی تو نور بانو کا ایک بوجھ ہلکا ہوگیا۔ پھر اس نے یہ
بھی سمجھ لیا کہ جو بات عبدالحق کو نہیں مانی، وہ اس سے کسی طور بھی نہیں منوا سکتی۔
اس نے اپنا طریق کار تبدیل کر لیا۔

جب وہ لاہور شفٹ ہونے لگے تو حمیدہ نے زبیر اور رابعہ کے لئے بھی

اصرار کیا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ! زبیر بھائی یہاں نہیں ہوتے تو یہاں کے معاملات کون سنبھالے گا؟" نور بانو نے کہا۔

"نور بی بی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" زبیر نے جلدی سے کہا۔ وہ اس کا مزاج پہچاننے لگا تھا۔

"مگر ساجد کیسے رہے گا عبدالحق کے بغیر؟" حمیدہ نے اعتراض کیا۔

"چھوٹا بچہ ہے۔ بہل جائے گا اماں!" رابعہ بولی۔

"لیکن میں نہیں رہ سکوں گا اس کے بغیر۔" عبدالحق کو مداخلت کرنا پڑی۔

"کمال کرتے ہیں آپ! بچے کو ماں باپ سے جدا کر کے لے جائیں گے اپنے ساتھ۔" نور بانو جیسے تڑپ اُٹھی۔

"یوں کرتے ہیں کہ رابعہ اور ساجد ہمارے ساتھ چلیں گے۔" حمیدہ نے فیصلہ سنایا۔

"بچے کو باپ سے دُور کرنا......"

"میرا کوئی مسئلہ نہیں۔" زبیر نے جلدی سے کہا۔

"ساجد ویسے بھی مجھ سے زیادہ صاحب سے مانوس ہے۔ پھر میں ہر ہفتے کبھی دو دن کے لئے اور کبھی موقع ملا تو تین دن کے لئے لاہور آجایا کروں گا۔"

اور اس پر عمل بھی ہوگیا۔

پھر زرینہ بھی ماں بن گئی۔ اس کے ہاں بھی پہلا بیٹا ہی ہوا تھا اور اب تو وہ دوبارہ ماں بننے والی تھی۔

عبدالحق رکھ رکھاؤ کا بہت قائل تھا۔ زرینہ اس کی سگی بہن نہیں تھی۔ اس لئے وہ اس رشتے کی نزاکت کا زیادہ خیال رکھتا تھا کہ کہیں وہ وہاں خود کو اکیلا اور لاوارث نہ سمجھ لے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی ایسے نہیں تھے۔ وہ زرینہ کو بیٹی ہی کی طرح چاہتے تھے اور اکبر بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

زرینہ وہاں بہت خوش تھی۔ پھر بھی عبدالحق نے مہینے میں کم از کم ایک بار وہاں جانا خود پر فرض کر لیا۔ زبیر یہاں آتا تو وہ وہاں جاتا۔ رات کو قیام کے لئے اپنا گھر موجود تھا۔

جب وہ پہلی بار جانے لگا تو نور بانو نے کہا۔

"میں بھی چلوں گی۔" وہ اسے ایک رات بھی اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

عبدالحق کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

اور کبھی زرینہ تین چار دن کے لئے لاہور آجاتی۔ ایسے میں نور بانو کا چڑچڑا پن اور بڑھ جاتا۔

سب کچھ مل گیا تھا، سب کچھ اچھا تھا۔ مگر عبدالحق کو احساسِ زیاں ستاتا تھا۔ لگتا تھا کہ بہت کچھ اس سے چھن گیا ہے۔ نامعلوم محرومی کا احساس اس پر مستزاد تھا اور جب بھی یہ احساس حد سے گزرتا، وہ بے چین اور اندر سے مضطرب ہو جاتا۔

آج بھی وہ اسی کیفیت سے دوچار تھا۔ ایسے میں اسٹڈی ہی اس کی پناہ گاہ ہوتی تھی۔ سب یہی کہتے تھے کہ وہ پڑھائی میں مصروف ہے۔ ایسے میں ڈسٹرب کیا جانا اسے پسند نہیں تھا۔

ویسے تو وہ بی اے کا امتحان دے چکا تھا، اور اب رزلٹ کا منتظر تھا۔ لیکن مسعود صاحب نے اسے خالی نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ چنانچہ وہ ان کی راہنمائی میں اب مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔

کتاب سامنے رکھ کر وہ بیٹھا اپنی کیفیت پر غور کر رہا تھا۔ مسئلہ کیا ہے آخر؟

لاہور کی مصروف زندگی بھی ایک وجہ تھی اور وہ جانتا تھا کہ اس کی مصروفیت ابھی اور بڑھ گئی۔ مصروفیات نے اسے قرآن سے دور کر دیا تھا۔ نماز چار وقت کی رہ گئی تھی۔

لیکن یہ سب کچھ تو حق نگر سے ہی ایسے چل رہا تھا۔ فجر کی نماز سے تو

وہ وہیں محروم ہوگیا تھا اور قرآن پڑھنا بھی وہیں کم ہو چکا تھا۔ وہ خواہ مخواہ لاہور پر الزام لا دہا ہے۔

شاید کچھ ایسی باتیں تھیں، جو کہیں نیچے دبی ہوئی تھیں، کریدتا تو سامنے آ جاتیں۔ لیکن وہ کریدنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ انہیں سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ مزاجاً وہ ایسا نہیں تھا۔ اسے تو عذر کرنا، پیچیدگی کو سادگی میں تبدیل کرنا اور واضح طور پر سمجھنا مرغوب تھا۔ اب ایسا کیا ہوگیا کہ وہ خود سے نظریں چرانے لگا ہے۔

اس نے سوچا، شاید یہی اس کا بنیادی مسئلہ ہے۔ حقیقت جیسی بھی ہو، اسے سمجھنا تو چاہئے۔ سمجھے گا ہی نہیں تو اصلاحِ احوال کیسے ہوگی۔ مسئلہ سامنے ہو تو اس کا حل نکلتا ہے۔

اس نے سوچا، سب سے پہلے یہ یاد کیا جائے کہ زندگی میں سب سے زیادہ خوش وہ کب ہوا تھا؟

اس کے لئے اسے زیادہ سوچنا نہیں پڑا۔ دہلی کی وہ شامیں، جب وہ عصر اور مغرب کے درمیان کوٹھے پر بیٹھ کر نور بانو کی آواز سنتا تھا، اس سے بڑی کوئی خوشی آج تک اس کی زندگی میں نہیں آئی۔ وہ ایک لفظ ہی نہیں سمجھتا تھا۔ مگر اس کے تمام حواس سرشاری کی کیفیت میں گندھے اس آواز پر مرکوز ہوتے تھے اور اندر کی کیفیت بتاتی تھی کہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود جیسے وہ سمجھ رہا ہے، جب وہ کوئی سچائی ہے، جو اس کی روح میں اُتر رہی ہے۔

مگر اس خوشی سے تو وہ دہلی میں ہی محروم ہوگیا تھا۔

ذہن نے فوراً ہی اس کی تردید کر دی۔ وہ آواز تو اس کی سماعت میں محفوظ ہوگئی تھی۔ وہ جب چاہتا، سر جھکا کر بیٹھتا، اور اسے سن لیتا۔ وہ آواز آنی بند ہوگئی تھی۔ پھر بھی وہ محروم نہیں ہوا تھا۔ محروم ہوگیا ہوتا تو وہ محبت بھی کسی نقش کی طرح دھیمی ہوتے ہوتے مٹ جاتی۔ لیکن وہ محبت تو اور توانا ہوگئی تھی۔

پھر اس رات اس نے وہی آواز سنی، اور بے اختیار ہوگیا۔ اپنے آپ میں ہوتا تو وہ کبھی اُوپر نہ جاتا...... یہ جانتے ہوئے کہ اُوپر نور بانو ہوگی۔ اب یہ تو وہی جانتا تھا۔ کوئی اور کیسے جان سکتا تھا کہ وہ اوپر پہنچا تو سراپا سماعت تھا۔ اسے

کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ صرف سن رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے نور بانو کو دیکھا بھی نہیں۔ وہ تو بعد میں بھی کبھی اسے دیکھتا تو پہچان نہ پاتا اور اس کیفیت میں اس نے آسمان کا مشاہدہ کیا اور کلمہ پڑھا۔

اس دن کے بعد اس کے لئے ایک نیا حوالہ بن گیا۔ وہ جب چاہتا، نور بانو کو سورۃ الملک کی تلاوت کرتے سن لیتا تھا۔

مگر نور بانو سے شادی کے بعد وہ اس نعمت سے محروم ہوگیا تھا۔

کیوں؟

شاید اس لئے کہ وہ سوچتا تھا، نور بانو سے شادی کے بعد اس کو سامنے بٹھا کر اس کی قرأت سنا کرے گا۔ اس نے پہلی ہی رات یہ فرمائش کی بھی لیکن نور بانو نے اسے ٹال دیا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ جب بھی نور بانو سے یہ فرمائش کرتا ہے، وہ ٹالتی ہے۔ عموماً وہ یہی کہتی تھی کہ ابھی ذرا دیر میں سناتی ہوں۔

پھر ایک دن وہ اس کے پیچھے پڑ گیا۔

''ابھی وضو کر کے آؤ اور مجھے سناؤ۔''

لیکن جب نور بانو نے تلاوت شروع کی تو اسے مایوسی ہوئی۔ آواز تو وہی تھی، لیکن بے خود اور مبہوت کر دینے والی وہ کیفیت موجود نہیں تھی، جس نے پہلی بار اسے اسیرِ محبت کیا تھا۔ وہ پڑھتی رہی اور وہ سنتا رہا لیکن دل میں کچھ نہیں ہوا۔ اندر سے حق کی وہ آواز نہیں آئی، جو اس رات آئی تھی اور اس پر آسمان کا ایک بھید کھول گئی تھی۔

اس دن پہلے تو عبدالحق کو لگا کہ وہ لٹ گیا ہے۔ جیسے اس سے کوئی متاعِ عزیز چھن گئی ہے اور یہ سچ تھا۔ برسوں سے قرأت کی وہ آواز اس کے لئے متاعِ حیات ہی تو تھی۔ وہ جھنجھلا گیا۔ اس نے سوچا، اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ بہت بڑا دھوکا۔ جیسے اس کی محبت کی بنیاد ہی اس دھوکے پر رکھی گئی تھی اور اب وہ بنیاد ہی نکال لی گئی تھی۔ اب بغیر بنیاد کے محبت کی وہ عمارت کیسے قائم رہ سکے گی۔ اسے تو سچ مچ لگا کہ نور بانو کے لئے اس کے دل میں محبت مٹنے لگی ہے۔

لیکن پھر جادوگر رات آئی، اور رات کے جادو کے سوا کچھ بھی نہیں رہا۔
وہ تو نوربانو سے محبت کرتا تھا۔ مجبور تھا محبت کرنے پر۔ آواز ایک دور کی حقیقت تھی...... قریب ساعت جیسی۔ اور جسم ایک فریب تھا۔ تمام حواس پر حاوی و طاری، اور حقیقت سے بڑھ۔''

راتیں تو ویسی ہی رہیں، لیکن اس کے دن مضطرب ہوگئے۔ اس نے سمجھنے اور سوچنے کی کوشش کی۔ بات کچھ ایسی مشکل بھی نہیں تھی۔ اللہ نے فرمایا۔ علم القرآن، تو بے شک وہ عظیم، زبردست مقتدر رب، وہ کائنات کا مالک...... اپنا کلام وہی تو پڑھا سکتا ہے اور وہی پڑھاتا ہے۔

عبدالحق کو تو ذاتی طور پر تجربہ بھی تھا۔ قرآن پڑھتے ہوئے کبھی کسی آیت پر نظر ہوتی، اور اچانک ان لفظوں کے نیچے اس کا مفہوم، اس کے معانی اُبھر کر آنکھوں کے راستے دماغ میں اُتر جاتے۔ وہ ایسا مفہوم ہوتا، جو اس آیت کے ظاہری مفہوم سے بالکل مختلف ہوتا۔ لیکن تمام ادراکی قوتیں ایک ثانیے میں متفق ہو جاتیں کہ واقعی اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہے...... یہ حکمت ہی ہے اس میں۔

اساس کے بعد خود بخود وہ مفہوم حافظے میں محو بھی ہو جاتا۔ ایسے کہ وہ بار بار اس آیت کو پڑھ کر اس مفہوم کو یاد کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن وہ اسے یاد نہ آتا۔ وہ سوچتا۔ یہ بھی اللہ کی رحمت ہے۔ بندہ کھوئے گا نہیں مانے گا کیسے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اور مانے گا نہیں تو ڈرے گا کیسے۔ ایسے میں کبھی اچانک یوں بھی ہوتا کہ وہ پہلا مفہوم تو یاد نہ آتا۔ لیکن اسی آیت کا ایک اور مفہوم اس پر کھل جاتا۔

اور ایسا ہی ہوتا کہ کبھی بلند آواز میں تلاوت کرتے ہوئے کسی آیت پر اس پر کیفیت طاری ہو جاتی۔ آنکھوں سے آنسو بہتے۔ گلے میں پھندے لگنے لگتے، اسی کی ہچکیاں بندھ جاتیں اور آگے پڑھنا اس کے لئے ممکن ہی نہ رہتا۔ بلکہ وہ تو اسی آیت کو بھی نہ دہرا پاتا۔ وہ کیفیت بہت اچھی لگتی تھی اسے۔ لگتا تھا کہ اسے دھو کر پاک کیا جا رہا ہے۔

اور کئی دن بعد بھی اس کا جی چاہتا کہ پھر وہ کیفیت اس پر طاری ہو۔ وہ اس آیت کو پڑھتا، بار بار دہراتا، لیکن کچھ بھی نہ ہوتا۔ آنکھوں کو تو چھوڑو، دل میں بھی نمی کا احساس تک نہ ہوتا۔ وہ بے بسی اور شوق سے نڈھال ہو جاتا۔ لیکن نامراد رہتا۔

تو اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اقتدار و اختیار اور قدرت کلی طور پر صرف اللہ کی ہے۔ بے شک اس نے اس میں سے کچھ بہت تھوڑا سا انسان کو بھی عطا کر دیا ہے۔ جس پر انسان پھولتا پھلتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتا کہ دینے والا جب جس لمحے چاہے، اور جتنی دیر کے لئے چاہے، وہ اختیار اس سے واپس لے لے، اور چاہے تو دوبارہ دے ہی نہیں۔ اس کی سمجھ میں موہوم سے انداز میں یہ بات بھی آئی تھی کہ بندہ تقویٰ، اطاعت اور اللہ کی محبت اپنائے تو وہ دُنیا میں بھی اسی کا انعام دیتا ہے۔ ایسے کہ بندے کو دیئے ہوئے اقتدار و اختیار و قدرت میں اضافہ کر دیتا ہے۔

اور اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اپنے جید کلام میں بھی اللہ نے اپنے اقتدار و اختیار اور قدرت کو منتقل کر دیا ہے۔ عاجزی سے، گڑگڑا کر پڑھو، سوچ کر، اے میرے رب کے کلام، مجھے روشن کر دے، تو آدمی پر کائنات کے بھید کھلنے لگتے ہیں۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آئی تھی کہ اللہ نے اپنے اقتدار و اختیار اور قدرت کا جو ایک ذرّہ انسان کو عطا کیا تو اس سے لاکھوں، کروڑوں گنا زیادہ اقتدار و اختیار اور قدرت اپنے کلام میں منتقل کر دی۔ کس کے لئے؟ انسان کے لئے! اس انسان کے لئے جو اس کلام عظیم کو اس طرح پڑھے، جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ علم و اقتدار سارے کا سارا اللہ کا ہے۔ یہ اس کی کریمی ہے کہ اس نے اپنے خلیفہ کے لئے اس میں ایک حصہ مقرر کر دیا۔ چھوٹا سا حصہ، مگر وہ بھی انسان کے لئے اتنا بڑا ہے کہ شاید وہ اسے قیامت تک حاصل نہ کر سکے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ بدنصیب یہ بھی نہیں سمجھتا کہ یہ سب کچھ اسے صرف قرآن سے ملے گا۔ وہ قرآن کو چھوڑ کر باہر کی مادّی نشانیوں میں سر کھپاتا ہے۔ وقت ضائع کرتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ قرآن اللہ کی مملکت علم کا

دروازہ ہے، سائنس کو حقیر اور بے معنی کر دینے والے علم کا شارٹ کٹ ہے۔ اسی لئے تو پیغمبر آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں تمہارے لئے قرآن چھوڑے جا رہا ہوں۔ اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا مگر اُمت اسے طاق پر رکھ کر بھول گئی۔

عبدالحق کو اچھی طرح یاد تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ کوئی بہت بڑا راز اس پر کھلنے والا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس پر عجیب سی گھبراہٹ اور خوف طاری ہو گیا تھا۔ دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہونے لگا تھا اور یہ نہیں کہ ارتکاز کی کمی اور انتشار کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ وہ اپنی بساط کی حد تک مکمل ارتکازی حالت میں تھا۔ مگر کوئی بہت بڑی کمی تھی جو اس کے آگے بڑھنے میں مزاحم تھی۔ شاید اس کے ارتکازی استعداد اس راز کے لئے لازمی استعداد سے بہت کم تھی اور وہ جانتا تھا کہ وہ اسے قرآن سے ہی ملے گی۔ وہ ایسی کیفیت تھی جو ریاضی کا کوئی پیچیدہ سوال حل کرتے وقت ہوتی ہے۔ ایسا سوال، جس میں ہندسوں کی کثرت ہو اور ضرب کرتے وقت آدمی کو کم اوقاتی کا احساس ہونے لگے تو وہ گھبراہٹ میں پورا عمل گنوا کر نقطۂ آغاز پر واپس آ جاتا ہے اور تاسف سے ہاتھ ملتا رہتا ہے۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ علم تو صرف قرآن میں ہے اور جن علوم کے پیچھے انسان بھاگ رہا ہے، وہ ساٹھ سال کی مہلت میں کروڑوں سال کی مسافت پر موجود منزل تک پہنچنے کی احمقانہ اور یقینی طور پر ناکام کوشش ہے۔ جبکہ اس منزل تک پہنچنے کا شارٹ کٹ قرآن ہے۔

اس بات کا اسے تجربہ تھا کہ آپ قرآن پڑھ رہے ہوں، سن رہے ہوں، خود سمجھ رہے ہوں یا سمجھا رہے ہوں، ہر بار ایک مختلف کیفیت میں ہوتے ہیں۔ یہ عام لوگوں کی بات ہے۔ وہ دیکھتا تھا کہ مولوی مہر علی کی کیفیت کا معاملہ مختلف ہے۔ اکثر و بیشتر وہ اس سے قرآن کے بارے میں بات کرتے تھے۔ لیکن ان کے ہاں کیفیت ایک ہی ہوتی تھی۔ ان کی بات ہر بار ویسے ہی دل میں اترتی تھی۔

وہ مولوی صاحب سے اپنا موازنہ نہ کرتا، غور کرتا پھر ایک دن اس کی سمجھ میں بات آ گئی۔ عام آدمی تو دُنیا سے چپکا ہوتا ہے۔ دُنیا کے مسائل، پریشانیاں اور تفکرات کی وجہ سے وہ یکسوئی سے محروم ہوتا ہے۔ مولوی صاحب کو اس نے کبھی پریشان نہیں دیکھا تھا۔ بیوی بچوں کو وہ مناسب وقت دیتے تھے لیکن اس کے بعد وہ اللہ کے لئے جو کچھ کرتے، نہایت یکسوئی کے ساتھ کرتے۔ قرآن پڑھتے وقت ان کے استغراق کا یہ عالم ہوتا کہ پکارتے رہو اور آواز ان تک نہ پہنچے۔

اس پر عبدالحق کو یاد آیا کہ قرآن میں کئی مقامات پر اللہ نے اسے بہت بڑی صفت قرار دیا ہے۔ اور یہ صفت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تھی۔ وہ جو سب سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو رہا، یکسوئی کے ساتھ، ابراہیم خلیل اللہ، آتش نمرود بھی جن کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔

اس نے سوچا، دُنیا میں بے شمار لوگ ہوں گے، جو مولوی صاحب سے بھی آگے ہوں گے۔ یکسوئی میں، بہت آگے۔ وہ ہر وقت قرآن کی کیفیت میں رہتے ہوں گے۔ ان پر آیات کے مفاہیم اترتے ہوں گے، کائنات کے، زندگی اور موت کے بھید کھلتے ہوں گے۔ وہ ایسا کہاں، وہ تو ہر وہ پوش رات کے حوالے سے نوربانو کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ نماز میں ہو یا قرآن پڑھ رہا ہو، اس کا آزاد اور بے لگام نفس تصور میں اسے ترغیبات دکھا رہا ہوتا ہے۔ تو یکسوئی تو نفس پر مکمل غلبہ حاصل کرنے سے مشروط ہے۔

اس نے سوچا، نوربانو کے لحن میں تاشبہ نہ ہونا وقتی چیز ہے، جو کسی بھی لمحے واپس آ سکتی ہے۔ لیکن اسے یاد تھا کہ دہلی میں اس آواز میں ہر روز ایک ہی کیفیت ہوتی تھی۔ سرشاری اور بے خودی کی، شاید اس لئے کہ نوربانو اس وقت دُنیا سے، اس کی رنگینیوں سے ناآشنا تھی۔ اس کے نفس کے سامنے دماغ کو منتشر کر دینے والے لاتعداد امکانات نہیں تھے۔ جبکہ اب اس کے پاس اس کی محبت بھی ہے، اور اس محبت کے اظہار کے بے شمار پیرائے بھی ہیں اور جسمانی پیرایہ ان سب پر حاوی ہے۔

تو محبت سے یہ نقصان بھی ممکن ہے۔ اس نے حیرت سے سوچا۔ جبکہ محبت تو اللہ کی عطا ہے۔ فوراً ہی اسے خیال آیا کہ دُنیا میں سب کچھ آزمائش کے لئے ہے۔ اللہ کی ہر عطا آزمائش ہے۔ وہ محبت دیتا ہے یہ دیکھنے کے لئے جس کی محبت بندے کو دی، بندہ اس کی محبت میں محبت دینے والے کو تو نہیں بھول جاتا، وہ محبت دینے والا، جس سے سب سے بڑھ کر محبت کرنا انسان کا فرض ہے، اور محبت کیا، یہ تو ہر نعمت کے لئے ہے۔ بندہ کہتا ہے، میری ماں مجھ سے بہت محبت کرتی ہے، میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ یہ کبھی نہیں کہتا کہ میرا ربّ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ ساری دُنیا میں اتنی محبت ہے ہی نہیں۔ اس لئے میں بھی ہر چیز، ہر شخص اور ہر رشتے سے بڑھ کر اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ نہیں کہتا، کیونکہ اللہ اسے نظر نہیں آتا۔

خود پر شرم آنے لگی۔ لڑکپن میں وہ سوچتا تھا کہ اسے اللہ کو تلاش کرنا اور جاننا ہے۔ تاکہ وہ اس سے محبت کرے۔ کیونکہ اسے سب کچھ اسی نے دیا ہے۔ مگر آج ایمان کو پہنچنے کے بعد وہ اسے بھول بیٹھا۔

مسئلہ یہ ہے کہ آدمی سب سے زیادہ انحصار آنکھوں پر کرتا ہے۔ محاورہ ہے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اور سچ ہے، آپ کسی سے محبت کرتے ہوں، اور وہ دور چلا جائے تو اس کی صورت تصور سے بھی ہٹنے لگتی ہے۔ برسوں ہو جائیں تو اسے بھول ہی جاتا ہے۔ کوئی کتنا ہی محبوب ہو، وہ مر جائے تو اسے بھول ہی جاتا ہے نا، تو دیکھے بغیر محبت کیسے ہو؟

مگر اس نے نور بانو کو نہیں دیکھا تھا، پھر بھی اس سے محبت ہوگئی تھی۔

اللہ نے انسان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگوں سے، چیزوں سے ایسی محبت کرتے ہو، جو صرف مجھ سے کرنی چاہئے۔ یہ ایک سیدھا سا بیان ہے، جو حقیقت بیان کرتا ہے، ایک تلقین عطا فرماتا ہے لیکن اصرار نہیں کرتا۔ ہاں اللہ اصرار کرتا ہے، حکم دیتا ہے کہ مجھ پر ایمان لاؤ، مجھے دیکھے بغیر۔ اَب ایمان کے درجے میں، اور ایمان کا سفر ہے۔ ایمان زبانی جمع خرچ کی حد تک رہ گیا اور آپ نے ایمان کے ارتقاء کا سفر نہیں کیا تو زندگی رائیگاں ہوئی نا۔

عبدالحق پر کپکپی طاری ہوگئی۔

ایمان اسی محبت کے سفر کا نقطۂ آغاز ہے، جس کا سزاوار صرف اللہ ہے۔ بغیر دیکھے ایمان تو لے آئے لیکن اسے سمجھا، جانا تو نہیں۔ اب ایمان لاکر رُک مت جاؤ، آگے بڑھو، اسے دیکھو، اسے جانو، جان گئے تو محبت کئے بغیر رہ ہی نہیں سکو گے۔

اب دیکھیں کیسے؟ جانیں کیسے؟

اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے محبت سمیت مجھے اتنی نعمتیں دیں، جن کا شمار تو کجا مجھے ادراک تک نہیں۔ عبدالحق نے زیرِ لب کہا۔

یہ اس سوال کا جواب تھا کہ دیکھیں کیسے؟ جانیں کیسے؟ بندہ سوچے، غور کرے تو اللہ رہنمائی فرماتا ہے۔ نعمتوں کا ادراک عطا فرماتا ہے۔ نعمتوں کا علم ہوتا ہے تو بندے کو اپنے ربّ کی، دینے کی قدرتِ کاملہ سمجھ میں آتی ہے۔ سمجھے تو وہ شکر ادا کرتا ہے، اور شکر اللہ کو سمجھنے اور جاننے کا پہلا دروازہ ہے۔ آگے بڑھو تو ایک ایک کر کے دروازے کھلتے جاتے ہیں۔ اللہ کو جاننے اور سمجھنے کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ بندہ خلوص کے ساتھ غور تو کرے۔ غور کے لئے فرصت تو نکالے اور دماغ سے دُنیا کو جھٹک کر ارتکاز کے ساتھ غور کرے۔

دل نے کہا تھا کہ بندہ اللہ کو دیکھ سکتا ہے، جان سکتا ہے۔ لیکن کیسے؟ اس سوال کا جواب خاموشی تھی۔ خاموشی کا مطلب تھا کہ جتنا پتا چل ہے، پہلے اس پر تو عمل کرو۔

مگر وہ تو قرآن سے بھی دور ہوگیا تھا۔ نور بانو کی آواز سے اُمید تھی، وہ بھی پوری نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے بار بار نور بانو سے قرأت کی فرمائش کی کہ شاید کسی دن وہ کیفیت لوٹ آئے، چاہے ایک بار ہی کے لئے ہو۔ لیکن وہاں تو ایسا کچھ جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ قرأت جس نے اسے آسمان کے رنگ دکھائے تھے، اس کی سماعت سے بھی محو ہو چکی تھی۔

وہ جھنجھلانے لگا۔ وہ بچہ نہیں تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا فرمائش

پر نور بانو جھنجلاتی ہے، ٹالتی ہے، عذر پیش کرتی ہے۔ پھر بھی اصرار قائم رہے تو بے دلی سے پڑھتی ہے۔ ایسے میں کیفیت کیسے آئے گی؟

اب ایک سوال یہ قائم ہوگیا کہ ایسا کیوں ہے؟ نور بانو بدل کیوں گئی؟ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے ہار گیا تو اس نے یہ بات نور بانو سے پوچھ لی۔

''یقین سے تو نہیں کہہ سکتی میں۔'' نور بانو نے کہا۔

''لیکن شاید بات یہ ہے کہ دہلی میں میں آزاد تھی۔ جی چاہا تو کوئی کام کرلیا۔ نہیں تو چمن بوا اور امی تو موجود تھیں ہی۔ ذمہ داری کوئی تھی نہیں تو دل لگا کر پڑھتی تھی۔ پورے دھیان کے ساتھ اور جس رات آپ نے مجھے سنا، اس کی تو بات ہی اور تھی۔ وہ رمضان کی چاند رات تھی اور میں...... کیا کیا دیکھا تھا میں نے......'' اس کا جسم کانپنے لگا۔ کیا کیا...... اور وہ سب تازہ تھا۔ اور میں اپنے مرے ہوئے لوگوں کے لئے سورۂ ملک پڑھ رہی تھی۔ اب وہ کیفیت تو آ بھی نہیں سکتی۔''

بات معقول تھی۔ عبدالحق نے کہا۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے پہلے بھی تو تم پڑھتی تھیں اور میں بے خود ہو جاتا تھا۔''

''میں نے کہا نا، جب میں آزاد تھی۔ اب میں ایک پورے گھر کی ذمہ دار ہوں۔ بے شک نوکر موجود ہیں، لیکن دوسروں سے کام کرواتا، نوکروں پر نظر رکھنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس میں کام کرنے سے زیادہ تھکن ہوتی ہے۔ پورا دن گزر جاتا ہے۔ ایک لمحے کی فرصت نہیں ملتی اور ذرا فرصت ملے تو آپ کے بارے میں سوچتی ہوں۔''

''میرے بارے میں! کیا سوچتی ہو میرے بارے میں؟''

''بس ایک ہی بات! ایسا کیا کروں کہ آپ خوش رہیں۔ بس یہی ایک فکر کرتی ہوں۔''

''مگر میں تو خوش ہوں۔ بہت خوش!''

''ہر خوشی وقت کے ساتھ پھیکی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ خوشی ہی نہیں رہتی۔'' نور بانو نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''میرے ساتھ تو ایسا کبھی نہیں ہوتا۔''

''پتا نہیں چلتا ہوگا آپ کو، یہ تو انسان کی فطرت ہے۔ مجھے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں آپ کے دل سے اُتر نہ جاؤں۔ اس لئے فرصت میں بیٹھ کر آپ کے لئے نت نئی خوشیاں تلاش کرتی ہوں۔''

''اور جو میری اصل خوشی تھی، اسے بھلا بیٹھیں۔'' عبدالحق نے شکایتاً کہا۔

''اب پڑھتی تو ہوں، سناتی تو ہوں، لیکن آپ کو اچھا ہی نہیں لگتا۔ دیکھیں، میری بات ثابت ہوگئی نا، ہر خوشی ملنے کے بعد پل پل پھیکی ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ خوشی ہی نہیں رہتی۔'' نور بانو نے بات اس پر ہی رکھ دی۔

''اب وہی میں ہوں، وہی میری آواز اور وہی اللہ کا کلام۔ مگر آپ کی کیفیت بدل گئی۔

عبدالحق کو بھلا لگا لیکن وہ معقولیت سے سوچنے والا آدمی تھا۔ اس نے سوچا۔ یہ ناممکن تو نہیں کہ فرق مجھ میں آیا ہو اور وہ جانتا تھا کہ فرق تو اس میں آیا ہے۔ نہ پہلے کی طرح نماز پڑھتا ہے، نہ قرآن۔ فرصت ہی نہیں ملتی اسے۔

کبھی کبھی اس کا جی چاہتا ہے کہ یہ مقابلے کا امتحان چھوڑ کر لاہور چھوڑ کر حق نگر واپس چلا جائے۔ اللہ کے فضل و کرم سے اسے اس کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ تو ہے اس کے پاس اور ان غیر ضروری چیزوں کی وجہ سے وہ اہم ترین چیزوں سے دُور ہو رہا ہے۔

لیکن اسے یاد تھا...... مولوی صاحب نے کہا تھا...... اللہ تک پہنچنے کے بے شمار راستے ہیں۔ سب سے آسان یہ ہے کہ اس کے بندوں سے محبت کرو۔ اس کی مخلوق پر مہربانی کرو اور مسعود صاحب کہتے تھے یہ ملک اللہ کی عطا ہے۔ یہ عالمِ اسلام کی اُمید ہے۔ اس کی فلاح اور ترقی کے لئے کچھ کرنا اللہ کو خوش کرنا ہے۔ اس ملک کو تعلیم یافتہ، عقل مند، دیانتدار اور دردمند افسروں کی ضرورت

ہے۔ ورنہ بددیانت، ظالم اور راشی افسر اس ملک کو کھوکھلا کر دیں گے۔

یہ یاد آتا تو وہ سوچتا کہ یہاں بھی وہ ایک طرح سے اللہ کا کام ہی کر رہا ہے۔ مگر دل کی خلش دور نہیں ہوتی تھی۔

اسی ہاں اور نا میں تین سال گزر گئے۔ اب تو اسے نتیجے کا انتظار تھا اور ادھر وہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ بس دل کی یہ بے سکونی ستاتی رہتی تھی۔

نوربانو کی بات ایک اور انداز میں سچ ثابت ہوگئی تھی۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ چیزیں جب اپنی اہمیت کھونے لگیں تو پھر ایک وقت آتا ہے کہ غیر اہم ہی ہو جاتی ہیں۔ جب تسکین ہی نہیں رہتی تو اس نے نوربانو سے فرمائش کرنا چھوڑ دیا۔ اور نوربانو تو ویسے بھی اس کی فرمائش ہی کی وجہ سے مارے باندھے سناتی تھی۔ فرمائش نہ رہی تو وہ بھی مطمئن ہوگئی۔

''یہ آپ کی چائے۔''

نوربانو نے اسے چونکا دیا۔

''کیا کر رہے تھے آپ؟''

''پڑھ رہا تھا۔''

''لگتا تو نہیں۔'' نوربانو کے لہجے میں شک تھا۔

''نظریں تو خالی خالی ہیں آپ کی۔''

''تمہیں دیکھتا ہوں تو ایسی ہی ہو جاتی ہیں۔''

''اب مجھے بنا رہے ہیں آپ!''

''نہیں......! سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ سنجیدہ ہوگیا۔

''تم ہی کہو، اگر میں پڑھ نہیں رہا تو کیا کر رہا ہوں؟''

''کچھ سوچ رہے ہوں گے۔''

''سوچ تو کچھ بھی سکتا ہے آدمی۔''

''مگر میں کبھی تم سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ میری ہر سوچ تم پر آ کر رُک جاتی ہے۔''

''پھر وہی...... مجھے بنا رہے ہیں آپ......''

''نہیں......! سچ کہہ رہا ہوں۔''

''تو اتنے افسوس سے کیوں کہہ رہے ہیں؟'' نوربانو نے رنگ بدلا۔

''مجھے افسوس ہوتا ہے۔'' عبدالحق نے زور دے کر کہا۔

''کبھی کبھی میں تمہیں پیچھے چھوڑے بغیر تم سے آگے جا کر بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔''

نوربانو سہم گئی، دل میں ڈر گئی۔ یہی تو دھڑکا لگا رہتا تھا اسے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور عبدالحق کی گردن کو سہلانے لگی۔

''کوئی ضرورت نہیں۔'' اس نے بڑے ناز سے کہا۔

''مجھ سے جتنا ہی آگے جائیں گے، وہاں بھی میں ہی ملوں گی آپ کو۔''

عبدالحق بے خود ہوگیا۔ مسحور ہوگیا۔ اس لمس میں آج بھی وہی تاثیر تھی۔ بلکہ شاید بڑھ گئی تھی۔ اس نے نوربانو کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

نوربانو نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''کیا کرتے ہیں، کوئی دیکھ لے گا۔''

''اور تم نے جو ہاتھ رکھا ہوا تھا، وہ کوئی دیکھ لیتا تو؟''

''تو میں ہاتھ اُوپر لے جاتی اور سر دبانا شروع کر دیتی، اور کہتی...... سر میں درد ہو رہا ہے صاحب کے۔''

''بڑی مکار ہو تم!''

''ہاں......! وہ تو میں ہوں۔'' نوربانو نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا اب جاؤ......! مجھے کام کرنے دو۔''

''میں سامنے بیٹھی رہوں تو آپ کام نہیں کر سکتے۔''

''کر سکتا ہوں...... ایک ہی کام کر سکتا ہوں۔ لیکن اس وقت وہ ممکن نہیں۔ اس وقت تو مجھے کچھ اور کرنا ہے۔ جاؤ تم۔''

نوربانو خوش ہوگئی۔ وہ ہنستی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ عبدالحق اپنے کام

کی طرف متوجہ ہو گیا۔

* * *

"مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔" نادرہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تم نے انہیں بتایا نہیں میرے بارے میں۔"

"بتایا تھا باجی!" یہ کہتے ہوئے ثمن نے نہ جانے کیوں شرمندگی سے نظریں جھکا لیں۔

"پھر بھی؟"

"وہ کہتے تھے، گاہک یا تماش بین کی حیثیت سے نہیں، عزت کرنے والے دوست کی حیثیت سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"عزت اور دوستی! اور وہ بھی کوٹھے پر۔" نادرہ نے حقارت سے کہا۔

"نہ تم دودھ پیتی بچی ہو ثمن! اور نہ میں۔ ہم دونوں ہی یہ بات سمجھتے ہیں۔"

"ایک بات کہوں باجی! وہ بہت مختلف آدمی ہیں۔"

"کتنے ہی مختلف ہوں، ہیں تو مرد ہوں۔"

ثمن بجھ سی گئی۔

"مرد اچھے بھی تو ہوتے ہیں باجی!" اس نے آہستہ سے کہا۔

نادرہ نے اسے غور سے دیکھا۔

"تم ان سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئی ہو؟"

"وہ ہیں ہی ایسے۔"

"اچھا......! میں سوچ کر جواب دوں گی۔"

اور نادرہ کو واقعی سوچنا تھا۔ کوئی بڑا افسر ایک کوٹھے کی نائیکہ سے عزت کرنے والے دوست کی حیثیت سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ غرض کہ کاروبار کی اس دُنیا میں دوستی نہیں چلتی۔ عارف کو اس سے...... بلکہ اس کوٹھے سے کچھ نہ کچھ لینا ہوگا ورنہ وہ اس انداز میں بات کبھی نہ کرتا۔

اور جو نقشہ ثمن نے کھینچا تھا، اس سے وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ عارف

کوئی بڑا اور اہم افسر ہوگا۔ بھٹی جیسے آدمی نے وہ محفل اس کے اعزاز میں برپا کی تھی اور سب سے پہلے لڑکی کے انتخاب کا حق بھی اسے دیا گیا تھا۔ بھٹی یوں ہی بلاوجہ تو کسی کو اہمیت نہیں دے سکتا تھا۔ یہ عارف یقیناً کوئی بڑی چیز ہوگا۔

اعلیٰ افسران کی اہمیت تو نادرہ نے نیلم بائی کی زندگی میں ہی سمجھ لی تھی۔ اس کے بعد اس پر اور رموز بھی کھل گئے تھے۔ ان افسران کا دبا ہوا تحفظ بڑی نعمت تھا۔ ان کی سرپرستی میسر ہوتے ہوئے کوئی بھی کوٹھے کو ٹیڑھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نہ کوئی بدمعاش نہ کوئی پولیس والا۔ اور وہ بگڑ جاتے تو کوٹھے پر پولیس کا Raid بھی ہو جاتا تھا۔

اور بھٹی تو اعلیٰ افسران کا سرتاج تھا۔ اس کی پہنچ بہت اوپر تک تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی بات کبھی نہیں ٹالی جاتی تھی۔

اس تناظر میں عارف کی استدعا اور اہمیت اختیار کر گئی۔ اس نے خاموشی سے ثمن سے بات کی تھی اور وہ بھی بے حد باعزت انداز میں۔ وہ چاہتا تو بھٹی سے بات کرتا اور نادرہ کو جہاں چاہتا، بلوا لیتا۔ انکار کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس معاملے کو ذاتی بنا لیا۔

تو کیا یہ عارف کی اچھائی ہے؟

لیکن جو کچھ نادرہ نے دیکھا اور بھگتا تھا، اس کے بعد بے غرضی کا فلسفہ اس کے حلق سے اتنی آسانی سے نہیں اُتر سکتا تھا۔ طوائف کی عزت تو کوئی اپنی غرض سے بھی نہیں کرتا، بے غرضی کے ساتھ تو بہت دور کی بات ہے۔

تو یہ طے ہے کہ بات کسی غرض کی ہے۔ اور کسی نائیکہ سے کسی کو کیا غرض ہو سکتی ہے۔ یہی نا کہ کوئی لڑکی پسند آ گئی ہو۔

ایک لمحے کو نادرہ ڈر گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کہیں سے انہیں ارجمند کی سن گن مل گئی ہو۔ لیکن نہیں...... ارجمند تو ابھی بچہ ہے...... اس...... گیارہ سال کی...... لیکن بے راہ رووں کا کیا ٹھکانا؟

مگر پھر اسے ثمن کا انداز یاد آیا۔ عارف کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں احترام اور محبت ہوتی تھی اور اس نے عارف سے متاثر

ہونے کا اعتراف بھی کیا تھا۔

اور خود ثمن بھی لاکھوں میں ایک تھی۔ صورت شکل ہی نہیں، اس کی عادات و اطوار بھی بہت اچھے تھے۔ کون جانے، دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا ہو اور عارف اسی سلسلے میں اس کے پاس آ رہا ہو۔

یقیناً یہی بات ہوئی۔ جبھی تو اس نے بھٹی سے بات نہیں کی۔ ان افسروں کا بھی ایک اُصول تھا۔ کوٹھے سے کسی لڑکی کو زندگی بھر کے لئے کبھی نہیں اٹھاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ ایسا کرنے لگے تو کوٹھے ہی اُجڑ جائیں گے۔ پھر جو لڑکی جب جی چاہے، مل سکتی ہو، اسے گلے کا ہار بنانے کا فائدہ؟ تو اگر عارف یہ بات بھٹی سے کرتا تو بھٹی کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے لئے دیوار بن جاتا۔ اسی لئے عارف نے سوچا ہوگا کہ اس سے مل کر بات کرے۔

نادرہ نے سوچ لیا کہ وہ عارف سے ضرور ملے گی۔ لیکن اپنے انداز میں۔

اسی وقت ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

''پھپھو! اچھی پھپھو! بھوک لگ رہی ہے مجھے۔''

''تو چلو۔ تمہیں کھانا دے دوں۔''

''آپ نہیں کھائیں گی؟''

''میں بھی کھا لوں گی۔''

کھانا نکالتے ہوئے اس نے اچھو میاں کو آواز دی۔

''آپ بھی کھا لیں۔''

''ابھی تو بھوک نہیں ہے۔ میں بعد میں کھا لوں گا۔'' اچھو میاں نے جواب دیا۔

''تم کھاؤ بیٹا!''

وہ پوچھنا بھی محض رسمی تھا۔ نادرہ جانتی تھی کہ وہ ان کے ساتھ نہیں بیٹھیں گے۔ وہ کبھی ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ یہ بات نادرہ کو عجیب

لگتی تھی۔ مگر ایک اطمینان تھا اسے۔ اس کا سبب کراہت ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ وہ ہر بار کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرتے، اور پھر اس سے کہتے۔ تمہارا احسان ہے بیٹا! اس کوٹھے پر بھی حق حلال کی روٹی کھلا رہی ہو تم۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں نواب صاحب! یہ تو اللہ کا کرم ہے۔''

''مگر وسیلہ تو تم ہو۔''

''ہم برابر کے حصہ دار ہیں نواب صاحب! میں محنت کرتی ہوں، لیکن بھاگ دوڑ تو آپ کرتے ہیں اور کرم اللہ کا ہے۔''

''بے شک! یہ اللہ کی بہت بڑی عنایت ہے؟''

ایک بار پھر ارجمند نے نادرہ کو چونکا دیا۔

''پھر وہی دال پھپھو!'' وہ ٹھنک کر بولی۔

''تم چھوٹی ہو نا، اس لئے تمہیں پتا نہیں ہے کہ یہ دال کتنی بڑی نعمت ہے۔'' نادرہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''اوہ! کھا کر تو دیکھو، کتنے مزے کی ہے۔'' اس نے نوالہ ارجمند کی طرف بڑھایا۔

ارجمند نے کوئی تعرض نہیں کیا۔

''اب بتاؤ سچی پچی، مزے کی ہے یا نہیں؟''

''بہت مزے کی ہے پھپھو! لیکن کئی دنوں سے گوشت کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔''

''واقعی! کئی دن ہوگئے گوشت پکے۔'' نادرہ نے کہا۔

''اچھا...... ! آج اور صبر کرلو۔ کل انشاء اللہ قورمہ کھلائیں گے تمہیں۔''

یہ دیکھ کر اسے خوشی ہوئی کہ ارجمند نے بے دلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ پیٹ بھر کر کھایا۔ اس نے اسے لپٹا کر خوب پیار کیا۔

''سچ میں تم بڑی پیاری اور صابر بچی ہو۔''

''آپ کی بھتیجی جو ہوں پھپھو!'' ارجمند نے معصومیت سے کہا۔

کھانے کے بعد نادرہ کام میں مصروف ہوگئی۔ شام کو اس نے اچھو

میاں کو بلایا۔

''کپڑے تیار ہوگئے ہیں نواب صاحب!'' اس نے تھیلا ان کی طرف بڑھایا۔

''آپ آج ہی لے جائیں۔ اور کوشش کیجئے گا کہ پیسے آج ہی مل جائیں۔''

''کوئی خاص بات؟'' اچھو میاں نے پوچھا۔

''ارجمند کئی دن سے گوشت کو ترس رہی ہے۔''

''تم فکر نہ کرو بیٹا! میں پیسے لے کر ہی آؤں گا۔''

نادرہ مطمئن ہوگئی۔ اللہ نے اسے کبھی مایوس نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اس کے لئے راہ نکالی تھی۔

یہ سلسلہ تو نیلم بائی کی زندگی میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ اس وقت سے جب نیلم بائی نے سب کچھ اسی کے نام کر دیا تھا۔ اس رمضان سے ہی نادرہ کو یہ خلش ستانے لگی تھی کہ خود تو خود، وہ ارجمند کو بھی حرام کھلا رہی ہے۔ تب اس نے سوچا تھا کہ اسے کچھ کرنا چاہئے۔ مگر کیا؟ اس کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ پھر جب اس نے اچھو میاں کے لئے کرتے سیئے اور ان پر کڑھائی کی تو اسے خیال آیا کہ یہ ایک ہنر تو ہے اس کے پاس۔ یہ اس کے لئے رزق کا وسیلہ بن سکتا ہے۔

اس نے اس سلسلے میں اچھو میاں سے بات کی۔

اچھو میاں کو باہر کی دُنیا کا کچھ پتا نہیں تھا۔ لیکن نادرہ کے جذبے نے ان کے دل کو چھولیا۔ اللہ سے دُعا کر کے ایک دن وہ بازار چلے گئے۔ وہاں جو کچھ ہوا، اور انہوں نے انداز میں معاملات طے کیئے وہ ان کے لئے بھی حیران کن تھے۔

بازار میں سلے سلائے کپڑوں کی بہت دُکانیں تھیں۔ وہ کئی کئی بار ہر دُکان کے سامنے سے گزرے۔ مقصد صرف یہ دیکھنا تھا کہ کون سی دُکان زیادہ چلتی ہے، اور کون دُکان دار دیکھنے میں زیادہ معقول لگتا ہے۔

بالآخر ایک جگہ ان کا دل ٹھکا اور وہ دُکان میں چلے گئے۔ انہوں نے دکاندار سے کرتے دکھانے کو کہا۔ دکاندار نے کرتے دکھائے۔ کپڑا تو اچھا تھا۔ لیکن سلائی اچھی نہیں تھی۔

''کڑھائی والے نہیں ہیں۔''

دکاندار نے کڑھائی والے کرتے ان کے سامنے رکھ دیئے۔

''نہ تو سلائی اچھی ہے نہ کڑھائی۔'' انہوں نے اعتراض کیا۔

''یہ میرے کرتے کو دیکھو، ایسے کرتے ہیں تمہارے پاس۔''

دکاندار نے بہت غور سے ان کے کرتے کو دیکھا۔

''اونہیں جی! ایسے کرتے دکانوں پر کہاں ملتے ہیں۔ یہ تو گھر کا سلا ہوا ہے۔ ہاتھ کی سلائی ہے پوری۔ اور کڑھائی بھی بہت اچھی ہے۔ تم پورا بازار دیکھ لو۔ ایسے کرتے نہیں مل سکتے تمہیں۔''

''اور اگر میں ایسے کرتے تمہیں لا کر دوں تو......''

دکاندار چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''میں تمہیں اچھی قیمت دوں گا ان کی۔ پر ایک شرط ہوگی۔''

''وہ کیا؟''

''بازار میں صرف مجھے دو گے وہ کرتے۔ کسی اور کو نہیں دو گے۔''

''تم اچھی قیمت دو گے تو میں کسی اور کو کیوں دوں گا۔''

''بس تو لے آؤ مال۔ مختلف سائز کے لانا۔''

اچھو میاں دُکان سے نکلے تو جیسے ہواؤں میں اُڑ رہے تھے۔ مگر وہ اللہ کا شکر ادا کرنا نہیں بھولے۔ یہ اللہ ہی کا کرم ہے۔ انہوں نے سوچا۔ ورنہ مجھے تو کاروباری بات کرنی آتی بھی نہیں۔

انہوں نے یہ خوش خبری نادرہ کو پہنچا دی۔

''بس...... اب تم کرتے تیار کر کے دے دو۔''

مگر نادرہ کے سامنے ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ کپڑا خریدنے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ یہ بات اس نے اچھو میاں سے کہی تو وہ چکرا گئے۔

"پیسوں کی کیا کمی ہے؟ سب کچھ تو ہے تمہارے پاس۔"

"یہ بات ہے تو پھر اتنی محنت کی کیا ضرورت ہے؟" نادرہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے نواب صاحب! کہ یہ سب تو مالِ حرام ہے، اور ہم رزقِ حلال کی کوشش میں ہیں تو کیا ہم اپنے حلال رزق کی بنیاد حرام رزق پر رکھیں گے؟"

"ہاں......! یہ تو ہے۔"

دونوں اپنی اپنی جگہ سوچتے رہے۔ پھر ایک دن اچھو میاں نے تجویز پیش کی۔

"ایسا کرو، اس میں سے کچھ بطور قرض لے لو۔ کرتوں کی قیمت ملے تو قرض واپس دے دینا۔"

نادرہ نے چند لمحے سوچا، پھر نفی میں سر ہلایا۔

"پھر دوبارہ کپڑا بھی تو لانا ہوگا۔ یوں تو یہ حرام کا قرض ہمیشہ ہمارے سر چڑھا رہے گا۔"

"تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کر دینا۔"

"نہیں نواب صاحب! قرض لینے سے مالِ حرام حلال نہیں ہوگا۔ رہے گا تو حرام کا پیسہ ہی۔ میں نے اللہ سے رزقِ حلال کی دُعا کی ہے۔ حرام مال کے قرض سے بھی میں یہ کام نہیں کروں گی۔"

"تو پھر؟" اچھو میاں کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"جس نے خیال عطا فرمایا ہے، وہی راستہ بھی بنائے گا۔" نادرہ نے بڑے یقین سے کہا۔

کئی دن گزر گئے۔ مگر بہت سوچنے پر بھی کوئی صورت نکلتی دکھائی نہیں دی۔ نادرہ کو بھی اپنے دل میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کوٹھا ایسی جگہ ہے، جہاں رزقِ حلال کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے باوجود وہ اس کے لئے ذہنی طور پر آمادہ نہیں تھی

کہ اپنے اس اکل حلال کی بنیاد حرام مال پر رکھے، خواہ وہ قرض ہی کیوں نہ ہو اور خواہ وہ قرض ادا بھی کر دے۔ مگر اسے اپنا حلال رزق خالص کبھی نہیں لگے گا۔

دشواری یہ تھی کہ اب نوالے بھی اس کے حلق میں پھنسنے لگے تھے۔ ارجمند کا ساتھ دینے کی خاطر وہ اس کے ساتھ کھانے پر مجبور تھی۔ ورنہ کھانے کو اس کا دل چاہتا ہی نہیں تھا۔ مجبوری یہ بھی تھی کہ ارجمند کو وہ یہ سب کچھ بتانا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اچھو میاں اس کے حال سے بے خبر نہیں تھے۔ لیکن وہ بے بس تھے۔

پھر جس نے اکل حلال کا خیال عطا فرمایا تھا، اس نے راستہ بھی بنا دیا۔

اس روز اچھو میاں کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ اس ارادے سے نکلے کہ کوئی مزدوری مل جائے تو کر لیں۔ کئی جگہ انہوں نے کوشش کی مگر بات نہیں بنی۔

اچانک کہیں سے کوئی جھپٹ کر آیا اور مضبوطی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"او بابا جی! تم تو پلٹ کر ہی نہیں آئے اس دن کے بعد؟"

انہوں نے چونک کر دیکھا۔ وہ وہی دکاندار تھا جس سے اس دن انہوں نے کرتوں کے لئے بات کی تھی۔ انہیں پتا بھی نہیں چلا تھا کہ وہ اس بازار کی طرف نکل آئے ہیں۔

چند لمحے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"او بابا جی! کسی اور دکاندار سے بات کر لی ہے کیا؟" دکاندار نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"نہیں بھئی......! نہیں تو......"

"دیکھو بابا جی! بازار میں جو سب سے زیادہ دام دے رہا ہو، میں اس سے زیادہ دوں گا۔ پر شرط وہی ہوگی۔ میرے علاوہ کسی کو مال نہیں دو گے تم۔"

"یہ بات نہیں، دراصل ہم کام شروع ہی نہیں کر سکے۔"

"کیوں؟ ایسا کیا ہوگیا؟ اچھا آؤ میرے ساتھ۔" دکاندار نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ اور ان کا ہاتھ تھام کر انہیں دکان میں لے گیا۔

"یہاں بیٹھو! اور مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہے؟" اس نے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔

اچھو میاں اسٹول پر بیٹھ گئے۔

"بس کیا بتاؤں؟" وہ بولے۔

"او کھل کر بتاؤ بابا جی!"

"بات یہ ہے کہ ہمارے پاس کپڑا خریدنے کے لئے پیسے نہیں تھے۔" اچھو میاں نے شرمندگی سے کہا۔

"او......! یہ پہلے ہی بتا دینا تھا نا بابا جی! یہ کون سا مسئلہ ہے۔ کپڑا، دھاگا، ساری چیزیں میں دے دیتا اور کام کی اجرت طے کر لیتے۔ یہ تو اور اچھا ہے۔ کپڑا میں اپنی مرضی کا دوں گا۔"

اچھو میاں تو کھل گئے۔

"یہ تو خیال ہی نہیں آیا تھا ہمیں۔"

"دیکھو بابا جی! کام جتنا اچھا ہوگا، میں دام بھی اتنے ہی اچھے دوں گا۔ پر بات وہی ایمانداری کی ہے۔ میرے سوا کسی کو مال نہیں دینا، یہ وعدہ کرنا ہوگا۔"

"ہم زبان کے پکے ہیں۔"

"بس تو میں ضرورت کی ساری چیزیں دیتا ہوں۔ کام شروع کرو۔ تعلق بن جائے گا تو میں سلائی کی مشین بھی خرید کر دوں گا تمہیں۔ پھر کچھ کام مشین کا بھی دے دیا کروں گا۔"

"بڑی مہربانی تمہاری۔"

"مہربانی کیسی بابا جی! یہ تو کاروبار ہے۔ مجھے بھی فائدہ ہوگا اور تمہیں بھی۔"

دکاندار نے تھیلے میں ململ کا ایک تھان ڈالا اور اچھو میاں کی طرف بڑھایا۔

"ڈھاکے کی ململ ہے اعلیٰ درجے کی۔ کام کرنے والے کا بھی دل خوش

ہو جائے گا۔"

اچھو میاں دکان سے نکلنے لگے تو دکاندار نے پکارا۔

"او بابا جی! اپنا پتا تو بتاتے جاؤ۔"

اچھو میاں پلٹے اور اس کی طرف بڑھے۔

"دیکھو بھائی! پتا تو میں نہیں بتاؤں گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں کپڑے کا پورا تھان دے رہا ہوں تمہیں۔ نہیں آئے تو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا تمہیں؟"

"اعتبار کر سکتے ہو تو کر لو، ورنہ یہ رہا تمہارا کپڑا۔" اچھو میاں نے تھیلا کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"سنو بابا جی! میں اپنے لڑکے کو تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ وہ گھر دیکھ آئے گا۔" دکاندار نے نرم لہجے میں کہا۔

"اور بات صرف اعتبار کی نہیں، کبھی کوئی ارجنٹ کام ہوا تو لڑکے کے ہاتھ کپڑا بھجوا دوں گا۔ کبھی کچھ منگوانا ہوا تو منگوا لوں گا۔"

"نہیں بھائی! نہ میں پتا بتاؤں گا، نہ اپنا گھر دکھاؤں گا۔ یہ کر سکتا ہوں کہ ہر دوسرے دن تمہارے پاس ایک چکر لگا لوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ آگے تمہاری مرضی۔"

دکاندار سوچ میں پڑ گیا۔ اچھو میاں باہر جانے کے لئے پلٹے تو دکاندار نے کہا۔

"ٹھیک ہے بابا جی! کپڑا لے جاؤ۔"

اچھو میاں کوٹھے پر پہنچے اور نادرہ کو کپڑا دیا اور تفصیل بتائی۔ نادرہ خوش ہوگئی۔

"دو نفل پڑھوں گی شکرانے کے۔ دیکھا آپ نے، اللہ نے راستہ بھی بنا دیا نا......!"

اب اس تعلق کو تقریباً تین سال ہو گئے تھے۔ اب نادرہ کے پاس مشین بھی تھی۔ وہ لیڈیز سوٹ بھی سیتی تھی اور کڑھائی کا کام تو وہ ایسا کرتی تھی کہ

دیکھتے رہ جاؤ۔ دکاندار بھی بہت خوش تھا۔ اسے اس کے تصور سے بھی زیادہ فائدہ ہو رہا تھا۔ دکان کی ساکھ کہیں کی کہیں پہنچ گئی تھی۔

''لو بیٹا! یہ گوشت لے آیا ہوں میں۔'' اچھو میاں کی آواز نے نادرہ کو چونکا دیا۔

نادرہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''یہ کہاں سے لے آئے آپ! اور کیوں لے آئے؟''

''تمہاری گڑیا گوشت کو ترسے، یہ ہو سکتا ہے بھلا؟ اور ادھار نہیں لائے۔ نقد پیسے دے کر لائے ہیں۔''

''پیسے کہاں سے آئے آپ کے پاس؟''

''تمہارے ہی دیئے ہوئے ہیں۔ زبردستی دے دیتی ہو تو رکھ لیتے ہیں ورنہ ہماری تو اپنی کوئی ضرورت ہے نہیں۔ کپڑے تو وہ اپنا دکاندار ہی دے دیتا ہے۔''

نادرہ مسکرائی۔

''تب تو بہت امیر ہوں گے آپ! بہت پیسے ہوں گے آپ کے پاس۔'' مگر یہ کہتے کہتے وہ اُداس ہوگئی۔ وہ یہ بات اس شخص سے کہہ رہی تھی جو کبھی نواب تھا۔ ہر رات سینکڑوں لٹا دیتا تھا۔ لیکن اس نے یہ بات کہی نہیں۔

''نہیں بیٹا! ایک دو روپے سے زیادہ نہیں رکھتے ہم اپنے پاس۔'' اچھو میاں نے بے پروائی سے کہا۔

''تو پھر کرتے کیا ہیں؟''

''جب بھی داتا دربار جانا ہوتا ہے...... وہاں لنگر میں خرچ کر دیتے ہیں۔''

نادرہ نے بڑی محبت سے انہیں دیکھا...... جب اس نے پہلی بار انہیں دیکھا تھا...... اس کے مقابلے میں کتنے بدل گئے تھے وہ...... سفید داڑھی...... چہرے پر پاکیزگی اور رونق...... اور پیشانی پر نماز کا نشان...... سب اللہ کی رحمت ہے...... وہ مقلب القلوب کیسے بدل دیتا ہے لوگوں کو...... اور کہاں کہاں بدل دیتا

ہے؟ طوائفوں کے کوٹھوں پر بھی، واقعی اس کی رحمت پوری کائنات پر محیط ہے۔

❁ ❁ ❁

اس بار عبدالحق اور نور بانو حق نگر جانے لگے تو حمیدہ نے کہا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی پتر!''

''کیوں اماں! خوامخواہ اتنا تکلیف دہ سفر کرنا۔ پھر وہاں یہاں جیسا آرام کہاں ملے گا؟'' نور بانو نے جلدی سے مداخلت کی۔

''کیسی باتیں کرتی ہو؟'' عبدالحق نے اسے ٹوکا۔

''جس چیز سے آدمی کو خوشی مل رہی ہو، اس کی تکلیف بھی آدمی کو تکلیف نہیں لگتی اور اماں کہہ رہی ہیں تو کچھ سوچ کر ہی کہہ رہی ہوں گی۔''

نور بانو کھسیا گئی۔

''میں تو اماں ہی کے خیال سے کہہ رہی تھی۔''

''میری بٹی کتنا خیال رکھتی ہے میرا۔'' حمیدہ بولی۔

''لیکن اس بار تو میں جائے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''ضرور چلو اماں!''

وہ لوگ گھر پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ حمیدہ دو سال بعد حق نگر آئی تھی۔ وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔

''ارے! کتنا بدل گیا ہے اپنا گاؤں۔ اتنے گھر بن گئے۔ یہ تو دنیا ہی بدل گئی۔''

''اب تو یہ شہر بن گیا ہے اماں!'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بجلی بھی آگئی ہے گھر گھر۔''

اور حمیدہ گھر دیکھ کر بھی حیران ہوئی۔ وہاں بھی بڑی تبدیلیاں نظر آئیں۔ وہ کمرہ جس میں وہ رہتی تھی، اس کے ساتھ اب باتھ روم بھی تھا اور اس میں کموڈ تھا۔ اسے دیکھ کر حمیدہ خوش ہوگئی۔

''لو! یہی ایک پریشانی تھی مجھے۔ یہ کب بنوایا تم نے؟''

''ایک سال ہوگیا ہے اماں!'' عبدالحق نے کہا۔

''میں نے سوچا، آپ کبھی یہاں آئیں گی تو کموڈ کی وجہ سے پریشان ہوں گی۔ بس یہی سوچ کر یہاں کموڈ لگوا لیا۔''

حمیدہ نے اسے لپٹا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

''کتنا خیال رکھنے والا ہے میرا بیٹا!'' پھر وہ نوربانو کی طرف مڑی۔

''اور تو کیوں پریشان ہو رہی تھی میرے لئے؟''

''میں تو آپ کی ضعیفی کے خیال سے کہہ رہی تھی۔''

''بڑھاپا تو اپنی جگہ سچ ہے دھیے! مگر میں نے ساری عمر اللہ سے دعا کی ہے کہ چلتے ہاتھ پیروں اُٹھانا میرے مولا۔ کسی کی محتاجی نہ ہو اور وہ تو ایسا کریم ہے کہ اس نے تو آنکھیں بھی مجھے لوٹا دیں۔ میں تو اس گھر میں اکیلی بھی رہ سکتی ہوں۔''

نوربانو رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ عبدالحق نے کہا۔

''میں زرینہ کی طرف جا رہا ہوں۔ ایک گھنٹے میں آ جاؤں گا۔''

''میں بھی چلوں گی پتر!''

عبدالحق نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں یہاں آئی ہی اس لئے ہوں۔'' حمیدہ نے وضاحت کی۔

''زرینہ کی وجہ سے۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ آج کل میں ہی اس کی طرف سے خوش خبری ملے گی۔''

''تو ٹھیک ہے اماں! چلو!''

''مجھے تو اکیلے میں ڈر لگے گا۔'' نوربانو بولی۔

''تو تم بھی چلی چلو۔ کھانا آ کر پکا لینا۔''

وہ تینوں ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچے۔ صفیہ تو حمیدہ کو دیکھ کر کھل اُٹھی۔

''آہا......! آج تو نصیب جاگ گئے ہمارے۔''

''ہاں......! دو سال بعد آئی ہوں میں۔ اب اتنی دُور سے آنا اتنا آسان تو نہیں۔''

''واقعی! آپ نے بڑی ہمت کی۔''

''ہمت کیا؟ یہ زرینہ کی محبت میں آئی ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے شوخ لہجے میں کہا۔

''سچ کہتے ہیں آپ!'' حمیدہ نے زرینہ کو لپٹاتے ہوئے کہا۔

''اور اب خوش خبری لے کر ہی جاؤں گی۔ آنے والے کا منہ دیکھے بغیر نہیں جاؤں گی میں۔''

زرینہ کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔ یہ کیسے لوگ تھے، جو اس کے اپنے بن گئے تھے۔ اس نے محبت بھری نظروں سے عبدالحق کو دیکھا۔ یہ سب کچھ اس کے دم سے تھا۔ وہ نہ ہوتا تو آج وہ کسی کوٹھے پر بے عزتی کی زندگی گزار رہی ہوتی۔ اب وہ پلٹ کر اس گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتی تھی تو پہلے وہ اسے غیر حقیقی لگتا تھا اور اس کے بعد اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔

''آئیں......! اندر چلیں۔'' صفیہ بیگم نے کہا۔

تمام خواتین اندر چلی گئیں۔ بیٹھک میں ڈاکٹر صاحب اور عبدالحق رہ گئے۔

''تمہارا رزلٹ ابھی نہیں آیا بیٹے!'' ڈاکٹر صاحب نے مشفقانہ انداز میں عبدالحق سے پوچھا۔

''اب کسی دن بھی آ جائے گا چچا صاحب!''

''اور مقابلے کے امتحان کی تیاری کیسی چل رہی ہے؟''

''الحمدللہ! بہت اچھی!''

''انشاءاللہ! اللہ تمہیں کامیاب کرے گا۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ پھر بولے۔

''اس بار دو چار دن رُک جاؤ۔''

''کیوں چچا صاحب! خیر تو ہے؟''

''ہاں ہاں! خیر ہی خیر ہے۔'' ڈاکٹر صاحب مسکرائے۔

''میں چاہتا ہوں کہ اس بار بچے کے کان میں اذان تم دو۔''

''یہ تو اعزاز ہوگا میرے لئے۔'' عبدالحق بھی مسکرایا۔

’’اس کے لئے تو میں ایک ہفتہ بھی رُک سکتا ہوں۔‘‘

’’میرا اندازہ ہے کہ تین دن اور ہیں۔ اچھا آؤ میرے ساتھ۔ تمہیں کچھ دکھانا ہے۔‘‘

عبدالحق ان کے ساتھ نکل آیا۔

اور جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے اسے دکھایا، اسے دیکھ کر اس کا دل خوش ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب کے اسپتال کی عمارت مکمل ہو چکی تھی۔ اسپتال میں میٹرنٹی ہوم بھی تھا۔

’’یہ تو آپ نے کمال کر دیا۔‘‘ اس نے بے ساختہ کہا۔

’’اندر تو چلو!‘‘

اندر جا کر پتا چلا کہ اسپتال کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس کے علاوہ اسٹاف کی کمی کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہاں نرسیں، وارڈ بوائے اور ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ کچھ مریض بھی موجود تھے۔

’’بہت خوب!‘‘

’’مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ لوگوں نے میٹرنٹی ہوم کو قبول کر لیا ہے۔‘‘ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

’’تجربہ کار دائیاں اپنا کام تو جیسے تیسے نمٹا دیتی تھیں، مگر زچہ و بچہ کی بعد کی دیکھ بھال اتنی موثر نہیں ہوتی تھی۔ یہ بہت بڑا کام ہوا ہے۔‘‘

’’واقعی! یہ بڑا کام ہے۔ لیکن اسٹاف کا بندوبست کیسے کیا آپ نے؟‘‘

’’دیکھو! ایک تو یہ اب کوئی گاؤں نہیں، اچھا خاصا شہر ہے۔‘‘

’’زمین لیتے وقت یہی پیش گوئی کی تھی آپ نے۔‘‘ عبدالحق سے رہا نہیں گیا۔

’’ہاں! جو میری نگاہوں نے اس وقت تصور میں دیکھا تھا، اب وہ حقیقت ہے۔ اوہ...... میں ڈاکٹروں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ تو اچھی تنخواہ پر یہاں آکر کام کرنے سے کون انکار کر سکتا ہے اب؟‘‘

’’مگر وہ تنخواہیں تو آپ جیب سے دیتے ہوں گے؟‘‘

’’اب ایسا بھی نہیں ہے۔‘‘ ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر کہا۔

’’امیر لوگوں سے میں رعایت نہیں کرتا۔ ہاں غریبوں کی اور بات ہے۔ ضرورت ہو تو انہیں دوائیں بھی مفت دی جاتی ہیں۔‘‘

’’تب بھی آپ پر بار تو پڑتا ہوگا؟‘‘

’’کوئی بار نہیں پڑتا۔ تم سے زمین خریدتے وقت میں نے سب کچھ سوچ لیا تھا۔‘‘ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

’’اب باہر چل کر دیکھو۔ اکبر کی دکان جدید طرز کے جنرل اسٹور میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جہاں ضرورت کی ہر چیز دستیاب ہے۔ پھر جیسا کہ میں نے سوچا تھا، میں نے مارکیٹ بنوا دی ہے۔ پورا بازار بن گیا ہے۔ سب دُکانیں خوب چلتی ہیں۔ پگڑی پر اٹھا رکھی ہیں۔ اسپتال میں جو کمی پڑتی ہے، وہ اس پیسے سے پوری ہوتی ہے۔ میری جیب سے کچھ نہیں جاتا۔ میں کوئی بے وقوف تھوڑا ہی ہوں۔‘‘

’’مگر وہ بھی تو آپ ہی کی جیب ہے۔ سرمایہ کاری تو آپ ہی نے کی ہے۔‘‘

’’تو اللہ کے دیئے ہوئے مال ہی میں سے تو کی ہے۔‘‘

’’ایک بات کہوں؟ وعدہ کریں کہ مانیں گے؟‘‘

’’اب تم کوئی ایسی ویسی بات تو کہہ نہیں سکتے۔‘‘ ڈاکٹر صاحب نے خوش مزاجی سے کہا۔

’’اس لئے وعدہ کرتا ہوں۔‘‘

’’اب کارِ خیر میں میری طرف سے بھی حصہ قبول فرما لیں۔ میں ہر ماہ ایک مخصوص رقم دیا کروں گا۔‘‘

’’منظور ہے۔ ذمہ داری بڑی اور بھاری ہے۔ مگر میں ذمہ داری سے نہیں گھبراتا۔‘‘

’’شکریہ......!‘‘

اور بازار دیکھ کر عبدالحق واقعی حیران رہ گیا۔ جب وہ دکانیں بن رہی تھیں تو انہیں دیکھ کر اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہاں اتنی رونق ہوگی۔ پھر وہاں جاننے والوں سے سلام دعا ہونے لگی۔ وہ دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا رہا کہ اس نے اسے اتنی محبتیں عطا کیں۔

ڈاکٹر صاحب کے گھر واپس جاتے ہوئے اس نے ڈاکٹر صاحب سے اصغر کے بارے میں پوچھا۔

''اس نے ایم بی بی ایس کر لیا ہے۔ اب ایف آر سی ایس کے لئے انگلینڈ جانا چاہتا ہے۔''

''تو آپ کے لئے کون سا مسئلہ ہے اس بھیجنا۔''

''بھئی......! میں ٹھہرا کاروباری آدمی۔ میں نے کہہ دیا کہ بونڈ بھر دو کہ واپسی پر کم از کم پانچ سال میرے اسپتال میں کام کرو گے۔ تو میں بھیجنے کے لئے تیار ہوں۔''

''کمال کرتے ہیں آپ......! اس سے ایسی بات کی آپ نے......؟''

''میری طرح وہ بھی عقل مند کاروباری ہے۔ وہ تیار ہوگیا۔ اگلے مہینے اس کی روانگی ہے انشاء اللہ......!''

عبدالحق ہنسنے لگا۔

''آپ دونوں نے ہی فائدے کا سودا کیا ہے۔''

✿ ✿ ✿

نادرہ کرتے کی تڑپائی کر رہی تھی کہ ثمن آگئی۔

''وہ...... وہ عارف صاحب آئے ہیں آپ سے ملنے۔'' اس کے لہجے میں دبا دبا ہیجان تھا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ وہ عزت کرنے والے دوست کی حیثیت سے آئیں گے؟''

''ایسے ہی آئے ہیں وہ۔ کہہ رہے ہیں کہ آپ خوشی سے ملنا چاہیں تو ٹھیک ہے۔ ورنہ وہ واپس چلے جائیں گے۔''

''یہ مطلب نہیں ہے میرا۔ تم خود سوچو، کوٹھے پر یہ تو گاہکوں کے آنے کا وقت ہے۔'' نادرہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''اور یہ بات وہ بھی جانتے ہوں گے۔''

''تو پھر دن میں بلا لوں انہیں؟''

''نہیں! تم انہیں میرے پاس لے آؤ۔ میں خود بات کروں گی ان سے۔''

''جی......ٹھیک ہے۔''

ثمن گئی اور ایک منٹ بعد عارف کو ساتھ لے کر آگئی۔

''اب میں جاؤں باجی!'' اس نے نادرہ سے پوچھا۔

''ہاں! تم جاؤ۔''

نادرہ نے عارف کو بہت غور سے دیکھا۔ اس کی شخصیت بے حد متاثر کن تھی۔ خوش شکل اور وجیہہ تو وہ تھا ہی، لیکن اس کے چہرے پر شرافت بھی تھی اور غیر معمولی بات یہ تھی کہ اب تک اس نے نظریں نہیں اُٹھائی تھیں۔

''میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے وقت دیا۔'' عارف نے کہا۔

اس کے لہجے اور انداز میں بھی شائستگی اور تہذیب تھی۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ ابھی میں نے آپ کو وقت نہیں دیا ہے۔''

عارف نے بے ساختہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''جی! میں سمجھا نہیں۔''

''ثمن نے کہا تھا کہ آپ ایک عزت کرنے والے دوست کی حیثیت سے مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''جی ہاں! یہ سچ ہے۔''

''مگر کوٹھے پر اس وقت صرف تماش بین آیا کرتے ہیں۔ یہ بات آپ نہیں جانتے؟''

''سچ پوچھیں تو میں اس وقت آپ سے ملنے کے لئے نہیں آیا تھا۔''

عارف نے کہا۔

''سچ تو یہ ہے کہ مجھے اُمید نہیں تھی کہ آپ رضامند ہوں گی۔ میں تو ثمن سے یہ پوچھنے کے لئے آیا تھا کہ آپ نے کیا جواب دیا ہے؟''

''آپ مجھے بھلے آدمی لگتے ہیں۔'' نادرہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ سے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا، اور کہوں گی بھی نہیں۔''

''میں اس پر گلہ بھی نہیں کروں گا۔ مگر یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ نے بھلا آدمی کیسے سمجھ لیا مجھے؟''

''بہت بڑے افسر ہیں آپ، آپ حکماً بھی مجھ سے مل سکتے تھے۔ میں انکار کہاں کر سکتی ہوں؟''

''پھر عزت اور دوستی کا تعلق کہاں رہ جاتا؟ یہ تو میری سچائی کا ثبوت ہے۔ ویسے میں بھلا آدمی بالکل نہیں ہوں۔''

''میں نے بھی اس وقت عزت اور دوستی کا پاس رکھتے ہوئے آپ کو بلوا لیا کہ ثمن سے کہلوانے کے بجائے خود ہی آپ سے کہہ دوں۔''

''یہ کہ آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتیں۔'' عارف کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''جی نہیں! مجھے آپ کو یہ بتانا تھا کہ آپ کل صبح دس بجے مجھ سے ملنے کے لئے آجائیں۔''

عارف ایک دم خوش ہوگیا۔

''بہت شکریہ! میں چلتا ہوں۔ کل حاضر ہوں گا۔'' وہ جانے کے لئے ٹا۔

''سنیں! اس وقت کی بداخلاقی کے لئے میں شرمندہ ہوں۔ معذرت ہتی ہوں۔''

عارف نے اسے پلٹ کر دیکھا اور مسکرایا۔

''یہ بداخلاقی ہرگز نہیں۔ یہ تو رکھ رکھاؤ ہے آپ کا۔ مجھے اچھا لگا۔'' یہ کر وہ چلا گیا۔

نادرہ دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ ثمن نے ٹھیک کہا تھا، اس شخص میں تماش بینوں والی کوئی بات نہیں تھی اور اس کی شخصیت واقعی مسحور کن تھی۔ ثمن تو پھر طوائف تھی، اس سے تو کوئی عام عورت بھی متاثر ہو سکتی تھی۔

اگلی صبح نادرہ نے ارجمند سے کہا۔

''آج میرا ایک مہمان آرہا ہے گڑیا! خیال رکھنا تم اس کے سامنے نہیں آؤ گی۔''

ارجمند کو حیرت ہوئی۔ کب سے پھپھو کے لئے کوئی مہمان نہیں آیا اور دن میں تو یہاں کوئی مہمان کبھی آتا ہی نہیں تھا۔

''کوئی آپ سے شادی کے لئے آرہا ہے؟'' اس نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''ارے نہیں پگلی!'' نادرہ کو ہنسی آگئی۔

''تمہیں تو پتا ہے، ہم نے شادی کا خیال ہی دل سے نکال دیا ہے۔''

''وہ تو لوگ ہی ایسے آتے تھے۔'' ارجمند نے معصومیت سے کہا۔

''کوئی شہزادہ آجائے تو آپ منع تو نہیں کریں گی۔''

''نہیں گڑیا! اب یہ نہیں ہوسکتا۔ ایسی باتیں نہ کرو۔''

مگر سچ یہ تھا کہ نادرہ بھی تجسس سے بے حال ہو رہی تھی۔ کچھ اسے تشویش بھی تھی۔ لیکن عارف کو دیکھنے کے بعد وہ بس برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ تاہم وہ سوچتی تھی کہ یہ ملاقات بے مقصد تو نہیں ہوسکتی۔

اس نے بڑے کمرے کی صفائی کی۔ گھڑی دیکھی تو صرف نو بجے تھے۔ اس احساس ہوا کہ وہ بڑی شدت سے عارف کی آمد کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ اخبار لے کر بیٹھی، جو اب باقاعدگی سے آتا تھا۔ لیکن اس کا دل نہیں لگا۔ وہ اپنے کمرے سے جا کر وہ کرتا لے آئی، جس پر کڑھائی کر رہی تھی۔ دس بجتے بجتے کرتے مکمل ہوگیا۔

اس نے کرتا برابر والے صوفے پر رکھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اچھو میاں سے اس نے کہہ دیا تھا کہ مہمان کو وہاں لے آئیں۔

چند لمحوں کے بعد عارف کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سلام کیا۔
نادرہ نے سلام کا جواب دیا اور سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''شکریہ!'' عارف نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ بیٹھیں، میں ابھی حاضر ہوتی ہوں۔'' نادرہ نے کہا اور کمرے سے نکل کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

عارف نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کرتے پر نظر پڑی تو وہ اُٹھ کر گیا اور کرتا اُٹھا کر اس کا جائزہ لیا۔ پورا کرتا ہاتھ کا سلا ہوا تھا۔ گریبان پر بڑی نفیس کڑھائی تھی۔ وہ بہت ہی خوب صورت کرتا تھا۔

عارف ستائشی نظروں سے کرتے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کرتا وہیں صوفے پر رکھا اور میز پر رکھے اخبار کا جائزہ لینے لگا۔

چند منٹ بعد نادرہ ہاتھوں پر ٹرے لئے کمرے میں آئی۔ ٹرے پر چائے کی دو پیالیاں اور بسکٹوں کی پلیٹ تھی۔ ٹرے اس نے میز پر رکھ دی۔

''لیجئے پلیز!''

''آپ نے تو تکلف کر ڈالا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ مہمان ہیں، عزت کرنے والے دوست ہیں۔ کوٹھے کے لئے یہ ایک نئی روایت ہے۔ یہ میرا اظہارِ تشکر ہے۔''

عارف نے ایک بسکٹ اُٹھا لیا۔

''آپ باتیں بہت اچھی کرتی ہیں۔''

''پتا نہیں! مجھے تو لگتا ہے کہ میں بات کرنا بھول ہی گئی ہوں۔ آپ بسکٹ اور لیجئے نا......!''

کچھ دیر خاموش رہی۔ دونوں چائے پیتے رہے۔ پھر دونوں نے ایک ساتھ ہی پیالیاں خالی کر کے ٹرے پر رکھیں۔

''میں یہ رکھ آؤں، پھر آپ سے باتیں ہوں گی۔'' نادرہ نے ٹرے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئی اور عارف کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔

''جی! اب فرمائیے۔''

''کیا عرض کروں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں؟ بات بہت گھسی پٹی اور روایتی ہے۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ آپ اسے اسی پیرائے میں سنیں اور سمجھیں۔ میرے لئے یہ بات بہت سنجیدہ اور اہم ہے۔''

''ہم بالکل غیر روایتی ماحول میں ملے ہیں۔ اس لئے آپ اس کی فکر نہ کریں اور جہاں تک فرسودہ پن کا تعلق ہے تو دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں۔ صرف اندر کا خلوص بات کی سچائی کی گواہی دیتا ہے۔''

''خلوص اور سچائی تو ہے میرے پاس، مگر میں اس سے ڈرتا ہوں کہ وہ ارزاں نہ ہو جائے۔''

نادرہ کو یقین ہوگیا کہ وہ اس سے ثمن کے بارے میں بات کرنے والا ہے۔

''میری طرف سے تو آپ فکر نہ کریں۔ خلوص اور سچائی کو تو میں ترستی رہی ہوں اور اس کی خوب پہچان ہے مجھے۔''

عارف ایک دم مطمئن اور پُر اعتماد نظر آنے لگا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور مسکرایا۔

''تو میں گھماؤ پھراؤ کے بغیر سیدھی بات کر سکتا ہوں۔ بات یہ ہے نر......'' وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

''یہ آپ کا اصل نام تو نہیں ہوسکتا۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''بہت فرق پڑتا ہے۔ عزت کرنے والا دوست آپ کو بے عزتی کے نام سے تو نہیں پکار سکتا۔''

اس کے لہجے کے خلوص نے نادرہ کا دل چھو لیا۔ خواہ مخواہ اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''میں یہاں اپنا اصل نام سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ کسی کو بتانا تو بہت دور

کی بات ہے۔"

"آپ ایک بات سمجھ نہیں رہی ہیں۔" عارف نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں جس طرح آپ سے ملنے آیا ہوں، اور آپ نے کل رات مجھے جس انداز میں لوٹا کر آج یہاں بلایا ہے، اور جس طرح آپ نے میری تواضع کی ہے، اس کے بعد کم از کم اس وقت تو یہ جگہ وہ نہیں رہی، جو یہ درحقیقت ہے، یہ تو اس وقت ایک معزز دوست کا ڈرائنگ روم ہے۔"

نادرہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس وقت وہ خود کو بہت بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا کہ اسے خلوص اور سچ کی پہچان ہے۔ سو اب وہ اسے ردّ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھا ہوا وہ شخص اس کے لئے بہت عجیب اور انوکھا تھا۔ وہ مخلص بھی تھا اور سچا بھی۔ اسے سمن کی خوش بختی پر رشک آنے لگا۔

"کچھ کہنے والے تھے آپ!" اس نے اپنے خیالات سے چونک کر کہا۔ وہ تو کھو ہی گئی تھی۔

"وہ میں ضرور کہوں گا۔ مگر اس سے پہلے آپ کا نام جاننا چاہتا ہوں۔"

"میرا نام نادرہ ہے۔"

"تو میں یہ کہہ رہا تھا نادرہ! گھماؤ پھراؤ اور لفاظی کے بغیر کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ نادرہ کے لئے دھماکا تھا اور وہ بھی بہت اچانک اور یکسر غیر متوقع۔ وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔ دیر تک منہ کھولے وہ اسے دیکھتی رہی۔

عارف نے کچھ بھی نہیں کہا۔ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ ردِعمل اس کی توقع کے خلاف ہرگز نہیں تھا۔

نادرہ کو سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ مگر اس کی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی تھی۔

"کیا کہا آپ نے؟ پھر کہیں؟"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟" عارف نے کہا۔

"آپ کا ردِعمل بتاتا ہے کہ آپ نے میری بات واضح طور پر سنی بھی ہے اور اس پر یقین بھی کیا ہے۔ ویسے میں یہ بات ہزار بار کہنے کے لئے تیار ہوں۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ آج سے پہلے آپ مجھے پسند تھیں۔ بہت زیادہ پسند۔ مگر آج میں کہتا ہوں کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔"

"سوری! میں شاک میں تھی، اس لئے یہ سوال کر بیٹھی۔"

نادرہ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"ورنہ مجھے اس سوال کا حق ہی نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے تو سیدھا سچا جواب دینا چاہئے تھا، جو میں اب دے رہی ہوں۔ یہ ممکن نہیں ہے۔"

اب سوال پوچھنے کی باری میری ہے۔ مگر کیوں؟" عارف کے لہجے میں گھمبیرتا تھی۔

"جیسے مجھے وہ سوال پوچھنے کا حق نہیں تھا، ویسے ہی آپ کو یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے۔"

"آپ خود ہی کہہ رہی ہیں کہ آپ کو حق نہیں تھا، مگر آپ نے پوچھا اور میں نے سیدھا سچا جواب دے دیا۔ اب میں پوچھ بیٹھا ہوں تو آپ کو بھی اخلاقاً جواب دینا چاہئے۔"

"میرا جواب اتنا سادہ نہیں ہے اور پھر معاملہ بے حد ذاتی ہے۔"

"شاید میں سمجھ رہا ہوں۔" عارف نے اداسی سے کہا۔

"یہ گھسا پٹا جملہ بہت سنا ہوگا آپ نے۔ آپ اس پر یقین نہیں کر سکتیں۔"

نادرہ کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ عجیب صورتِ حال تھی۔ اس کے سامنے ایک بہت شاندار اور سچا مرد بیٹھا تھا، اور اس سے اظہارِ محبت کر رہا تھا۔ وہ تو شاید

غیر شعوری طور پر، اور کسی حد تک شعوری طور پر برسوں سے اس کی آرزو کر رہی تھی۔ مگر اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

''آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔'' وہ بولی تو اس کے لہجے میں تلخی اور جھنجلاہٹ تھی۔ طوائف کسی اظہارِ محبت کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیتی۔ یہ غلطی کرے تو پھر طوائف سے بھی زیادہ بے عزت اور ذلیل ہو جاتی ہے۔''

''پلیز! آپ یہ لفظ استعمال نہ کریں۔ یوں آپ صرف اپنی نہیں، بلکہ ایک عزت کرنے والے دوست کی بھی توہین و تذلیل کر رہی ہیں۔'' عارف نے تڑپ کر کہا۔

''مجھے عورت اور طوائف کے درمیان جو فرق ہوتا ہے، اس کا علم ہے۔ میں نے ایک اچھی اور پسندیدہ ۔ بلکہ محبوب عورت کو پروپوز کیا ہے اور میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں اس وقت بازار کے کسی کوٹھے پر نہیں، ایک معزز دوست کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوں۔ آپ پلیز مجھے زخمی نہ کریں۔''

سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ نادرہ کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے منہ سے ہر بات غلط نکل رہی ہے۔ سیدھی بات کر کے وہ معاملے کو آسانی سے رفع دفع کر سکتی تھی۔ مگر بات غلط رخ پر نکلی جا رہی ہے۔

''سوری ...! میں واقعی شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسی بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ لیکن دیکھیں نا، میں انکار کر چکی ہوں۔''

''یہ آپ کا حق ہے۔ لیکن میں وجہ جاننا چاہتا ہوں۔''

''آپ یقین کریں وجہ ایسی ہے کہ بتائی نہیں جا سکتی۔'' نادرہ نے بے حد نرم اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''آپ مجھ سے جو چاہیں پوچھ سکتی ہیں۔ پھر آپ انکار کریں گی تو کم از کم مجھے بے انصافی کا احساس تو نہیں ہوگا۔'' عارف کے لہجے میں التجا تھی۔

نادرہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ عارف کو اصل وجہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے یہ بہتر تھا کہ اس کی بات مان لے۔

''پہلے میں ایک بات بتا دوں۔ میرے انکار میں آپ کی بہتری ہے۔ میں ایک ایسی خوفناک بیماری میں مبتلا ہوں، جو لگنے والی ہے۔ آپ مجھے اچھے انسان لگتے ہیں۔ میں کیوں آپ کو عمر بھر کے عذاب میں مبتلا کروں۔''

عارف مسکرایا۔

''میں اس کے باوجود آپ سے شادی کرنا چاہوں گا۔ میں آپ کا علاج کرواؤں گا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔'' وہ کہتے کہتے رکا، اور چند لمحے کے توقف کے بعد بولا۔

''اور سچی بات بتاؤں، میں نہیں مانتا کہ آپ کو کوئی بیماری لاحق ہے۔ یہ تو آپ نے خود کو گناہوں سے بچانے کے لئے ایک قلعہ تعمیر کر لیا ہے۔'' وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

نادرہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ کچھ بول بھی نہ سکی۔

''بے فکر ہو جائیں۔ آپ کا راز ایک عزت کرنے والے دوست کے پاس آپ کی امانت ہے۔'' عارف نے کہا۔

''لیکن آپ کے جھوٹ بولنے پر مجھے رنج ہوا۔ میں اور آپ تو یہاں صرف سچ بولنے کے لئے ملے ہیں۔''

نادرہ شرمندہ ہو گئی۔ اب اس کے پاس مدافعانہ انداز اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے ایک بہت مختلف مرد بیٹھا تھا۔ وہ بہت اچھا اور نفیس انسان تھا اور وہ ذہین اور معاملہ فہم بھی تھا۔ ایک لمحے میں اس نے سمجھ لیا کہ اس کی بیماری دھوکا ہے۔ اب وہ یہ بات عام کر کے اس کے لئے مسائل بھی کھڑے کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس نے یقین دلایا تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ لیکن بہر حال وہ اسے بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تو تھا۔

''کہاں کھو گئیں آپ؟'' عارف نے اسے چونکا دیا۔

''میں ... میں آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''زہے نصیب ...! یہ تو بڑی خوش آئند خبر ہے۔''

''میں آپ کے بارے میں سوچ کر الجھتی ہوں۔ آپ کس طرح بھی

تماش بین نہیں لگتے۔ لیکن......"

"ہوں میں تماش بین ہی۔" عارف نے اس کی بات پوری کر دی۔

"ہے نا......!"

"تو کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں؟" نادرہ نے اسے چیلنج کیا۔

"کر سکتا ہوں۔ لیکن نہیں کروں گا۔"

"تو پھر بتائیں کہ ایسا کیوں ہے؟"

"میری مجبوری ہے۔"

"نفس کی غلامی کو مجبوری کہہ رہے ہیں آپ؟" نادرہ نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

"آپ عورت بن کر، روایتی انداز میں سوچ رہی ہیں۔ ورنہ یہ بات کبھی نہ کہتیں۔ مگر مجھے کوئی شکایت نہیں ہے آپ سے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اس معاملے کا کوئی دوسرا زاویہ بھی ہے؟"

"مجھے یہ بتائیں کہ آپ یہاں کیوں موجود ہیں؟"

"مردوں کی وجہ سے۔" نادرہ نے کہا۔ پھر بات کی تلخی کم کرنے کے لئے جلدی سے اضافہ کیا۔

"اور میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہی ہوں کہ آپ جیسے مردوں کی وجہ سے۔"

"میں یہی جواب سننا چاہتا تھا آپ سے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ بہت محدود ہو کر، روایتی انداز میں سوچ رہی ہیں۔"

"میں پھر دوسرے زاویے کے بارے میں پوچھوں گی۔"

"اور میں کہوں گا کہ زاویے تو بے شمار ہیں۔ آپ اس پورے معاملے پر خود کو پھیلا رہی ہیں۔ صرف اپنی صورتِ حال کے حوالے سے بات کر رہی ہیں۔ اپنے حوالے سے آپ نے یہ باور کر لیا کہ یہاں صرف مظلوم عورتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ سچ نہیں ہے۔ یہاں ظالم عورتیں بھی موجود ہیں۔"

"عجیب بات کر رہے ہیں آپ! حقیقت سے دور، اور افسانوی بات۔"

"جی نہیں! افسانوی انداز تو وہ ہے جس میں آپ سوچ رہے ہیں۔

ورنہ یہاں عورتیں بھی ہیں، جو اپنی بے راہ روی کی وجہ سے یہاں تک پہنچی ہیں۔ ان میں اپنے شوہروں کے ساتھ بے وفائی کرنے والی عورتیں بھی ہیں اور وہ بھی ہیں، جنہوں نے نام نہاد محبت کے نام پر، جو محض دھوکا تھا، اپنے والدین سے بغاوت کی، اور گھر چھوڑا۔ اب یہ نہ کہئے گا کہ وہ محبت کے نام پر فریب کا شکار ہوئیں اور ان کی ذمہ داری مردوں پر ہے۔ جو عورت گھر کی چار دیواری کے تحفظ کو خود چھوڑے، اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ یہاں وہ عورتیں بھی ہیں جو بیک وقت کئی مردوں کو فریب دے رہی تھیں، اسی لئے اس انجام کو پہنچیں اور یہاں وہ عورتیں بھی ہیں جو اچھے لباس، زیورات، آسائشات اور دولت کے لالچ میں یہاں تک آ پہنچیں۔ تو نادرہ! تصویر کا ایک رُخ کبھی نہیں دیکھنا چاہئے۔ یہ بازار، یہ کوٹھے صرف مردوں کے دم سے آباد نہیں ہیں۔ اس میں عورتوں کا بھی حصہ ہے۔"

نادرہ کھسیا گئی۔

"ایک بات بتائیں۔ خریدار نہ ہو تو بازار میں گرمی کہاں سے آئے؟ مرد یہاں کا رخ نہ کریں تو یہ کاروبار کیسے چلے گا؟ کوٹھے تو خود بخود بند ہو جائیں گے۔"

"میں خود اسی طرف آ رہا تھا۔" عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میری باتوں سے یہ نہ سمجھئے گا کہ میں عورتوں پر ہی ذمہ داری ڈال رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جہنم مردوں اور عورتوں نے باہم تخلیق کیا ہے۔ کہیں مردوں کا حصہ زیادہ ہے تو کہیں عورتوں کا۔ تالی بہرحال دو ہاتھوں سے بجتی ہے، ایک ہاتھ سے نہیں۔"

"بات آپ کے بارے میں ہو رہی تھی۔" نادرہ نے کچھ چڑ کر اسے یاد دلایا۔

"جی ہاں! میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ یہاں کیوں ہیں؟ تو آپ نے کہا، مردوں کی وجہ سے۔ اب آپ مجھ سے پوچھتی ہیں کہ میں یہاں کیوں ہوں تو میں جواب دوں گا کہ ایک عورت کی وجہ سے۔"

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''عورتوں کی طرح مردوں کی بھی بے شمار قسمیں ہیں۔ بے شک عیاش لوگ یہاں آتے ہیں۔ مگر اور بھی بے شمار مرد یہاں آتے ہیں، جن کی مجبوری ہوتی ہے۔''

''مرد اور مجبوری! بظاہر یہ سنجیدہ تبادلہ خیال ہے، اور میں ہنسنا نہیں چاہتی۔''

''آپ کو غور تو کرنا چاہئے۔ نفسانی خواہش تو فطری ہے۔ جسمانی تقاضے تو آدمی کو اللہ نے سونپے ہیں اور یہ بھی طے ہے کہ مردوں میں یہ خواہش فطری طور پر عورتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنسی بے راہ روی میں مرد زیادہ آسانی سے، اور کثرت سے مبتلا ہوتے ہیں۔''

''تو اللہ نے اس کا علاج بھی تو عطا فرمایا ہے۔'' نادرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ نکاح اللہ کا تحفہ ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ترین سنتوں میں سے ہے۔ تو جس معاشرے میں بھی نکاح کو مشکل بنا دیا جائے گا وہاں بدکاری اور گناہ بڑھ جائیں گے۔ معاشرے کی فلاح اور بہتری نکاح کے فروغ میں ہے اور یہ اسلامی معاشرے میں ہی ممکن ہے۔''

''تو آپ کے خیال میں یہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے؟''

''یہ مسلمانوں کا معاشرہ تو ہے، لیکن اسلامی نہیں ہے۔ ہندوؤں کی معاشرت کا اثر ہم پر غالب ہے۔ اسلام سادگی کے ذریعے آسانیوں کا راستہ دکھاتا ہے۔ جبکہ ہم نے شادی کو رسومات کا مجموعہ بنا کر مہنگا اور دشوار بنا دیا ہے۔ اب سوچو، کوئی شخص تیس سال کا ہو جائے، اور اس کی شادی نہ ہو سکے تو وہ کیا کرے گا۔ اس بازار کا رخ کرے گا تو مجبوری تو ہوئی نا۔ اب یہاں آئے گا تو گنہگار ہوگا، اور گناہ کا عادی ہوتا جائے گا۔ نتیجہ یہ کہ شادی کی امنگ ہی کھو بیٹھے گا۔''

نادرہ کو قرآن کی آیت یاد آ گئی۔ پڑھنے کا فائدہ تو ہوتا ہے نا، اس نے کہا۔

''اللہ نے ایسے لوگوں کو نفس پر قابو رکھنے کے لئے روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے کی تلقین کی ہے۔''

''درست..... لیکن قرآن پڑھتے کتنے لوگ ہیں اور جو پڑھتے ہیں وہ بھی سمجھنے کے لئے نہیں پڑھتے۔ میں نے کہا نا کہ یہ مسلمانوں کا معاشرہ ہے۔ اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ جو شخص فرض روزہ نہیں رکھتا، وہ نفس کو زیر کرنے کی نیت سے نفلی روزہ رکھے گا بھلا؟ آج سات سال ہو رہے ہیں پاکستان کے قیام کو۔ ماہِ رمضان میں تمام ہوٹل اور ریسٹورنٹ کھلے ہوتے ہیں، بس ایک بھاری پردہ ڈالنے کا تکلف کر دیا جاتا ہے اور اندر اتنے لوگ ہوتے ہیں کہ گیارہ مہینوں میں اتنا رش نہیں ہوتا۔ یعنی لوگوں کو اس بنیادی تصور کی بھی پرواہ نہیں کہ اللہ سب کچھ دیکھتا، سنتا اور جانتا ہے اور ہوٹلوں اور ریستورانوں کے رش کے مقابلے میں مسجدوں کو دیکھو تو رونا آ جاتا ہے۔''

نادرہ کو تو یہ سب معلوم ہی نہیں تھا۔

''کیا واقعی ایسا ہی ہوتا ہے رمضان میں؟''

''اب کے باہر نکل کر خود ہی دیکھ لینا۔ پردے ڈال کر سمجھتے ہیں کہ اللہ سے چھپ گئے۔''

''خیر..... چھوڑیں اس بات کو، اپنی کہیں۔ آپ کی کیا مجبوری ہے۔ آپ تو بڑے افسر ہیں۔ صاحب حیثیت ہیں۔ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟''

''آپ میری بات توجہ سے نہیں سن رہی ہیں۔'' عارف نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''میں نے کہا تھا کہ میں یہاں ہوں تو اپنی عورت کی وجہ سے اور وہ عورت میری بیوی ہے۔''

''یہ تو عجیب بات کہہ رہے ہیں آپ؟''

دیر تک عارف تفصیل بتاتا رہا اور وہ سنتی رہی۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے دُنیا کی کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں دُنیا میں..... ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔

وہ سنتی اور سوچتی رہی۔ عارف کی بیوی کیسی ناشکر گزار عورت ہوگی اور عارف نے سچ کہا، پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ دُنیا میں کچھ بھی یکطرفہ نہیں۔ یہ کہنا کہ کوٹھوں کو آراستہ بھی مرد ہی کرتے ہیں اور آباد بھی وہی رکھتے ہیں، غلط ہے، یہ کام تو دونوں مل کر کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مرد صنف قوی ہونے کی حیثیت سے زیادہ ذمہ داری ہیں۔ لیکن صنف نازک کو بھی بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ استعمالی معاشرے میں دو ہی طبقے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو استعمال کرتے ہیں، دوسرے وہ جن کا استعمال ہوتا ہے اور اس میں جنس کی کوئی تفریق نہیں۔ عورتیں بھی مردوں کا استعمال کرتی ہیں، نسبت میں فرق ہوتا ہے۔ مگر بہرحال معاملہ دوطرفہ۔

سب کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔

''تب بھی آپ کے پاس گناہ کے لئے جواز نہیں۔ آپ دوسری شادی کر سکتے ہیں۔''

''وہی تو میں کرنا چاہتا ہوں۔ مگر آپ انکار کر رہی ہیں۔''

''دُنیا میں عورتوں کی کمی تو نہیں۔'' نادرہ نے سادگی سے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ! لیکن ایک مشاہدہ ہے میرا، زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ آدمی کو دوسری بیوی بھی پہلی بیوی جیسی ہی ملتی ہے۔ میں اس بات سے بہت گھبراتا ہوں کہ میرے ساتھ ایسا ہو۔ اس کے بعد تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔''

نادرہ کو ہنسی آ گئی۔

''یہ تو مفروضہ ہے آپ کا۔ مزدوری تو نہیں کہ ایسا ہی ہو۔''

''یہ بھی ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ! لیکن ہر آدمی کے ساتھ کچھ کمپلیکس بھی ہوتے ہیں۔''

''آپ کا مسئلہ کیا ہے آخر؟''

''میں محبت کا قائل ہوں۔ یہی ایک جذبہ ہے جو دو متضاد شخصیتوں کے درمیان بھی مطابقت پیدا کر دیتا ہے۔'' عارف نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اب میری شادی کو ہی لیجئے۔ میں نے اپنی بیوی کو پہلے دیکھا بھی نہیں تھا، والدین نے اسے پسند کیا اور شادی کر دی۔''

''لیکن اسلام تو لڑکے اور لڑکی کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھیں، ناپسندیدگی ہو تو شادی نہ کریں۔ اسلام میں تو اس پر بھی زور دیا گیا ہے کہ دونوں کا جوڑا اچھا ہو اور اگر دونوں ایک دوسرے کو پسند کر لیں تو پھر جوڑا کا مسئلہ ہی نہیں رہتا۔''

''اب میں پھر وہی بات کہوں گا کہ یہ مسلمانوں کا معاشرہ ہے، اسلامی معاشرہ نہیں۔'' عارف نے بڑے جوش سے کہا۔

''ہمارے ہاں انکار کیا جائے تو لڑکا نافرمان کہلاتا ہے اور لڑکی کا انکار تو برداشت ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسے تو آوارہ اور بدچلن سمجھ لیا جاتا ہے۔ پھر ایسی ہی لڑکیاں تو گھر سے بھاگتی ہیں۔ اس کے بعد ان کا جو حشر ہو، اس کا ذمہ دار کون ہوگا اور دوسری شادی کی بات سنیں۔ شادی کا تو اعلان کیا جاتا ہے نا، کیونکہ مستحسن عمل ہے، اسلام کا ایک اہم ادارہ ہے۔ میں دوسری شادی کا نام بھی لوں تو میری بیوی قیامت کھڑی کر دے گی اور پورا معاشرہ میرے خلاف ہو جائے گا۔ مجھے ظالم اور عیاش قرار دے گا۔''

''حالانکہ آپ کی بیوی کو دوسری شادی کی اجازت دے دینی چاہئے آپ کو.....''

''اب خود کو ہی دیکھیں آپ! یہ کیسی غیر اسلامی بات کی ہے آپ نے۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''اسلام نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دیتے ہوئے صرف حیثیت اور عدل کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ کہیں نہیں ہے کہ اسے بیوی سے اجازت لینا ہوگی۔

بیشتر عورتیں اس بات پر دین تک کے خلاف ہو جاتی ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتیں کہ یہ اجازت کیوں دی گئی؟''

''یہ بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''حالانکہ سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ تو ایمان کا معاملہ ہے۔ اللہ نے جس چیز سے منع کیا، اس سے سوچے سمجھے بغیر بچو، اور جس کی اجازت دی، اسے بے سوچے سمجھے قبول کرو۔ یہی ایمان ہے۔ اللہ نے کہا، اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کرو، جو میرے احکام سے متصادم ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ خلوص سے غور کرو تو اللہ کے ہر حکم میں ہر لحے بے شمار حکمتیں سامنے آتی ہیں۔ خواہش نفس کا اسیر تو اندھا ہوتا ہے۔''

''ذرا چار شادیوں کے بارے میں بتائیں۔ اس کی حکمتوں پر غور کیا آپ نے؟''

''جی ہاں! پوری طرح تو کوئی کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن غور کرنے پر کچھ کچھ میری سمجھ میں آتا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ نکاح ایک بہت عام گناہِ کبیرہ یعنی بدکاری کا راستہ روکتا ہے۔''

''یہ کام تو ایک شادی سے بھی ہو جاتا ہے۔'' نادرہ نے جلدی سے کہا۔

''بعض لوگوں کے لئے نہیں ہوتا ہوگا نا، اسی لئے تو اللہ نے چار شادیوں کی اجازت دی۔ وہ پیدا کرنے والا ہی تو انسان کو پوری طرح جانتا ہے۔ کچھ غور کرو تو بات سمجھ میں بھی آتی ہے۔ بہت سے مردوں میں نفسانی خواہش بہت شدید ہوتی ہے۔ ایک بیوی اس کی ضرورت پوری نہیں کر پاتی۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ اس کی بیوی طبعاً سرد مزاج ہو۔ تو اس صورت میں دوسری شادی ضروری ہوئی نا۔ ایسے لوگوں سے تو ایام کا عرصہ بھی نہیں گزارا جاتا۔ یہ سب مسائل تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں سامنے آگئے تھے۔ قرآن میں تاکید کی گئی کہ اس مخصوص صورت حال میں لوگ اپنی بیویوں کے قریب بھی نہ جائیں۔ مگر ایسا ہوتا تھا۔ اس لئے سختی سے حکم دیا گیا۔ پھر مرد تنوع پسند بھی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے، اس لئے بھی مرد کو چار شادیوں کی

اجازت دی گئی۔''

نادرہ کو اس کی معلومات پر حیرت ہو رہی تھی۔

''آپ اتنا کچھ کیسے جانتے ہیں؟''

''اللہ کے احکامات سے بے خبری اور قرآن سے دوری سے مجھے خوف آتا ہے، اس لئے قرآن کو سمجھنے کے لئے پڑھتا ہوں اور اللہ نے قرآن اسی لئے نازل فرمایا ہے کہ آدمی پڑھے اور روشنی حاصل کرے، نہ یہ کہ چومے، آنکھوں سے لگائے اور طاق پر رکھ کر بھول جائے۔''

''مجھے یہ بتائیے کہ یہ مجبوریاں تو عورت کے ساتھ بھی ہو سکتی ہیں تو عورت کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت کیوں نہیں دی گئی؟'' نادرہ نے اعتراض کیا۔

''دیکھیں نادرہ! میں بہت گنہگار بندہ ہوں۔ لیکن ایک بات سمجھتا ہوں۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ اس لئے اللہ کا حکم ماننا بنیادی بات ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اللہ نے جو حکم دیا، اس میں ہماری فلاح ہے، بہتری ہے۔ خواہ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اسی میں عافیت ہے۔ اللہ پیدا کرنے والا ہے، ہمیں جانتا ہے۔ اس نے ہمیں آسانیاں عطا فرمائی ہیں۔ عورتوں کے لئے اس نے یہ حکم نہیں دیا تو یقیناً اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ غیر ضروری اور الٹا زررساں ہوگا۔ اللہ کے حکم میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ سو بہتر یہ ہے کہ پہلے حکم مانو، اس پر عمل کرو اور اس پر غور کرتے رہو۔ سو میں یہی کرتا ہوں۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ مرد محبت بار بار کرتا ہے، جبکہ عورت محبت صرف ایک بار کرتی ہے۔ یہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے۔ عورت میں صبر ہوتا ہے، مرد میں نہیں ہوتا۔ عورت کی فطرت میں تنوع بھی نہیں۔ سو ہمیں تخلیق کرنے والے نے ہماری فطرت کے مطابق قوانین بنائے۔

''اور ایک بات، عورت کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ اب ذرا دیر کے لئے یہ تصور کریں تو آپ کو چکر آجائیں گے۔ دیکھیں نا، عورت تو اپنے شوہر کے نطفے کی، اس کی نسلوں کی امین

ہوتی ہے۔ اس کے کئی شوہر ہوتے تو کتنا اُلجھاؤ ہوتا۔ سب کچھ مشتبہ ہو رہ جاتا۔ معاشروں میں رشتوں کی حرمت سے جو پاکیزگی قائم ہے، وہ تباہ ہو جاتی۔ انسانوں اور جانوروں میں کیا فرق رہ جاتا۔ نہیں نادرہ! اللہ نے یہ دُنیا حق کے ساتھ بنائی ہے۔ توازن کے ساتھ نظام قائم فرمایا ہے۔ اس کا ہر قانون اٹل اور نافع ہے۔ جب اس کی خلاف ورزی کی جائے گی تو انسان ذلیل ہوگا۔ نہ صرف ذلیل ہوگا بلکہ مٹ جائے گا۔ اس کی حکمت سچی ہے۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، مان لو۔ اس میں عافیت ہے اور پھر دیکھو، جہاں بھی تہذیب اور تمدن موجود ہے وہاں مذہب کوئی بھی ہو، یہ قانون وہاں تسلیم کیا جاتا ہے، بلکہ بے دین معاشرے میں بھی اس پر عمل ہوتا ہے۔

''اب دوسرے پہلو سے بھی دیکھو۔ جہاں عورت میں خواہش زیادہ ہو اور مرد میں کم، تو اس کا حل بھی ہے۔ طلاق مستحسن نہیں۔ لیکن اللہ کہتا ہے کہ تم دیکھو کہ اللہ کی حدود قائم نہیں رکھ سکو گے تو احسن طریقے سے علیحدہ ہو جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ عورت صبر کرے تو اللہ کے ہاں اس کا بہت بڑا اجر ہے۔ لیکن بدکاری کا راستہ یہاں بھی روک دیا گیا۔ خلع کا راستہ کھول کر۔ بلکہ مرد یہ بات محسوس کرے تو وہ خود ہی خوش دلی سے طلاق دے دے۔ اللہ نے جس چیز کو منع فرمایا ہے تو اس کے لئے عذر کہیں نہیں چھوڑا۔ اور کہیں عذر ہے تو اس کی مشروط اجازت دے دی۔ جیسے بھوک سے مرتے ہوئے آدمی کے لئے مردار کو بھی حلال کر دیا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نہ کھائے اور باطن میں نافرمانی نہ ہو۔ بلکہ اقرار ہو۔''

نادرہ اب اسے احترام آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بلاشبہ ہر اعتبار سے ایک پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ ظاہری طور پر تو وہ خوب رو تھا ہی، لیکن اس کی شخصیت میں باطنی رچاؤ بھی تھا۔ بس ایک پہلو کمزور تھا، اور وہ اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اس نے اسے کریدنے کا فیصلہ کر لیا۔

''آپ کی ہر بات سچی ہے۔'' اس نے کہا۔

''آپ نے ٹھیک کہا۔ اللہ نے جس چیز کو منع فرمایا، اس کے لئے عذر

نہیں چھوڑا۔ اس کا بہترین متبادل بھی عطا فرما دیا۔ تو پھر آپ جو خود کو خراب کرتے ہیں، اس کا کیا عذر ہے آپ کے پاس۔ اور جو گناہ جان بوجھ کر کیا جائے، وہ تو بغاوت کے زمرے میں آتا ہے۔''

عارف یوں سمٹا جیسے نادرہ نے اسے کوڑا مار دیا ہو۔ وہ جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہی احساس تو مجھے سب سے زیادہ مارتا ہے۔ ہر بار میں توبہ کرتا ہوں۔ لیکن ہار جاتا ہوں۔''

''دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے آپ؟''

''ہمارے معاشرے میں یہ سوچنا اور کہنا ہی آسان ہے کرنا بہت مشکل ہے۔'' عارف نے گہری سانس لے کر کہا۔

''کسی اچھے گھرانے میں، ایک بیوی کے ہوتے ہوئے، کوئی شادی کا پیغام دے تو منہ توڑ جواب ملنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے، ویسے ایک تجربے کے بعد آدمی کی ہمت ہی نہیں ہوتی، دوسری کوشش کی۔ لوگ برا سمجھتے ہیں دوسری شادی کرنے والے کو، عیاش سمجھتے ہیں۔''

''کوئی بیوہ، کوئی مطلقہ......؟''

''میں نے کہا نا کہ یہ آسان نہیں۔ میرے پاس وقت نہیں، اور میرا رشتہ لے کر جانے والا کوئی ہے نہیں، اسی لئے تو......''

نادرہ نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ جانتی تھی کہ وہ کیا کہے گا۔ ''ثمن نے بتایا تھا کہ آپ شراب بھی پیتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''جب آپ حرام و حلال کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں تو پھر یہ کیوں؟ اس کا تو آپ کے پاس برائے نام بھی عذر نہیں ہے۔''

عارف کا انداز اب پوری طرح مدافعانہ ہوگیا تھا۔

''یہی تو تباہی ہے۔ آدمی ایک برائی سے نہ بچ پائے تو ایک کے بعد ایک برائی میں مبتلا ہوتا جاتا ہے۔ بڑھتا جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ میں بنیادی طور پر اپنے گھر میں خوش رہنے والا آدمی ہوں۔ گھر میرے لئے جنت ہے۔ بدقسمتی سے وہ میرے لئے جہنم بنا دیا گیا ہے اور میں ایسا آدمی بھی

نہیں تھا کہ اپنے طور پر اپنی فطری ضرورت کے لئے سامانِ تسکین تلاش کر پاتا۔
سو کچھ ساتھی افسران سے ضرورت کا تعلق استوار کرنا پڑا۔ جو میری ضرورت تھی،
وہ ان کا شوق تھا۔ ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہوا تو پینے پلانے کا سلسلہ بھی شروع
ہوگیا۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے گھر کا سکون حاصل ہو جائے تو یہ
سب کچھ انشاء اللہ بڑی آسانی سے چھوٹ جائے گا۔''

''اور اگر یہ نہ ہوا تو آپ اس غلط راستے پر بڑھتے ہی جائیں گے۔''
نادرہ نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

عارف نے کندھے جھٹک دیئے۔

''اپنی بے بسی اور گناہوں کے باوجود میں اللہ سے بہتری کی اُمید رکھتا
ہوں۔''

''مگر خود کچھ نہیں کر سکتے۔'' نادرہ کے لہجے کی کاٹ بڑھ گئی۔

''کر تو رہا ہوں۔'' عارف نے بے حد معصومیت سے کہا۔

''بس آپ مان جایئے۔''

نادرہ نے سمجھ لیا کہ اب پہلو بچانا ممکن نہیں۔

''یہ بتایئے کہ میں ہی کیوں؟''

عارف مسکرایا۔

''وجہ تو میں بتا چکا ہوں۔ میں آپ کو بہت پہلے سے پسند کرتا ہوں مگر
اب تو مجھے آپ سے محبت ہے۔''

نادرہ کے لئے اب اپنے تجسس پر قابو رکھنا ممکن نہیں تھا۔

''آپ مجھے بہت پہلے سے پسند کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ
بہت پہلے سے مجھے جانتے ہیں۔ جبکہ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں آپ سے کبھی ملی
ہوں یا آپ کو کہیں دیکھا ہو۔''

''عام لوگ ایک ملاقات میں دل پر نقش نہیں ہوتے۔ کوئی گہرا اثر نہیں
چھوڑتے نا۔ تو میں تو عام سا آدمی ہوں۔ آپ کو کیسے یاد رہ سکتا تھا؟''

نادرہ اس بات کی تردید کرنا چاہتی تھی کہ وہ کوئی عام آدمی ہے۔ وہ تو

ایسا آدمی تھا کہ جسے کبھی بھلایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن اس نے بروقت خود کو
روک لیا۔ اس وقت یہ اظہارِ حقیقت بری طرح گلے پڑ سکتا تھا۔

عارف اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کہے جا رہا تھا۔

''اور خاص لوگ تو ایک لمحے میں بھی دل پر اَن مِٹ نقش چھوڑتے
ہیں۔ جیسے آپ ہیں۔ میں نے ایک بار آپ کو دیکھا، اور ہمیشہ آپ کو یاد رکھا......
اور وہ بھی بے حد پسندیدگی کے ساتھ۔ میں کبھی بھولا نہیں آپ کو۔''

''اور دوبارہ کبھی ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔'' نادرہ کے لہجے میں تجسس
تھا۔

''جی نہیں!''

''یہ تو عجیب پسندیدگی ہوئی۔'' نادرہ نے اعتراض کیا۔

''دوبارہ کیوں نہیں ملنا چاہا آپ نے؟''

''ایک تجربہ کافی تھا۔ اسی میں سارے زخم ہرے ہوگئے۔ دوسرے
تجربے کی ہمت کیسے کرتا؟''

عجیب معمہ تھا۔ بات سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے
بھی سوال پر سوال کرنے پر مجبور تھی۔ نادرہ اندر ہی اندر جھنجلا رہی تھی۔

''آپ کے اس جملے سے پسندیدگی تو نہیں، البتہ شکایت جھلک رہی
ہے۔'' اس نے کہا۔

''بخدا! یہ شکایت نہیں، ستائش ہے۔'' عارف نے تڑپ کر کہا۔

''ورنہ پسندیدگی کہاں سے آتی؟''

''وضاحت کریں۔ کیونکہ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔''

''دیکھیں، اپنے گھر میں، اپنی بیوی سے محرومی کے جو زخم مجھے ملتے ہیں،
ان پر مرہم رکھنے کے لئے میں ان گلی کوچوں کی خاک چھانتا ہوں۔ ایک رات
میں یہاں، اس کوٹھے پر آیا تھا۔ عام تماش بین کی حیثیت سے نہیں، خاص مہمان
کی حیثیت سے، اور میں آپ سے ملا۔ آپ مجھے بہت اچھی لگیں۔ لیکن آپ نے
مجھے نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے وہی کیا، جو ہمیشہ کرتا ہوں۔ میں نے

آپ کا ہاتھ تھاما، اسے چوما۔ لیکن وہ برف کی طرح سرد رہا۔ ایسے میں میں فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ لیکن آپ مجھے کچھ زیادہ ہی اچھی لگی تھیں۔ میں باتوں کے ذریعے، ہاتھ سہلا کر آپ میں کسی جذبے کی حرارت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ناکام رہا۔ میں نے آپ سے آپ کا نام پوچھا تو آپ نے کہا۔ آپ کو نام سے مطلب؟ اپنا مطلب پورا کیجئے اور چلتے بنئے۔ بس پھر میں یہاں سے چلا گیا۔ اس کے بعد کل یہاں آیا تھا پہلی بار۔ اب آپ مجھے کیسے پہچان سکتی ہیں؟ آپ نے تو مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔''

مگر نادرہ کو یاد آگیا تھا۔ صورت تو اس نے واقعی نہیں دیکھی تھی اس کی۔ لیکن ایسے گاہک کو کون بھول سکتا تھا، جو سرد مہری کے جواب میں جبراً پامال کرنے کی بجائے نامراد ہی چلا گیا تھا۔ کچھ دن تو وہ اسے یاد رہا تھا، مگر اس کے پاس زیادہ دن کسی گاہک کو یاد رکھنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

''زخم ہرے کرنے والے کو اتنی پسندیدگی کے ساتھ اتنی مدت تک یاد کیسے رکھا جا سکتا ہے؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

''آپ کا طرزِ عمل میرے لئے غیر معمولی تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ آپ تقدیر کے جبر کا شکار ہوئی ہیں۔ اس بازار میں ایسی بے شمار عورتیں ہوں گی۔ لیکن سب سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ مگر آپ یہاں بیٹھ کر بھی، مجبور ہو کر بھی اپنی روح کا سودا کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ آپ اپنی عزتِ نفس اور آبرو کی حفاظت کر رہی تھیں۔ میں اس یقین کے ساتھ یہاں سے رُخصت ہوا تھا کہ میں نے زندگی میں آپ سے زیادہ عزت دار، پاکیزہ اور باحیا عورت نہیں دیکھی۔''

نادرہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''اور اب مجھ سے محبت کیسے ہوگئی آپ کو؟''

''سمن نے بتایا کہ اس کا تعلق اس کوٹھے سے ہے تو مجھے قدرتی طور پر آپ کا خیال آیا۔ پوچھا تو آپ کی بیماری کا پتا چلا۔ میں سمجھ گیا کہ اس طرح آپ خود کو بچا رہی ہیں۔ یہ بتا دوں کہ آپ کو پسندیدگی کے ساتھ یاد رکھتے ہوئے میں نے ہمیشہ سوچا تھا کہ بالآخر آپ کی مزاحمت بھی دم توڑ گئی ہوگی۔ لیکن سمن کی

زبانی یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ بس اسی لیے مجھے آپ سے محبت ہوگئی۔ میرا خیال ہے، محبت تو مجھے آپ سے پہلی نظر میں ہوگئی تھی۔ اس کا ادراک اس دن سمن سے ملنے کے بعد ہوا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آپ سے مل کر بات ضرور کروں گا۔''

اس کی سچائی میں نادرہ کو کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ ایسے ہی کسی آدمی کے خواب تو دیکھتی رہی تھی کوٹھے پر۔ اور وہ آیا تو اس وقت جب وہ اپنے ہاتھ خود کاٹ چکی تھی۔ کاش وہ پہلے آگیا ہوتا۔ نیلم بائی کی زندگی میں۔

عارف کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو وہ محبت اور عزت دوں گا، جس کی آپ کو آرزو رہی ہے۔'' عارف کہہ رہا تھا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ مل گئیں تو شراب بھی چھوڑ دوں گا۔ میں صرف گھر کا ہو جاؤں گا۔ یہ گندگی تو مجھ پر مسلط کر دی گئی ہے۔ میں ایسا ہوں نہیں، بس آپ مجھ سے شادی کر لیں۔''

نادرہ تڑپ گئی۔ عزت کی زندگی اور محبت اس کی چوکھٹ پر ہاتھ پھیلائے قبولیت کا سوال کر رہی تھی۔ یہ وہ کچھ تھا، جو وہ چاہتی تھی، لیکن جانتی تھی کہ ملے گا نہیں۔ مگر آج وہ سب ممکن ہوگیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اب وہ اسے قبول نہیں کر سکتی تھی۔

''مجھے افسوس ہے عارف صاحب! لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔'' اس نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''نہ سہی..... آپ مجھے اس حد تک تو قبول کر لیں کہ مجھے اپنی مجبوری میں شریک کر لیں۔ میں اسی میں خوش ہو جاؤں گا۔'' عارف کے لہجے میں التجا تھی۔

''وہ کوئی بہت ذاتی بات ہے۔ میں آپ کو نہیں بتانا چاہتی۔''

جواب میں عارف نے جو کیا، وہ اس کے لئے اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکی۔ وہ اپنے صوفے سے اُٹھا اور اس کے سامنے آکر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ تھاما اور سرگوشی میں بولا۔

"آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

مردوں کے فریب اور نفرت انگیز لمس کی ڈسی ہوئی نادرہ کے لئے وہ بے حد انوکھا، خوش گوار اور پہلا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے کسی نے محبت سے اسے نہیں چھوا تھا۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس سنسنی میں لذت اور سرشاری بھی تھی۔ وہ شل ہو کر رہ گئی۔ دماغ بھی کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کا جسم دہک اُٹھا ہے۔ وہ تو خواب جیسی کسی کیفیت میں تھی۔

عارف نے اس کا ہاتھ اُٹھایا اور اس پر ایک طویل بوسہ دیا۔ پھر وہ دوبارہ اپنی جگہ جا بیٹھا۔

نادرہ کو سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ پھر وہ سنبھلی تو اس نے ذرا خفگی سے کہا۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا عارف!"

"یہ ضروری تھا۔ اس سے مجھے وہ معلوم ہوگیا، جو آپ اپنی زبان سے کبھی نہ کہتیں۔"

نادرہ کا دل ایسے دھڑکا کہ پہلے کبھی نہیں دھڑکا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ پر اب بھی عارف کے ہونٹوں کے لمس کا گداز محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ کو دیکھا، جیسے وہاں کوئی نشان نظر آئے گا۔

"کیا معلوم ہوگیا آپ کو؟" اس نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

"یہ کہ اتنی دیر میں آپ کو بھی مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔"

وہ ایسی سچائی تھی کہ وہ اس کی تردید کی ہمت بھی نہیں کر سکی۔

"مگر میں اب بھی یہی کہوں گی کہ میں مجبور ہوں۔"

"آپ کے دل میں میرے لئے جگہ بھی ہے، اور آپ کو اس جہنم سے نکلنے کا موقع بھی مل رہا ہے۔ آپ اسے گنواتی ہیں تو یقیناً وہ کوئی بڑی مجبوری ہوگی۔ میں وہ مجبوری جاننا چاہتا ہوں۔ شاید اس کا کوئی حل ہم مل کر تلاش کر سکیں۔"

"اس کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔"

"آپ بتائیں تو......"

نادرہ نے گہری سانس لی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ بھی سن لیں۔" اس نے کہا اور عارف کو نیلم بائی سے اپنے عہد کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

عارف کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ کچھ کہنے کو بے تاب ہے۔ لیکن بہرحال اس نے مداخلت نہیں کی۔ البتہ نادرہ کے خاموش ہوتے ہی اس نے بے ساختہ کہا۔

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، قسموں سے نکلنے کے لئے کفارہ ہے۔ ہم وہ ادا کر سکتے ہیں۔"

"وہ قسم نہیں تھی عارف! ایک مرتی ہوئی عورت سے کیا گیا عہد تھا۔ جو میں نے بہت سوچ سمجھ کر اور اللہ کو گواہ بنا کر کیا تھا۔"

"ایسے عہد کی کیا اہمیت ہے، جو ایک عورت کو اس جہنم سے نہ نکلنے پر پابند کرتا ہو؟" عارف نے بہت جوش سے کہا۔

"اس عہد کی تو پاسداری بھی میرے خیال میں گناہ ہے۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔ میرے لئے تو وہ اللہ کا کرم اور بائی مرحومہ کا احسان تھا۔" نادرہ نے تیز لہجے میں کہا۔

"بائی نے مجھ سے دوٹوک بات کی تھی۔ میں وہ عہد نہ کرتی تو وہ کوٹھا کسی بائی کو بیچ دیتی۔ پھر میرا کیا بنتا؟ میں پہلے سے بڑی خرابی میں ہوتی۔ اسی لئے میں نے اللہ کو گواہ بنا کر وہ وعدہ کیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ تب سے اب تک میں اسی جہنم میں رہتے ہوئے بھی گناہ سے محفوظ ہوں۔ بلکہ یوں کہیں کہ اللہ نے آگ کے اس الاؤ کو میرے لئے گلزار بنا دیا۔ اب جبکہ بائی زندہ بھی نہیں تو میں اسی سے کیا ہوا عہد کیسے توڑ سکتی ہوں۔ یہ تو بہت بڑا ناشکرا پن ہوگا۔"

"ہم اس پر فتویٰ لے سکتے ہیں۔" عارف نے تجویز پیش کی۔

"نہیں عارف! یہ معاملہ اپنے ضمیر کا ہے۔ یہ تو میں جانتی ہوں نا کہ جس چیز سے بچنے کے لئے میں حرام موت کو گلے لگانے کے لئے تیار تھی، اللہ

نے مجھے کوٹھے پر رہتے ہوئے بھی اس سے بچا لیا۔“

”تم خودکشی کا سوچتی تھیں؟“ عارف کو جیسے شاک لگا۔

”صرف سوچتی نہیں تھی، کر بھی لیتی، مگر وہاں بھی مجبور تھی۔ میرے لئے یہ پاکستان نہیں، جبرستان ہے۔ یہاں مجھے ذِلت اور مجبوری کے سوا کچھ بھی نہیں ملا۔“ نادرہ کی آواز بھرا گئی۔

”پھر اللہ نے میرے لئے راستہ نکال دیا۔ اب میں بدعہدی کیسے کر سکتی ہوں؟“

عارف کا تجسس بھڑک اُٹھا تھا۔

”مجبوری کیا تھی تمہاری؟“

نادرہ ایک دم چوکنا ہوگئی۔ وہ یہ بات کبھی نہیں بھولتی تھی کہ اپنی مجبوری کے ساتھ وہ بہرحال ایک کوٹھے پر ہے۔ بلکہ اب تو بارہ تیرہ سال کی ارجمند کو دیکھ کر اسے خوف آتا تھا۔ لڑکیاں تو ایک دم سے بڑی ہو جاتی ہیں۔ اب وہ ارجمند کو عارف کے بارے میں بتائے یا......

”آپ نے جواب نہیں دیا۔“

عارف نے اسے چونکا دیا۔ اس نے نظر اٹھا کر عارف کو دیکھا۔ کالج میں ٹھاکر اوتار سنگھ کو اس نے دیکھا اور پسند کیا تھا۔ لیکن محبت کا خیال دل میں نہیں آیا۔ کیونکہ وہ ہندو تھا۔ مسلمان ہوتا تو وہ اس سے محبت کئے بغیر نہ رہتی۔ مگر عارف نے اتنی سی دیر میں ایک ملاقات میں اس کا دل جیت لیا تھا۔ اس کے باوجود یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اسے بتائے یا نہ بتائے۔

پھر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ کیا پتا، یہ بھی اللہ کی رحمت ہو۔ اللہ اس کے لئے راستہ بنا رہا ہو۔ اس میں ارجمند کی بہتری ہو۔ ورنہ طوائف کے کوٹھے پر شادی کا باعزت پیغام کہاں آتا ہے۔ بالآخر دل نے فیصلہ کیا کہ اسے بتا دینا چاہئے۔

”ہمارے کنبے میں کوئی بھی نہیں بچا۔ سب ٹرین میں شہید کر دیئے گئے۔ سوائے میرے اور میری چھ سالہ بھتیجی ارجمند کے۔ سو ارجمند میری مجبوری

ہے۔ میں اسے اس زندگی سے بچانا چاہتی ہوں۔ اس نے مجھے زندہ رہنے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ جان دینا میرے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔“

عارف مضطرب ہوگیا۔

”وہ..... وہ تو اب تیرہ سال کی ہوگی۔ یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔“

”ہاں......! اور اس کی اٹھان بہت اچھی ہے۔ تیزی سے بڑی ہو رہی ہے وہ۔“

”اور اس کے باوجود تم اپنے عہد کو لئے بیٹھی ہو۔“ عارف نے تیز لہجے میں کہا۔

”ایک مری ہوئی عورت سے کیا ہوا عہد ہے، جس پر میں نے اللہ کو گواہ بنایا تھا۔“ نادرہ نے رسان سے کہا۔

”اس عہد کو بھول جاؤ اور مجھ سے شادی کر لو۔ میری خاطر نہیں، اپنی خاطر نہیں، اس بچی کی خاطر کر لو۔ یہ ضروری ہے۔ میں اسے تحفظ، عزت اور اچھا مستقبل، سب کچھ دے سکتا ہوں۔“

”مگر میں یہ نہیں چاہتی۔“

”تو پھر تم چاہتی کیا ہو؟“ عارف جھنجلا گیا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ بہت دیر سے وہ نادرہ کو تم کہہ کر مخاطب کر رہا ہے۔

”میں نہیں چاہتی کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ میں داغ دار ہوں۔ میرا ایک ماضی ہے، جو میرا پیچھا کبھی نہیں چھوڑے گا۔ کہیں بھی، کوئی بھی مجھے پہچان لے گا۔ نہیں عارف! میں اسے اپنے سائے سے بھی دُور رکھنا چاہتی ہوں۔“

”عجیب منطق ہے تمہاری۔ تم گھر میں رہو گی۔ باہر نکلو گی نہیں تو کون پہچانے گا تمہیں؟“

”باہر نکلنے کی ضرورت تو کبھی بھی پڑ سکتی ہے۔ طوائف کے لئے دُنیا بہت چھوٹی ہوتی ہے عارف!“

”پلیز! تم اپنے لئے یہ الفاظ استعمال نہ کیا کرو۔“

نادرہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

''اور ارجمند کا رشتہ آیا، اور ان لوگوں نے مجھے پہچان لیا تو......''

''اتنے دور کے اندیشے پالتی ہو تم؟''

''عقل میری کام نہیں کرتی عارف! اور میں دل کے کہنے پر چلتی ہوں۔''

''اچھا! یہ تو بتا دو کہ اس کے لئے کیا سوچا ہے تم؟'' عارف کے لہجے میں اب بے بسی تھی۔

''میں ہر لمحے اللہ سے دعا کرتی ہوں اس کے لئے، اور مجھے یقین ہے کہ کوئی ایسا آدمی اللہ بھیجے گا، جس کے سپرد ارجمند کو کر کے میں مطمئن ہو جاؤں گی۔''

''اور اس کے بعد؟''

''جب تک اللہ زندہ رکھے گا میں یہیں رہوں گی۔ کیونکہ نیلم بائی نے مجھ سے خودکشی نہ کرنے کا بھی عہد لیا تھا۔''

''پھر وہی بات......جہنم سے نکلنے کا ایک اچھی زندگی گزارنے کا یہ موقع بھی تو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ اس سے منہ موڑنا بھی تو ناشکری ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ کفارہ ادا کر کے تم اس عہد سے نکل سکتی ہو۔''

''میرا دل اس بات کو قبول نہیں کرتا۔''

''تو پھر تمہاری بہتری کے لئے میں تمہارے ساتھ زبردستی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اتنا بااثر تو ہوں میں۔''

نادرہ نے اسے غور سے دیکھا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

''اس صورت میں آپ کو مجھ سے کوئی خوشی تو نہیں ملے گی۔ بلکہ آپ کو دوسری بیوی بھی پہلی بیوی جیسی ہی ملے گی۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں یہ کام بے غرضی سے کروں گا۔ محبت کی خاطر کروں گا۔ محبت کبھی ہارتی نہیں۔''

[illegible]۔ اس میں کوئی شک

نہیں رہا تھا کہ وہ سچا اور کھرا آدمی ہے۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''آپ کل دوپہر کو آیئے۔ کھانا یہیں کھایئے گا۔''

''کھانا......؟''

''گھبرایئے نہیں، ہم کو اللہ نے رزقِ حلال سے نوازا ہے۔ میں سلائی کڑھائی کا کام کرتی ہوں۔ کوٹھے کی ایک پائی بھی حرام ہے مجھ پر۔''

''اوہ......!'' عارف کی سمجھ میں وہاں برتنوں کی موجودگی آ گئی۔

''میں ضرور آؤں گا۔ لیکن آپ میرے حق میں فیصلہ سنایئے گا۔''

''اس کی تو کوئی ضمانت نہیں۔ میں اپنے ضمیر کی روشنی میں فیصلہ کروں گی۔''

''میں چلتا ہوں۔'' عارف اُٹھ کھڑا ہوا۔

نادرہ اسے چھوڑنے دروازے تک گئی۔ راستے میں عارف نے پوچھا۔

''میرے لئے دروازہ جن صاحب نے کھولا، وہ کون تھے؟''

''نواب اشرف علی خان صاحب، آپ شاید انہیں اچھو میاں کے نام سے جانتے ہوں۔''

عارف کا منہ کھلا اور کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''تو......تو......وہ اچھو میاں تھے۔ یقین نہیں آتا......اچھو میاں......''

''وہ ہمارے رزقِ حلال کے شریک ہیں۔ بلکہ منیجر کہیۓ انہیں۔''

''یہ تو کایا پلٹ ہے۔''

''اللہ مقلب القلوب ہے عارف صاحب!''

عارف اس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر دروازے پر کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ وہ خدا حافظ کہہ کر سیڑھیاں اُترنے لگا۔

نادرہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو اس نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ اسے بہت بڑی مشکل میں ڈال گیا تھا۔ سوچنے کے لئے بہت کچھ چھوڑ گیا تھا۔

اور سوچنے کے لئے وقت بہت کم تھا۔ نادرہ نے دانستہ ایسا کیا تھا۔ وہ

چاہتی تو اسے ایک ہفتہ بعد بلا لیتی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ سوچنے کو جتنا وقت ملے گا، وہ اتنا ہی زیادہ اُلجھے گی۔ فیصلہ عقل کو نہیں، دل کو کرنا تھا اور دُشواری یہ تھی کہ اس کا دل تقسیم ہوگیا تھا۔ ایسے میں زیادہ مہلت فیصلے کی راہ میں رکاوٹ بنتی۔ کم وقت اور سخت وقت میں فیصلہ بہرحال ہو جاتا تھا۔

وہ گہری سانس لے کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ حق نگر سے واپس آئی تو بہت کھوئی کھوئی سی تھی۔ گاؤں میں اس نے زرینہ کی نومولود بیٹی کو گود میں لیا تو اس کے دل نے کہا، ایسے ہی عبدالحق کے بیٹے کو گود میں لے گی تو کیسا لگے گا۔ بس وہاں سے اس پر سوچوں کے دروازے کھل گئے۔

گھر واپس آ کر وہ اس پر سوچنے بیٹھی تو حیران ہوئی کہ پہلے اس محرومی کا خیال کیوں نہیں آیا؟ اب تو عبدالحق کی شادی کو ساڑھے تین سال ہوگئے ہیں اور وہ اب تک اولاد سے محروم ہے۔ ایسا کیوں؟

اس ایسا کیوں کے جواب میں اسے ڈر لگنے لگا۔ عبدالحق بھی تو بائیس برس کے انتظار کے بعد پیدا ہوا تھا۔ شاکر جی اور ٹھاکرائی نے کہاں کہاں ماتھا نہیں ٹیکا تھا۔ مگر پھر اللہ نے انہیں کیسا اچھا اور میٹھا پھل دیا تھا، وہ ایسا مبارک بچہ تھا، جو پہلے دن سے ہی اللہ کے راستے پر چلا تھا۔ اس نے تو پہلا دودھ ہی مسلمان عورت کا پیا تھا اور وہ بھی اپنی جان پر کھیل کر۔

حوالہ تو بہت اچھا تھا۔ اس سے حمیدہ کو حوصلہ ہوا۔ اللہ کے ہاں دیر تو ہے، اندھیر نہیں اور صبر کا پھل بھی میٹھا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ خوف زدہ بھی ہوگئی۔ وہ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ کون جانے، کب اللہ کے ہاں سے بلاوا آ جائے۔ اب اس کا ایک یہی تو خواب تھا۔ عبدالحق کو اس نے دودھ پلایا تھا، اللہ نے اس کے دل میں اسے دودھ پلانے کی کیسی تڑپ دی تھی۔ یہ اسے آج بھی یاد تھا۔ تو وہ اس کے لئے بیٹا ہی تھا۔ بلکہ بیٹے سے بھی بڑھ کر تھا۔ اس کی خاطر تو اس کا شوہر اور بیٹا شہید ہوئے تھے۔ عبدالحق کا خیال نہ ہوتا

تو وہ ان دونوں کے مرنے کے بعد کبھی زندگی کی آرزو نہ کرتی اور اب تو اس کی بس یہی تمنا تھی کہ عبدالحق کے بیٹے کو گود میں لے اور کھلائے۔

اچانک اسے نور بانو کا خیال آ گیا اور ساتھ ہی اپنی خودغرضی کا بھی۔ وہ اپنی آرزو کے بارے میں تو سوچ کر فکرمند ہو رہی تھی۔ اسے یہ خیال نہیں آیا کہ نور بانو اس سلسلے میں کتنی پریشان ہوگی۔ ارے......! وہ بن باپ کی بچی، جس نے اپنی ماں اور بہنوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا۔ اسے بھی تو بچے کی آرزو ہوگی۔ بچہ ہی تو عورت کو مکمل کرتا ہے۔ بچے کے بغیر تو عورت ادھوری ہی ہوتی ہے اور اس نے کبھی اس سے پوچھا بھی نہیں۔

اس پشیمانی میں اسے عبدالحق کا خیال آیا۔ عبدالحق کو بھی تو آرزو ہوگی۔ بلکہ اسے تو بیٹے کی خواہش ہوگی۔ قدرتی بات ہے۔ اللہ نے اسے ایمان سے نوازا۔ پھر اسے خوش خبری ملی کہ اس کا باپ مرا تو مسلمان تھا، وہ کیسے تڑپتا ہوگا کہ اس کا بیٹا ہو۔ جوانی کی گمراہ نسل کو اب اللہ کے راستے پر آگے بڑھائے۔

حمیدہ پر رقت طاری ہوگئی۔ کیسی بے حس اور خودغرض ہے وہ۔

اس نے نسیمہ سے کہہ کر نور بانو کو بلوایا۔

''آ دھیے! یہاں بیٹھ میرے پاس!'' نور بانو آئی تو اس نے کہا۔

نور بانو اس کے پاس بیٹھ گئی۔ حمیدہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تو خوش تو ہے نا؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے سوچا کہ خوش کیسے ہوسکتی ہے؟

''ہاں اماں! بہت خوش ہوں میں۔'' نور بانو بولی۔

حمیدہ نے دل میں سوچا، کیسی صابر و شاکر لڑکی ہے۔ اللہ اسے کبھی محروم نہیں رکھے گا۔

''کوئی کمی ہمیشہ نہیں رہتی دھیے! تو غم نہ کر۔'' اس نے بڑی شفقت سے کہا۔

''اللہ ہر کمی پوری کر دیتا ہے۔''

"غم کیسا اماں! کوئی کمی نہیں، اللہ کا شکر ہے۔" نوربانو نے بے فکری سے کہا۔

حمیدہ کو اس پر اور پیار آیا۔

"کمی تو ہے، غم بھی کرتی ہوگی۔ پر مجھ سے کیوں چھپاتی ہے۔ میں تو ماں ہوں تیری۔"

"سچ کہتی ہوں اماں! کوئی کمی نہیں، میں بہت خوش ہوں۔" نوربانو نے بے حد سچائی سے کہا۔

"ارے! زرینہ کی شادی تیرے بعد ہوئی، اور دو بچے بھی ہوگئے اس کے، کمی تو ہے۔"

"مجھے تو اماں بچوں کا ایسا کوئی شوق بھی نہیں۔ پھر کمی کیسی؟"

حمیدہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ لیکن بعد کے لمحوں میں نوربانو کے لہجے میں موجود سچائی میں لپٹی بے رخی دھیرے دھیرے اس کے دل میں اتری تو اسے بہت صدمہ ہوا۔ کچھ دیر تو وہ بول ہی نہ سکی۔ پھر اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"تجھے بچے کا کوئی ارمان نہیں؟"

"نہیں اماں! میں سچ کہہ رہی ہوں۔" نوربانو نے سادگی سے کہا۔

"تجھے عبدالحق سے محبت نہیں ہے؟"

"بہت ہے اماں!"

"تو پھر تجھے بچے کا ارمان کیوں نہیں؟"

اسی لئے تو نہیں اماں! میں نہیں چاہتی کہ ایک دوسرے کی محبت میں ہمارا کوئی بھی شریک ہو۔ نوربانو نے دل میں کہا۔ پھر بڑی معصومیت سے بولی۔

"ان کی محبت سے اس ارمان کا کیا تعلق اماں؟"

"تعلق تو ہے۔ بچہ آتا ہے تو میاں بیوی کی محبت کو مضبوط کرتا ہے۔ بچے کے بغیر تو ان کی محبت کچے دھاگے جیسی ہوتی ہے۔"

"ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہے اماں!" نوربانو نے بے حد اعتماد سے کہا۔

"نادان ہے تو! مرد کے لئے اولاد بہت اہم ہوتی ہے۔ خاص طور پر بیٹا۔ کیونکہ اس سے اس کی نسل چلتی ہے۔ اور عبدالحق کے لئے تو یہ اور بھی ضروری ہے۔"

پہلی بار نوربانو کے دل میں خوف جاگا۔

"کیوں اماں؟"

"پگلی ہے تو، اتنا بھی نہیں سمجھتی۔" حمیدہ نے پیار سے کہا۔

"سوچ تو ذرا، وہ ہندوؤں میں پیدا ہوا تھا۔ اللہ اسے اپنے راستے پر لایا اور اسے ایمان عطا فرمایا۔ اس کے لئے تو بیٹے کی اہمیت دوسروں سے ہزاروں گنا زیادہ ہوگی۔ وہ اس کی نسل میں پہلا بچہ ہوگا، جو پیدا ہی مسلمان ہوگا۔ یہ تو اس کے لئے بہت ضروری ہے۔ وہ اس کی نسل کو آگے چلائے گا۔"

اس بار بات پوری طرح نوربانو کی سمجھ میں آئی، اور وہ واقعی خوفزدہ ہوگئی۔

"بیٹے کی خاطر تو مرد دوسری شادی بھی کر لیتے ہیں۔" حمیدہ نے اس کا خوف اور بڑھا دیا۔

"جبکہ عبدالحق کے لئے تو یہ عام لوگوں سے بہت زیادہ ضروری ہے۔"

"تو اس سلسلے میں تو میں کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ اللہ کی مرضی!" نوربانو نے بے بسی سے کہا۔

"تو تو بے پرواہ بن کر بیٹھی ہے۔ دُعا تو کیا کر۔"

"اب اس کے لئے بھی دُعا کرنی پڑے گی۔"

حمیدہ دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگی۔

"توبہ کر نوربانو! توبہ کر۔ کیا ہوگیا ہے تجھے۔"

"میرا مطلب تھا اماں کہ یہ تو قدرتی عمل ہے۔ اولاد تو اللہ سبھی کو دیتا ہے۔"

"کچھ کو نہیں بھی دیتا اور دعا کو تو کیا سمجھتی ہے؟ اس کا تو بندہ حق ادا ہی نہیں کرسکتا۔ ورنہ سوچ کہ کھانے کے وقت جو نوالہ میرے ہات میں ہے، میں تو

اسے اپنا ہی سمجھوں گی نا...... کہ ابھی منہ میں لے جاؤں گی اور کھا لوں گی۔ پر اس کے لئے بھی دُعا کرنی چاہئے رب سے۔ وہ چاہے تو وہ نوالہ میرا، نہ چاہے تو وہ میرے منہ میں جا ہی نہیں سکتا۔"

وہ بات ایسی تھی کہ نور بانو سناٹے میں آگئی۔

"ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ جو چیز ہمارے پاس نہیں، ہمارے بس میں نہیں، صرف اس کے لئے دعا کرنی چاہئے۔ نا دھیے! نا، دعا تو شکر ہے، رب کی قدرت کو تسلیم کرنا ہے کہ جو اس نے دیا ہے، وہ جب چاہے، واپس لے لے۔ اس لئے جو تمہارے پاس ہے، اس پر بھی شکر ادا کرو، اور دُعا کرو کہ وہ تمہیں وہ چیز نصیب بھی کرے۔ تو دعا کیا کر گڑگڑا کر۔ دُعا نہ کرنا بھی نعمت سے منہ موڑنا ہے۔ رب کو برا لگ جائے تو بندہ محروم رہ جاتا ہے۔ ورنہ تو اس کی رحمت بہت بڑی ہے۔ وہ ناشکروں کو بھی دیتا ہے اور انکار کرنے والوں کو بھی۔"

اب نور بانو اندر ہی اندر رو رہی تھی۔ حمیدہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس پر صادق آرہا تھا۔ حالانکہ حمیدہ کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اب وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ تو رمضان کی طاق راتوں میں اولاد نہ ہونے کی دُعا مانگتی رہی ہے۔ اب اس کی دعا اگر اللہ کے ہاں قبول ہو چکی ہے تو......

تب تو اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

"تم بھی دعا کیا کروں نا اماں!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"میں تو کرتی ہوں اور اب اور فکر بھی کروں گی۔ یہ تیری دعا کی بات اور ہوگی۔"

"میں بہت دعا کروں گی اماں......!" نور بانو نے بڑے خلوص سے کہا۔

نور بانو حمیدہ کی باتوں سے ڈر تو گئی لیکن اپنے اور عبدالحق کے تعلق پر سے بڑا بھروسہ تھا۔ عبدالحق تو آج بھی اس کا ویسا ہی اسیر تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ تو اس کے سوا کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

پھر بھی اس نے سوچ لیا کہ وہ اسے جانچے گی ضرور۔ دل میں تو اس

کے بہرحال خلش اور ڈر پیدا ہو گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

نادرہ اس رات سونے کے لئے لیٹی تو اسے یقین تھا کہ وہ سو نہیں سکے گی۔ ذہن بری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ دن بھر کام کے دوران میں بھی وہ اسی پر سوچتی رہی تھی کہ اس اُلجھن کا کیا حل ہوگا۔

"پھپھو! اب تو آپ شادی کر لیں گی نا۔" ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

"شادی...... کس سے......؟"

"ان سے جو آج آئے تھے۔"

"ارے پگلی! وہ اس لئے تو نہیں آئے تھے۔"

"پھپھو! جھوٹ بولنا بری بات ہے۔"

نادرہ کو جھٹکا لگا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں نے خود سنا تھا پھپھو! انہوں نے آپ سے شادی کے لئے کہا تھا۔"

"اچھا! جبکہ میں نے تمہیں باہر آنے کو منع کیا تھا۔" نادرہ نے اُلٹا اسے پکڑ لیا۔

"یہ کتنی بری بات کی تم نے۔"

"سچ پھپھو! بس میں انہیں ایک نظر دیکھنے کے لئے آئی تھی، اور دروازے کی اوٹ سے انہیں دیکھا تھا۔ اسی وقت انہوں نے آپ سے شادی کی بات کی۔ میں پھر اسی وقت واپس چلی آئی تھی۔"

نادرہ کو یہ فکر تھی کہ کہیں ارجمند نے پوری گفتگو تو نہیں سنی۔ اس گفتگو میں تو ایسے موضوعات شامل تھے، جن کے بارے میں ارجمند کو کچھ معلوم ہی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ سن کر اسے کچھ اطمینان ضرور ہوا کہ ارجمند وہاں بس ایک لمحہ رکی تھی۔ مگر پوری طرح تسلی بہرحال نہیں ہوئی تھی۔

"تم جانتی ہو نا ارجمند! کہ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔" اس نے تنبیہ

لہجے میں کہا۔

"جی پھپھو! میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔" ارجمند نے کہا۔ یہ کہنا اسے اچھا نہیں لگا کہ جھوٹ تو آپ کا پکڑا گیا ہے۔

"تم واقعی بس اتنی دیر کے لئے آئی تھیں؟ سچ کہنا!" نادرہ کا لہجہ اب بھی سخت تھا۔

ارجمند نے اس کے سر کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ کے سر کی قسم پھپھو! میں جھوٹ نہیں بولتی۔"

نادرہ نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ اسے بڑی شدت سے اس پر پیار آیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ اس کے جھوٹ کا حوالہ دے کر اسے شرمندہ کرنے سے دانستہ گریز کر رہی ہے۔

"ٹھیک ہے بیٹا! لیکن کسی بات کو منع کریں تو مان جانا چاہئے۔"

"اب ایسا نہیں ہوگا اچھی پھپھو! مگر یہ بتائیں آپ ان سے شادی کر رہی ہیں نا؟"

"نہیں گڑیا! یہ ممکن نہیں ہے ہمارے لئے۔"

"کیوں ممکن نہیں ہے۔ پہلی بار تو کوئی اچھا آدمی آیا ہے آپ سے شادی کرنے۔"

نادرہ نے دل میں سوچا، بچی کو خود بھی نہیں معلوم کہ اس نے کیسی خطرناک حد تک سچی بات کہی ہے۔

"یہ تو ٹھیک ہے گڑیا! لیکن کچھ مجبوریاں ہیں، جو میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔"

ارجمند اس سے لپٹ گئی۔

"اچھی پھپھو! آپ میری خاطر ان سے شادی کر لیں۔"

نادرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا گڑیا!"

"پہلا تو یہی کہ آپ ان کے ساتھ خوش رہیں گی۔"

"اور؟"

"اور یہ کہ میں بھی خوش رہوں گی۔ اور یہ کہ میں یہاں سے نکل سکوں گی۔"

نادرہ کے دل میں پہلی بار اس امکان نے جگہ بنائی۔ ارجمند نے اپنے یہاں سے نکلنے کا جس انداز میں کہا تھا، وہ چونکا دینے والا تھا۔ لگتا تھا کہ بچی بھی صورتِ حال کو کچھ کچھ سمجھنے لگی ہے۔ اس نے دل میں سوچا کہ اسے یہاں سے نکالنے ہی کی آس میں تو وہ زندہ رہی ہے۔ ورنہ مرنا کیا مشکل تھا۔ ہر روز مرنے کے مقابلے میں ایک بار مرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اور وہ ارجمند کو کیسے بتاتی کہ اس کی تو ہر سانس اللہ سے دعا کرتی ہے کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکل جائے۔

لیکن اس کا دل ایفائے عہد سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

"کیا سوچ رہی ہیں پھپھو!" ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

"آپ ان سے شادی کر لیں گی نا؟"

"کچھ نہیں کہہ سکتی گڑیا! بظاہر تو یہ ناممکن ہے۔"

"کیوں پھپھو!"

"بہت سی باتیں میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ بس تم دُعا کرو میرے لئے۔"

"کیا دُعا کروں اچھی پھپھو!"

"یہ کہ اللہ میرے بارے میں فیصلہ کر دے۔ ایسا کہ وہ مجھ سے ناراض بھی نہ ہو۔" بے بسی سے نادرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آپ روئیے نہیں پھپھو! اللہ میاں سب ٹھیک کر دیں گے۔" ارجمند نے کہا اور اس سے لپٹ گئی۔

وہ لمحہ نادرہ کے لئے چشم کشا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ ارجمند بڑی ہو گئی ہے۔ وہ تو اب بھی اسے وہی چھ سال کی بچی سمجھتی تھی۔ اس نے غور سے اسے دیکھا تو لگا کہ اب شاید وہ کبھی سکون سے سو نہیں سکے گی۔ وہ بے چین ہو گئی۔ اتنی حسین بچی کا کوٹھے پر رہنا اب کسی بھی طرح مناسب نہیں۔

اس کی الجھن اور بڑھ گئی۔ ارجمند تو سو گئی مگر وہ سوتی ہوئی ارجمند کو

دیکھ کر دہلتی رہی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اسے اپنے قلب اور ضمیر کے خلاف بھی فیصلہ کرنا پڑ سکتا ہے۔

نہ جانے کب اسے نیند آئی۔ لیکن فجر کے وقت اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو چند لمحوں میں ہی اندازہ ہوگیا کہ آج اس کی رات کی رانی کچھ پھیکی پھیکی، بجھی بجھی سی ہے۔

''کیا بات ہے نوربانو! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''جی! میں ٹھیک ہوں۔'' نوربانو نے کہا۔

''کچھ پریشان ہو؟''

''جی ..... جی نہیں ..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

نوربانو اس وقت منقسم تھی۔ وہ اولاد کے موضوع پر عبدالحق سے بات کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ سوچتی تھی کہ یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات ہے۔ عبدالحق نے آج تک کوئی بے تابی ظاہر نہیں کی تھی۔ تو اب وہ خود اس کے دل میں یہ بات کیوں ڈالے؟

لیکن حمیدہ کی باتیں اسے یاد تھیں، اور یہ بھی تھا کہ حمیدہ کی ہر بات معقول تھی۔ عبدالحق نے بات نہیں کی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسے اولاد کی پرواہ ہی نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ دل میں یہ بات سوچتا ہو اور جو بات دل میں ہو لیکن کی نہ جائے وہ زیادہ طاقتور بن جاتی ہے۔ بات کرنے سے مسئلے کی سنگینی بہرحال کم ہوتی ہے۔

اور پھر اس بات کا امکان بھی موجود تھا کہ حمیدہ اس موضوع پر کسی بھی وقت عبدالحق سے بات کر لے گی، جیسے اس سے کی تھی۔ تو اس سے یہ بہتر تھا کہ وہ خود ہی یہ بات کر لے۔

ایک بات کا اندازہ نوربانو کو ہوگیا تھا کہ جیسے عبدالحق کے لئے بیٹے کی

اہمیت ہے، ویسے ہی حمیدہ کے لئے بھی ہے اور یہ فطری تھا۔ دودھ کے رشتے سے عبدالحق حمیدہ کا بیٹا تھا۔ اس کی پوتے کی آرزو فطری .....

''کچھ سوچ رہی ہو تم؟'' عبدالحق نے اسے چونکا دیا۔

''آج کیا ہوگیا ہے تمہیں؟''

''جی ہاں..... ! میں کچھ سوچ رہی ہوں۔''

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''یہی کہ ہم ابھی تک اولاد سے کیوں محروم ہیں؟''

عبدالحق کے چہرے پر ایک رنگ سا آکے گزر گیا۔

''اللہ کی مرضی! اولاد تو اللہ کی دین ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''آپ کو اس کی وجہ سے کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا؟'' نوربانو نے بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہوتا؟ بالکل ہوتا ہے۔'' عبدالحق نے صاف گوئی سے کہا۔

''آپ نے کبھی کچھ کہا نہیں اس سلسلے میں؟''

''کہنے سے کیا ہوتا ہے، یہی ایک دعا تو میں کرتا ہوں اللہ سے۔ جانتا ہوں کہ میرے یا تمہارے چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب اللہ چاہے گا، ہمیں نواز دے گا۔ وہ مرضی کا مالک ہے۔ میں اور تم تو بس دعا کر سکتے ہیں۔''

اور میں بہت پہلے الٹی دعا کر چکی ہوں۔ نوربانو نے دل میں سوچا۔

''ایک بات بتائیں، مرد کے لئے اولاد کی بہت اہمیت ہوتی ہے نا؟''

''مرد کی تخصیص کیوں کرتی ہو۔ عورت کے لئے تو شاید اولاد مرد کی نسبت زیادہ اہم ہوتی ہے۔''

''کیسے؟''

''بھئی مرد کے لئے تو اہمیت اس لئے ہوتی ہے کہ اس کی نسل چلتی ہے۔ لیکن عورت تو بچے کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔ اولاد کے بغیر تو اس کی تکمیل ہی نہیں ہوتی۔ عورت کو تو اللہ نے ممتا دی ہے نا؟''

''تو مجھے یہ کمی کیوں محسوس نہیں ہوتی؟'' نوربانو نے بے ساختہ کہا۔

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یہ کیسی بات کی تم نے؟ یہ تو غیر فطری ہے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" نور بانو نے بات بگڑتی دیکھ کر جلدی سے کہا۔

"کمی تو مجھے بھی محسوس ہوتی ہے لیکن مجھ میں صبر ہے اس معاملے میں۔"

"صبر تو مجھ میں بھی ہے۔ میں نے کبھی تم سے اس سلسلے میں بات نہیں کی۔ آج بھی تم نے ہی یہ بات چھیڑی ہے۔ حالانکہ مجھے دوسروں کے مقابلے میں اولاد کی خواہش زیادہ ہے۔"

"کیوں؟" نور بانو نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

"مجھ پر اور پتا جی پر اللہ نے جو فضل فرمایا، وہ انشاء اللہ میرے بیٹے کے ذریعے آنے والی نسلوں میں منتقل ہوگا۔ میرے لئے تو اس بات کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ تمہیں پتا ہے نا، میں اپنے والدین کے ہاں بائیس سال کے انتظار کے بعد پیدا ہوا تھا۔ جتنی انہیں اولاد کی آرزو تھی، میں یقین سے کہتا ہوں کہ مجھے ان سے بھی زیادہ آرزو ہے۔ حالانکہ ہماری شادی کو تو ابھی تین ساڑھے تین سال ہی ہوئے ہیں۔"

نور بانو چوکنا ہوگئی۔ حمیدہ کی بات بالکل درست ثابت ہو رہی تھی۔

"آپ نے مجھ سے کبھی کچھ کہا نہیں۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"تم سے کیا کہتا؟ تمہارے اختیار میں تو کچھ نہیں ہے۔ جس کے اختیار میں ہے، اس سے ہر روز دُعا کرتا ہوں۔" عبدالحق نے کہا۔

"اور پتا جی زندہ ہوتے تو یقیناً وہ مجھ سے بھی زیادہ دُعائیں کرتے میرے لئے بیٹے کی۔"

کوئی بات نہیں، ان کی جگہ اماں جو موجود ہیں۔ نور بانو نے دل میں سوچا۔

"پھر بھی، بات ت کرنی چاہئے تھی آپ کو۔ کسی ڈاکٹر کو بھی دکھانا

چاہئے۔ ممکن ہے کوئی خرابی ہو۔"

"کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" عبدالحق نے بے پرواہی سے کہا۔ "یہ تو بس اللہ کی مرضی کی بات ہے۔ میں قرآن پاک پڑھتا ہوں۔ اللہ کی مرضی ہوئی تو ضعیف شوہر اور بانجھ بیوی کو بھی اس نے اولاد سے نوازا۔ اور وہ نہ چاہے تو یہ نعمت کہیں سے نہیں ملتی۔ ویسے تمہیں بتا دوں کہ میں ڈاکٹر سے مل چکا ہوں۔ ظاہری طور پر تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔"

نور بانو نے تیزی سے موضوع بدل دیا۔

"لوگ تو اولاد کی خاطر دوسری شادی بھی کر لیتے ہیں۔"

"اس میں کوئی برائی نہیں۔ اسلام نے تو چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔"

نور بانو کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ لیکن اس نے بظاہر شوخ لہجے میں چیلنج کیا۔

"تو آپ کب کر رہے ہیں دوسری شادی؟"

"میں کر ہی نہیں سکتا۔" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

پہلی بار نور بانو کو اطمینان ہوا۔

"کیوں نہیں کر سکتے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے بے پرواہی سے کہا۔

"تمہیں تو اعتراض کافی ہی نہیں۔ لیکن میں دوسری شادی کر نہیں سکتا۔"

"وہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ کیوں نہیں کر سکتے؟"

"بیویوں کے درمیان عدل کیسے کروں گا میں؟ تمہارے بعد میں کسی اور سے محبت کر ہی نہیں سکتا اور بغیر محبت کے صرف اولاد کی غرض سے شادی کروں تو یہ خودغرضی ہوگی اور دوسری عورت کے ساتھ زیادتی۔ اور پھر میرے نزدیک یہ ایمان کا معاملہ ہے۔ اللہ کو منظور ہے تو اولاد تم سے ہی مل جائے گی اور خدانخواستہ اس کی مرضی نہیں تو پھر یہ ممکن ہی نہیں۔"

نور بانو نے اطمینان کا سانس لیا۔ رات کی رانی پھر سے مہک اُٹھی۔

پھر عبدالحق تو سو گیا۔ لیکن نور بانو جاگتی رہی۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ سکون تو اوپری تھا۔ اندر تو عدم تحفظ کا پرانا، سویا ہوا خوف جاگ اُٹھا تھا۔ اب وہ وہی پرانی نور بانو تھی، جو ہر چیز پر شک کرتی تھی، جو یقین سے محروم تھی۔

اس نے سوچا۔ عبدالحق اس وقت کچھ بھی کہتا رہے لیکن یہ تو اس نے مان لیا ہے کہ اسے اولاد کی خواہش عام لوگ سے زیادہ ہے۔ کون جانے، یہ خواہش اس کی محبت پر بھی حاوی آ جائے۔ اور مردوں کا کیا ہے؟ کسی وقت بھی، کسی سے بھی محبت کر سکتے ہیں۔ اور عبدالحق نہ بدلے تو بھی حمیدہ تو ہے نا۔ وہ اسے دوسری شادی پر مجبور کر سکتی ہے۔

اس لمحے نور بانو کو حمیدہ اپنے دل میں چبھا ہوا کانٹا لگی۔ مگر اس کانٹے کو وہ خود نہیں نکال سکتی تھی۔ اس کانٹے سے تو اللہ ہی نجات دلا سکتا ہے۔ اس نے بے رحمی سے سوچا۔

لیکن اس نے ایک بات اور طے کر لی۔ اب اسے ہر لمحے اللہ سے اولاد کے لئے دُعا کرنی تھی۔

مگر اس کے دل میں ایک اور کانٹا بھی پیوست ہو گیا تھا۔ پچھتاوے کا کانٹا۔ کاش اس نے رمضان کی ان طاق راتوں میں وہ منحوس دعا نہ کی ہوتی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی وہ دعا جسے اب وہ بددعا سمجھ رہی ہے، اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو چکی ہے۔

❁ ❁ ❁

فجر کی نماز کے بعد نادرہ دیر تک دُعا مانگتی رہی۔ وہ اللہ کے حضور گڑگڑا رہی تھی۔

''اے اللہ! یہ مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا آپ نے؟ اس کے اعتبار سے میں تو بہت چھوٹی ہوں میرے رب! اور آپ سے تو کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔ میں نے آپ کو گواہ بنا کر نیلم بائی سے عہد کیا اور اس کے بعد اپنے لئے کبھی دُعا بھی نہیں مانگی۔ میں تو بس ارجمند کے لئے ہی دُعا کرتی رہی آپ سے۔ اپنے لئے تو میں صرف موت ہی مانگتی ہوں آپ سے۔ مگر ارجمند کے یہاں سے نکلنے

کے بعد .....'' اس کی آواز آنسوؤں سے رُندھ گئی۔

''اب جب میں نے عہد کر لیا تو آپ نے مجھے اس آزمائش میں ڈال دیا۔ اب آپ ہی میری راہنمائی کریں۔ میں بدعہدی نہیں کرنا چاہتی۔ میرا دل کفارے والی بات کو قبول نہیں کرتا۔ اب آپ ہی مجھے راستہ دکھایئے۔'' وہ رونے لگی۔

پھر اچانک ہی بغیر کسی وجہ کے اس کے دل کو سکون آ گیا، جیسے اللہ نے اس کی سن لی ہو۔ اور مدد کا وعدہ بھی کر لیا ہو۔

اس نے اُٹھ کر کھانے کے لئے چیزوں کی فہرست بنائی اور اچھو میاں کو دی۔

''یہ سب کچھ لے آیئے جلدی سے۔''

''کوئی مہمان آ رہا ہے کیا؟'' اچھو میاں نے پوچھا۔

وہ نظریں چرانے لگی۔

''جی نواب صاحب!''

''وہی جو کل آئے تھے۔''

''جی...... جی ہاں...... !''

''میرا کوئی حق تو نہیں بیٹا! لیکن .....''

نادرہ نے جلدی سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ کو سب کچھ جاننے کا حق ہے نواب صاحب! آپ یہ سودا لے کر آ جائیں تو پھر بات کریں گے۔ میں کھانے کی تیاری تو شروع کروں۔''

اچھو میاں چلے گئے۔ واپس آئے تو نادرہ نے انہیں سب کچھ بتایا۔

اچھو میاں سے تو خوشی چھپائی ہی نہیں جا رہی تھی۔

''بہت بہت مبارک ہو بیٹا!'' وہ بولے۔

''آپ مبارک باد دے رہے ہیں۔ جبکہ آپ جانتے ہیں کہ میں نیلم بائی سے کوٹھا نہ چھوڑنے کا عہد کر چکی ہوں۔'' نادرہ نے حیرت سے کہا۔

''اس وقت تمہارے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا بیٹا! وہ تمہاری

مجبوری تھی۔'' اچھو میاں بولے۔

''اور دیکھو بیٹا! یہاں زندگی اس کوٹھے پر گزری ہے۔ آدمی کی بڑی پہچان ہے ہمیں۔ وہ آدمی ہیرا ہے ہیرا۔''

''لیکن نواب صاحب! میں نے اللہ کو گواہ بنا کر عہد کیا تھا بائی سے۔''

''میں نے کہا نا کہ وہ تمہاری مجبوری تھی۔''

''نہیں نواب صاحب! میں سمجھتی ہوں کہ اللہ نے میرے لئے وہ راستہ نکالا تھا۔ اور میں نے سوچ سمجھ کر وہ عہد کیا تھا۔ اور اس کا مجھے فائدہ بھی ہوا۔ میں اسے مجبوری کیسے کہہ سکتی ہوں؟''

''لیکن بیٹا! یہ بہرحال کوٹھا ہے۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ اللہ نے تمہیں یہاں سے نکلنے کا موقع دیا ہے؟''

''میرے نزدیک یہ آزمائش ہے میری کہ اس ترغیب کے سامنے میں اللہ کے سامنے کئے ہوئے عہد کا پاس رکھتی ہوں یا نہیں؟''

اچھو میاں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''معاف کرنا بیٹا! میرا نکتہ نظر مختلف ہے۔ میرے نزدیک اس پیش کش کو ٹھکرانا کفران نعمت ہے۔ اللہ نے تمہارے لئے کوٹھے سے نجات کی راہ نکالی ہے۔ تم کیسے منہ موڑ سکتی ہو؟''

''آپ جذباتی ہو کر سوچ رہے ہیں نواب صاحب!'' نادرہ نے کہا۔

''یہ نہ بھولیں کہ اس عہد کی ہی وجہ سے میں اس کوٹھے پر بھی عزت کے ساتھ جی رہی ہوں۔ اور کون سوچ سکتا ہے کہ اس کوٹھے پر ہی ہمیں اللہ کی مہربانی سے رزق حلال مل رہا ہے۔ جیسے اللہ نے اس کا اہتمام کیا، آپ خود اس پر گواہ ہیں۔ اب میں خودغرض اور مطلبی بن کر اس عہد سے منہ موڑ لوں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہاں سے نکل کر میں اس عزت سے جی سکوں گی؟ جیسے اس کوٹھے پر جی رہی ہوں۔''

اچھو میاں دم بخود رہ گئے۔ چند لمحے تو وہ بول ہی نہیں سکے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے بیٹا! اس طرح تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔''

''اب میں کیا کروں نواب صاحب!'' نادرہ نے بے بسی سے کہا۔

اچھو میاں چند لمحے سوچتے رہے پھر بولے۔

یہ تو بہت نازک معاملہ ہے۔ دونوں طرف اللہ کی ناراضی کا خطرہ ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''مجھے بتایئے نا! میں کیا کروں؟'' نادرہ روہانسی ہوگئی۔

''اللہ کی ناراضی کا معاملہ ہے۔ اللہ پر ہی چھوڑ دو۔''

''مگر مجھے عارف صاحب کو جواب بھی دینا ہے آج!''

''اللہ سے لو لگاؤ۔ وہی تمہیں درست راستہ دکھا دے گا۔ وہی تمہیں درست جواب سجھا دے گا۔''

''مگر کیسے؟''

''انشاء اللہ تمہارے دل کو خود بخود جواب مل جائے گا۔''

اور نادرہ کا دل سچ مچ مطمئن ہوگیا۔ وہ کھانے میں مصروف ہوگئی۔

❁ ❁ ❁

عارف پوری رات نہیں سو سکا۔ عجیب ملی جلی سی، ہیجانی سی کیفیت تھی اس کی۔ خوشی بھی تھی مگر ڈر بھی تھا کہ نادرہ انکار نہ کر دے۔ اس بات کا اسے یقین ہوگیا تھا کہ برسوں سے اسے جس کی تلاش تھی، وہ نادرہ ہی ہے۔

اسے یاد تھا، اس نے وہاں بہت عمدہ سلے ہوئے، بے حد نفیس کڑھائی والے کرتے دیکھے تھے۔ وہ اسے بہت اچھے لگے تھے۔ لیکن وہ ان کی اہمیت نہیں سمجھ سکا تھا۔ پھر جب نادرہ نے اسے کھانے پر مدعو کیا تو وہ اپنا اکراہ چھپا نہیں سکا تھا تو نادرہ نے کیسے کہا تھا کہ ہمیں اللہ نے رزق حلال سے نوازا ہے۔

طوائف کے کوٹھے پر رزق حلال؟

اس نے حیرت سے سوچا تھا، اور اسی وقت نادرہ نے کہا تھا کہ اچھو میاں اس کے رزقِ حلال کے کاروبار کے منیجر ہیں اور ایک لمحے میں بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ سناٹے میں آگیا تھا اور پھر وہ اللہ کی قدرت کا قائل

ہوگیا۔ واقعی وہ جہاں چاہے، جسے چاہے، جتنا نواز دے اور یہ نادرہ کیسی غیر معمولی عورت ہے کہ طوائف کے کوٹھے کی مالک ہے۔ دولت کی کوئی کمی تو ہو ہی نہیں سکتی اسے۔ مگر وہ کپڑوں کی سلائی کڑھائی کر کے رزقِ حلال کما رہی ہے۔
یہ تو اللہ کی رحمت ہے اس پر، اور وہ بڑے بڑے معززین سے بڑھ کر معزز ہے۔
وہ واقعی غیر معمولی عورت تھی۔ کوٹھے پر بیٹھی ایفائے عہد کی فکر کر رہی تھی۔ اس کے لمس پر جو اس کا ردِعمل تھا، وہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ بھی اسے کم از کم پسند ضرور کرنے لگی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے اس کی محبت پر یقین ہے، اور وہ اسے اچھا آدمی سمجھتی ہے۔
اور وہ جو کوٹھے پر بیٹھ کر بھی رزقِ حلال کی جستجو کرتی ہے، کوٹھے سے نجات تو اس کا خواب ہوگا اور وہ اسے کوٹھے سے نجات دلا کر عزت کی زندگی دینے کی بات کر رہا تھا۔ یعنی اسے اپنے ناممکن خواب کی تعبیر مل رہی تھی۔ مگر وہ اپنا عہد توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس عہد کی خاطر گھر آئی محبت اور عزت کو ٹھکرا رہی تھی، جو ایک مطلبی طوائف نے اللہ کو گواہ بنا کر اس سے لیا تھا۔
ایسی سچی اور کھری عورت کے لئے تو دنیا بھی چھوڑی جا سکتی ہے۔
عارف نے سوچا۔ اس کے دل میں نادرہ کی محبت اور گہری...... اور زیادہ ہوگئی۔
کاش...... کاش وہ اسے مل جائے۔

ویسے یہ پورا معاملہ ہی عجیب تھا۔ کہانی کی سی بات لگتی تھی۔ چار سال پہلے نرگس کی شہرت سن کر وہ نیلم بائی کے کوٹھے پر گیا تھا۔ وہاں سچ مچ اس کے زخم ہرے ہوگئے تھے۔ وہ عورت نہیں تھی، پتھر جیسی برف سے تراشا ہوا خوب صورت مجسمہ تھی۔ وہ اسے کہیں اور ملی ہوتی تو وہ اسے اپنی بیوی سے بھی برا سمجھتا۔ لیکن کوٹھے پر بیٹھی ہوئی طوائف ایسی ہو تو اس سے بڑھ کر عزت کے لائق کون ہو سکتا ہے۔ خوب صورتی کی تو اس کے نزدیک کوئی ایسی خاص اہمیت نہیں تھی لیکن عزت کے حوالے سے وہ اسے ہمیشہ یاد رہی۔
یاد رکھنا اپنی جگہ، لیکن محبت کا تو وہاں کوئی سوال نہیں تھا۔
پھر اس رات وہ سمن سے ملا۔ نرگس بائی کا نام اسے یاد نہیں تھا۔ مگر نیلم

بائی کے کوٹھے کے حوالے سے وہ اسے یاد آ گئی، پوچھنے پر اس کی نام نہاد بیماری اور پیشے سے کنارہ کشی کا پتا چلا، اور وہ سمجھ گیا کہ اپنی زندہ عزتِ نفس کی خاطر برف کی سل بن جانے والی عورت نے اپنے لئے راستہ نکال لیا ہے۔ بس اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ اسے نرگس سے محبت ہوگئی ہے۔
اور ملاقات نے اس کی محبت کو پختہ کر دیا۔ کردار کے کتنے قابلِ رشک پہلو اس ملاقات میں اسے نظر آئے۔ کوئی اور عورت ہوتی تو اس کے لئے یہی بہت ہوتا کہ اسے مردوں کے جبر سے نجات مل گئی ہے، اور وہ عزت کی زندگی گزار رہی ہے۔ اسے تو عیش کی زندگی گزارنی چاہئے تھی۔ لیکن نہیں! نادرہ کے لئے یہ کافی نہیں تھا۔ اس نے اپنے لئے رزقِ حلال کی جدوجہد کی اور اس پر اس کی ایفائے عہد کی فکر، اور وہ بھی اس حد تک کہ اسے زنداں سے باعزت رہائی بھی قبول نہیں۔
ایسی عورت سے تو بس محبت ہی کی جا سکتی ہے۔
وہ مل جاتی تو زندگی سنور جاتی۔ لیکن عارف کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے قائل کرنا اتنا آسان نہیں۔ اس لئے ت اس نے اپنے مزاج کے خلاف دھمکی بھی دے دی تھی، جس پر وہ اب شرمندہ تھا۔ بس طمانیت اس بات کی تھی کہ نادرہ نے اس دھمکی میں چھپے خلوص کو بھی پہچان لیا تھا۔ ورنہ اس کے انداز میں تکدر ضرور محسوس ہو جاتا۔
عارف کو اس پر حیرت تھی کہ اتنے بڑے فیصلے کے لئے نادرہ نے صرف ایک دن کی مہلت کیوں مانگی؟ اس پر سوچتے ہوئے اسے احساس ہونے لگا کہ جیسے اس کے اور نادرہ کے درمیان کوئی رابطہ ہے۔ جیسے وہ اور رہ کر بھی نادرہ کو سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔
اور بات ایک زاویے سے اس کے لئے خوش آئند تھی۔ اور دوسرے زاویے سے تشویش میں مبتلا کرنے والی۔ خوش آئند پہلو یہ تھا کہ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ نادرہ اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہے۔ اس کے دل میں اس کے لئے گنجائش بنی ہے۔ یعنی وہ اس معاملے پر خود سے بحث کرے گی تو

اسے اس کے حق میں بہت زیادہ دلیلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ورنہ تو وہ ایفائے عہد پر جس طرح قائم ہے، اس میں تو اسے اسی وقت فیصلہ سنا دینا چاہئے تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ دل اس فیصلے کی راہ میں مزاحم تھا۔

مگر دوسرا پہلو تشویش میں مبتلا کرنے والا تھا۔

اتنے بڑے فیصلے کے لئے اتنی سی مہلت؟ وجہ وہ اس کی بھی سمجھ گیا تھا۔ اسی لئے تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ نادرہ کو اپنے دل کی طرف سے اپنے فیصلے پر شدید مزاحمت کی توقع تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اس پر جتنا سوچے گی، اتنا ہی زیادہ الجھے گی۔ اور کسی نتیجے پر پہنچنا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دشوار ہوتا جائے گا۔ اس لئے اس نے خود کو کم مہلت کا پابند کر لیا۔ اس میں تشویش ناک پہلو اس امکان کی وجہ سے تھا کہ نادرہ نے خود پر اپنا پہلا فیصلہ مسلط کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

لیکن مزید غور کرنے پر اس کی تشویش کم ہوگئی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اسی وقت فیصلہ سنا دیتی، اسے اگلے روز کیوں بلاتی؟

بالآخر وہ اصل بات سمجھ گیا۔ نادرہ خوفِ خدا رکھنے والی تھی۔ اسے اپنے عہد کی فکر بھی تھی۔ لیکن کوٹھے کے اس جہنم سے نجات کی وہ ترغیب بھی اس کے لئے بہت بڑی تھی۔ اس نے اس فیصلے کے معاملے میں اللہ سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اور اللہ سے رجوع کرنے کے لئے لمحے بھی بہت ہوتے ہیں۔

ویسے نادرہ کی بات میں وزن تھا۔ وہ جو خود کو اپنی بھتیجی سے علیحدہ رکھنا چاہتی تھی۔ تو اس کا خوف بے جا نہیں تھا۔ چاہے اس کا سبب جبر ہو، مگر بہرحال اس کا ایک ماضی تھا۔ کہیں بھی کوئی تمش بین اسے اس کی ماضی کی حیثیت میں پہچان سکتا تھا۔ لیکن عارف جانتا تھا کہ بدلے ہوئے اس منظر نامے میں یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ کراچی تیزی سے بڑھتا ہوا شہر تھا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کو اکثریت نے وہاں کا رخ کیا تھا۔ عارف نے سوچ لیا تھا کہ وہ نادرہ اور اس کی بھتیجی کو لے کر کراچی چلا جائے گا۔ وہاں اگر کوئی نادرہ کو پہچانے گا بھی تو ہندوستان کے پرانے اور عزت والے حوالے سے۔ یہاں کا کوئی تماش

بین کراچی کہاں جائے گا؟

اس نے سوچا کہ یہ بات وہ کل نادرہ کو بھی سمجھائے گا۔

جاگتے سوچتے اسے صبح ہوگئی۔ رات بھر جاگنے والوں کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ صبح کے وقت بالآخر وہ سو جاتے ہیں۔

عارف کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور جانے کی تیاریوں میں لگ گیا۔

❁ ❁ ❁

وہ اسی کمرے میں بیٹھے تھے، جہاں پچھلی بار ملے تھے۔

نادرہ بہت نروس تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اسے عارف کو جواب دینا تھا اور فی الحال اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ نواب صاحب نے کہا تھا کہ اللہ تمہیں خود راستہ سجھا دے گا۔ سو اب وہ دل میں اللہ سے مدد کی دعا کرنے، اور اس کی طرف سے جواب کا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

نروس ہونے کی دوسری وجہ اس کی سمجھ اس وقت آئی، جب اس نے سامنے بیٹھے عارف کو نظر اٹھا کر دیکھا، اور فوراً ہی نظریں جھکانے پر مجبور ہوگئی۔ عارف کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں بہت خوش گوار اور کیف آور انداز میں بے ترتیب ہوگئی تھیں۔

ایک لمحے میں اسے احساس ہوگیا کہ وہ عارف کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اس احساس نے اسے اور نروس کر دیا۔ وہ جواب جو وہ عارف کو دینا چاہتی تھی، اس کے لئے اور دشوار ہوگیا تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے، کوشش کر کے نظر اٹھائی اور عارف کو دیکھا۔ وہ پہلے ہی سے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی آواز میں لرزش ہے۔

''آپ نہیں سمجھ سکتیں کہ اس وقت میرا کیا حال ہے؟'' عارف نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''جی...... میں بھی نہیں۔''

''میرا حال اس وقت اس ملزم جیسا ہے، جسے سزائے موت بھی ہو سکتی ہے، اور تمام تر رعنائیوں اور خوشیوں کے ساتھ زندگی بھی مل سکتی ہے اور آج فیصلہ سنائے جانے کا دن ہے۔'' وہ کہتے کہتے رکا اور اس نے گہری سانس لی۔ اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

''اب تو آپ سمجھ سکتی ہیں کہ میرا اس وقت کیا حال ہے؟''

''چھوٹی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔''

''زندگی اور موت سے بڑی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔''

''کسی کے ملنے نہ ملنے سے کوئی مر نہیں جاتا۔''

''یہی تو اور بری اور بڑی بات ہے۔'' عارف نے کہا۔

''مر جانا تو آسان بات ہے۔ لیکن جس کے ساتھ جینا آدمی کے لئے زندگی کی سب سے بڑی اور اہم ترین خواہش بن جائے، اس کے بغیر جینا موت سے بھی بدتر ہوتا ہے۔''

نادرہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''آپ ایسی باتیں کرتے ہیں، جبکہ آپ نے پریشانی دیکھی بھی نہیں۔ مجھے دیکھیں، جو جو کچھ دیکھا اور سہہ چکی ہوں، اس کے بعد بھی زندہ ہوں۔ ایک معصوم بچی کی خاطر۔''

''تو میں آپ کی تمام پریشانیاں ہی تو بانٹنا چاہتا ہوں۔ آپ کے دکھ میرے، اور میری تمام خوشیاں آپ کی۔''

''خوشی تو نصیب سے ہوتی ہے۔ کسی کے دینے سے کہاں ملتی ہے کسی کو، ایسا ہوتا تو دنیا میں بھی کوئی خوشی سے محروم نہیں ہوتا۔'' نادرہ نے آزردگی سے کہا۔

''اب نصیب کا کسی کو کیا پتا؟''

''میرا ہاتھ تھام کر دیکھئے۔ پتا چل جائے گا۔''

''قوتِ فیصلہ سے محروم نادرہ کو اس گفتگو نے اور پریشان کر دیا۔ وہ گھبرا

کر اٹھی۔

''کہاں چلی آپ؟''

''کھانا لگا دوں، تیار ہے۔''

''مجھ یقین ہے کہ آپ کھانا بھی بہت اچھا پکاتی ہوں گی۔'' عارف نے کہا۔

''لیکن یقین کریں، اس بے یقینی کے عالم میں تو لذیذ ترین کھانا بھی میرے حلق سے نہیں اُترے گا۔''

''آپ چاہتے کیا ہیں؟''

''پہلے فیصلہ سنا دیں۔''

''اور فیصلہ آپ کو ناپسند ہوا تو آپ کھانا بھی نہیں کھائیں گے۔''

''وہ تو فیصلہ سننے سے پہلے بھی نہیں کھایا جائے گا۔''

''جی نہیں! ہمارے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ آپ کھانا یہاں کھائیں گے، اور پھر میں آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کروں گی۔''

''مجھے یاد ہے۔ لیکن میں التجا کرتا ہوں کہ آپ ترتیب بدل دیں۔''

''جی نہیں!''

''اچھا! ایک وعدہ کر لیں۔ مجھ پر احسان ہوگا آپ کا۔''

''آپ جانتے ہیں، میں وعدہ نہیں کر سکتی۔''

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔'' عارف نے گہری سانس لے کر کہا۔

''میں بے انصاف آدمی نہیں ہوں۔ میں آپ سے اپنے حق میں فیصلہ کرنے کا وعدہ نہیں لوں گا۔''

نادرہ نے ٹٹولنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

''اچھا! کہئے، کیا چاہتے ہیں آپ؟''

''میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ بھی بے انصافی سے کام نہ لیں۔ چاہے فیصلہ میرے خلاف ہو، مگر اسے سن کر مجھے یہ احساس ہو کہ آپ نے میرے ساتھ بے انصافی نہیں کی ہے۔''

"لیکن آپ کو تو اپنی مرضی کے خلاف فیصلہ بے انصافی ہی لگے گا۔"
"آپ مجھے سمجھی ہی نہیں ابھی تک۔" عارف نے اداس لہجے میں کہا۔
"نہ میں بے انصاف ہوں، اور نہ ہی نامعقول۔ اور انہی دو باتوں کی آپ سے اُمید رکھتا ہوں۔"
اس لمحے نادرہ کو اس شائستہ اور خوش اطوار شخص پر بہت پیار آیا۔ درحقیقت وہ بہت اچھا اور معقول آدمی تھا۔ لیکن وہ اس سے جو اُمید رکھ رہا تھا، اسے پورا کرنا آسان نہیں تھا۔
اسے ہچکچاتا دیکھ کر عارف نے کہا۔
"ایک بات بتائیں، کیا آپ فیصلہ کر چکی ہیں؟"
"جی نہیں......!"
"تو کھانے کے بعد کریں گی؟"
"مجھے معلوم نہیں۔"
"یہ کیا بات ہوئی؟"
"دراصل یہ معاملہ میں نے اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔"
"اللہ اپنے بندوں سے کلام تو نہیں کرتا۔" عارف نے اعتراض کیا۔
"لیکن قلب کے ذریعے ان کی راہنمائی تو کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے، وہ میری راہنمائی کرے گا۔"
عارف کے چہرے سے پریشانی جیسے دھل گئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔
"ارے! یہ تو کمال کر دیا آپ نے۔ لیجئے، میں تو مطمئن ہو گیا کہ بے انصافی ہو ہی نہیں سکتی۔ اب تو آپ کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہو گا۔"
نادرہ بھی خوش ہو گئی۔ اس کی خوبیاں کھلتی ہی جا رہی تھیں۔ وہ سچا اور سادہ دل بھی تھا، اور بھروسہ کرنے والا بھی۔ ایسے آدمی سے کون محبت نہیں کرے گا۔
"تو پھر میں......؟"
"جلدی جائیں، اب تو مجھے بہت شدید بھوک لگ رہی ہے۔" عارف

نے ہنستے ہوئے کہا۔
"میں تو آج ناشتہ بھی نہیں کر سکا ہوں۔"
نادرہ کے دل کا بوجھ جیسے ہٹ گیا۔
مگر کھانا کھاتے ہوئے عارف کے انداز میں بے رغبتی تھی۔
"آپ کو کھانا اچھا نہیں لگا؟" نادرہ نے پوچھا۔
"جی نہیں......! اتنا لذیذ اور خوش ذائقہ کھانا میں نے پہلے کبھی نہیں کھایا۔"
"آپ کے انداز سے تو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ زہر مار کر رہے ہیں۔"
"وہ جب بھوک نہ لگے تو ایسا ہی ہوتا ہے، چاہے کیسی ہی نعمت سامنے رکھی ہو۔"
"ذرا دیر پہلے تو آپ کہہ رہے تھے کہ بہت شدید بھوک لگی ہے۔" نادرہ نے اسے غور سے دیکھا۔
"جیسے ایک لمحے میں اچانک لگی تھی، ویسے ہی اچانک ختم ہو گئی۔" عارف نے سادگی سے کہا۔
نادرہ کو اس پر بڑی شدت سے پیار آیا۔ وہ اس سے وجہ نہیں پوچھ سکتی تھی، کیونکہ وجہ اسے معلوم تھی۔ خود اس سے بھی ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا جا رہا تھا۔ وہ اللہ سے جس راہنمائی کی اُمید کر رہی تھی، ابھی تک اس سے محروم تھی اور لمحے تیزی سے گزر رہے تھے۔ جواب دینے کا مرحلہ سر پر آ رہا تھا۔ وہ اسے روکنے کے لئے دھیرے دھیرے، بے دلی کے ساتھ نوالے ٹونگ رہی تھی۔
بالآخر وہ دونوں ہی ہاتھ روکنے پر مجبور ہو گئے۔
نادرہ اُٹھنے لگی تو عارف نے کہا۔
"بس نادرہ! مجھے اور آزمائش میں نہ ڈالیں۔"
نادرہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

''اب آپ برتن سمیٹیں گی، پھر چائے لائیں گی۔ سکون سے چائے پی جائے گی۔ مگر میرے اعصاب اب یہ بوجھ نہیں اٹھا سکیں گے۔ یقین کیجئے، اب کچھ ہو جائے گا مجھے۔''

''تو پھر؟'' نادرہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''یہ سب کچھ یہیں رہنے دیجئے۔ آپ پہلے مجھے جواب دے دیجئے۔''

نادرہ نے ہمدردانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ واقعی بہت زیادہ اعصاب زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ مگر وہ بھی مجبور تھی۔ اللہ کی طرف سے جواب. تواب بھی دل پر نہیں اترا تھا۔ ایسے میں تو وہ بس ایک ہی جواب دے سکتی تھی۔ میں اللہ کو گواہ بنا کر کیا ہوا وعدہ نہیں توڑ سکتی۔ بلکہ توڑوں گی بھی نہیں۔ لیکن وہ یہ جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔

''دیکھئے! ابھی تو میرے پاس کوئی جواب......'' اس نے معذرت طلب انداز میں بات شروع کی لیکن اسی لمحے جیسے کچھ ہو گیا۔ دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ اپنی بات پوری کئے بغیر رک گئی ہے۔ پھر اسے یہ بھی نہیں پتا چلا کہ وہ اب کیا کہہ رہی ہے۔

''ٹھیک ہے، میں آپ کو جواب دیتی ہوں۔'' وہ کسی تنویم زدہ معمول کی طرح بول رہی تھی۔

''میں نے جو وعدہ اللہ کو گواہ بنا کر بائی سے کیا تھا، وہ دل کی گہرائی سے، پوری سچائی کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے بعد سے ہر روز میں نے اللہ سے بس یہی دعا کی ہے کہ ارجمند کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے غیب سے کسی کو بھیج دیں۔ میں ہر روز اس دعا کی قبولیت کا انتظار کرتی ہوں۔''

عارف چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''اچھا! کسی دن ایسا ہوگا تو پھر؟ اپنے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟''

''اپنے بارے میں سوچنے کو میرے پاس ہے ہی کیا؟ وعدہ مجھے پورا کرنا ہے، جب تک زندگی ہے، اس کوٹھے پر ہی گزارنی ہے اور یہ میرے لئے

بہت بڑی سزا ہے۔ اس لئے دوسری دعا کرتی ہوں کہ اللہ میری ارجمند کو محفوظ کرتے ہی مجھے موت دے دے۔''

عارف جھرجھری لے کر رہ گیا۔

''زندگی کی نعمت کو ٹھکرانا، رد کرنا، اور موت کی دعا کرنا، یہ تو اللہ کے لئے ناپسندیدہ ہے۔ ناشکرا پن ہے۔ اللہ کو غضب ناک کرنا ہے۔''

''بندے کچھ نہیں سمجھتے، کچھ نہیں جانتے، اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ اسی لئے تو اس نے بہت سے معاملات میں استثنٰی دیا ہے۔'' نادرہ نے سادگی سے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ اللہ اس دعا پر مجھ سے خفا نہیں ہوگا۔''

''میری دعا ہے کہ اللہ آپ سے کبھی خفا نہ ہو۔'' عارف نے بڑے خلوص سے کہا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اچانک چونک کر بولا۔

''میں بھی کن باتوں میں الجھ گیا۔ یہ آپ نے کیا کہا کہ اپنے بارے میں سوچنے کو آپ کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ آپ اس کے بارے میں سوچیں، جو آپ کے سارے دکھ درد بانٹنا چاہتا ہے۔ جو عزت سمیت آپ کو ہر خوشی دینا چاہتا ہے۔ وہ میں ہوں۔ آپ میرے بارے میں سوچیں نا۔''

نادرہ نے سر اُٹھا کر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں! آپ ہیں۔ اور میں آپ کے بارے میں سوچتی بھی ہوں۔ حالانکہ دو دن کا ہی تعلق ہے۔''

وہ عارف کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ پتھر کی جونک لگی تھی۔ وہ اعترافِ محبت کر رہی تھی۔

''اگر آپ کے بارے میں سوچتی نہ ہوتی تو فیصلہ کیا مشکل تھا۔ کل ہی سنا دیتی۔'' نادرہ نے اپنی بات پوری کی۔

''یہ میرے لئے بہت بڑی خوشی ہے۔ اب فیصلہ تو سنا دو۔'' عارف کے لہجے اور تخاطب میں بے تکلفی آ گئی۔

''آپ یہی کہتے ہیں نا کہ بے انصافی نہیں ہونی چاہئے۔''

''جی ہاں!''

"میرا خیال ہے کہ یہ فیصلہ بے انصافی کا نہیں۔"
عارف کی دھڑکنیں جیسے تھمنے لگیں۔
"اب خدا کے لئے کہہ بھی دو۔"
"میرا فیصلہ یہ ہے کہ میں تین مہینے اپنی دعا کی قبولیت کا انتظار کروں گی۔ اگر اس عرصے میں کوئی ارجمند کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے نہیں آیا تو میں آپ سے شادی کرلوں گی۔ پھر آپ جہاں لے جائیں گے، میں اور ارجمند آپ کے ساتھ وہاں جائیں گے۔"
خوشی سے عارف کی سانسیں رکنے لگیں، اسے مثبت جواب ملا تھا اور وہ بھی اپنی توقع کے برعکس۔ لیکن پھر اس کے دماغ میں ایک اندیشہ سرسرایا۔
"اور اگر اللہ نے ارجمند کے لئے کوئی نجات دہندہ بھیج دیا تو؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
نادرہ چند لمحے خاموش رہی۔ جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ جیسے کوئی نامعلوم سرگوشی سننے کے لئے سماعت پر زور دے رہی ہو۔ پھر بالآخر وہ بولی۔
"تب تین ماہ بعد اسی تاریخ کو اگر میں زندہ ہوئی تو خود کو آپ کے سپرد کردوں گی۔"
عارف چوکنا ہوگیا۔
"لیکن آپ خودکشی نہیں کریں گی۔"
"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ خودکشی تو حرام موت ہے۔"
عارف کو خیال آیا کہ نادرہ ہر روز ارجمند کے لئے کوٹھے سے یہ عافیت نجات اور اس کے ساتھ ہی اپنے لئے موت کی دعا کرتی رہی ہے۔ خودکشی تو وہ نہیں کرے گی۔ لیکن موت کی دعا......
"اب کہئے! اس فیصلے میں آپ کے ساتھ بے انصافی تو نہیں ہوئی؟"
"فیصلہ تو آپ کا منصفانہ ہے۔ لیکن ایک معاملے میں مجھے اختلاف ہے۔ اور اس کے علاوہ مجھے آپ سے ایک یقین دہانی بھی چاہئے۔" عارف نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"فرمائیے! میں ہر معقول بات پر غور کروں گی۔"
"پہلے یقین دہانی کے بارے میں بات کروں۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ اب آپ ایسی ویسی دعا کبھی نہیں کریں گی۔"
"یہ کیسے ممکن ہے کہ میں زندہ ہوں اور ارجمند کی بہتری کے لئے دعا نہ کروں۔"
"غلط سمجھیں آپ! میں نے کہا، ایسی ویسی دعا۔" عارف نے بڑے تحمل سے کہا۔
"ابھی ذرا دیر پہلے آپ نے بتایا تھا کہ آپ ہر روز دعا کرتی ہیں کہ ارجمند کو محفوظ کرتے ہی اللہ آپ کو موت دے دے۔ آپ وعدہ کریں کہ اب یہ دعا کبھی نہیں کریں گی۔"
نادرہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر سر کو یقینی جنبش دیتے ہوئے بولی۔
"میں وعدہ کرتی ہوں، اب ایسی دعا کبھی نہیں کروں گی۔"
"اب میں آپ کو اپنے اختلاف کے بارے میں بتاتا ہوں۔" عارف نے کہا۔
"وہ ہے مدت کے بارے میں۔ تین مہینے بہت زیادہ ہیں۔"
"جب فیصلہ غیر منصفانہ نہیں لگا تو پھر آپ اختلاف کیوں کر رہے ہیں؟" نادرہ نے اعتراض کیا۔
"میری بات معقول ہوئی تو آپ ترمیم کرلیں گی۔"
چند لمحے غور کرنے کے بعد نادرہ نے کہا۔
"ٹھیک ہے! لیکن اگر مجھے آپ کی بات معقول نہیں لگی، اور ظاہر ہے کہ آپ تو معقول سمجھ کر ہی کہیں گے......"
"مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔ آپ کے نزدیک وہ معقول نہیں ہوئی تو میں دست بردار ہو جاؤں گا۔"
نادرہ نے بڑی محویت اور محبت سے اسے دیکھا۔
"آپ سچ مچ بہت اچھے ہیں۔ چلئے، کہئے!"

''آپ کو اللہ پر بھروسہ نہیں ہے۔'' عارف نے پوچھا۔

''توبہ توبہ! اسی پر تو بھروسہ ہے مجھے۔''

''آپ یہ یقین نہیں رکھتیں کہ اس کے حکم پر پلک جھپکنے میں کچھ کا کچھ ہوسکتا ہے۔''

''کیوں نہیں؟ مجھے یقین ہے اس پر۔''

''تو پھر تین مہینے کی شرط کیوں؟ میرے حق میں تو یہ ظالمانہ فیصلہ ہے۔''

''بات آپ کی معقول ہے۔ تو آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''اسے ایک ہفتہ کر لیجئے۔''

''اتنے بڑے فیصلے کے لئے ایک ہفتے کی مدت بہت کم ہے۔''

''اللہ تو ایک پل میں ناممکن کو ممکن بنا دے۔ جس بات کی آپ دعا کرتی ہیں، وہ تو ناممکن بھی نہیں۔''

نادرہ اس سے نظریں چرانے لگی۔ درحقیقت اس نے ایسی بات کہی تھی کہ وہ اس وقت خود سے بھی نظریں چرا رہی تھی۔ ارے...... آدمی خاک بھروسہ کرتا ہے اللہ پر۔ اس نے دل میں سوچا۔

''اب کچھ کہیے بھی......''

عارف کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''ٹھیک ہے! اسے ایک ماہ کر لیتے ہیں۔''

''چلیں، منظور ہے۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا دیئے۔ پھر نادرہ اٹھنے لگی تو عارف نے اسے ٹوک دیا۔

''کہاں جا رہی ہیں؟''

''برتن سمیٹ لوں۔''

''کمال کرتی ہیں۔ یہاں بھوک سے برا حال ہے اور آپ کھانا اٹھا رہی ہیں۔''

نادرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''آپ تو کھا چکے تھے۔''

''خوف کی وجہ سے بھوک ہی اُڑ گئی تھی۔ مگر اب خوف دور ہونے کے بعد تو ایسی بھوک لگی ہے کہ بس۔ ایک بات بتائیں! آپ کو بھوک نہیں لگ رہی؟''

نادرہ نے غور کیا اور ہنس دی۔

''سچ...... ! بھوک تو مجھے لگ رہی ہے۔''

''بس تو آ جائیں۔''

''ٹھنڈا ہوگیا ہے۔ گرم کر لاؤں؟''

''اس کی ضرورت نہیں۔ اتنا انتظار نہیں ہوگا۔ ویسے بھی کھانا آپ نے بہت لذیذ بنایا ہے۔''

نادرہ بھی بیٹھ گئی۔ اس بار دونوں بڑی رغبت سے کھا رہے تھے۔

❁ ❁ ❁

اب وہ اس طرح گھل مل کر بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے کہ کوئی انہیں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

ارجمند کو تو معلوم تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ پھر بھی اسے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ اور وہ بہت خوش تھی۔ سامنے بیٹھ کر قریب سے دیکھنے پر عارف اسے اور زیادہ اچھا لگا تھا۔ وہ ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ رہی تھی، اور خوش ہو رہی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اور زیادہ اچھے لگ رہے ہیں۔ جیسے...... جیسے وہ ایک دوسرے کے لئے بنے ہوں۔

پھپھو نے اسے کھانا دیا تھا اور کہا تھا کہ کھانے کے بعد برتن باورچی خانے میں رکھ دے۔ وہ جانتی تھی کہ کون آیا ہوا ہے؟ اس لئے اس نے پھپھو سے اپنے ساتھ کھانے کو کہا بھی نہیں۔

''اور اس کے علاوہ تم کمرے سے باہر نہیں آؤ گی۔'' پھپھو نے کہا تھا۔

''چھپ کر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بری بات ہوتی ہے۔''

وہ اداس ہوگئی۔ اس سے ٹھیک سے کھایا بھی نہیں گیا۔ وہ یہی سوچتی اور کڑھتی رہی کہ پھپھو انہیں کوئی اچھا جواب نہیں دیں گی۔ یہ تو انہوں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا۔

کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ جائے اور جا کر دیکھے۔ لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ پھپھو کا حکم وہ کبھی ٹالتی نہیں تھی۔ مرضی کے خلاف بات بھی وہ مان لیتی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے پھپھو نے اسے چادر جتنا، بہت بڑا دوپٹہ دیا تھا، اور اوڑھنے کا طریقہ بھی بتایا تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا کہ اب وہ بغیر دوپٹے کے کبھی کمرے سے نہ نکلے، چاہے سب لوگ سو رہے ہوں۔ اور کمرے میں بھی صرف پھپھو کی موجودگی میں ہی وہ بغیر دوپٹے کے رہ سکتی تھی۔ اسے دوسری عورتوں کے سامنے بھی اس طرح دوپٹہ اوڑھنا تھا، اور یہ پھپھو کا حکم تھا۔

اسے وہ دوپٹہ بہت بھاری، بہت بڑا بوجھ لگتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جیسے اس کی آزادی سلب کر لی گئی ہے اور اسے اس دوپٹے میں قید کر دیا گیا ہے۔ وہ دوپٹہ اسے ایک تنگ کوٹھری لگتا تھا۔ لیکن پھپھو کا حکم وہ ٹال نہیں سکتی تھی۔ اور پھپھو نے کہا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کہتی ہیں، اس کی بہتری کے لئے کہتی ہیں اور ارجمند کو پھپھو کی ہر بات پر یقین تھا۔ پھپھو کبھی جھوٹ نہیں بولتی تھیں۔

سو وہ کمرے میں اکیلی اداس بیٹھی یہی سب کچھ سوچ رہی تھی۔ اکیلی ہونے کے باوجود اس نے بڑے سلیقے سے دوپٹہ اوڑھ لیا، شاید خود کو یہ یاد دلانے کے لئے کہ پھپھو کا حکم چاہے اس کی مرضی کے خلاف ہو، اسے ہر حال میں ماننا ہے۔ وہ اندر ہی اندر جھنجلا رہی تھی۔

اسی وقت پھپھو کمرے میں آگئیں۔

"کھانا کھا لیا تم نے؟"

ان کی آواز اور لہجے میں تازگی اور ایک نئی اور انوکھی سی خوشی تھی۔ جس نے ارجمند کو سر اٹھا کر حیرت سے انہیں دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ یہ آواز اور یہ لہجہ تو اس نے دہلی میں اپنے گھر کے بعد آج سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

اس نے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ پھپھو کے چہرے پر ایسی روشنی تھی کہ وہ

جگمگا رہا تھا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟"

"کیا پھپھو!" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"کھانا کھا لیا تم نے؟"

"جی پھپھو! کھا لیا۔"

"تو چلو میرے ساتھ!"

"کہاں پھپھو؟"

"میں تمہیں عارف سے ملواؤں گی۔"

ارجمند کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"سچ پھپھو!"

"ہاں بھئی! کیا میں تم سے مذاق کر رہی ہوں۔"

وہ خوشی سے ہڑبڑا کر اٹھی تو دوپٹہ اس کے سر سے ڈھلک گیا۔

"ٹھیک سے دوپٹہ لو سر پر۔" پھپھو نے تنبیہ لہجے میں کہا۔

اور اب وہ بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی اور ان کی باتیں سن رہی تھی۔ پھپھو جس طرح باتیں کر رہی تھیں، ان سے نہیں لگتا تھا کہ انہوں نے شادی سے انکار کیا ہوگا۔ اور یہ اس کے لئے بڑی خوشی کی بات تھی۔

"آپ کی پھپھو نے مجھے بتایا کہ آپ ڈرائنگ بہت اچھی کرتی ہیں۔"

عارف اس کی طرف اچانک مڑا۔

"جی..... وہ یوں ہی....." ارجمند گڑبڑا گئی۔

"مجھے لا کر تو دکھائیں ذرا۔"

"ارے..... چھوڑیں نا، آپ بھی....." اس بار نادرہ بوکھلائی تھی۔

"نہیں بھئی.....! مجھے تو دیکھنی ہے۔ اچھی لگی تو بہت خوب صورت تحفہ دوں گا بیٹا کو۔"

نادرہ منع تو نہیں کر سکی۔ لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے ارجمند کو تنبیہ کر دی۔

ارجمند سمجھ گئی کہ اس کی ڈرائنگ کی کاپیوں میں سب سے زیادہ تصویریں تو شہزادے کی ہیں۔ پھپھو نہیں چاہتیں کہ وہ انہیں دکھائے اور پھر شہزادے کے بارے میں بات کرے۔

"لائیے نا بیٹا! میں وہ دیکھے بغیر تو نہیں جاؤں گا یہاں سے۔" جملے کا دوسرا حصہ عارف نے نادرہ سے کہا تھا۔

نادرہ مجبور ہوگئی۔

"لے آؤ ارجمند!" اس نے کہا۔ مگر اس کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

ارجمند سمجھ گئی کہ اسے شہزادے کے بارے میں بات بالکل نہیں کرنی۔

وہ اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

نادرہ اب نروس ہو رہی تھی۔ نہ جانے ارجمند کیا کہے، اور عارف کیا سمجھے؟ مگر اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ گھبراہٹ چھپانے کے لئے اس نے عارف سے پوچھا۔

"کیا تحفہ دیں گے آپ ارجمند کو؟"

"یہ کیوں بتاؤں میں؟"

"چلیں، نہ بتائیں۔"

"یہ بات ہے تو بتا دیتا ہوں۔" عارف نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ایک انگریز نے مجھے ایک نہایت شان دار اسکیچ بک اور بہت ہی اچھا واٹر کلر باکس دیا تھا۔ میرے تو کسی کام کا ہے نہیں۔ وہ میں بیٹا کو دوں گا تو وہ خوش ہو جائے گی۔"

ادھر اپنے کمرے میں ارجمند اپنی ڈرائنگ کی تمام کاپیوں کو چیک کر رہی تھی۔ بڑی تلاش کے بعد اسے ایک ایسی کاپی مل گئی، جس میں شہزادے کی تصویریں قدرے کم تھیں۔ کچھ بازار کے مناظر بھی تھے۔ وہ اس کاپی کو لے کر نکل آئی۔

کاپی لاکر اس نے بڑے ادب اور احترام سے عارف کو دی۔ اسے احساس تھا کہ پھپھو اسے بری طرح گھور رہی ہیں۔ لیکن اسے نظریں اٹھانے کی

جرأت نہیں ہوئی۔ دل ہی دل میں وہ خود کو محتاط رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔

عارف نے کاپی کھولی اور پہلی ہی تصویر کو دیکھ کر جیسے بت بن گیا۔ کافی دیر خاموشی رہی۔ پھر عارف نے ارجمند کو دیکھا، جو نظریں جھکائے کھڑی تھی۔

"یہ تصویر تم نے بنائی ہے؟ یقین نہیں آتا؟" بالآخر اس نے کہا۔

"یہ میری سب سے خراب ڈرائنگ کی کاپی ہے۔" ارجمند نے نظریں اٹھائے بغیر بڑی سچائی سے کہا۔ جس کاپی میں شہزادے کی تصویریں سب سے کم ہوں، وہ تو سب سے خراب کاپی ہی ہوگی۔

"یہ خراب ہے تو پھر اچھی کیسی ہوگی؟"

ارجمند کی نظریں بے ساختہ اٹھیں تو اس نے نادرہ کو خود کو گھورتے پایا۔

"جی! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ یہ میری سب سے پہلی کاپی ہے نا، اور ابھی تو میں بچی ہوں نا۔"

"کون کہہ سکتا ہے یہ بات؟" عارف نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور ورق الٹا۔

پوری کاپی کا جائزہ لینے کے بعد عارف نے کہا۔

"اس میں ایک آدمی ہے، جو تم نے بار بار بنایا ہے۔"

"یہ اچھے لگے تھے نا، اس لئے بار بار بن جاتے ہیں خود بخود۔" ارجمند کے منہ سے نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اسے پھپھو کی نظریں اپنے جسم کو چھیدتی محسوس ہونے لگیں۔

"ہاں! چہرے پر شرافت اور معصومیت ہے۔" عارف نے کہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔

"لیکن اس بیک گراؤنڈ میں مس فٹ لگ رہا ہے۔"

ارجمند کی سمجھ میں اس کی دوسری بات نہیں آئی۔ لیکن پھپھو کی نظروں کی گرمی کم کرنے کے لئے اس نے کہا۔

"میں نے زیادہ لوگ دیکھے کہاں ہیں، اس لئے بار بار......"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔" عارف نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

''لیکن اب میری تصویر تو بنا سکتی ہو نا؟''

''جی! ضرور بناؤں گی۔''

''بس! اب تم جاؤ۔'' نادرہ نے کہا۔

عارف نے کاپی ارجمند کی طرف بڑھائی۔

''تمہارا تحفہ پکا ہوا۔ کل دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔''

''آپ کی عنایت ہوگی۔'' ارجمند نے کہا اور کاپی لے کر کمرے سے نکل گئی۔

''بہت پیاری، ذہین اور تمیزدار بچی ہے۔'' عارف نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''بس اس کی طرف سے پریشان رہتی ہوں۔ اللہ اسے اپنی امان میں رکھے۔''

''انشاء اللہ یہ اللہ کی امان میں ہی رہے گی۔ اور انشاء اللہ اس کے نصیب بھی اچھے ہوں گے۔''

''بس! تو اب یہ طے ہوگیا کہ آپ اگلے ماہ کی سترہ تاریخ کو یہاں آئیں گے۔ دیکھیں، اللہ کیا فیصلہ کرتا ہے؟'' نادرہ نے کہا۔

''تو کیا میں درمیان میں یہاں نہیں آ سکتا؟'' عارف کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی نہیں......! سترہ تاریخ سے پہلے آپ یہاں ہرگز نہیں آئیں گے۔''

''یہ تو زیادتی ہے۔''

''اس معاملے میں اختلاف مجھے گوارا نہیں۔'' نادرہ کا لہجہ سخت ہوگیا۔

''مگر ایک بات اور ہے۔'' عارف جیسے سہم گیا۔

''فرمائیے!'' نادرہ کے لہجے میں اب بھی سختی تھی۔

''ایک...... ایک کرتا...... ایک جوڑا میرے لئے بھی سی دیں۔''

نادرہ کے چہرے پر ایک دم نرمی چھا گئی۔ پھر وہ بولی تو اس کا لہجہ بھی ریشم سا تھا۔

''ایک نہیں! انشاء اللہ سترہ تاریخ کو دو جوڑے ملیں گے آپ کو۔''

عارف کھل سا گیا۔

''ٹھیک ہے، میں کل کپڑا لیتا آؤں گا۔''

''کل؟ میں نے کہا، اب آپ سترہ تاریخ کو ہی یہاں آئیں گے۔''

''دیکھئے! کل تو آنا ہی ہوگا مجھے۔ ارجمند بیٹی کا تحفہ بھی لانا ہے۔ اور مجھے اس سے اپنی تصویر بھی بنوانی ہے۔ اس سے تو آپ مجھے نہیں روک سکتیں۔''

''چلئے، ٹھیک ہے۔'' نادرہ نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔

''لیکن کپڑا لانے کی ضرورت نہیں۔''

''تو پھر؟''

''وہ میں منگوا لوں گی اپنی مرضی سے۔ یہ آپ کے لئے تحفہ ہوگا میری طرف سے۔'' یہ کہتے کہتے نادرہ کے لہجے میں شرمیلا پن آ گیا۔

برسوں کے بعد اس نے خود کو ایک الہڑ اور نوخیز لڑکی کی طرح محسوس کیا تھا۔

''زہے نصیب!'' عارف مسکرایا۔

''تو ناپ تو لے لیجئے۔''

نادرہ نے ایک لمحے کو نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور فوراً ہی نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ آپ کو کسی طرح کی شکایت نہیں ہوگی۔''

''چھوٹا بڑا ہوا تو ٹھیک بھی آپ سے ہی کراؤں گا۔''

''انشاء اللہ ایسا ہوگا ہی نہیں۔'' نادرہ نے بڑے یقین سے کہا۔ پھر کچھ خیال آنے پر بولی۔

''اور ہاں! کل صبح ہی آئیے گا۔''

''میں تو جانا ہی نہیں چاہتا۔'' عارف نے کہا، پھر شوخ لہجے میں بولا۔

''کھانا بچانا چاہتی ہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔''

''تو پھر صبح سات بجے آ جاؤں؟''

''یہ سروچشم، ہم تو فجر کے وقت اُٹھنے والے ہیں۔''

دونوں بات سے بات نکال رہے تھے۔ دونوں ہی رفاقت کے ان لمحوں کو طول دینا چاہ رہے تھے۔ لیکن جدائی تو طے تھی۔ عارف کو گھٹن محسوس ہونے لگی تو وہ خود ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب میں چلتا ہوں نادرہ!''

❁ ❁ ❁

ارجمند کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ سحرزدہ سی اس بہت بڑی اسکیچ بک اور کلر باکس کو دیکھے جا رہی تھی۔ دونوں چیزیں بہت خوب صورت تھیں۔ اسکیچ بک کے بارے میں تو وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ ایسی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ ڈرائنگ کی کاپی سے آگے تو اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔

عارف اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا گڑیا! اچھا نہیں لگا یہ تحفہ آپ کو؟''

''جی...... جی...... بہت خوب صورت ہیں دونوں چیزیں۔''

''آپ کچھ بول ہی نہیں رہی تھیں۔ میں سمجھا......''

''میں لفظ ڈھونڈ رہی تھی، شکریہ ادا کرنے کے لئے۔''

''نہیں ملے نا؟'' عارف نے ہنس کر کہا۔

ارجمند نے کچھ کہا نہیں۔ نفی میں سر ہلا دیا۔

''ملیں گے بھی نہیں۔ لیکن میں آپ کو شکریہ ادا کرنے کا بہت اچھا طریقہ بتا سکتا ہوں۔''

ارجمند نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''اس اسکیچ بک میں آپ سب سے پہلے میری تصویر بنا دیجئے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ آپ نے میرا شکریہ ادا کر دیا۔'' عارف نے کہا۔ پھر بولا۔

''ویسے شکریہ کی ضرورت ہے نہیں۔ کیونکہ یہ تو وعدے کے مطابق آپ

کا انعام ہے۔''

ارجمند جو اس کی فرمائش سن کر بوجھل ہو گئی تھی، دوسری بات سن کر خوش ہو گئی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس خوب صورت اسکیچ بک میں پہلی تصویر وہ اپنے شہزادے کی نہ بنائے۔ پھر بھی اس نے بات بنانے کے لئے کہا۔

''آپ کی تصویر تو میں ضرور بناؤں گی۔ لیکن پہلے کاپی میں بناؤں گی۔ بعد میں اسے اسکیچ بک میں منتقل کر لوں گی تاکہ کچا پن نہ رہے۔''

''جیسی آپ کی مرضی! مگر تصویر آپ کو آج ہی بنانی ہوگی۔ کیونکہ پھر میں ایک ماہ بعد آؤں گا۔''

نادرہ نے اب تک کچھ نہیں کہا تھا۔ خاموشی سے دیکھتی اور سنتی رہی تھی۔

ارجمند نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بولی۔

''مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو؟ یہ تو تمہاری اور ان کی بات ہے۔''

''ایک بات کہوں اچھی پھپھو! آپ خفا تو نہیں ہوں گی؟'' ارجمند نے بڑی لجاجت سے کہا۔

''کہو گڑیا!''

''آپ ان کے ساتھ اس والے صوفے پر بیٹھ جائیں۔ میں دور اس کھڑکی سے آپ کو دیکھ کر تصویر بنا لوں گی۔''

عارف تو خوش ہو گیا۔ لیکن نادرہ بھڑک گئی۔

''میں اس بیچ میں کہاں سے آ گئی؟''

''وہ تو آپ پہلے ہی سے ہیں۔'' ارجمند کے بجائے عارف نے کہا۔

''تصویر تمہیں ان کی بنانی ہے۔'' نادرہ نے ارجمند پر آنکھیں نکالیں۔

ارجمند کو اس لمحے پھپھو بہت اچھی، بہت خوب صورت لگیں۔ پرانی جیسی، دہلی والی پھپھو۔ اس نے ایک لمحے کو آنکھیں موند لیں، جیسے نادرہ کے اس عکس کو محفوظ کر رہی ہو۔ کیسی گلابی ہو گئی ہیں پھپھو۔ اس نے دل میں سوچا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

''آپ ناراض نہ ہوں اچھی پھپھو!'' آپ دونوں کی تصویر بہت اچھی

بنے گی۔“

”اور کیا، مجھ اکیلے کی تصویر کیا خاک اچھی بنے گی۔“ عارف نے ٹکڑا لگایا۔

”دیکھا .....! یہ بدتمیزی کی ہے تم نے۔“ نادرہ نے ارجمند کو ڈانٹا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ ارجمند روہانسی ہوگئی۔

”کیوں بچی کو پریشان کر رہی ہیں آپ! میں نے تو مذاق میں کہی تھی یہ بات۔“

نادرہ کہنا چاہتی تھی کہ ساتھ بیٹھنا کیوں ضروری ہے۔ دونوں سامنے بیٹھے ہوں، تب بھی تصویر بن سکتی ہے۔ لیکن وہ بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ارجمند کھسیا رہی ہے۔ اور وہ اس کا دل میلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔

”لیکن یہ بتاؤ، دیر کتنی لگے گی۔“

ارجمند کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”دیر کیا اچھی پھپھو! دس منٹ بھی نہیں لگیں گے۔“

”صرف دس منٹ!“ عارف نے حیرت سے کہا۔

”اس سے بھی کم، دیکھیں نا، میں بس خاکہ ہی تو اتاروں گی۔ پھر باقاعدہ تصویر تو اپنے کمرے میں جا کر بناؤں گی۔ آپ باتیں کرتے کرتے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھیں گے تو میں غائب ہوں گی۔“

اور واقعی، باتیں کرتے کرتے انہوں نے ایک ساتھ کھڑکی کی طرف دیکھا تو ارجمند وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ دونوں ہنسنے لگے۔

”آپ ہنستے ہوئے بہت اچھی لگتی ہیں۔“ عارف نے کہا۔

”تو کیا میں ہنسی تھی؟“ نادرہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”آپ کو نہیں پتا؟“

”بے خیالی میں ہوا ہوگا۔ ورنہ ہنسنا تو میں بھول چکی ہوں۔“

”میرے ساتھ رہیں گی تو سب اچھی باتیں یاد آجائیں گی۔“

”دیکھیں گے عارف صاحب! ہم نے تو کھلے آسمان کے نیچے تیز ہوا میں دیا جلایا ہے۔“

”ایسی اداس باتیں نہ کریں۔ مجھے پورا ایک مہینہ گزارنا ہے۔ اور وہ بھی پل پل کر کے۔ آپ کے پاس تو مصروفیت بھی ہوگی۔ ارجمند بھی ہوگی اور اچھو میاں بھی۔ میرے پاس تو اس انتظار کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جو اکیلے ہونے کی وجہ سے طویل تر لگے گا۔ ایک ایک لمحہ برس کی طرح گزرے گا میرا۔“

”اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اس انتظار کا کوئی حاصل بھی ہے یا نہیں۔“ نادرہ نے بے رحمی سے کہا۔ شاید اس طرح وہ اپنے اندر موجود بے یقینی کی اذیت سے لڑ رہی تھی۔

”پلیز نادرہ! ایسی باتیں نہ کریں۔“ عارف اب فریاد کر رہا تھا۔

”تو پھر کیا کروں؟“

”میری مدد کریں۔“

”کس طرح؟“

”اس ایک ماہ کی مسافت کے لئے مجھے کوئی زادِ راہ دے دیں۔“

”میرے پاس ہے ہی کیا؟ میں کیا دے سکتی ہوں آپ کو؟“ نادرہ نے اداسی سے کہا۔

”اتنا تو کہہ سکتی ہیں کہ آپ بھی مجھ سے محبت کرتی ہیں۔“

”کیسے کہہ دوں۔ میرے پاس نہ محبت کی اہلیت ہے اور نہ ہی حق۔“

”اور ایک ماہ بعد.....؟“

”دیا روشن رہا تو آپ کو انشاء اللہ سب کچھ ملے گا۔“ نادرہ نے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔

”جھوٹ میں نہیں بولتی۔ فی الوقت تو محبت کرنے کا حق مجھے نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔ بہت زیادہ۔“

”شکریہ! مجھے زادِ راہ مل گیا۔“ عارف نے خوش ہو کر کہا۔

پھر ایک ماہ کے لئے جدا ہونے کا کڑا وقت آ گیا۔ نادرہ اور ارجمند نے دروازے پر عارف کو خدا حافظ کہا۔ اچھو میاں اسے چھوڑنے کے لئے باہر آ گئے۔

کچھ سوچ کر نادرہ کوٹھے پر چلی گئی۔ اسے عارف پر ترس آ رہا تھا۔ وہ تیس دن اس کے لئے درحقیقت بہت سخت ہوں گے۔ اس نے سچ کہا تھا کہ وہ اپنے انتظار میں اکیلا ہوگا۔ سو وہ اسے جاتے جاتے کچھ اور دینا چاہتی تھی۔ کوئی دید، اوہ ہو سکتا ہے، یہ آخری دید ہو۔ اس نے اداسی سے سوچا۔

وہ کوٹھے پر کھڑی عارف کو اچھو میاں کے ساتھ جاتے دیکھتی رہی۔ دل میں پکارتی رہی۔ ایک بار تو پلٹ کر دیکھ لو۔ پھر کون جانے ...... کون جانے ......

اور بالآخر عارف نے پلٹ کر اسے دیکھا، جیسے وہ پکار اس تک پہنچ گئی ہو۔ وہ مسکرایا اور چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ پلٹ کر چل دیا۔

''الوداع میری آخری محبت۔'' نادرہ نے سرگوشی میں کہا۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

جب تک عارف نظر آتا رہا، وہ کوٹھے پر کھڑی رہی۔ پھر پلٹ آئی۔

❁ ❁ ❁

نور بانو کو ان دنوں ایک اور پریشانی لاحق ہوگئی تھی اور اس کا سبب بھی حمیدہ ہی تھی۔ یہ تو ہمیشہ سے تھا کہ وہ ملازموں سے نچلے طبقے کے لوگوں سے گھل مل کر بات کرتی تھی لیکن ان دنوں وہ نسیمہ اور اس کی بچیوں سے کچھ زیادہ ہی گھل مل گئی تھی۔ بلکہ اس نے انہیں زیادہ ہی سر چڑھا لیا تھا۔ اب نسیمہ کو ساتھ لے کر یعقوب کے ساتھ گاڑی لے کر نکل جانا روز کا معمول بن گیا تھا اور انہوں نے اسے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہاں کہاں جا رہی ہیں۔

یہ سوچتے ہوئے نور بانو کو احساس ہوا کہ اس کا ایک دکھ تو نہیں۔ یہ دکھ تو اور بڑا تھا کہ اماں اب اسے اپنا نہیں سمجھتی۔ سمجھتیں تو اسے ساتھ لے کر جاتیں۔ نہ جاتیں تو بھی اسے بتاتیں تو کہ کہاں جا رہی ہیں۔

وہ اندر ہی اندر جھنجلاتی، مٹھیاں بھینچتی، غصہ کرتی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سلسلے میں کیا کرے۔ یہ حقیقت اس نے بہت پہلے تسلیم کر لی تھی

کہ عبدالحق پوری طرح اس کا اسیر ہے۔ لیکن اماں کے مقابلے میں کبھی اس کا ساتھ نہیں دے گا۔ یعنی اسے حمیدہ سے تصادم سے ہر حال میں پہنچا ہے۔ یہ بات ویسے ہی اس کے لئے سوہانِ روح تھی کہ حمیدہ اس کی مکمل اقتدار کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اور اب بڑھیا کی یہ من مانیاں، اس کے اندر نفرت امنڈنے لگی۔ نہ جانے کتنے عرصے اور جیے گی یہ۔

حمیدہ اپنے مسئلے میں اس بری طرح الجھی ہوئی تھی کہ اسے نور بانو کے غصے کا بھی پتا نہیں چلا۔ ورنہ نور بانو تو اپنے اندر کا حال چھپانے پر قادر ہی نہیں تھی۔ خاص طور پر غصہ اور نفرت کہ اس کے چہرے پر فوراً غصے اور نفرت کی تحریر اُبھر آتی تھی۔ اور حمیدہ تو ویسے بھی نور بانو کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ تو سامنے کی بات تھی، وہ تو اس کے اندر کا حال بھی جان لیتی تھی۔ وہ تو جیسے اس کے اندر اتر کر اسے دیکھ لیتی تھی۔

مگر کب تک؟ آخر ایک دن اسے پتا چل ہی گیا۔

اس روز سر میں کچھ بھاری پن تھا، ہلکا سا درد بھی تھا۔ اس نے نور بانو کو آواز دے لی۔ وہ آئی تو اس نے کہا۔

''دھیے! ذرا میرے سر میں تیل تو لگا دے۔''

نور بانو خاموشی سے تیل کی شیشی لینے چلی گئی۔ لیکن یہ غیر معمولی بات تھی کہ نہ اس نے بلائے جانے پر اس سے پوچھا تھا کہ کیا بات ہے اماں! اور نہ تیل لگانے کی فرمائش پر کچھ کہا تھا۔

نور بانو آئی تو حمیدہ نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ جو کچھ نظر آیا، اسے دیکھنے کے لئے تو ایک نگاہ ہی کافی تھی۔

پھر سر پر تیل ملتے ہوئے بھی اس کی بے دلی کا صاف پتا چل رہا تھا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ پھر حمیدہ نے کہا۔

''تو مجھ سے ناراض ہے دھیے!''

''میں کیوں ناراض ہونے لگی؟ میرا ایسا کیا حق ہے آپ پر؟''

حمیدہ نے جان لیا کہ آتش فشاں پھٹنے کو تیار ہے۔

"تو بیٹی ہے میری، میں نے کبھی بہو نہیں سمجھا تجھے۔"

"مجھ سے اچھی تو نوکرانیاں ہیں، جن میں گھسی رہتی ہیں آپ۔" نور بانو نے تنک کر کہا۔

"مجھے تو کئی کئی دن پوچھتی تک نہیں۔"

"تو بیٹی ہے، مجھے پوچھنا، میرا خیال رکھنا تیرا کام ہے، نہ کہ میرا۔ اب میں نے آواز دے کر بلایا اور سر میں تیل لگانے کو کہا تو یہ تو تجھے خود ہی پوچھنا تھا مجھ سے۔ اور تو مجھ سے شکایت کر رہی ہے۔" حمیدہ نے محبت سے کہا۔

"یہ بات آپ کی ٹھیک ہے۔" نور بانو کا لہجہ نرم ہو گیا۔

"لیکن آپ تو نوکرانیوں کو بیٹی پر فوقیت دیتی ہیں۔"

"توبہ توبہ! بیٹی تو بیٹی ہوتی ہے۔" حمیدہ نے کہا۔ پھر بولی۔

"ایک بات بتا! تو اپنی ماں سے بھی ایسے ہی ناراض ہوتی تھی؟"

نور بانو کے تیل لگاتے ہوئے ہاتھ رُک گئے۔ وہ جیسے اپنی دہلی کے گھر میں پہنچ گئی۔

"آپ کے نزدیک میں تو جیسے آپ کی بیٹی ہی نہیں۔" وہ امی سے تلخ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"میں تو نوکرانی ہوں اس گھر کی۔ یہ کر لو، وہ کر لو، یہ کیا کر دیا، تم تو پھوہڑ ہو، بے ڈھنگی ہو۔"

"اے ہے! ایسا کب کہا میں نے؟" امی کے لہجے میں حیرت اور فریاد تھی۔

مگر وہ جب بولتی تھی ایسے میں تو سنائی کچھ نہیں دیتا تھا اور اندر کا ملغوبہ پوری طرح نکالے بغیر رکتی ہی نہیں تھی۔ اس کی زبان چلتی رہی۔

"اور محبت کے لئے یہ دونوں ہیں، حسین و جمیل مہرباں آپ کی۔ مجھے تو آپ نے شاید کسی سے لے کر پال پوس لیا ہے ہمدردی میں۔"

"توبہ توبہ! اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں کسی کے لئے سب سے دعا کرتی ہوں۔" امی نے آسمان کی طرف رخ کر کے جیسے گواہی مانگی۔

"لیکن محبت تو نہیں کرتیں نا؟"

"پتا نہیں! تو محبت کسے سمجھتی ہے؟ اور کیسی محبت چاہتی ہے؟"

"جو صرف میرے لئے ہو، جس میں کوئی شریک نہ ہو۔"

"ایسی محبت میرے اختیار میں ہوتی تو اپنے اللہ سے نہ کرتی۔ تجھ جیسی چڑیل اور جل ککڑی سے کرتی، جو اپنی بہنوں تک سے جلتی ہے۔" امی نے غضب ناک ہو کر کہا۔

ہاتھ کو رکے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ اور نور بانو کا چہرہ حمیدہ کو نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تو کہاں کھو گئی دیبے!" اس نے پوچھا۔

"اپنے گھر چلی گئی تھی اماں!" نور بانو نے بہت آہستہ سے، نرم لہجے میں کہا۔

"تو نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔"

"وہ سچ ہی تو ڈھونڈ رہی تھی اماں!"

"تو پھر ملا؟"

"ہاں اماں!"

"مجھے بھی بتا۔"

"میں امی سے اس سے بھی زیادہ ناراض ہوتی تھی۔"

"تو پھر اور ناراض ہوا کر مجھ سے۔" حمیدہ نے شفقت سے کہا۔

"مجھے اپنی امی سے کم نہ سمجھا کر۔"

کچھ دیر کے لئے حمیدہ کی محبت نے نور بانو کے دل کے اس غبار کو دھو ڈالا۔

"لیکن اماں! نوکرانیوں کو اتنا سر نہیں چڑھانا چاہئے۔"

"میری بات سن دیبے! دیکھو ہوتے تو سبھی انسان ہیں نا، اور انسان تو سبھی برابر ہوتے ہیں۔"

"لیکن اماں! فرق تو پھر بھی ہوتا ہے۔ چھوٹے آدمی کی سوچ بھی چھوٹی

ہوتی ہے۔"

"نا دھیے! یہ فرق بھی رب نے ڈالا ہے۔ اس میں آزمائش بھی ہے اور یہ یاد دلانا بھی ہے کہ غنی صرف اللہ ہے۔ بندے تو محتاج ہیں۔ اللہ کے تو ہیں ہی، ایک دوسرے کی بھی ہیں۔"

"واہ اماں! کیسی بات کی آپ نے۔ اب بھلا بادشاہ کو کیا محتاجی ہو سکتی ہے؟"

"ہوتی ہے۔" حمیدہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"رعایا کے بغیر بادشاہت کیسی؟ اگر اللہ نے انسانوں میں سے ہی نوکر چاکر، خدمت گار نہ بنائے ہوتے تو بادشاہ کو بادشاہ کون کہتا۔ اور کہتا بھی تو بادشاہت کا کیا فائدہ ہوتا۔ اپنے محل میں خود جھاڑو لگاتا ہوا بادشاہ کیسا لگتا؟ اور دنیا کا نظام کیسا چلتا۔ اناج کون اگاتا۔ تجارت کون کرتا۔ لوگوں کی ضرورتیں کیسے پوری ہوتیں۔ اسی لئے اللہ نے ہر ایک کو اس کا اپنا ایک مقام دیا۔ لیکن ہیں تو سب برابر۔ اللہ کے ہاں تو بڑا وہ ہے جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔ چاہے دنیا میں وہ نوکر ہی ہو۔ ظالم اور مغرور بادشاہ بھی اللہ کے ہاں چھوٹا ہوگا۔ تو دھیے! نوکروں سے بھی عزت سے بات کرنی چاہئے۔ ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ قیامت کے دن اللہ ان کے بارے میں بھی پوچھے گا اور پھر اللہ جب چاہے، فقیر کو بادشاہ بنا دے۔ تو کبھی فقیر کی بے عزتی جس نے کی ہوگی، وہ فقیر کے بادشاہ بننے کے بعد اسے جھک کر سلام کرے گا تو اسے کیسا لگے گا۔ اس لئے سب سے عزت سے بات کرنی چاہئے۔"

"لیکن اماں......!"

"دیکھ دھیے! میرے وصال دین کا ابا بھی کمی تھا۔ پر اللہ نے اسے عزت دی۔ اس کا کرم ہے کہ آج میں مالکن ہوں۔ ورنہ میں تو نوکرانی تھی۔"

"میں یہ تو نہیں کہہ رہی ہوں اماں! کہ نوکروں کی بے عزتی کرو۔ میں تو بس سر چڑھانے کے خلاف ہوں۔"

"تو سر کون چڑھاتا ہے؟"

"آپ ہر وقت نسیمہ سے بات کرتی ہیں۔ روز اسے گاڑی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتی ہیں اور کیا ہوتا ہے سر چڑھانا؟"

حمیدہ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

"تو یہ ہے تیرے خیال میں سر چڑھانا؟"

"تو اور کیا؟"

"ایک بات بتا! کبھی تو نے نسیمہ کو مجھ سے بدتمیزی کرتے دیکھا؟"

"نہیں!"

"کبھی تجھ سے بدتمیزی کی اس نے؟"

"نہیں اماں!"

"تو پھر وہ سر چڑھی کہاں سے ہوگئی؟ کبھی دیکھے بھی ہیں سر چڑھے نوکر۔ برابری کرنے لگتے ہیں۔"

"پر روز روز اسے گاڑی میں لے کر جانا......"

"وہ تو اپنی غرض ہے نا، یہ تو اس کا احسان ہے کہ وہ جاتی ہے میرے ساتھ۔" حمیدہ نے آہ بھر کر کہا۔

نوربانو کا تجسس بھڑک اُٹھا۔

"آپ کی کیا غرض ہے اس سے؟"

"جانے دے اس بات کو۔ یہ میں نہیں بتا سکتی۔"

"آپ نے کبھی مجھ سے ساتھ چلنے کو نہیں کہا اماں!" نوربانو نے شکایت کی۔

"آپ نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اس طرح آپ نسیمہ کی نظر میں مجھے حقیر کر رہی ہیں۔"

"جب نسیمہ نے تجھ سے کبھی بدتمیزی نہیں کی تو پھر تو یہ بات کیسے کہہ سکتی ہے؟"

"لیکن اماں! آپ نسیمہ کو چھوڑ کر مجھے ساتھ لے جا سکتی تھیں۔"

"نہیں لے جا سکتی نا!" حمیدہ نے پھر آہ بھری۔

"کیوں نہیں لے جاسکتیں؟"

"تجھے اچھا نہیں لگے گا، اس لئے، تیری ہی تو فکر کرتی ہوں ہر طرح سے۔"

"اچھا! مجھے یہ تو بتا دی کہ جاتی کہاں ہیں آپ؟"

"کوئی ایک در تھوڑی ہے۔"

نوربانو کو اندازہ ہوگیا کہ حمیدہ اسے کچھ نہیں بتائے گی۔ خود اس نے سوچنا چاہا تو وہ اسے ایسی الجھی ہوئی ڈور لگی، جس کا سرا ڈھونڈے سے بھی نہ ملے۔

تاہم کچھ اہم اشارے تو اسے مل گئے تھے۔ حمیدہ نے کہا تھا کہ غرض اپنی ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ کوئی ایسی جگہ ہوگی، جہاں اس کا جانا معیوب لگے گا۔ تبھی تو حمیدہ نے کہا کہ تجھے اچھا نہیں لگے گا۔ تیسری بات یہ کہ وہ کوئی ایک خاص مقام نہیں۔ بلکہ حمیدہ نے تو ایک طرح سے اسے در در بھٹکنا قرار دیا تھا۔

تو کیا ایسا ہے کہ حمیدہ کو کوئی خطرناک مرض لاحق ہوگیا ہے؟

نوربانو کا دل جیسے اُچھل پڑا۔ شاید کانٹا نکلنے والا ہے۔

اس امکان پر اس نے جتنا سوچا، اتنا ہی اس کا یقین بڑھتا گیا۔ ضرور یہی بات ہے۔ اور یقیناً بڑی بات ہے۔ ورنہ حمیدہ تقریباً ہر روز یوں گھر سے نہ نکلتی، اور رہا سوال یہ کہ وہ کہاں جاتی ہے، تو حمیدہ نے خود ہی کہا تھا کہ وہ در در پھرتی ہے۔ تو یقیناً وہ حکیموں، ویدوں اور سنیاسیوں کے لئے پھرتی ہوگی۔ اب یہ ایسی جگہیں تو نہیں جہاں وہ اسے ساتھ لے جا سکے۔ تو پھر وہ نسیمہ ہی کو تو لے کر جائے گی۔

تمام کڑیاں مل گئی تھیں۔ نوربانو مطمئن ہوگئی۔

ایک اور بات اس کی سمجھ میں آئی۔ جس بیماری میں حمیدہ مبتلا ہے، وہ کوئی عام بیماری نہیں، بلکہ وہ ایسی بیماری ہے کہ وہ اس کے بارے میں عبدالحق کو بھی نہیں بتانا چاہتی۔

چلو، جو بھی ہے، کچھ امکان تو ہے۔ نوربانو نے بڑی بے رحمی سے

سوچا۔ وہ جانتی تھی کہ حمیدہ کی زندگی میں تو اس کا اقتدار بھی مکمل نہیں ہوگا۔ اس کا اور حمیدہ کا رشتہ تو چاند سورج کا رشتہ ہے۔ دن کے وقت، سورج کی روشنی میں چاند بھلا کہاں نظر آتا ہے۔ اسے تو بس رات کو ہی موقع ملتا ہے چمکنے کا۔

❁ ❁ ❁

مقابلے کے امتحان کی تیاری ہی گم ہونے کے باوجود عبدالحق کو احساس ہوگیا کہ پٹرول کا خرچ غیر معمولی حد تک بڑھ گیا ہے۔ وہ تو بمشکل ہفتے میں ایک آدھ بار ہی کہیں نکلتا تھا۔ تو پھر یہ اتنا پٹرول......

اسے یعقوب پر شک ہونے لگا۔ کبھی آدمی پر سے نگاہ ہٹا لی جائے تو وہ خرابی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ یہ بات اس نے پاکستان آکر سیکھی تھی۔ اور ویسے میں خراب ہونے والا اور خراب کرنے والا، دونوں برابر کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

وہ خود ہی یعقوب کے کوارٹر کی طرف نکل گیا۔

"گڈ نائٹ سر!" یعقوب نے دروازہ کھول کر اسے دیکھتے ہی سلیوٹ کیا۔ پھر اسے کچھ حیران سا دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی۔

"رات کا وقت ہے نا سر! یہ سمجھیں کہ میں نے شب بخیر کہا ہے آپ کو۔" انداز ایسا تھا، جیسے کسی ان پڑھ کو سمجھا رہا ہو۔

"اوہ! میں سمجھا نہیں تھا۔"

"کہیں چلنا ہے سر؟"

"یہیں اپنے لان تک چلیں گے ذرا۔"

"میں اپنی کیپ لے آؤں سر!" یعقوب اس وقت بھی وردی میں تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔"

عبدالحق اسے لان میں لے گیا اور بے تکلفانہ انداز میں گھاس پر بیٹھ گیا۔

"آؤ بیٹھو۔"

"یہ آپ کی شان اور میری وردی کے خلاف ہے سر!" یعقوب نے صاف انکار کر دیا۔

"آپ ادھر جھولے پر بیٹھیں تو میں نیچے بیٹھ جاؤں گا۔"

"بیٹھ جاؤ! ورنہ تمہاری وردی پر پابندی لگا دوں گا۔"

"نا سر...... سوری سر...... پھر تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔" یعقوب کی تو جیسے جان نکل گئی۔ وہ بیٹھ گیا۔

"کیا حکم ہے سر!"

"کیسی چل رہی ہے؟"

"بہت بڑا حال ہے سر! انگریز کیا گئے، یہاں تو قاعدہ قانون ہی ختم ہوگیا۔" یعقوب شروع ہوگیا۔

"ہر ایرا غیرا پولیس والا روک لیتا ہے۔ بس ایک چونی کے لئے۔ ورنہ چالان کی دھمکی دیتا ہے۔ ایسے میں یہ وردی ہی تو کام آتی ہے سر! تین چار لفظ انگریزی کے رسید کرتا ہوں سالے کو، اور کہتا ہوں، پتا بھی ہے، کس کا ڈرائیور ہوں، تب جا کر کہیں سیدھے ہوتے ہیں سالے۔ وردی نہ ہو تو سر! مہینے کے تیس چالیس چالان یا چونیاں تو سر پر پڑیں ہی پڑیں۔"

"ارے! میں گاڑی کے بارے میں پوچھ رہا تھا مسٹر جیکب!" عبدالحق کو اسے ٹوکنا پڑا۔

"گاڑی کیسے چل رہی ہے؟"

"وہ تو اچھی ہی چلے گی سر! انگلش جو ہے۔" یعقوب جیکب پکارے جانے پر اور ترنگ میں آگیا۔

"یہ انگریز جو بھی چیز بناتے ہیں، لائف ٹیم ہوتی ہے سر! بس سروس کراتے رہو باقاعدگی سے۔ کوئی پربیلم نہیں سر! گاڑی فس کلاس ہے۔"

"مجھے لگتا ہے، پٹرول زیادہ کھا رہی ہے آج کل۔"

"اوہ نو سر! آج کل چل زیادہ رہی ہے۔"

"اچھا! مجھے تو پتا نہیں، میرا تو آج کل نکلنا ہی نہیں ہوتا۔"

"پر مدر صاحبہ تو روز جاتی ہیں سر! اور ان کا ٹرپ کبھی چھوٹا نہیں ہوتا۔ ابھی تین دن پہلے تو قصور لے گئی تھیں مجھے۔"

"بیگم صاحبہ بھی ہوتی ہیں ساتھ؟"

"نو سر! وہ کالی نوکرانی ہوتی ہے ان کے ساتھ۔" یعقوب نے منہ بنا کر کہا۔

"تو جاتی کہاں ہیں؟"

"کبھی کسی مزار پر جاتی ہیں سر! تو کبھی کسی زندہ بابے کے پاس۔" یعقوب نے بدمزگی سے کہا۔

یہ انکشاف عبدالحق کے لئے خلافِ توقع تھا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چند لمحوں میں اس نے خود کو کوشش کر کے سنبھالا۔

"کبھی یہ بھی پتا چلا کہ کیوں جاتی ہیں وہاں؟" اس نے پوچھا۔

"اب سر! مدر صاحبہ سے تو میں پوچھ نہیں سکتا۔ اور چھوٹے لوگوں سے میں بات نہیں کرتا۔" یہ دوسری بات کرتے ہوئے یعقوب کے لہجے میں حقارت آگئی۔

"پر مجھے پتا ہے، یہ سب چھوٹے سر کے لئے کرتی ہیں وہ۔"

عبدالحق پریشان ہوگیا۔

"یہ چھوٹے سر کون بلا ہیں مسٹر جیکب؟"

"وہ چھوٹے سر! سوری سر! میرا مطلب ہے سر! مجھے بابا کہنا چاہئے تھا۔" یعقوب بری طرح گڑبڑا گیا۔

"کوئی زندہ بابا؟"

"وہ بابا نہیں سر! آپ کا بابا...... آپ کا بیٹا سر!"

"کیا بک رہے ہو؟ میرا بیٹا کہاں سے آگیا؟" عبدالحق کو غصہ آنے لگا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں سر! بابا ابھی نہیں ہے اور مدر صاحبہ مزاروں پر اور زندہ بابوں کے پاس اس لئے تو جاتی ہیں سر! کہ آپ کا بابا آجائے۔ وہ دعا کرتی ہیں اور دعا کراتی ہیں اس کے لئے۔"

بات سمجھ میں آئی تو عبدالحق کا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا۔

"یہ...... یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"انٹیلی جنس سر! انٹیلی جنس!" یعقوب نے انگشت شہادت سے اپنی کن پٹی تھپ تھپائی۔

"ابے گدھے! وہ تیرے پاس کہاں سے آ گئی۔" عبدالحق نے بھنا کر کہا۔

"انسلیٹ کرتے ہیں سر! کرنل جعفری بولتا تھا......تم بہوت ذہین ہے جیکب!"

"کرنل جعفری؟"

"کرنل جعفری پیڈسن سر!"

"وہ کرنل جعفری پیڈسن ہوگا۔" عبدالحق نے تصحیح کی۔

"وہی سر! کرنل جعفری......"

"میں نے پوچھا تھا، تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ میرے لئے بیٹا مانگتی ہیں؟"

"وہی تو بتا رہا ہوں سر! میں اپنے کان کھلے رکھتا ہوں۔ ایک دن مدر صاحبہ اس کالی عورت سے کہہ رہی تھیں۔ اللہ میرے بیٹے کو ایک بیٹا دے دے اور میں اسے گود میں کھلاؤں تو خوشی سے مرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"ارے مسٹر جیکب! بس اب تم جاؤ، تھینک یو ویری مچ۔"

"تھینک یو فور تھینک یو سر!" یعقوب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر کمر کے بل جھکتے ہوئے بولا۔

"گڈ نائٹ سر!"

اس کے جانے کے بعد عبدالحق وہیں گھاس پر ہاتھوں کا تکیہ بنا کر اس پر سر رکھ کر لیٹ گیا اور ستاروں بھرے آسمان کو تکنے لگا۔ بیٹا! اس کا خواب، اور اس خواب کی تعبیر کے لئے اماں در بہ در پھر رہی تھیں۔ اور وہ...... وہ کیا کر رہا تھا؟ وہی جو کر سکتا تھا۔ دعا، صرف دُعا۔ اللہ کہہ رہا تھا۔ یہ جو نطفہ تم گراتے ہو تو سمجھتے ہو کہ تم خالق ہو؟ نہیں! خالق میں ہوں۔ تو پھر آدمی کیا کر سکتا ہے دعا کے

سوا۔ اور اللہ تو مرضی کا مالک ہے۔ دل چاہے تو دریا دے دے، اور دل چاہے تو ایک بوند کو بھی ترسا دے۔

اس نے خود کو ٹٹولا، پھر کھکھوڑا۔ بیٹے کی آرزو تو بہت شدید تھی۔ لیکن وہ بس دعا پر قانع اور مطمئن تھا۔ اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں تھی۔ کوئی جھنجلاہٹ نہیں تھی۔ وہ بس اس سے مانگتا تھا، جو دینے والا ہے۔ لیکن اماں......

اماں کی بے چینی اور تڑپ سے وہ بے خبر تھا۔ مگر اب اسے محسوس کر سکتا تھا۔ وہ تو اس کے لئے قصور تک ہو آئی تھی۔ ہر روز در در کی خاک چھانتی تھی۔ جیسے کسی در سے کوئی بابا اس کی جھولی میں ننھا سا بچہ ڈال دے گا۔ کیسی بھولی ہے اماں۔ ایسے کہیں بچہ ملتا ہے۔ ارے وہ تو جب اللہ کی مرضی ہوگی تو ملے گا۔ اور وہ بھی اماں کی جھولی میں نہیں ٹپکے گا۔ وہ تو نور بانو کی کوکھ میں اترے گا۔ پورا سسٹم ہے اللہ کا بنایا ہوا۔ ایسے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

اس کے پتا جی اور ماتا جی بھی اسی طرح در در بھٹکتے تھے اس کے لئے۔ پر اماں تو مسلمان ہے۔ ایمان پر پیدا ہوئی ہے۔ یہ اماں کو کیا ہوگیا۔ سہارا دینے والی واحد ذات کو چھوڑ کر ادھر ادھر سہارے تلاش کر رہی ہے۔ جبکہ وہ تو بعد میں ایمان لایا ہے۔ اماں جیسا ایمان تو نہیں ہوگا اس کا۔ مگر وہ تو بس اللہ سے مانگتا ہے۔

یہ بھی سسٹم ہی ہے۔ اللہ کا بنایا ہوا۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ اس نے ہر انسان کو ایک جیسے نقوش کے باوجود الگ الگ صورت دی، ویسے ہی شخصیت، کردار اور مزاج بھی الگ الگ دیا۔ سب کی اپنی اپنی سوچ ہے۔ اور اللہ نے انسانوں کو برابر تو نہیں بنایا۔ ہر اعتبار سے درجے ہیں، تفریق ہے۔ بادشاہ، امیر، غریب، فقیر، آخر میں تلیں گے سب اپنے اپنے عمل پر اور تقویٰ پر، کون کتنا ڈرتا رہا اللہ سے۔ یہی حال ایمان کا ہے۔ کوئی ایمان کے کسی درجے پر ہے، اور کوئی کسی درجے پر۔ پھر ایمان گھٹتا بڑھتا بھی تو ہے۔ آزمائش کا کوئی باٹ ترازو میں آ گرتا ہے تو اس بات اور آدمی کی ظرف کی نسبت سے ایمان ہلکا ہو جاتا ہے۔ آزمائش کا لمحہ گزر جاتا ہے تو کبھی بحال ہو جاتا ہے۔ کبھی بڑھ جاتا ہے اور

بھی گھٹ جاتا ہے۔ اور کسی کو اللہ ظرف اور استقامت دے تو بہت بھاری بات سے بھی ایمان ہلکا نہیں ہوتا۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ بہت عرصے کے بعد، وہ بہت پہلے کے سے انداز میں سوچ رہا ہے۔

کسی نے کہا تھا کہ جتنے انسان ہیں، اللہ تک پہنچنے کے اتنے ہی راستے ہیں۔ تو اللہ نے گنجائش سب کے لئے برابر چھوڑی ہے۔ کوئی یہ شکایت نہیں کر سکتا کہ مجھے تجھ تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملا۔ اپنے مزاج کی مناسبت سے اپنے راستے پر چلو۔ ہر راستے کا انت اللہ ہے۔

اللہ نے فرمایا کہ وہ ہماری رگِ جاں سے بھی نزدیک ہے۔ وہ سب سنتا، دیکھتا اور جانتا ہے۔ اس نے کہا۔ مجھ سے مانگو۔ مجھے تمہارا مانگنا اچھا لگتا ہے۔ میں تمہیں دوں گا۔ لیکن کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ مانگے جاؤ اور کچھ نہیں ملے۔

اسے یاد آیا، مولوی مہر علی سے کسی نے یہی کہا تھا تو مولوی صاحب نے کہا:

''جب ایسا ہو تو کثرت سے استغفار کرو۔''

اس آدمی نے شکایتی نظروں سے مولوی صاحب کو دیکھا۔

''اتنے لوگوں میں ایک میں ہی گناہ گار نظر آتا ہوں آپ کو؟ چھوٹے موٹے گناہ تو سبھی کرتے ہیں۔ میں کوئی برا آدمی تو نہیں۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم گناہ گار ہو۔'' مولوی صاحب نے بڑے تحمل اور محبت سے کہا۔

''بزرگوں نے کہا ہے کہ دعا قبول نہ ہو، پریشانیاں گھیر لیں اور نہ ٹلیں، اور بارش نہ ہو تو استغفار کرو۔ اور دیکھو، ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم روز استغفار کرتے تھے۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی تلقین کرتے تھے اس کی۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی وہ، جنہیں ان کی زندگی میں مغفرت اور جنت کی نوید مل گئی تھی۔ ہم تو ہیں ہی معمولی اور گناہ گار لوگ۔ دن میں لاکھوں گناہ تو بے خبری میں

ہی کرتے ہیں۔''

تو ایک بات تو یہ ہوئی۔ دوسرا زاویہ بھی مولوی صاحب نے ہی دکھایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا، ہمیں تو اگلے پل کی خبر نہیں، اور اللہ ابد تک سب کچھ جانتا ہے۔ ہم بے خبری میں ایسی دعا کرتے ہیں، جس میں ہمارے لئے زر ہوتا ہے۔ تو سب جاننے والا رب ہماری بہتری کی خاطر اس دعا کو قبول نہیں کرتا۔ یہ اس کی رحمت ہے کہ وہ اسے آخرت کے لئے جمع کر لیتا ہے اور وہاں انشاء اللہ اس کا زیادہ بہتر اجر دے گا۔

اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے دعا کرنے کا حکم بھی تو ہے۔ اس حکم کا دوسرا پہلو یہ بھی تو ہوا کہ دوسروں سے اپنے لئے دعا کو کہو۔ اور لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھنا۔

اور یہ بھی طے ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں تو وہ اللہ کے دوست ہیں۔ اولیاء...... ہمیں اس کا علم ہو یا نہ ہو، تو اللہ...... سب کچھ جاننے والا اللہ ان کی دعا تو نہیں ٹالے گا۔ تو اماں اگر ایسے لوگوں کے پاس دعا کرانے کے لئے جاتی ہیں تو اس میں حرج کیا ہے؟

لیکن مزار والی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ صاحب مزار اپنی قبر میں تو نہیں ہوگا۔ وہ تو عالم ارواح میں ہوگا۔ اللہ کا ولی ہے تو اللہ کی رحمت کے سائے میں ہوگا۔ اور پھر کسی سے دعا کرانا اور بات ہے۔ اور غیر اللہ سے مانگنا اور بات۔

اسے یاد تھا، مزار پر ایک عورت بلند آواز میں پکار رہی تھی۔ داتا صاحب! مجھے تو بیٹا چاہئے...... بیٹا، تمہارے در سے لے کر ہی ٹلوں گی۔ تو کیا داتا صاحب اسے بیٹا دینے کی قدرت رکھتے ہیں؟ وہ کانپ گیا۔ نہیں بھئی...... وہ عورت جانے، داتا جانے اور اللہ جانے۔ مجھے یہ سب کچھ نہیں سوچنا۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ اللہ کے ہاں شرک کی معافی نہیں۔

بیٹے کی آرزو تو اسے بھی بہت تھی کہ وہ ہو تو اس کی ایمان والی نسل چلے۔ دل تو اس کا بھی چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ کرے، لیکن شرک سے ڈرتا تھا۔

مولوی صاحب سے البتہ وہ دعا کے لئے کہتا رہتا تھا۔ لیکن اور کسی سے کہتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔

مگر اماں اس کے لئے ہر جگہ بیٹا مانگتی پھر رہی تھیں۔

اس نے سوچا، اللہ کو عاجزی اور انکساری بہت پسند ہے بندے میں، تو یہ تو اماں کا عجز ہی تھا۔ وہ تو گھر کی ملازمہ نسیمہ سے ہی دعا کے لئے کہتی تھیں۔ کہتی تھیں، اللہ نے میرے عبدالحق کو بیٹا دیا تو میں خوش کر دوں گی تجھے۔ تو کوئی کسی سے اپنے لئے دعا کو کہے تو وہ اس کو خود سے بہتر سمجھ رہا ہوتا ہے۔ وہ شخص کتنا اچھا لگے گا اللہ کو، جو دنیا میں ہر شخص کو خود سے بہتر سمجھتا ہو۔ تو اماں تو بہت اچھی ہیں۔ لیکن یہ مزاروں پر جانا......

پھر اس کی سمجھ میں ایک بات آئی۔ ہر شخص کا زاویہ نظر اور اس کا عمل درست ہو سکتا ہے۔ خواہ بظاہر غلط نظر آ رہا ہو۔ بنیادی شرط ایک ہی ہے۔ اللہ کا ڈر۔ اس شرط کے ساتھ دلوں کا حال...... سب کچھ جاننے والے ربّ نے برابر کی گنجائش چھوڑی ہے۔ اور پھر ہر بندے کا اللہ کے ساتھ الگ معاملہ ہے۔ دوسرے بندوں کا کیا بیچ۔ جو اللہ کے محبوب دوستوں سے محبت کرتے ہیں تو وہ اللہ ہی سے تو محبت کر رہے ہوتے ہیں۔ بس اس کی محبت میں بھی شرک کی طرف سے خبردار رہنا چاہئے۔ ایک لمحے میں آدمی مغفرت سے محروم ہو سکتا ہے۔

اس نے خود کو ٹٹولا۔ وہ جو بس خود ہی دعا کرتا ہے اپنے لئے تو یہ غرور تو نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ وہ دوسروں کو اس قابل نہیں سمجھتا ہو۔ اس کا جواب نفی میں تھا، اور بالکل سچا تھا۔ وہ بس محتاط تھا۔ اور محتاط بندوں کے لئے اللہ نے بتا دیا تھا کہ وہ ان کی رگِ جاں سے بھی نزدیک تر ہے۔ اور وہ سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے۔ اس کا دل مطمئن ہو گیا کہ وہ راستی پر ہے، اور دوسروں کو جواب وہی بھی اس کے ذمے نہیں۔

اس نے سوچا، اور یاد کیا۔ وہ اللہ سے اپنے لئے بیٹا مانگتا ہے تو اس کے دل میں ایک ہی خیال ہوتا ہے۔ یہ کہ اس کے زندگی کے آخری ایام میں ایمان سے سرفراز ہونے والے باپ کی نسل آگے بڑھے۔ یہ اس کے اور اس کے

باپ کے لئے اعزاز ہوگا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ اسی لئے تو وہ اس کے لئے اتنا تڑپ رہا تھا۔

مگر یہ طے تھا کہ اماں کی تڑپ اس کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ تبھی تو وہ یوں ماری ماری پھر رہی ہیں۔ لیکن کیوں؟ اماں کی تڑپ اس سے بڑھ کر کیوں ہے؟

وہ اس پر سوچنے لگا۔

اس میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا کہ اماں اس سے اپنے بیٹے سے بھی زیادہ محبت کرتی تھیں۔ اسے یاد تھا، لال آندھی آنے سے پہلے کیسے وہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اسے کچھ دینے کو، زندگی کا زادِ راہ دینے کو۔ اور جب اس نے انہیں چاچا اور ویر جی کی موت کے بارے میں بتایا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ انہیں یہ بات معلوم ہے۔ انہوں نے اسے دھکیل کر وہاں سے بھگا دیا تھا، اور خود وہیں رہ گئی تھیں۔ اپنی دانست میں اس کی دولت کو محفوظ کرنے کے لئے، جو درحقیقت انہی کی تھی، اور وہ اس کی وہ دولت سمیٹ کر آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود اس کا انتظار کرتی رہیں۔

ایک تو اس کے لئے اماں کی بے پناہ محبت، پھر اس کے پتا جی سے رشتہ وفا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے پاس جینے کے لئے اس کے سوا بچا ہی کیا تھا؟ تو اس کے لئے ان کے بیٹے کی آرزو تو فطری تھی۔

یہ تو ایک پہلو تھا۔ دوسرا یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر اور اکلوتے بیٹے کو کھو چکی تھیں۔ ان کے شوہر کی نسل منقطع ہو چکی تھی۔ لیکن ایک بہت بڑا رشتہ، بہت بڑا امکان ان کے لئے موجود تھا۔ انہوں نے اسے بہت محبت سے دودھ پلایا تھا۔ اور اس وقت انہیں معلوم بھی نہیں تھا کہ زندگی میں ایک مرحلے پر یہ تعلق اتنا اہم ہو جائے گا کہ وہ صرف اسی کے سہارے زندگی کا ایک طویل حصہ گزاریں گی۔

خون کا رشتہ خون سے ہوتا ہے۔ لیکن خون بھی تو ماں کے دودھ سے بنتا ہے۔ تبھی تو دودھ پلانے والی کو ماں کا درجہ ملتا ہے، اور اس کی اولاد سگے بھائی بہنوں جیسی ہوتی ہے۔ محرم کہلاتی ہے۔

تو اماں کے لئے اس کے بچے کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کا پوتا ہوگا اور ماں باپ کو اولاد کی اولاد بہت عزیز ہوتی ہے۔ اور یوں بھی کہ اس کی شکل میں اماں کو جینے کا اور مضبوط جواز مل جائے گا۔

اماں کے لئے تو وہ ایک طرح سے ویر جی...... وصال دین کا بھی بیٹا ہوگا۔ کیونکہ اس کی رگوں میں ان کے دودھ سے بننے والا خون دوڑ رہا ہوگا۔ وہ ان کا پوتا ہوگا۔

پھر وہ اس سے محبت کرتی ہیں۔ وہ پتا جی کی عزت کرتی تھیں۔ اب جبکہ انہیں معلوم ہے کہ پتا جی تو اس سے بھی پہلے مسلمان ہو چکے تھے تو وہ ان کی نسل کو بڑھتے دیکھنا چاہیں گی۔

وہ سمجھ گیا کہ اس کے پاس بیٹے کی چاہت کے لئے صرف ایک زاویہ تھا۔ لیکن اماں کے پاس کئی زاویے ہیں۔ اس لئے تو ان کی تڑپ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی لئے تو وہ اس کے لئے در در بیٹا مانگتی پھر رہی ہیں، جیسے بیٹا کوئی سکہ ہے کہ کوئی بھی ان کے کاسے میں ڈال دے گا۔

اس لمحے اسے اپنی خودغرضی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ صرف اپنے، اپنے پتا جی اور اپنی نسل کے لئے بیٹے کی خواہش کر رہا ہے۔ اس نے کبھی نہیں سوچا کہ اماں کو اس کے بیٹے کی اس سے زیادہ ضرورت ہے۔ کیا محبت کرتا ہے وہ اماں سے؟ اور اس نے کبھی نہیں سوچا کہ نور بانو کو بھی اولاد کی آرزو ہوگی۔ اسے نور بانو کا خیال کبھی نہیں آیا۔ کیسا خودغرض ہے وہ......

مگر اسی لمحے اسے نور بانو کی بے ساختہ کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ نور بانو نے کہا تھا...... مجھے اولاد کی کمی کیوں محسوس نہیں ہوتی۔ پھر اس کے چہرے کا تاثر دیکھ کر اس نے بات بدل دی تھی۔

لیکن اب عبدالحق سمجھ سکتا تھا کہ نور بانو نے سچ کہا تھا۔ وہ کبھی اولاد کے لئے پریشان نہیں ہوئی تھی۔ پریشانی تو وہ چھپا ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کی پریشانی ہمیشہ جھنجلاہٹ کی شکل میں سامنے آتی تھی۔ وہ پریشان صرف اس کے لئے ہوتی تھی۔ کبھی اس کی دانست میں وہ اسے کم توجہ دیتا تو وہ پریشان ہوتی اور

جھنجلاتی۔ کبھی وہ دوسروں کو...... زرینہ کو، بھائی اور آپا کو اور ان کے بچوں کو زیادہ وقت دیتا تو اسے غصہ آتا، اور کسی نہ کسی طرح وہ اس کا اظہار کر دیتی۔ لیکن اس نے زرینہ اور آپا کے بچوں کو دیکھ کر بھی کبھی اپنے لئے بچے کی آرزو نہیں کی تھی۔

یہ تو بڑی غیر فطری بات ہے۔ عبدالحق نے سوچا۔ شاید اس لئے کہ وہ بس مجھ پر قناعت کر کے بیٹھ گئی ہے۔ شاید وہ مجھے کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتی۔ بچوں کے ساتھ بھی نہیں۔

اس خیال پر نہ جانے کیوں عبدالحق خوفزدہ ہوگیا۔ یہ کیسی باتیں سوچ رہا ہے وہ۔ ایسا کہیں ہوتا ہے بھلا۔ اولاد تو مرد اور عورت کے رشتے کو مضبوط کرتی ہے، وہ تو مشترکہ دولت ہوتی ہے۔

وہ اٹھا اور اندر چلا گیا۔

✿ ✿ ✿

نادرہ کے لئے وہ طویل انتظار تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے نہیں معلوم تھا کہ اللہ کیا فیصلہ کریں گے۔ شاید اس لئے بھی کہ وہ اس معاملے میں غیر جانبدار نہیں رہی تھی۔ نہ جانے کب، کیسے وہ عارف کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ اور اب اسے پتا چل رہا تھا کہ کسی کی محبت زندگی کی محبت کو کیسے بڑھا دیتی ہے۔ وہ جو ہر وقت مرنے کے لئے تیار رہتی تھی، اب موت سے ڈرنے لگی تھی۔

اور محبت کی سرشاری کا بھی اسے پہلی بار پتا چلا تھا۔ کام کرتے کرتے اچانک عارف کا چہرہ سامنے آ جاتا۔ اور اس کا ہاتھ خودبخود رک جاتا۔ اسے پتا بھی نہ چلتا اور وہ دیر تک ایسے ہی بیٹھی رہتی۔ پھر کوئی آ کر اسے چونکاتا، یا وہ خود چونکتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔ شرم بھی آتی۔

کیسی عجیب بات ہے۔ وہ سوچتی۔ مجھے محبت بھی ہوئی تو کب اور کہاں؟ متاع آبرو پامال ہو جانے کے بعد اور طوائف کے کوٹھے پر؟ پھر اسے خیال آتا کہ یہ بھی اللہ کا کرم، اسی کی عطا ہے۔

اور اتنی تلخی کے بعد کیسے ہوگئی اسے محبت؟

جواب میں وہ تصور میں عارف کو دیکھتی، اس کی باتیں سنتی، اور اسی کی

سمجھ میں آ جاتا۔ جب اس نے ثمن کے انداز میں عارف سے عارف کے لئے محبت محسوس کی تھی۔ تو وہ بہت حیران ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بدنصیب عورت طوائف بنتے ہی محبت کے جذبے سے محروم ہو جاتی ہے۔ پھر اس ثمن کو کیا ہوگیا؟ طوائف کی محبت تو حماقت ہی کہلاتی ہے۔

لیکن جب اس نے عارف کو دیکھا تو سمجھ لیا۔ ایسے شخص سے تو محبت کئے بغیر رہا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ ہے ہی ایسا۔ اور جس سے عارف محبت کرے، تو وہ اس کے لئے اعزاز ہی ہوگا۔ تو اللہ نے یہ اعزاز اسے عطا فرما دیا تھا۔

اور اب تیس دن کاٹنا تھے۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے تو ایسا لگ رہا تھا کہ تین ہفتے گزر گئے ہیں۔ لیکن اخبار پر تاریخ دیکھ کر پتا چلا کہ ابھی تو صرف تین دن گزرے ہیں، صرف تین دن۔ یااللہ! یہ انتظار کے دن ایک ایک پل کر کے کیوں گزرتے ہیں؟

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس وقت کا تصور کرنے لگتی، جب وہ عارف کے ساتھ ہوگی۔ عزت کی محبت بھری زندگی۔ لیکن پھر دل میں کانٹا سا چبھ جاتا۔ اسے یہ سوچنے کا حق نہیں تھا۔ اس نے نیلم بائی سے وعدہ کیا تھا کہ نہ وہ خودکشی کرے گی، اور نہ ہی کبھی کوٹھا چھوڑے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے فیصلہ اسی اللہ پر چھوڑا ہے جسے گواہ بنا کر نیلم بائی سے وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس کے اندر کہیں بہت گہرائی میں یہ خیال موجود تھا کہ اس عہد شکنی کے بعد وہ کسی حال میں بھی خوش نہیں رہ سکتی۔ حتیٰ کہ عارف بھی اسے خوش نہیں رکھ سکتا۔ اسے بس وعدہ نبھانا چاہئے۔

اور یہ خیال آتا تو مایوسی کی تیز لہر اس کے وجود کو اندر سے تہ و بالا کر کے گزر جاتی۔ وہ اداس اور بے چین ہو جاتی۔ زندگی محبت، خوشیوں، اور رعنائیوں کے ساتھ سامنے کھڑی اسے بلا رہی ہے اور اشارے کر رہی ہے۔ دو قدم کا فاصلہ ہے۔ لیکن وہ جانتی ہے، اس کا ضمیر بتاتا ہے کہ اس زندگی سے زیادہ وہ موت کی مستحق ہے۔ کم از کم اس محبت، خوشیوں اور رعنائیوں سے بھی اس زندگی پر اس کا ذرا بھی حق نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے اندر جیسے خوش ہونے کی

خوبی دم توڑ دیتی۔

وہ سوچتی کہ فیصلے کا حق تو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا بھی نہیں ہے تو پھر کیا اسے یہ حق بھی حاصل نہیں کہ اپنے تصور میں تھوڑے سے دن اپنی پسند کی زندگی جی لے۔ پھر کون جانے، فیصلہ کیا ہو؟ اس تصور کے ساتھ یہ ایک مہینہ اس کے لئے حاصل عمر ہو سکتا ہے۔ اس میں تو زندگی اور تقدیر کے دیئے ہوئے ہر دکھ اور ہر ذلت کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

لیکن ضمیر بہت طاقتور تھا، اور وہ اس کے مقابلے میں بہت کمزور تھی۔ ضمیر کہتا تھا، اسے تصور کا بھی حق نہیں۔ یہ ایک مہینہ تو اسے پہلے کی طرح گزارنا ہے۔ ہاں، فیصلہ حق میں آ گیا تو پھر تصور کی ضرورت نہیں۔ حقیقی زندگی ہی محبت، خوشیوں اور رعنائیوں کے ساتھ مل جائے گی۔ اس عرصے میں یہ خوش کن تصور تو درحقیقت عہد سے منہ موڑنے کے مترادف ہے۔

وہ اچھی..... بہت اچھی تھی۔ اس لئے ضمیر سے ہار گئی۔ ورنہ ضمیر سے کون ہارتا ہے۔ ضمیر کو ہرا بھی نہیں سکتے۔ تو سنی ان سنی کر کے اس کی آواز دبا دیتے ہیں، اسے سلا دیتے ہیں۔

پہلی بار اس کے سامنے ایک خوشگوار مستقبل کا امکان آیا تھا۔ اس کے تصور سے گریز کرنا آسان نہیں تھا۔ سو اس نے خود کو مصروف کر لیا۔ لیکن کام کرنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اور پھر نگاہ کا کام۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگتا تھا۔ اور پھر یہ اندیشہ الگ کہ نگاہ ہی نہیں جم رہی تو کام اچھا کیسے ہوگا؟

تو جب کام کرنا ممکن نہ رہتا تو وہ قرآن کی تلاوت کرتی۔ نماز تو وقت سے تھی۔ البتہ دعا سے وہ محروم ہوگئی تھی۔ اپنے لئے دعا کرنے کی تو اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔ عارف نے اچھا کیا کہ اسے پابند کر دیا۔ ورنہ ذہنی خلفشار اور مایوسی کی اس کیفیت میں وہ موت کے سوا اور کیا دعا کرتی۔ ہاں! ارجمند کے لئے وہ بڑی شدت سے دعا کرتی کہ اللہ اسے اس جہنم سے نکال دے۔

اس نے اپنے تصور کے لئے یہ پابندی تو قبول کر لی کہ وہ مستقبل بینی نہیں کرے گی۔ لیکن عارف کے لئے تو وہ خود ہی خود کو پابند نہیں کر سکتی تھی اور وہ

بھی آزاد تھا۔ جب چاہتا، تصور میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ اور کبھی کبھی تو تادیر اسے اس بات کا علم بھی نہ ہوتا۔

پھر اس کے جی میں کیا آئی کہ ہاتھ کا کام چھوڑ کر وہ عارف کے لئے دو جوڑے تیار کرنے میں لگ گئی۔ وہ ان پر ایسی خوب صورت کڑھائی کرنا چاہتی تھی، جو اس نے پہلے کبھی نہیں کی ہو۔ بہت باریک، بہت نفیس، بہت خوب صورت۔

اور یہ اس کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔ اتنی محبت سے تو اس نے پہلے کبھی کچھ کیا ہی نہیں تھا۔

❁ ❁ ❁

اس کوٹھے پر گزرنے والی زندگی میں اچھو میاں پہلی بار اتنے خوش تھے۔

عارف اور نادرہ کے معاملے میں انہیں بڑی تشویش تھی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف نادرہ تھی۔ ان کے خیال میں نادرہ کا سوچنے کا انداز بہت منفی تھا۔

ان کے نزدیک وہ سادہ سا معاملہ تھا۔ انہوں نے قرآن میں پڑھا تھا کہ ہر اچھی بات، ہر اچھی چیز اللہ کی طرف سے ہے۔ اور ان کے لئے یہ کافی تھا۔ قرآن کی کسی بات پر شک کرنا تو کفر ہے۔

تو وہ اپنے وجود کی سچائی کے ساتھ یہ یقین رکھتے تھے کہ یہ اللہ نے نادرہ اور ارجمند کی نجات کا راستہ نکالا ہے۔ عارف یوں ہی اتفاقاً نہیں چلا آیا تھا۔ اسے اللہ نے بھیجا تھا۔ تو پھر اس سے منہ موڑنا کیسا؟

لیکن نادرہ کی منطق بالکل مختلف تھی۔ اس کے نزدیک یہ آزمائش تھی، ویسی ہی آزمائش جیسی اس دنیا میں دی جانے والی زندگی ہے، جس سے آدمی دل لگا بیٹھتا ہے۔ اس کے نزدیک وہ عہد ہر چیز سے مقدس تھا، جو اس نے خدا کو گواہ بنا کر نیلم بائی سے کیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اسے نبھانا ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے۔

اپنا یقین اپنی جگہ، لیکن اچھو میاں نادرہ سے اختلاف بھی نہیں کر سکتے۔

عہد کی تو بڑی اہمیت ہے۔ اور ہر انسان سے پہلا عہد تو اللہ نے ہی لیا ہے۔ عہد شکنی اللہ کو ناراض کرتی ہے۔

وہ ایسی بند گلی تھی، جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اور ایسا تھا، جیسے واپسی کے راستے میں کوئی خون خوار کتا کھڑا ہو۔

پچھلے عرصے میں اچھو میاں نے ایک بات سیکھ لی تھی۔ جب آپ کوئی فیصلہ کر نہ سکیں تو صدقِ دل سے اللہ سے راہنمائی طلب کریں۔ اور اس کی فکر چھوڑ دیں۔ اللہ یقیناً راہنمائی فرمائے گا۔ اور اس میں دونوں جہان کی بہتری ہوگی۔

انہیں یاد تھا کہ وہ اس کوٹھے سے شرمندہ ہو کر نکلے تھے۔ کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔ اس وقت ان کے سامنے کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ اور زندگی کیسے گزاری جاتی ہے، یہ تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

تو اس کڑے وقت میں، ان کی دعا کے بغیر اللہ نے پہلے تو ان کے قدموں کی راہنمائی کی تھی اور انہیں دکھا دیا تھا کہ ان کا ٹھکانا کہاں ہے۔ اور پھر اسی نے ان کے دل کے ذریعے ان کی راہنمائی کی تھی کہ ابھی یہ ٹھکانا ان کے لئے نہیں ہے۔ انہیں واپس جانا ہے، اور دو معصوموں کی فکر کرنی ہے، اور ان کا خیال رکھنا ہے۔

اچھو میاں سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ وہ واپس آنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اس شرمندگی کے بعد کوٹھے پر جانا اور کسی کو منہ دکھانا...... اس کے مقابلے میں تو مر جانا بہت آسان تھا۔ لیکن اللہ کا فیصلہ اٹل تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ واپس آئے کہ اللہ کا حکم تھا اور پھر تعمیل کے صلے میں بدترین ذلت کے بجائے انہیں عزت ملی۔ اور سب سے بڑی چیز ملی، جس سے محروم ہو کر انہوں نے زندگی گزاری تھی۔ رشتے، نادرہ ان کے لئے بیٹی تھی اور ارجمند نواسی یا پوتی۔

وہ جانتے تھے کہ اللہ نے کرم فرمایا اور ان کے یقینی نقصانات کو نفع میں بدل دیا۔ کیسا انعام کیا اللہ نے ان پر کہ وہ جو جانوروں کی سی زندگی گزار رہے تھے، انہیں انسان بنا دیا۔ اپنا راستہ دکھایا۔ نماز نصیب فرمائی۔ قرآن پڑھوایا۔ کیسا

راہنما ہے وہ۔

سو جب نادرہ پر بحران آیا تو انہوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں اسے بھی یہی مشورہ دیا کہ وہ فیصلہ اللہ پر چھوڑ دے۔ اور نادرہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی۔

اس کے باوجود وہ پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ معاملہ بن جائے۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ وقت تیزی سے پھسل رہا ہے۔ ارجمند تیزی سے بڑی ہو رہی تھی۔ اس کا اب یہاں سے نکلنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

مگر اُمید کی ایک کرن انہیں نظر آ گئی تھی۔

عمر انہوں نے جیسے بھی گزاری، لیکن بہر حال انہوں نے دنیا دیکھی تھی۔ طوائف کے کوٹھے سے دنیا دیکھنا شاید سب سے بڑا مشاہدہ، سب سے بڑا تجربہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک نظر میں پہچان لیا کہ نادرہ کو بھی عارف سے محبت ہو گئی ہے۔ اور یہ بڑی خوش آئند اور مثبت پیش رفت تھی۔ بس اُلجھن نادرہ ہی کی طرف سے تھی۔ وہ جو اپنے عہد کو زندگی سے بھی زیادہ اہمیت دیتی تھی۔

پھر انہوں نے انہیں ہنسی خوشی جدا ہوتے دیکھا تو ان کی اُمید اور توانا ہو گئی۔ کیونکہ اس صبح ہی تو انہوں نے نادرہ کو پریشان دیکھا تھا اور اس نے کہا تھا کہ ابھی تک وہ اللہ کی راہنمائی سے محروم ہے۔ انہوں نے اسے اطمینان دلایا تھا۔

اور ان دونوں کو دیکھ کر لگا تھا کہ دونوں ہی مطمئن ہیں۔

نادرہ نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ انہوں نے بھی کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

اگلے دن عارف پھر آ گیا۔ اس دن بھی وہ دونوں بہت خوش تھے۔ پھر نادرہ نے ان سے کہا کہ وہ عارف کو چھوڑ آئیں۔

عارف کے ساتھ چلتے ہوئے اچھو میاں کا بہت جی چاہ رہا تھا کہ اس سے بات کریں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر عارف نے خود ہی اچھو میاں سے کہا۔

''آپ ہمارے لئے بہت دعا کیجئے گا۔''

''وہ تو میں پہلے ہی سے کر رہا ہوں میاں!'' اچھو میاں نے سادگی سے کہا۔

''اللہ آپ کو خوشیاں نصیب فرمائے۔ ان بچیوں کا خیال رکھئے گا۔''

''تو میں تو آپ کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

''نہیں میاں! میری منزل کوئی اور ہے۔ میں تو اب یہاں صرف ان بچیوں کی وجہ سے پڑا ہوں۔''

عارف نے چلتے چلتے سر گھما کر انہیں دیکھا۔ اس نے ایک نظر میں جان لیا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں، حتمی ہے۔

وہ چلتے رہے۔ پان کی ایک بند دُکان کے سامنے عارف رکا۔ اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور پھر وہ کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا۔

''دیکھئے چچا صاحب......!''

اچھو میاں کی آنکھیں بھر آئیں۔ کیسا عزت دینے والا ہے میرا اللہ......! پان سگریٹ، شراب لانے والے اچھوں میاں کو اتنا مرتبہ عطا فرمایا۔

''میں تو اب سترہ تاریخ کو ہی یہاں آؤں گا۔ لیکن اسی دوران آپ کو کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت پڑے تو ان صاحب کے پاس چلے جائیے گا۔ کوئی بھی مسئلہ ہو، یہ انشاء اللہ حل کر دیں گے۔''

''لیکن میاں......!''

''میں اب نادرہ اور ارجمند کو ایک لمحے کے لئے بھی اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا۔ لیکن نادرہ نے پابندی لگا کر مجبور کر دیا ہے۔'' عارف نے ان کی بات کاٹ دی۔

''آپ کی موجودگی سے مجھے اطمینان ہے۔ مگر کسی وقت کوئی مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''یہ صاحب کون ہیں؟'' اچھو میاں نے پوچھا۔

''بہت بڑے افسر ہیں، اور میرے استاد ہیں۔'' عارف نے کہا۔

"یہ رقعہ لے کر ان کے پاس جائیں گے تو وہ ہر ممکن مدد کریں گے آپ کی۔"

اچھو میاں نے رقعہ تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ عارف ان سے گلے مل کر رخصت ہوگیا۔

واپس آتے ہوئے وہ یہی سوچتے رہے کہ یہ کیسا خیال رکھنے والا، محبت کرنے والا آدمی ہے۔ جس طرح سے وہ انہیں رقعہ دے کر گیا تھا، اس سے وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ دوری کے اس ایک مہینے میں وہ نادرہ اور ارجمند کی طرف سے کتنا فکرمند رہے گا۔

وہ واپس آئے تو ارجمند نے انہیں کمرے میں بلا لیا۔ یہ دیکھ کر انہیں خوشی ہوئی کہ وہ مسکرا رہی تھی۔

"کیا ہوا بیٹا! بہت خوش ہو؟"

نادرہ نے ان کے ہاتھ چوم لئے۔

"آپ کی زبان مبارک تھی۔ اللہ نے راہنمائی فرما دی۔"

"تو کیا طے پایا؟"

نادرہ نے انہیں پوری تفصیل سنا ڈالی۔

"بہت خوشی ہو رہی ہے یہ سن کر۔"

"یہ تو تھی اللہ کی راہنمائی۔ اب دیکھتے ہیں اللہ فیصلہ کیا کرتا ہے۔"

نادرہ کے لہجے میں ہلکی سی اداسی در آئی۔

"سب کچھ اچھا ہوگا انشاء اللہ!" انہوں نے بڑے خلوص سے کہا۔

اس رات اپنے بستر پر لیٹنے کے بعد اچھو میاں نے ایک ماہ بعد کا تصور کیا تو ان کے جسم میں خوشی اور سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ پہلی بار انہیں احساس ہوا کہ اگرچہ یہ بات ان کے شعور تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ لیکن درحقیقت شرمندگی کے اس دن سے آج تک وہ یہاں ایک قیدی کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ یہ الگ بات کہ وہ قید انہوں نے خود ہی قبول کی تھی۔ شاید اسی لئے انہیں اس کا شعوری احساس نہیں تھا۔ لیکن اب یہ سوچ کر کہ ایک ماہ بعد وہ بیڑیاں انشاء اللہ کھل

جائیں گی، ان کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔

بس ایک ماہ کی بات ہے۔ پھر وہ آزاد ہوں گے۔ انہوں نے خوشی سے سوچا۔ اپنی مرضی کا کام، اپنی مرضی کی زندگی۔

اب وہ ایک ایک دن گن رہے تھے۔

اور وہ نادرہ کو دیکھتے تو انہیں خوشی ہوتی۔ کام کرتے کرتے اس کا ہاتھ جیسے رک جاتا۔ آنکھیں ان دیکھے خلاؤں میں نہ جانے کیا دیکھتیں کہ ان میں دھنک کے ساتوں رنگ جھلملا رہے ہوتے۔ دیر تک وہ اس کیفیت میں رہتی۔ پھر چونک کر ادھر ادھر دیکھتی۔ وہ جلدی سے منہ پھیر لیتے۔ پھر چند لمحے بعد وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتے تو وہ کام میں مصروف نظر آتی۔ لیکن اس کے رخساروں پر شفق پھول رہی ہوتی۔

مگر چوتھے دن نہ جانے کیا ہوا کہ ایک تبدیلی آگئی۔ نادرہ اب بھی کام کرتے ہوئے کھو سی جاتی اور نہ جانے کیا دیکھنے لگتی۔ لیکن اب اس کی آنکھیں بجھی بجھی ہوتیں۔ اس کا چہرہ بھی خوشی کی اس چمک سے محروم ہوگیا تھا۔ جو پہلے تین دن انہیں نظر آئی تھی۔

انہوں نے سوچا کہ اس سے پوچھیں، پھر اسے سمجھائیں۔ جانے کس بات نے اس سے امید چھین کر مایوسی سے دوچار کر دیا ہے۔ شاید وہ اسے بحال کر سکیں۔ لیکن پھر وہ جھجک گئے۔ کہیں جلد بازی میں وہ اسے نقصان نہ پہنچا دیں۔

لیکن وہ تیس دن ان کے لئے ساری عمر کی دعاؤں کے تیس دن تھے۔ وہ مجسم دعا بن گئے۔ اتنے خشوع و خضوع سے تو انہوں نے رمضان کے تیس دنوں میں بھی دعا نہیں کی تھی۔ ایسی سچائی اور حضوری کے ساتھ تو انہوں نے اعتکاف کے دوران بھی دعا نہیں کی تھی۔

✿ ✿ ✿

عارف کے اس تحفے نے، اس کلر باکس اور اسکیچ بک نے ارجمند کو دنیا و مافیا سے بے خبر کر دیا تھا۔ ایک دن تو ایسا گزرا کہ وہ بس اسکیچ بک کے صفحے کو

بے یقینی سے دیکھتی، پھر اس پر انگلی پھیرتی۔ اور اسے احساس ہوتا کہ اس کی انگلی نے صفحے کو میلا کر دیا ہے۔ وہ ہاتھ سے اس خیالی میل کے دھبے کو مٹانے لگ جاتی۔ وہ خوب صورت دبیز صفحہ اسے اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ اس پر ڈرائنگ کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی ڈرائنگ ابھی اس خوب صورت صفحے کے قابل نہیں ہے۔

لیکن فنکار کا دل بہرحال دل ہوتا ہے۔ وہ اسکیچ بک کی خوب صورتی کے سحر سے نکلی تو دل ڈرائنگ کے لئے مچلا، اور ایسے مچلا کہ اور کسی چیز کا خیال ہی نہیں رہا۔

یہ تو اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ پہلی تصویر تو شہزادے ہی کی بنائے گی۔ اس نے ڈرائنگ شروع کی تو اسے کاغذ کی خوبی کا پتا چلا۔ عام کاغذ کے برعکس اس اسکیچ بک کا کاغذ اس کے ہاتھ اور پنسل، دونوں کی معاونت کر رہا تھا۔ یہی نہیں، وہ انہیں اکسا بھی رہا تھا۔ اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کر رہا تھا۔

ڈرائنگ مکمل کرنے کے بعد اس نے اسے دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ اتنی اچھی ڈرائنگ بھی کر سکتی ہے۔

پھر اس نے تصویر میں رنگ بھرے تو اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ نہ جانے کیسے رنگوں کے استعمال کا سلیقہ اسے آتا تھا۔ اور یہ ان رنگوں کا کمال تھا کہ وہ حقیقی رنگ تھے۔ تصویر تصویر نہیں لگ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ منہ سے بول اٹھے گی۔

دیر تک وہ اپنی ہی بنائی ہوئی تصویر کے سحر میں الجھی رہی۔ پھر اس کے دل میں شکرگزاری کا احساس ابھرا۔ اب اسے اس کی تصویر بنانی تھی، جس نے یہ تحفے اسے دیئے تھے۔ یہ خوب صورت تحفے......

اس نے پھپھو اور عارف صاحب کی وہ ڈرائنگ نکالی، جو اس روز بنائی تھی۔ یہ عارف صاحب کیا ہوتا ہے۔ اس کے دل نے کہا۔ یہ تو بدتمیزی ہے۔ اتنے بڑے ہیں وہ، نہیں بھئی! میں تو انہیں پھپھا جان کہوں گی۔ اس نے سوچا۔ مجھے تو وہ کہیں سے بھی بیگانے نہیں لگتے۔ بہت اپنے اپنے سے ہیں وہ۔ یہ پھپھو

بھی نہ جانے کیوں نخروں میں اتنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔

اس نے ڈرائنگ پر نظر ڈالی۔ اور خوش ہوگئی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ جیسے اللہ نے انہیں ایک دوسرے کے لئے ہی بنایا ہو۔ پھپھو کچھ بھی کہیے، لیکن یہ ڈرائنگ ثابت کرتی ہے کہ وہ بھی انہیں بہت پسند کرتی ہیں۔ اس نے دل میں سوچا۔

اس نے اس تصویر کو اسکیچ بک میں بنایا۔ اور اس کا دل خوش ہوگیا۔ واقعی یہ تو اسکیچ بک اور رنگوں کا کمال ہے۔ ویسے تو وہ اتنی اچھی تصویریں نہیں بناتی تھی۔ وہ چند لمحے اس تصویر کو دیکھتی رہی۔ اگر پھپھو کی زندگی ایسی ہو جائے تو کتنا اچھا ہوگا۔ اس نے سوچا۔

پھر اسے یاد آیا کہ یہ تصویر تو اس نے فرمائش پر بنائی تھی۔ تو فرمائش کرنے والے کا یہ حق تھا کہ تصویر اسے دی جائے۔ تو کیا اسے یہ صفحہ اسکیچ بک سے پھاڑنا ہوگا۔ وہ کچھ پریشان ہوگئی۔

لیکن اگلے ہی لمحے اسے اسکیچ بک کی ایک اضافی خوبی نظر آئی، جس نے اس کی پریشانی دور کر دی۔ اسکیچ بک کا ہر صفحہ ایسا تھا کہ اسے بآسانی اسکیچ بک سے الگ کیا جا سکتا تھا۔

لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کی اسکیچ بک اس یادگار تصویر سے محروم ہو۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس تصویر کو دوبارہ بنائے۔ ایک وہ پھپھا جان کو دے دی گی۔ اور دوسری اس کی اسکیچ بک میں محفوظ رہے گی۔

دوسری تصویر پہلی سے بھی اچھی بنی۔ اس نے سوچا۔ یہ وہ پھپھا جان کو دے دے گی۔

''ارجمند! چلو کھانا کھالو۔''

پھپھو کی پکار نے اسے چونکا دیا۔

''جی پھپھو! ابھی آئی۔''

اس نے چیزیں سمیٹ کر رکھیں اور کھانے کے لئے چلی گئی۔

''اسکیچ بک کیا مل گئی، تم تو بس اسی کی ہوگئیں۔'' پھپھو نے کہا۔

"وہ پھپھا جان سے وعدہ......"

نادرہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"گڑیا! ایسے ہی رشتہ نہیں جوڑتے، بری بات ہے۔" اس نے اسے ٹوکا۔

"مگر پھپھو! آپ سے شادی ہوگی تو پھر وہ پھپھا......"

نادرہ نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"اللہ ہی جانتا ہے کہ ایسا ہوگا یا نہیں۔ مگر ایسا ہونے سے پہلے تمہیں یوں نہیں کہنا چاہئے۔"

ارجمند کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ لیکن یہ کہتے ہوئے پھپھو کے لہجے میں ایسی گہری اداسی تھی کہ اس کا دل کٹنے لگا۔ وہ سہم گئی کہ پھپھو بھی یہی چاہتی ہیں لیکن ڈرتی ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ خوفزدہ ہیں۔ اب ایسے میں وہ ان سے بحث تو نہیں کر سکتی تھی۔

"تو پھر میں انہیں کیا کہوں پھپھو!" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"کچھ بھی کہہ لو۔ چچا کہہ لو۔"

"یہ بھی تو رشتہ جوڑنا ہی ہوگا پھپھو!"

نادرہ لاجواب ہوگئی۔

"سب مسلمان آپس میں بھائی ہوتے ہیں۔" اس نے کچھ جھنجلا کر کہا۔

"تو اس طرح وہ تمہارے بابا جان کے بھائی، اور تمہارے چچا ہی ہوئے نا؟"

"تو پھپھا میں کیا برائی ہے؟"

"یہ تو ان کا مجھ سے رشتہ جوڑنا ہوا نا؟" نادرہ اور جھنجلائی۔

"تو یہ تو ہونا ہی ہے نا پھپھو!"

"کیا پتا؟" نادرہ پھر افسردہ ہوگئی۔ پھر اچانک اس نے کہا۔

"تمہیں یقین ہے کہ تمہارا شہزادہ تمہیں ملے گا؟"

"جی پھپھو!"

"اور تم نے بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری آواز میں باتیں کرتے ہیں۔"

"جی پھپھو! انہوں نے ہی تو مجھے بتایا تھا۔"

نادرہ جھجکتی رہی مگر پھر اس سے رہا نہیں گیا۔

"تو میرے بارے میں بھی پوچھو نا؟"

"ٹھیک ہے پھپھو! اب پوچھوں گی۔"

❁ ❁ ❁

ویسے تو حمیدہ ہمیشہ سے ہی اس کے لئے مہربان اور شفیق تھی لیکن نور بانو نے محسوس کیا تھا کہ پچھلے چند دنوں سے وہ اس پر زیادہ ہی مہربان ہو رہی ہے۔ کبھی وہ اسے بلا کر اپنے پاس بٹھاتی، اور بہت غور سے اسے دیکھتی۔ پھر کہتی۔ اپنا خیال رکھا کر دھیے! دیکھو تو کتنی دبلی ہو رہی ہے۔

"ایسی کوئی بات نہیں اماں! تمہیں محبت کی وجہ سے ایسا لگتا ہے۔" وہ جواب دیتی۔

"کچھ کھاتی پیتی تو ہے نہیں۔ دیکھو رنگ روپ کو عورت سے منہ موڑتے دیر نہیں لگتی۔"

اور یہ سن کر نور بانو کو ڈر لگتا کہ جیسے وہ رنگ روپ کے نہیں، عبدالحق کے منہ موڑنے کی بات کر رہی ہے۔ دن بھر وہ اعتماد سے محروم، بولائی بولائی پھرتی۔ رات آتی تو وہ اپنے جادو کی آزمائش کرتی، اور جادو سر چڑھ کر بولتا تو وہ مطمئن ہو جاتی۔ وہ سوچتی کہ اماں تو یوں ہی ڈراتی رہتی ہیں مجھے۔

پھر ایک دن اماں نے اسے ایک پڑیا دی۔ اس نے کھول کر دیکھا تو وہ تلے چنے تھے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے حمیدہ کو دیکھا۔

"رات کو سونے سے پہلے چند دانے کھا لیا کر۔ اللہ فائدہ دینے والا ہے۔" حمیدہ نے کہا۔

"مگر کیوں اماں!"

"جو میں کہتی ہوں، خاموشی سے کر لے۔ حجت بازی، سوال جواب نہ

کیا مجھ سے۔'' حمیدہ کچھ جھنجلا گئی۔

''پھر بھی اماں!''

''کچھ تیرے نقصان کے لئے تو نہیں کہہ رہی ہوں گی میں۔ تیرا فائدہ ہی سوچتی ہوں ہمیشہ۔ ماں ہوں نا تیری۔''

بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نور بانو خاموشی سے وہ پڑیا اپنے کمرے میں لے آئی اور بیڈ کے سرہانے پر پھینک دی۔ اس نے سوچا، انکار کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اماں کو کون سا پتا چلے گا نہ کھانے کا۔

چند روز بعد حمیدہ نے اس سے پوچھا۔

''وہ میٹھے چنے تو ختم ہو گئے ہوں گے؟''

''جی اماں! کل رات ہی ختم ہوئے ہیں۔'' اس نے صاف جھوٹ بولا۔

حمیدہ نے اس بار نسبتاً ایک بڑا پڑا اس کی طرف بڑھایا۔

''لے..... یہ بتاشے ہیں۔ رات کو گرم دودھ میں دو تین بتاشے گھول کر پی لیا کر۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

اب تو نور بانو کو یقین ہو گیا کہ حمیدہ کوئی چکر چلا رہی ہے۔ اس نے سوچا، یہ ضرور اولاد کا چکر ہے۔ بڑی بی کہیں سے یہ چیزیں پڑھوا کر لائی ہیں کہ میں کھاؤں تو رام ہو جاؤں۔ اور یہ عبدالحق کی دوسری شادی کرا دیں۔

بہر حال بحث سے بچنے کا نسخہ تو اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اس نے بتاشوں کو بھی وہیں لے جا کر پھینک دیا مگر وہ بری طرح جھنجلا گئی تھی۔

پھر اس رات عبدالحق کی نظر ان دونوں چیزوں پر پڑ گئی۔

''یہ کیا ہے بھئی! چیونٹیاں آ رہی ہیں یہاں۔''

وہ گڑبڑا گئی۔

''کچھ نہیں! لایئے میں پھینک دوں۔''

مگر عبدالحق نے تجسس کے مارے پڑیا کھول لی۔

''ارے! یہ تو میٹھے چنے ہیں۔'' اس نے کہا۔ چیونٹیوں کی مہربانی سے میٹھے کی تہہ جگہ جگہ سے غائب ہو گئی تھی، اور چنے کی جھلکیاں نظر آ رہی تھیں۔

بتاشے بھی کھوکھلے ہو گئے تھے۔

نور بانو نے دونوں چیزیں اس سے لینے کی کوشش کی مگر وہ اڑ گیا۔

''پہلے مجھے بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟'' اس نے کہا۔

''یہ تم نے یہاں رکھے کیوں؟ اور رکھے تو کھائے کیوں نہیں؟''

رات کی رانی اپنے پورے مان کے ساتھ جاگ اُٹھی۔

''میں کیوں کھاؤں؟'' اس نے تنک کر کہا۔

''تو یہاں رکھے کیوں؟''

''غلطی ہوئی۔ مجھے پہلے ہی پھینک دینے چاہئیں تھے۔'' نور بانو اور جھنجلا گئی۔

''ایسی کیا بات ہے؟'' عبدالحق نے کہا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا۔ یہ تو اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اماں اس کے لئے ایک بیٹے کی تلاش میں مزاروں کی خاک چھان رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہی یہ چیزیں لائی ہوں۔

''اماں نے دیئے تھے یہ تمہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''مجھے نہیں معلوم ہے۔ میں پوچھ رہا ہوں تم سے۔'' عبدالحق نے بڑے تحمل سے کہا۔

''ہاں..... انہوں نے ہی دیئے تھے۔''

عبدالحق کو اس کے لہجے کی جارحیت بہت بری لگی۔

''تو تم نے کھائے کیوں نہیں؟''

''میں کیوں کھاؤں؟ ان کا مقصد پورا کر دوں؟''

''اور تمہارے خیال میں ان کا مقصد کیا ہے؟''

''یہی کہ میں گونگی بہری ہو جاؤں۔ تا کہ وہ من مانی کر سکیں۔'' نور بانو اس کے لہجے کی تبدیلی کو محسوس نہیں کر سکی تھی۔ اس کے لہجے میں اشتعال بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''اور تمہارے خیال میں وہ من مانی کیا ہے؟ جو وہ کرنا چاہتی ہیں؟''

''اولاد کی خاطر دوسری شادی کرانا، اور کیا؟''

عبدالحق کو ایسا شاک لگا کہ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکا۔ حیرت اور ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے؟''

''سنو نوربانو! جو کچھ تم نے کہا، وہ بہت شرم ناک ہے۔ بات اتنی سی نہیں کہ میں آئندہ ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتا، میں چاہتا ہوں کہ تم آئندہ ایسی بات سوچنے کی بھی غلطی نہیں کرو۔''

''لیکن میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔''

''غلطی کرنا برا ہوتا ہے نور! لیکن غلطی کے بعد اسی پر اصرار کرنا بدترین ہوتا ہے۔'' اس بار عبدالحق کا لہجہ بہت سخت تھا، اور آواز بھی بلند ہوئی تھی۔

''شیطان نے یہی تو کیا تھا۔''

نوربانو سہم گئی۔ اس نے عبدالحق کے یہ تیور پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اب چپ رہنے ہی میں عافیت تھی۔

''جب کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو وہ بغیر کہے سنے اس کو پوری طرح سمجھتا ہے اور جانتا ہے۔'' اب عبدالحق کے لہجے میں قدرے نرمی تھی۔

''تم اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ اماں اور میں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں۔''

اور میں اور تم؟ نوربانو نے دل میں سوچا۔ میں تو تمہیں جانتی اور سمجھتی ہوں۔ یعنی میں تو تم سے محبت کرتی ہوں۔ لیکن تم نہ مجھے جانتے ہو نہ ہی سمجھتے ہو۔ کیونکہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔

''میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ دوسری شادی کوئی برائی نہیں۔ اللہ نے چار کا حق دیا ہے مردوں کو۔ لیکن میں تمہارے علاوہ کسی سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے نہیں کروں گا۔'' عبدالحق کہہ رہا تھا۔

''اور یہ بات میں نے اماں سے کبھی نہیں کی۔ لیکن وہ جانتی ہیں۔ اس

کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسی وجہ سے وہ مجھے دوسری شادی کو نہیں کہتیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' نوربانو کو تو وہ تضاد لگا۔

''سمجھا رہا ہوں، کوشش کرو سمجھنے کی۔ اگر اماں مجھ سے دوسری شادی کو کہیں تو میں انکار کر دوں گا۔ لیکن اگر انہوں نے کبھی مجھے یہ حکم دے دیا تو میں انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ بات بھی اماں جانتی ہیں۔''

نوربانو کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ عبدالحق پر حمیدہ کے ایسے تسلط کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''تو جو کام صرف ان کے کہنے سے ہو سکتا ہے، اور اس میں کوئی شرعی رکاوٹ بھی نہیں، اس کے لئے وہ تمہیں پڑھے ہوئے میٹھے چنے اور بتاشے کیوں کھلائیں گی؟ یہ بات اپنی موٹی عقل میں بٹھا لو۔''

نوربانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عبدالحق نے کبھی اس سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔

''یہ آنسو اگر ندامت کے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ یہ کسی کام کے نہیں۔'' عبدالحق نے بے رحمی سے کہا۔

''تم بہت شکی اور وہمی ہو۔ اماں کو میری دوسری شادی کے لئے تمہیں گونگا بہرا بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں وہ میری اور تمہاری اولاد کے لئے در در ہاتھ پھیلاتی پھرتی ہیں۔ اس کے لئے وہ ماری ماری پھرتی ہیں۔ اور یہ پڑھے ہوئے چنے اور بتاشے لا کر تمہیں دیتی ہیں اور تمہاری سوچ یہ ہے؟''

اوہ! تو یہ بات ہے۔ نوربانو نے سوچا۔

''آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''میں نے کہا نا کہ محبت میں آدمی دوسرے کو سمجھتا اور جانتا ہے۔ یہ بتاؤ! اب تمہیں کچھ شرم آئی؟''

نوربانو نے کچھ نہیں کہا۔

''بس اب میں تمہیں ہر رات خود یہ کھلاؤں گا۔ لو یہ چنے کھاؤ۔''

اس کے لہجے میں ایسی سختی تھی کہ نوربانو انکار نہ کر سکی۔ باسی اور بدمزہ

چنے اس نے جیسے تیسے حلق سے اتارے۔ پھر وہ عبدالحق کی طرف مڑی۔

''آپ ان توہمات پر یقین رکھتے ہیں؟''

''نہیں! میں صرف اللہ پر یقین رکھتا ہوں۔ اور اسی سے مانگتا ہوں۔ لیکن اماں کے یقین کا بھی ویسے ہی احترام کرتا ہوں، جیسے اپنے یقین کا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بزرگوں کی دعاؤں سے لوگوں کو اولاد ملتی رہی ہے۔ بس اب سو جاؤ۔'' عبدالحق نے کہا اور دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

نوربانو کو اُمید تھی کہ ابھی وہ پلٹے گا اور...... لیکن ذرا دیر میں اسے احساس ہوا کہ وہ تو سو چکا ہے۔

وہ پہلا موقع تھا کہ عبدالحق نے اسے نظرانداز کیا تھا۔ اس کی تو نیند اُڑ گئی تھی۔ اب وہ صرف ایک بات پر سوچ رہی تھی۔ محبت ہو تو لوگ بغیر کچھ کہے ایک دوسرے کو سمجھ لیتے ہیں۔ جیسے عبدالحق اور حمیدہ۔

اب تک اسے یقین تھا کہ وہ عبدالحق سے محبت کرتی ہے اور عبدالحق اس سے محبت کرتا ہے۔ لیکن آج وہ اس پر غور کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اتنی قربت کے باوجود وہ عبدالحق کو جان، سمجھ نہ سکی۔ ورنہ بات یہاں تک پہنچتی ہی نہیں۔ وہ تو جھوٹی خوداعتمادی لئے بیٹھی تھی۔ مگر آج عبدالحق نے صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ حمیدہ اسے دوسری شادی کا حکم دے تو وہ انکار نہیں کر سکتا۔ جبکہ وہ سمجھتی تھی کہ عبدالحق اس کی مٹھی میں ہے۔

اس سے تو یہ ثابت ہوگیا کہ وہ عبدالحق سے محبت نہیں کرتی۔ ورنہ اتنی بڑی بات سے بے خبر نہ ہوتی۔

سوال یہ تھا کہ یہ محبت نہیں تو کیا ہے؟ وہ تو دہلی میں ہی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی۔ وہ اس محبت سے لڑتی رہی تھی۔ بلکہ نفرت کرتی رہی تھی۔ اس کی وجہ سے اسے تو محبت سے ہی نفرت ہوگئی تھی۔

مگر وہ اسے سمجھتی کیوں نہیں؟

شاید اس لئے کہ اس نے کبھی اسے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اسے حمیدہ کی وقتاً فوقتاً کہی ہوئی باتیں یاد آئیں۔ وہ اسے سمجھاتی رہی تھی۔ وہ اسے

بتاتی تھی کہ وہ اعتماد سے محروم ہے، اور شک بہت کرتی ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے عبدالحق نے بھی یہی کہا تھا۔ حمیدہ کہتی تھی، شک میں آدمی خود اپنے محبوب کو کھونے کا سامان کرتا ہے۔ اور حمیدہ کہتی تھی، محبت آسان نہیں۔ اس لئے کہ محبت دینے کا نام ہے، لینے کا نہیں۔ آدمی جس سے محبت کرتا ہے، اس کے فائدے کی ہر وقت فکر کرتا ہے، اور اس کے لئے اپنے نقصان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ کہتی تھی۔ محبت محبوب پر قابض ہونا نہیں سکھاتی بلکہ اسے اعتماد بھری آزادی دیتی ہے۔ وہ اسے بانٹتی ہے، تاکہ وہ پھیلے، اسے وسعت ملے، اسے اور محبتیں ملیں۔

اب وہ اس تعریف پر حمیدہ کی محبت کو جانچے تو بے شک وہ سچی محبت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے عبدالحق سے حمیدہ نے ہی ملایا تھا۔ وہ نہ چاہتی تو ان کی شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اور اب بھی...... اگر عبدالحق کی بات سچی ہے تو حمیدہ اس کے اور عبدالحق کے فائدے ہی کی سوچ رہی ہے۔ ورنہ دوسری شادی کرانا تو بہت آسان ہے اس کے لئے۔ اور وہ یہ بات بھی بتا چکی ہے کہ عبدالحق اس کی کوئی بات کبھی نہیں ٹال سکتا۔

تو عبدالحق اور حمیدہ کی باہمی محبت دونوں طرف سے سچی ہے۔ اور اس کی محبت؟

وہ تو عبدالحق پر یوں قابض ہونا چاہتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی کا بھی نہیں رہے۔ تو یہ محبت نہیں؟ حمیدہ کہتی تھی، یہ تو خود سے محبت کرنا ہے۔ تو وہ در حقیقت عبدالحق سے نہیں، خود سے محبت کرتی ہے۔

ذہن اسے تسلیم کر رہا تھا کہ اچانک اس کے مزاج کی مخصوص تند موج اسے اور ہر خیال کو بہا کر لے گئی۔ بکواس ہے، اس نے سوچا۔ ماں اور بیٹے کی محبت اور مرد اور عورت کی محبت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ وہ عبدالحق سے ماں جیسی محبت کیسے کر سکتی ہے۔ وہ تو اسے کبھی کسی کے ساتھ نہیں بانٹ سکتی۔

کسی عورت کے ساتھ ایک مرد کی حیثیت میں نہیں بانٹ سکتیں۔ اس کے اندر کسی نے کہا۔ لیکن تم تو حمیدہ سے، زرینہ سے، رابعہ اور زبیر سے۔ حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے بچوں سے بھی رقابت محسوس کرتی ہو۔

ہاں! میں ایسی ہی ہوں۔ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ وجہ یہ ہے کہ میں عبدالحق سے ایسی محبت کرتی ہوں کہ کسی نے کسی سے نہیں کی۔ ہوا چلے اور عبدالحق کو اس کا لمس اچھا لگے تو مجھے ہوا سے بھی رقابت ہوتی ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ کاش میں ہوا بن جاؤں۔

یہ محبت نہیں، دیوانگی ہے۔ اندر کی آواز نے کہا۔

اب وہ کمزور موقف کی وجہ سے اس پر بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے جلدی سے سوچ کا زاویہ بدل دیا۔ عبدالحق حمیدہ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ اسے نظر انداز کر کے دوسری شادی بھی کر سکتا ہے۔ تو اس کے لئے عبدالحق کی محبت کیسی ہے؟ کیا اس کی محبت، محبت کی تعریف پر پوری اترتی ہے؟ کیا وہ اسے سمجھتا ہے؟

یہ سوچ کر وہ گھبرا گئی۔ اگر وہ اسے سمجھتا اور جانتا تو اس سے محبت کیسے کرتا۔ اس کی تنگ دلی، اس کا حسد، اس کا گھٹیا پن...... یہ سب کچھ جان کر کوئی کسی سے کیسے محبت کر سکتا ہے۔

لیکن اسے یاد آیا، ابھی کچھ دیر پہلے عبدالحق نے اسے پہلی بار برا بھلا کہا تھا۔ اسے شکی اور وہمی کہا تھا۔ اور سچ کہا تھا۔ اس کا تو مطلب ہے کہ وہ اسے سمجھتا ہے۔ لیکن کیونکہ کسی کو برا کہنے کی اس کی عادت نہیں، اس لئے کچھ کہتا نہیں۔ آج اس کی برداشت جواب دے گئی تو اس نے کہہ دیا۔ لیکن عین ممکن ہے کہ یہ نتیجہ اس نے اس کی آج کی باتوں سے اخذ کیا ہو۔

اسے احساس ہوا کہ وہ عجیب مشکل میں پھنس گئی ہے۔ وہ یہ مان لے کہ عبدالحق اسے جانتا، سمجھتا ہے تو اسے گھبراہٹ اور شرمندگی ہوتی ہے کہ وہ اس کے گھٹیا پن سے واقف ہے۔ ایسے میں وہ اس سے کتنے دن محبت کر سکے گا۔ بالآخر وہ اس سے دُور ہو جائے گا۔

اور اگر وہ مان لے کہ عبدالحق اسے نہیں سمجھتا تو اس کے سینے میں یہ سوچ کر آگ بھڑک اُٹھتی ہے کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ وہ صرف جسمانی ضرورت کی وجہ سے اس کا اسیر ہے۔ اور یہ خود کو عدم تحفظ میں مبتلا کرنے والی

بات تھی۔ وہ تو خوب صورت بھی نہیں۔ دنیا میں ایک سے ایک خوب صورت عورتیں پڑی ہیں۔ جانے کب اسے کوئی بہا لے جائے۔

آخر میں اس کی تان حمیدہ پر ٹوٹی۔ یہ سارا فساد اماں ہی کی وجہ سے ہے۔ اس نے سوچا۔ وہ واقعی اس کے دل کا کانٹا بن گئی ہیں۔ ایک لمحے کو اس کے دل میں ملامت ابھری کہ وہ بے چاری تو اسے امی سے بڑھ کر چاہتی ہیں۔ ہمیشہ اس کی بھلائی کی فکر کرتی ہیں۔ لیکن وہ ان کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔

❁ ❁ ❁

پندرہ تاریخ آ گئی تھی۔ اب بیچ میں صرف دو دن تھے۔ ان اٹھائیس دنوں میں نادرہ کو ہر روز ایسا لگا تھا کہ کسی بھی لمحے کوئی آ جائے گا۔ اور اس بات سے وہ ڈرتی تھی۔ پھر اس پر شرمندہ بھی ہوتی تھی کہ وہ اپنے عہد کو بھول کر نفس کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔

اب تک وہ عارف کے ساتھ مستقبل کا تصور کرنے سے بچتی رہی تھی۔ لیکن اب وہ سامنے کی بات لگتی تھی۔ اس نے سوچا۔ یہ دو دن اور گزر گئے تو سترہ تاریخ کو کیا ہوگا؟ عارف آئے گا، اور اسے اور ارجمند کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔

وہ دن اس نے بہت بھاری گزارے تھے۔ لیکن پندرہ تاریخ کی اس صبح وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے خود کو ٹٹولا۔ وہ پوری سچائی کے ساتھ کہہ سکتی تھی کہ اللہ کو گواہ بنا کر کئے گئے اپنے عہد کے بارے میں وہ مخلص تھی اور یہ بھی کہ اللہ کے ہر فیصلے میں وہ خوش تھی۔ اسے یقین تھا کہ جو فیصلہ بھی ہوگا، اس میں اس کی بہتری ہوگی۔ نیلم بائی نے جو کچھ اس کے نام کیا تھا، وہ ثمن کو بتائے بغیر اس کے نام کر چکی تھی۔

اس عرصے میں اچھو میاں نے اسے بہت سہارا دیا تھا۔ وہ اسے سمجھاتے رہے تھے، زندگی کے مثبت اور روشن پہلوؤں کو دیکھنے کی تلقین کرتے

رہے تھے۔ ویسے ہی وہ اس کے لئے بہت بڑا سہارا تھے۔ اس کے جسم کا رواں رواں ان کے لئے دعا کرتا تھا۔

اخبار دیکھتے ہوئے وہ اس تصویر کو دیکھ کر بری طرح چونکی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ لیکن دھوکے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ سو فیصد ٹھاکر اوتار سنگھ کی تصویر تھی۔

بس ایک معمولی سا فرق تھا۔ تصویر میں وہ اس کے تصور کے مقابلے میں کچھ بڑا بڑا سا لگ رہا تھا۔ مگر یہ بھی قدرتی بات تھی۔ اس کے تصور اور اس تصویر کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا۔

دیر تک وہ اس تصویر کو دیکھتی اور سوچتی رہی کہ کیا یہ اس کی دعاؤں کا جواب ہے۔

پھر بالآخر اس نے تصویر کے نیچے عبارت پر نظر ڈالی۔ عبدالحق ولد عبداللہ، جنہوں نے اس سال بی اے کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔

اس کا ذہن الجھنے لگا۔ کیا یہ کوئی غیر معمولی مشابہت ہے؟ ہم شکل بھی ہوتے تو ہیں، اگر ولدیت نہ لکھی ہوتی تو وہ یہ سوچ سکتی تھی کہ اوتار سنگھ مسلمان ہوگیا ہوگا۔ لیکن صاحب تصویر کا باپ بھی مسلمان تھا۔ نہیں...... یہ اوتار سنگھ نہیں ہوسکتا۔

اس سوچ کے بعد وہ اسے نظرانداز کر کے بھول جاتی۔ لیکن اسے احساس تھا کہ اس پر بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ عجلت میں اوتار سنگھ کے عبدالحق نہ ہونے کا فیصلہ یہ شبہ پیدا کرتا تھا کہ وہ اپنے من پسند مستقبل کے لئے راہ ہموار کر رہی ہے۔ یہ عبدالحق بے شک ایک بند دروازہ تھا۔ لیکن اس پر دستک دینا، اسے کھلوا کر دیکھنا کہ کہیں اس کے پیچھے وہ راستہ تو نہیں، جس کے لئے وہ دعا کرتی رہی ہے، اس کی ذمہ داری ہے۔ اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کے ضمیر پر زندگی بھر بوجھ رہے گا۔

اس کے باوجود وہ دیر تک سوچتی اور الجھتی رہی۔ اس سلسلے میں کیا قدم

اٹھائے، کیا کرے؟ اور جو کچھ بھی کرنا تھا، بہت جلدی کرنا تھا۔ کیونکہ وقت بہت کم تھا۔ پرسوں سترہ تاریخ تھی۔

اس نے اچھو میاں کو بلالیا۔

''ایک بہت اہم اور ضروری کام ہے نواب صاحب!''

''کہو بیٹا!''

نادرہ نے اخبار میں چھپی تصویر اسے دکھائی۔

''ان صاحب کا پتا معلوم کرنا ہے اور پھر ان سے ملنا ہے۔''

اچھو میاں بھونچکے رہ گئے۔

''صرف تصویر سے پتا کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟''

''مشکل تو ہے، ناممکن نہیں۔ اخبار کے دفتر سے معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر یہ اللہ کی طرف سے ہے تو خود بخود آسانی ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے بیٹا!'' اچھو میاں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''لیکن پتا معلوم کر کے پہلے میرے پاس آیئے گا۔''

❁ ❁ ❁

اچھو میاں کے لئے وہ بہت طویل دن تھا۔

اخبار کے دفتر میں تو ایک منشی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اچھو میاں کے استفسار پر وہ بولا۔

''یہ تو رات کی دنیا ہے جی، دن میں تو بس میں ہی ہوتا ہوں یہاں۔ کام کیا ہے آپ کو؟''

اچھو میاں نے اخبار میں چھپی تصویر دکھائی اور مدعا بیان کیا۔

''میں تو نہیں سمجھتا جی کہ اس کا پتا ہمارے دفتر میں کسی کو بھی معلوم ہوگا۔''

''کیوں بھئی؟''

''دیکھو نا، یونیورسٹی نے نتیجے کا اعلان کیا۔ چھاپنے کے لئے ہمیں دیا۔ اول، دوم، اور سوم نمبر پر آنے والوں کی تصویریں ہمیں دیں۔ وہ سب ہم نے

چھاپ دیا۔ تو یہ تو خبر تھی نا، اب پاس ہونے والوں کا پتا تو خبر نہیں ہوتا۔"

بات معقول تھی۔

"تو پتا کہاں سے ملے گا؟" اچھو میاں نے پوچھا۔

منشی نے مشتبہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"پتے کی ضرورت کیوں ہے تمہیں؟"

"یہ بھتیجا ہے میرا۔ ہندوستان سے آتے ہوئے بچھڑ گیا تھا۔" اچھو میاں نے کہا۔

"ہاں! یہ تو بہت برا ہوا ہے۔" منشی نے آہ بھر کے کہا۔

"اب پتا تو تمہیں یونیورسٹی سے ہی مل سکتا ہے۔"

اچھو میاں یونیورسٹی چلے گئے۔ وہاں پہلے تو ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کس سے ملے، کس سے پوچھیں۔ اور جب سمجھ میں آیا تو چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔

وہ تھکے ہارے، مایوس اور ناکام لوٹ آئے۔

"چلیں، کوئی بات نہیں۔" نادرہ نے اپنی مایوسی چھپاتے ہوئے انہیں دلاسہ دیا۔

"جو نصیب میں نہ ہو، وہ ملتا نہیں۔ آپ کھانا کھائیں اور آرام کریں۔ تھک گئے ہوں گے۔"

لیکن اچھو میاں سے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ وقت بھی زیادہ ہو چکا تھا۔

شام کو وہ دُکان چلے گئے۔ نادرہ نے کام مکمل کر دیا تھا۔ وہ انہوں نے دکاندار کو لے جا کر دیا۔ دکاندار اور کپڑا دینے لگا تو انہوں نے منع کر دیا۔

"کیا بات ہے بڑے میاں! کسی دوسرے دکاندار سے بات بنا لی ہے کیا؟"

اچھو میاں کو بہت غصہ آیا۔ اس دکاندار کو ہمیشہ یہی شک ہوتا تھا کہ وہ کسی اور کے لئے کام کرنے لگیں گے۔

"یہ بات نہیں ہے میاں!" انہوں نے کچھ جھنجلا کر کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ پرسوں ہم یہ شہر چھوڑ جائیں۔ اس لئے ......"

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ جاؤ۔" دکاندار نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔

"اس کا امکان بہت کم ہے۔"

"ہے تو نا، دیکھو، اگر نہ جاؤ تو پھر کام میرے ہی لئے کرنا۔"

"ہم در در پھرنا پسند نہیں کرتے۔ بس ایک در کے ہو گئے، سو ہو گئے۔ اب تم حساب کر دو۔"

وہ پیسے لے کر واپس آئے۔

"اب تک کا حساب صاف ہو گیا ہے۔" انہوں نے پیسے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"رہنے دیجئے۔ اپنے پاس ہی رکھئے۔" نادرہ نے انہیں روک دیا۔

"کیوں؟"

"ایک بات کہوں، آپ خفا نہ ہوئیے گا۔"

"کہو بیٹا! ہم تم سے کیسے خفا ہو سکتے ہیں؟"

"زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو......"

اچھو میاں تڑپ گئے۔

"ایسی باتیں نہ کرو بیٹا!"

"دیکھئے، ایک پل کا پتا نہیں ہوتا۔ آدمی کو بات کر لینی چاہئے۔"

"تو ہماری زندگی کا پتا ہے تمہیں؟" اچھو میاں چڑ گئے۔

"اس بحث کو چھوڑیں، میری بات سنیں۔" نادرہ شاید اوتار سنگھ کا پتا نہ ملنے کی وجہ سے مایوسی اور دل گرفتہ تھی۔

"میں یہ نہیں چاہتی کہ مجھے موت یہاں آئے۔ مجھے یہاں نہ مرنے دیجئے گا۔"

اچھو میاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"دوسری بات یہ کہ کفن مجھے میری محنت کے پیسوں کا دیجئے گا۔"

"تمہاری محنت کے پیسے میرے پاس پہلے ہی بہت ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اچھو میاں نے پھر جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"میں نے کہا نا......" نادرہ کہتے کہتے رک گئی۔ اچھو میاں کا ہاتھ جیب میں تھا اور چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔

"کیا ہوا نواب صاحب!"

اچھو میاں نے کچھ کہا نہیں، البتہ جیب سے ہاتھ نکالا تو اس میں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ تھا۔

"ہم تو بھول ہی گئے تھے۔" انہوں نے کہا۔

"عارف میاں نے جاتے جاتے یہ تعارفی رقعہ ہمیں دیا تھا اور کہا تھا کہ کوئی بھی مسئلہ ہو تو ان صاحب کے پاس چلے جانا۔ یہ حل کر دیں گے۔"

"تو پھر......؟"

"یہ ہمارا مسئلہ حل نہیں کر سکتے؟ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں پتا مل جائے گا۔"

اب نادرہ کی سمجھ میں بات آئی۔ اس کی آنکھیں امید سے چمک اٹھیں۔

"مگر یہ ہیں کون؟"

"بہت بڑے افسر ہیں۔ عارف میاں کے استاد بھی ہیں۔"

"تو ان کا پتا ہے آپ کے پاس۔ کیونکہ اب تو رات ہو رہی ہے۔ دفتر تو بند ہو چکا ہوگا۔"

"گھر کا پتا بھی دیا ہے عارف میاں نے۔ بس میں چلتا ہوں۔ انشاء اللہ کام کر کے ہی آؤں گا۔"

❁ ❁ ❁

اچھو میاں کو مطلوبہ پتے پر پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ایک پرانے طرز کا چھوٹا سا بنگلہ تھا۔ انہوں نے گیٹ بجایا تو ایک نوجوان لڑکا آیا۔

"جی فرمایئے؟" اس نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

"بیٹے! مسعود احمد خان صاحب یہیں رہتے ہیں نا؟"

"جی......! لیکن اس وقت وہ گھر پر نہیں ہیں۔"

"کوئی بات نہیں، میں انتظار کر لوں گا۔"

"تو اندر آ جایئے۔"

اچھو میاں نے منع بھی کیا لیکن لڑکا انہیں اندر لے گیا۔ یہی نہیں، انہیں بٹھا کر وہ اندر گیا اور چند منٹ بعد ان کے لئے شربت لے آیا۔

اچھو میاں اس کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بڑے وضع دار شرفا کا گھرانہ ہے۔ بہرحال تھوڑی دیر بعد وہ بے چین ہونے لگے۔ وقت نکلا جا رہا تھا لیکن انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد مسعود صاحب آ گئے۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنا انتظار کرنا پڑا۔" انہوں نے معذرت کی۔

"فرمایئے! کیسے آنا ہوا؟ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟"

اچھو میاں نے عارف کا دیا ہوا رقعہ ان کی طرف بڑھا دیا۔

مسعود صاحب نے رقعہ پڑھا۔ ان کے چہرے پر محبت بھری نرمی پھیل گئی۔ عارف نے دس سال ان کی ماتحتی میں کام کیا تھا۔ وہ ہونہار بھی تھا اور دیانتدار بھی۔ لیکن اس کے ساتھ کچھ ذاتی، گھریلو قسم کے مسائل تھے۔ اس کے نتیجے میں وہ برے افسروں کی صحبت میں جا پھنسا، اور ان کے دور ہو گیا۔ مگر وہ اب بھی اس سے محبت کرتے تھے۔

"ہے کہاں وہ نالائق؟" انہوں نے اچھو میاں سے پوچھا۔

"اس کی تو پوسٹنگ کراچی ہو گئی تھی۔"

"جی......! مجھے نہیں معلوم۔"

مسعود صاحب ان سے پوچھنا چاہتے تھے کہ ان کا عارف سے کیا تعلق ہے، لیکن انہوں نے اسے مناسب نہیں سمجھا۔

"آپ یہ فرمایئے کہ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

اچھو میاں نے اخبار میں چھپی وہ تصویر انہیں دکھائی۔

"مجھے ان سے ملنا ہے، ان کا پتا چاہئے۔"

مسعود صاحب حیرت سے دیکھتے رہے۔ ابھی تو وہ عبدالحق کے گھر سے آ رہے تھے۔ وہ اس کے اول آنے کی خوشی کی مٹھائی لے کر گئے تھے۔ وہ بہت خوش تھے۔ مگر یہ......

"آپ عبدالحق کو کیسے جانتے ہیں؟"

اچھو میاں ایک لمحے کو ہچکچائے۔ مسعود صاحب نے جس طرح عبدالحق کا نام لیا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس سے واقف ہیں۔ ایسے میں وہ اسے اپنا بھتیجا کہتے تو کوئی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔

"جی......! میری بھتیجی دہلی میں ان کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔" انہوں نے کہا۔

"تصویر دیکھ کر وہ بے تاب ہوگئی کہ بس ان سے ملنا ہے۔"

مسعود صاحب اندر جا کر کاغذ اور قلم لائے اور عبدالحق کا پتا لکھ کر انہیں دے دیا۔

اچھو میاں کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ پتا اتنی آسانی سے انہیں مل گیا ہے۔

"آپ نے تو واقعی بہت بڑا مسئلہ چٹکی بجاتے ہی حل کر دیا۔ بہت شکریہ آپ کا۔" انہوں نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ عبدالحق میرے لئے بیٹے جیسا ہے۔" مسعود صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بلکہ اس وقت میں اس کے گھر ہی گیا تھا، مبارک باد دینے۔ اگر اس کی جگہ آپ کسی اور کا پتا جاننا چاہئے تو کم از کم آج تو میں آپ کی مدد نہ کر سکتا تھا۔ البتہ کل کوشش کرتا۔ اور اس میں بھی وقت لگتا۔"

"میں اجازت چاہتا ہوں۔" اچھو میاں اٹھ کھڑے ہوئے۔

باہر نکل کر انہوں نے سوچا کہ عبدالحق کا گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔

لیکن نہیں، وہ اسے سے کیا کہتے۔ انہیں تو پہلے نادرہ کے پاس جانا تھا۔

❁ ❁ ❁

نادرہ کو خوشی بھی تھی اور اسے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ ابتداء میں تو ایسا لگا تھا جیسے یہ معاملہ بنے گا ہی نہیں۔ مگر پھر بہت تیزی سے بات بنتی گئی۔ اور اب اچھو میاں اس عبدالحق کا پتا لے آئے تھے جو اس کے خیال میں اوتار سنگھ ہو سکتا تھا۔

اس نے کلاک میں وقت دیکھا رات کے نو بج چکے تھے۔ ارجمند سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔ یہ اچھی بات تھی۔ اگر یہ عبدالحق وہی ہے تو وہ ارجمند کی وجہ سے اسے یہاں نہیں بلا سکتی تھی۔ مگر یہ قدرتی طور پر بہت اچھا وقت بن گیا تھا۔ اب اس وقت اس کا نکلنا تو مناسب نہیں تھا اور ارجمند کے سونے کے بعد اسے یہاں بلانے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔

لیکن اسے اچھو میاں پر ترس آنے لگا۔ صبح سے ہی وہ اس بھاگ دوڑ میں لگے تھے۔ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا تھا انہوں نے۔ اور اب انہیں پھر دوڑنا تھا۔

یہ بات اس نے اچھو میاں سے کہی تو وہ برا مان گئے۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ اب یہ تو ہمارا کام ہے اور کون کرے گا؟" انہوں نے احتجاج کیا۔

"اچھا! اب کھانا تو کھا لیں۔"

"اب اس معاملے کو نمٹا کر ہی بیٹھیں گے۔"

"دیکھیں، اب میں اس کے لئے رقعہ لکھوں گی۔" نادرہ نے کہا۔

"آپ اتنی دیر میں کھانا کھا لیں۔ ویسے بھی کوئی جلدی تو ہے نہیں۔"

"کیوں؟"

"میں چاہتی ہوں کہ وہ آئے تو ارجمند سو چکی ہو۔"

"لیکن بیٹا! اگر وہ ...... وہ نہ ہوئے جو تم سمجھ رہی ہو تو اتنی رات کو زحمت دینا......"

"جی ہاں! لیکن مجبوری ہے۔ اس شرمندگی سے تو نہیں بچ سکتے۔"

نادرہ نے انہیں کھانا لا دیا۔ انہوں نے اس سے بھی کھانے کو کہا۔ لیکن اسے رقعہ لکھنا تھا۔ ویسے بھی ابھی تو وہ کھا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس امکان نے اس کی بھوک اُڑا دی تھی۔

لیکن رقعہ لکھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ اچھو میاں بھی بے دلی سے کھا رہے ہیں۔ شاید ان کی بھی اس جیسی ہی کیفیت تھی۔

اس نے رقعہ لکھ کر، تہہ کر کے اچھو میاں کی طرف بڑھایا۔

''یہ آپ اسے دے دیجئے گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا!'' اچھو میاں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے جانے کے بعد وہ بے چینی سے ادھر ادھر پھرتی رہی۔ کوٹھے کی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور ارجمند سو گئی تھی۔ مگر اسے قرار نہیں تھا۔ یہ معاملہ بہت اہم تھا۔

یہ ایسی بات تھی کہ لمحوں میں زندگی کا رخ بدل سکتا تھا۔ اگر وہ کوئی اور عبدالحق تھا تو بات یہیں ختم ہو جاتی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہتا۔ مگر اس صورت میں بھی زندگی کا رخ تو بدلنا ہی تھا۔ کوئی بڑا فیصلہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ پندرہ تاریخ اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے بعد درمیان میں صرف ایک دن تھا۔ سولہ تاریخ۔ اور سترہ تاریخ کی صبح ..... اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ نہ جانے کیا فیصلہ ہو؟

پھر اس نے سوچا، ابھی تو یہ معاملہ اہم ہے۔ اگر یہ وہی اوتار سنگھ ہے تو کیا ہوگا؟

اس کے ذہن میں تو یہ تھا کہ وہ ارجمند کو اس کے سپرد کر دے گی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے پاس ارجمند ہر طرح سے محفوظ رہے گی۔ بلکہ اس کا مستقبل بھی محفوظ ہوگا۔ بس ایک پیچیدگی تھی۔ وہ ارجمند کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ ابتداء میں تو اس نے سوچا تھا کہ یہ بچپن کی بات ہے۔ ہوتے ہوتے غیر اہم آ جائے گی۔ ایسی کہ بعد میں اسے یاد کر کے خود ارجمند بھی ہنسا کرے گی۔ لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ اس کی یہ سوچ غلط تھی۔ وہ سوچ تو بچی ہی کی تھی۔ لیکن

قدرت نے اسے پختگی دے دی تھی اور یہی نہیں، ارجمند کو یقین بھی تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اللہ میاں اس سے باتیں کرتے ہیں۔

سوال یہ تھا کہ کیا وہ عبدالحق اس پیچیدگی کو سنبھال پائے گا؟ یہ معاملہ اس بیچارے کے لئے مصیبت تو نہیں بن جائے گا۔

پھر اس نے سوچا، یہ تو قبل از مرگ واویلا والی بات ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ عبدالحق ماضی کا اوتار سنگھ ہی ہو۔

مگر اس کی بے چینی کم نہیں ہوئی۔ وہ ٹہلتی رہی۔

❁ ❁ ❁

صادق گیٹ کو تالا لگا کر اپنے کوارٹر میں آ چکا تھا۔ وہ سونے کے لئے لیٹ ہی رہا تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔

''یہ کون آ گیا اس وقت؟'' نسیمہ نیند میں ڈوبی آواز میں بڑبڑائی۔

''تم سو جاؤ۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔'' صادق نے کہا۔ پھر جاتے جاتے اسے خیال آیا تو اس نے دیوار پر کیل سے لٹکی چابی اُتار لی۔

اس نے گیٹ کی کھڑکی کو کھول کر باہر دیکھا۔ باہر سفید بالوں اور داڑھی والا ایک معمر شخص کھڑا تھا۔ وہ بہت باوقار لگ رہا تھا۔

''ہاں بابا! کیا بات ہے؟'' صادق نے پوچھا۔

''ہمیں عبدالحق صاحب سے ملنا ہے۔'' معمر شخص نے بڑے وقار سے کہا۔

بات چیت سے تو نواب لگتا ہے۔ صادق نے سوچا۔ لباس صاف ستھرا ضرور ہے لیکن قیمتی نہیں۔

''دیکھو بابا! صاحب تو سونے کے لئے چلے گئے ہیں۔ صبح آ جانا۔''

''میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

''اس وقت تو نہیں مل سکتے۔''

باہر کھڑے اچھو میاں نے تیزی سے سوچنے کی کوشش کی کہ اس چوکیدار کو کیسے متاثر کیا جائے۔

"یہ بہت اہم معاملہ ہے۔" بالآخر انہیں کچھ سوجھ گئی۔

"مجھے مسعود صاحب نے بھیجا ہے۔"

اس کا فوری نتیجہ برآمد ہوا۔ صادق نے گیٹ کھولا اور اسے لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ پھر وہ عبدالحق کے پاس گیا، جو اس وقت حمیدہ کے پاس بیٹھا تھا۔

"صاحب! مسعود صاحب نے کسی بزرگ کو بھیجا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"انہیں اندر بٹھایا کہ نہیں؟" عبدالحق فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"جی صاحب! وہ ڈرائنگ روم میں ہیں۔"

عبدالحق ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اچھو میاں وہاں کھڑے تھے۔

"ارے! آپ کھڑے کیوں ہیں؟ تشریف رکھئے نا!"

"ناوقت تکلیف دینے پر شرمندہ ہوں۔" اچھو میاں نے کہا۔

"معاملہ اہم نہ ہوتا تو ....."

"اس تکلیف میں نہ پڑیئے! بیٹھ کر سکون سے بات کریں۔ چچا جان کیسے ہیں؟ خیریت تو ہے نا؟"

اچھو میاں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ مسعود صاحب کو چچا جان کہہ رہا ہے۔

"جی وہ ٹھیک ہیں، میں یہ رقعہ لایا ہوں آپ کے لئے۔" انہوں نے رقعہ اس کی طرف بڑھایا۔

عبدالحق نے رقعہ کھولا۔ پہلی سطر پڑھتے ہی وہ حیران رہ گیا۔ بغیر خطاب و القاب کے لکھا تھا۔

"یہ رقعہ ٹھاکر اوتار سنگھ کے لئے ہے۔ اگر آپ وہ نہیں ہیں تو آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ رقعہ نواب صاحب کو واپس کر کے انہیں بتا دیجئے کہ آپ مطلوبہ آدمی نہیں ہیں۔ اور اگر آپ کبھی ٹھاکر اوتار سنگھ تھے تو یہ رقعہ آپ

ہی کے لئے ہے۔"

عبدالحق نے اس مختصر سی تحریر کو کئی بار پڑھا۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ یہ تو ماضی سے آنے والی کوئی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اس نے سوچا۔ کوئی ایسا شخص، جو میرا پرانا واقف کار ہے۔ لیکن اسے میرے مسلمان ہونے کا علم نہیں۔

کون ہو سکتا ہے وہ؟ اس کا تجسس بھڑک اٹھا۔ اس نے صفحہ پلٹا اور وہاں لکھی تحریر پڑھی۔ وہ بھی مختصر ہی تھی۔

"ٹھاکر! مجھے نہیں معلوم کہ میں تمہیں یاد ہوں یا نہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ تم میری واحد امید ہو۔ یہاں میرا تمہارے سوا کوئی جاننے والا نہیں۔ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ اور تمہارے سوا کوئی میری مدد نہیں کر سکتا۔

میں تمہیں یاد دلا دوں کہ دہلی میں کالج کی تعلیم کے دوران میں تمہاری کلاس فیلو تھی۔ شاید تمہیں جیمز اور ریٹا پارسن، محمود، امرتا، پشپا اور رام گوپال یاد ہوں۔ اور ریٹا کے گھر ہونے والی پارٹی ....."

وہ میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ عبدالحق نے سوچا۔

اچھو میاں اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل میں روشنی ہو گئی تھی۔ یہ یقیناً مطلوبہ آدمی تھا۔

عبدالحق آگے پڑھنے لگا۔

"یاد ہو اور شاید تمہیں نادرہ بھی یاد ہو۔ تو میں وہی نادرہ ہوں ٹھاکر! اگر تم میری مدد کرنا چاہتے ہو تو اسی وقت نواب صاحب کے ساتھ میرے پاس چلے آؤ۔ باقی باتیں بالمشافہ ہوں گی۔"

نادرہ! اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں؟ عبدالحق نے سوچا۔ اس نے ہی تو مجھے کلمہ سکھایا تھا۔ اور اس کی اہمیت مجھے بتاتی تھی۔ اس کا تو احسان ہے مجھ پر۔

اس نے دروازے کی طرف رخ کر کے صادق کو پکارا۔ ایک منٹ بعد صادق اندر آیا تو اس نے کہا۔

''یعقوب سے کہو کہ فوراً گاڑی نکالے۔ مجھے کہیں جانا ہے۔''

''بہتر صاحب!''

❁ ❁ ❁

گاڑی کو مین روڈ پر لانے کے بعد عبدالحق نے کہا۔

''اب بتایئے! کہاں جانا ہے نواب صاحب!''

اچھو میاں نے چونک کر اسے دیکھا۔ مگر اگلے ہی لمحے ان کی سمجھ میں آ گیا کہ نادرہ نے اس رقعے میں انہیں نواب صاحب لکھا ہوگا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''شاہی بازار۔''

عبدالحق نے بھرپور کوشش کر کے اپنے چہرے کو بے تاثر رکھا۔ اور اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ یعقوب کو ساتھ نہیں لایا۔

اس کے حکم پر صادق نے یعقوب کو سوتے سے اٹھایا تھا۔ وہ چلنے کے لئے تیار بھی تھا۔ حکم کا بندہ جو ٹھہرا۔ لیکن عبدالحق نے اس کا ہاتھ چھو کر دیکھا تو پتا چلا کہ اسے بہت تیز بخار ہے۔ بس پھر اس نے یعقوب کے اصرار کے باوجود اسے آرام کرنے کا حکم دیا اور خود ہی گاڑی نکال لی۔

اور اب اس کی افادیت سامنے آ رہی تھی۔ شاہی بازار اور نادرہ؟ اچھا ہی ہے، پردہ رہ گیا۔ یعقوب ساتھ آتا تو گواہ بن جاتا۔

اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے کن انکھیوں سے نواب صاحب کو دیکھا۔ نواب کا شاہی بازار میں کیا کام؟ اس نے سوچا۔ نواب نام بھی تو ہوتا ہے۔ ذہن میں جوابی سوچ اُبھری۔

اب وہ پھر کن انکھیوں سے ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کے سر اور داڑھی کے بال مکمل طور پر سفید تھے۔ اس سے ضعیفی کا تاثر بنتا تھا۔ لیکن چہرے پر تازگی اور روشنی تھی۔ وہ چہرہ جوان تو نہیں، البتہ ادھیڑ عمری کا چہرہ ضرور تھا۔

دوسرے اس پر واضح طور پر نیکی تحریر تھی۔ ایسے آدمی کا شاہی بازار میں کیا کام؟

اس کی آنکھوں میں زرینہ کا چہرہ ابھر گیا۔ زرینہ جسے وہ اپنی بہن سمجھتا تھا۔ کیا وہ شاہی بازار کے قابل تھی؟ لیکن وہ اسے وہیں ملی تھی۔ وہاں تو کوئی بھی پہنچ سکتا تھا۔ جو اللہ کی عافیت میں ہیں، وہ اس بازار سے وابستہ ہر مرد اور عورت کو مطعون کرتے ہیں، مجرم سمجھتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ تقدیر جو انہیں بھی اس قابل نفرت مقام پر پہنچا سکتی ہے۔

وہ نادرہ کا شاہی بازار میں تصور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی سوچوں کا رُخ موڑ دیا۔ وہ اس نادرہ کو یاد کرنے لگا، جو دہلی میں اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔

ادھر اچھوں میاں بھی اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی آدمی ہے۔ عمر تو اس کی زیادہ نہیں تھی۔ لیکن شاہی بازار کے حوالے پر جس طرح اس نے اپنے ردِعمل پر قابو رکھا تھا، وہ آسان نہیں تھا۔ اس سے اس کا رکھ رکھاؤ بھی ثابت ہوتا تھا، اور انسانیت نوازی بھی۔ نادرہ نے اس سے امید لگائی تھی، تو غلط نہیں لگائی تھی۔ شاہی بازار کے حوالے پر اس نے نادرہ کے بارے میں کچھ پوچھا بھی نہیں تھا۔

''ایسا کریں کہ یہاں روک دیں۔'' اچھو میاں نے کہا۔

''آگے تھوڑا فاصلہ ہے۔ ہم پیدل طے کر لیں گے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے نواب صاحب! آگے کوئی کیچڑ تو ہے نہیں کہ گاڑی کے گندے ہونے کا ڈر ہو۔ اور ہو تو بھی کیا؟ گاڑی کو تو ہر طرح کے راستوں پر چلنا ہوتا ہے۔''

اچھو میاں شرمندہ ہو گئے۔ وہ اب بھی انہیں نواب صاحب کہہ رہا تھا۔

وہ راستہ بتانے لگے۔ چند لمحے بعد انہوں نے گاڑی رکوائی اور نیچے اترے۔ عبدالحق شیشے چڑھا کر گاڑی لاک کر رہا تھا۔

اس خیال سے اچھو میاں کو حیرت ہوئی کہ اتنا راستہ انہوں نے طے کیا، اور ان میں سے کسی نے بھی نادرہ کا تذکرہ نہیں چھیڑا۔ یہ عبدالحق یقیناً بڑا عالی

ظرف اور گہرائی والا جوان ہے۔

''جی نواب صاحب!''

عبدالحق کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

''جی.....! تشریف لائیے۔'' انہوں نے کہا۔ ہارمونیم، طبلے کی آواز اور گھنگھروؤں کی آواز جیسے وہ پہلی بار سن رہے تھے، اور اس سے انہیں شرمندگی ہو رہی تھی۔

یہ بھی اس جوان کا کمال ہے۔ زینے پر قدم رکھتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

✿ ✿ ✿

وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے یوں دیکھ رہے تھے، جیسے گویائی سے محروم ہو گئے ہوں۔ وہ دونوں کے لئے شاک تھا۔ عبدالحق نے نادرہ کو بارہا یاد کیا تھا، لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اسے یہاں ملے گی۔ اسی طرح نادرہ اس سے ملنے کی دعائیں کرتی رہی تھی، لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ وہ کبھی آئے گا۔ اس کے نزدیک اوتار سنگھ کو تو ہندوستان میں ہی ہونا تھا۔

وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ وہ خاموشی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دبیز ہوتی جا رہی تھی۔

پھر عبدالحق نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

''مجھے افسوس ہے نادرہ! کہ وقت نے تمہیں یہاں لا پھینکا۔''

اور وہ جادوئی لفظ تھے۔ کوٹھے پر پہلی بار کسی اپنے نے وہ الفاظ کہے تھے۔ نادرہ کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے وجود میں کیسی کالی گھنا تلی کھڑی ہے۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ایسے کہ خود کو سنبھالنا ناممکن ہو گیا۔ پہلی بار سچی ہمدردی کے پرخلوص بول اس کے کانوں نے سنے تھے۔

عبدالحق اس کے پاس چلا آیا اور اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

''نہیں نادرہ! اب نہیں! اب تو رونے کا دور سمجھو کہ ختم ہو گیا۔''

وہ لمس بھائی جان کے ہاتھوں کا تھا۔ وہ ابا جان تھے۔ نادرہ کے اندر کا طوفان اور بپھر گیا۔ وہ عبدالحق سے لپٹ گئی۔

عبدالحق کبھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا، کبھی اس کی پیٹھ تھپ تھپاتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟

بالآخر طوفان تھم گیا۔ عبدالحق اپنی جگہ جا بیٹھا۔

نادرہ اب شرمندہ ہو رہی تھی۔

''تمہارے لفظوں نے سارے زخم ہرے کر دیئے۔ کسی اپنے کی کسی ایسی ہی ہمدردی کو تو ترس رہی تھی میں۔'' اس نے کہا۔

''اگلا جملہ تو تم نے مجھے بولنے ہی نہیں دیا تھا نادرہ! تم ایسے روئیں کہ میں سب کچھ بھول گیا۔''

نادرہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ جیسے اگلے جملے کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔

''مگر مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ اب انشاء اللہ تم یہاں نہیں رہو گی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن تم نے مجھے ڈھونڈا کیسے؟''

''تم نے تاپ کیا، تمہاری تصویر چھپی اخبار میں۔ پھر پتا چلایا۔'' نادرہ نے کہا۔ پھر وہ پہلی بار مسکرائی۔

''مجھے بھی بہت بڑی خوشی ملی۔ پتا ہے میں میرا بہت جی چاہتا تھا کہ تم مسلمان ہوتے۔''

آٹھ برس بعد ملنے والوں کو اس درمیانی عرصے کی روداد بھی کہنی اور سننی تھی۔ عبدالحق کی کہانی تو طویل نہیں تھی۔ لیکن نادرہ پر گزرنے والے وہ آٹھ برس بہت طویل تھے۔ اس کی کہانی سنتے ہوئے عبدالحق بار بار مٹھیاں بھینچتا تھا۔

نادرہ نے اسے سب کچھ سنا دیا۔ سب کچھ بتا دیا۔ ارجمند کے بارے میں، اچھو میاں کے بارے میں اور عارف کے بارے میں۔

''دیکھو اللہ کی کرنی، ایک ماہ پورے ہونے سے پہلے ہی مجھے تم سے ملا

دیا۔"

"واقعی……! اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔"

"اور یہاں، اس مقام پر بھی تم پر کیسے کیسے کرم فرمائے۔ نواب صاحب اور عارف جیسے لوگ، اور یہاں رزقِ حلال کی عطا، کوئی معمولی بات تو نہیں۔ مجھے تو فخر ہو رہا ہے تم پر۔"

"نہیں اوتا…… عبدالحق! یہ تو مقامِ شکر ہے۔" نادرہ نے کہا۔ پھر شرمندہ ہو کر بولی۔

"زبان پر وہ نام چڑھا ہوا ہے نا! آسانی سے تو نہیں اُترے گا۔" پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔

"اگر میں تمہیں ٹھاکر کہوں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا۔"

"نہیں بھئی! برا کیوں لگے گا؟ مجھے اللہ نے ٹھاکر پیدا کیا ہے۔ قبیلہ تو آدمی کی پہچان ہوتا ہے۔" عبدالحق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔

"یہ بتاؤ! مجھ سے کیا چاہتی ہو تم؟"

"میں چاہتی ہوں کہ میری بھتیجی ارجمند تمہارے گھر رہے۔ اور تم ہر طرح سے اس کا خیال رکھو۔"

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

"مسئلہ ہے، اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟"

"کوشش تو کرو۔ اب میں اتنا کمزور بھی نہیں ہوں۔"

"بھئی شرم بھی آتی ہے مجھے۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

"ارجمند تم سے محبت کرتی ہے، تم اس کے خوابوں کے شہزادے ہو۔"

عبدالحق کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا۔

"وہ مجھے کیا جانے؟"

نادرہ اٹھ کر گئی۔ پھر وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ڈرائنگ کی ایک کاپی تھی۔

"لو……! خود دیکھ لو۔"

عبدالحق نے کاپی کھولی تو دیکھتے کا دیکھتے ہی رہ گیا۔ وہاں پہلے سے بڑی حیرت اس کی منتظر تھی۔ اس کی تصویر…… اسی بازار میں…… ہوٹل کے باہر بیٹھے ہوئے…… اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

چند لمحے بعد اس نے بمشکل کہا۔

"یہ…… یہ کیسے؟"

"یہ تو تم ہی بتاؤ! مجھے تو حیرت ہوئی تھی کہ تم یہاں بھی آ سکتے ہو۔"

پھر عبدالحق کو یاد آ گیا۔

"ہاں……! میں یہاں تین چار بار آیا ہوں۔ کسی کی تلاش تھی۔ **پھر** اسے نکالنا تھا۔"

"یہ سامنے جو ہوٹل ہے، یہاں بیٹھے ہوئے ارجمند نے تمہیں دیکھا۔ تمہاری تصویر بنائی۔ اور بس، اسی روز سے تم اس کے شہزادے ہو گئے۔"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔

"کیا عمر ہوگی تمہاری بھتیجی کی؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"جب اس نے تمہاری یہ تصویر بنائی تو شاید چھ سات برس کی تھی۔"

عبدالحق کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"تب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو۔"

"اب ارجمند تیرہ برس کی ہے۔" نادرہ نے سنگین لہجے میں کہا۔

"تو بچی ہی ہے نا؟"

"اس عمر میں بچیاں بڑی ہونے لگتی ہیں۔" نادرہ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"اور ارجمند ویسے بھی ایک مختلف بچی ہے۔"

"بچیاں تو سبھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔"

"وہ غیر معمولی بچی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر تم وہی ہو جو میں سمجھ رہی ہوں تو تم ہندو ہو۔ اس پر اس نے پورے یقین سے کہا کہ نہیں، وہ

مسلمان ہیں۔ اور یہ بات اسے اللہ میاں نے بتائی ہے۔ میں گھبرا گئی۔ میں نے کہا، اللہ میاں کب بات کرتے ہیں کسی سے۔ کہنے لگی، مجھ سے تو کرتے ہیں۔ میرے دل سے آتی ہے ان کی آواز، اور بالکل میری آواز جیسی ہے۔ سچ ٹھاکر! مجھے تو بہت ڈر لگا۔''

عبدالحق کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اللہ کسی کو بھی، کسی بھی وقت حیران کر دینے والی حد تک نواز دیتا ہے۔ میں خود اس کی مثال ہوں۔ کون جانے تمہاری بھتیجی بھی '' وہ کہتے کہتے رُکا۔

''میرے بارے میں اور کیا کہا اس نے؟''

''وہ کہتی ہے کہ اللہ میاں نے اسے بتایا ہے کہ اس سے شادی کے بعد تم بڑے ہوگے، اور وہ تمہیں بڑا بنائے گی۔ اس نے کہا تھا کہ تم آؤ گے اور اسے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ اب تم خود ہی بتاؤ۔''

عبدالحق سوچتا رہا۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن اتنا اس نے سمجھ لیا کہ بات کرنے کا یہ رمز یہ انداز وہ پہلے بھی دیکھ اور سن چکا ہے۔ بلکہ اس کے پتا جی کو بھی اس کا تجربہ تھا۔ جس مجذوب نے اس سے کلمہ پڑھوایا تھا، وہ اسی انداز میں باتیں کرتا تھا۔ لیکن بارہ تیرہ سال کی بچی، اور جب اس نے یہ باتیں کی ہوں گی تو وہ اور بھی چھوٹی رہی ہوگی۔ لیکن کون جانے؟

بات سمجھ میں نہیں آئی، لیکن ذہن کے کسی نہاں خانے میں محفوظ ہوگئی۔

''لیکن عارف صاحب سے شادی کے بعد وہ عزت کے ساتھ تمہارے ساتھ رہ سکتی ہے۔'' اس نے کہا۔

نادرہ نے اسے غور سے دیکھا۔

''ڈر گئے ناٹھاکر!''

''یہ بات نہیں!'' عبدالحق نے جلدی سے کہا۔

''کچھ پیچیدگیاں میرے ساتھ بھی ہیں۔''

''ایک بات بتا دوں۔ ارجمند تمہاری ہر بات مانے گی۔ تمہارے لئے

اس کی فرمانبرداری مثالی ہوگی۔ یہ میں جانتی ہوں۔''

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''مجھے یقین نہیں ہے کہ عارف سے میری شادی ہو سکے گی۔''

''کیوں؟ ایسا کیوں سوچتی ہو تم؟''

''اللہ نے مجھ پر کرم کیا تھا۔ اور میں نے اللہ کو گواہ بنا کر ایک عہد کیا تھا۔ سچ پوچھو تو میں عہد شکنی کر کے خوش نہیں رہ سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ مجھے عہد شکنی سے بچائے گا۔ تو ظاہر ہے کہ ایسا ہوا تو عارف سے میری شادی نہیں ہو سکے گی۔''

''پرسوں سترہ تاریخ ہے۔ فیصلہ ہو جائے گا۔''

''کس نے دیکھی ہے سترہ تاریخ؟'' نادرہ کے لہجے میں گہری اداسی تھی۔

عبدالحق نے ٹٹولنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم کوئی منفی فیصلہ تو نہیں کر چکی ہو؟'' اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''جو لوگ فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیں، وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔ یہ تو بے ایمانی ہے نا!''

''دیکھو نادرہ! ایک بات سوچو! تمہیں اللہ نے عزت کی زندگی دی تو یہ بات سب کو عجیب اور غیر فطری لگے گی کہ ارجمند تمہاری بجائے میرے پاس رہے۔''

''چلو چھوڑو۔ مجھے لگتا ہے کہ میں زبردستی تم پر ایک ناگوار بوجھ ڈال رہی ہوں۔'' نادرہ نے دل گرفتگی سے کہا۔

عبدالحق تڑپ گیا۔

''غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔ میں نے تو سامنے کی ایک بات یاد دلائی تھی۔ تم بس یہ بتاؤ کہ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ دوستوں اور محسنوں کے لئے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''میں تمہارے لئے معاملے کو آسان کر دیتی ہوں۔'' نادرہ نے گہری

سانس لے کر کہا۔

''کل تم مجھے داتا دربار کے صحن میں ملو۔ میں ارجمند کو لے کر وہاں آؤں گی۔ اور تمہیں سونپ دوں گی۔ پھر اگر عارف سے میری شادی ہوگئی تو میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گی۔ یہ تو ٹھیک ہے نا؟''

''اب مجھے صحیح اور غلط، آسان اور مشکل سے کوئی سروکار نہیں۔ جو تم کہو گی، میں کروں گا۔''

''لیکن اگر مجھے کچھ ہوگیا تو پھر تم ہی ارجمند کے وارث ہوگے، اور اسے اپنے ساتھ رکھو گے۔''

''ٹھیک ہے!''

''اور اگر میری قسمت میں اٹھارہ تاریخ کو دیکھنا نہیں ہے تو وہ تمہارے ہی پاس رہے گی۔''

''تم بہت قنوطی ہوگئی ہو۔ دیکھ لینا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

نادرہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

''میں ارجمند کو سمجھا دوں گی۔ وہ انشاء اللہ تمہارے لئے کبھی مسئلہ نہیں بنے گی۔ لیکن تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''کہو.....!''

''بن ماں باپ کی بچی ہے۔ دُنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ اس کی کوئی بات بری لگے تو بھی نرمی اور شفقت سے کام لینا۔ اس کا دل میلا نہ ہونے دینا کبھی۔''

''ارے.....! میں اسے اولاد کی طرح رکھوں گا۔''

''یہی تو میں نہیں چاہتی، وہ بھی نہیں چاہے گی۔ اس سے اپنے تعلق کو کسی رشتے کا نام نہ دینا۔ اسے بہن، بیٹی کہہ کر کبھی نہ پکارنا۔ جیسے میرے اندر ایک یقین ہے، ویسے ہی اس کے اندر بھی ہے۔ اور اس کے خیال میں وہ یقین اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔''

''اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ انشاء اللہ وہ تمہارے پاس ہی رہے

گی۔'' عبدالحق نے بے حد خلوص سے کہا۔

''لیکن جو وعدہ تم چاہتی ہو، وہ میں کر رہا ہوں۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کل ہی کیوں؟ تم اٹھارہ تاریخ تک انتظار بھی تو کر سکتی ہو۔ دو تین دن کے لئے اسے مجھے سونپنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''تم نہیں سمجھو گے۔ یہ اللہ سے میرا کمٹمنٹ تھا۔ تم سا کوئی آ گیا تو ارجی کو فوراً ہی کوٹھے سے رُخصت کردوں گی۔ اس وقت آدھی رات نہ ہوتی، اور وہ سو نہ رہی ہوتی تو میں اسی وقت اسے تمہارے ساتھ بھیج دیتی۔''

''چلو ٹھیک ہے! اچھا ایک بات اور...... اگر وہ میرے پاس رہی تو اس کے مستقبل کے فیصلے میں ہی کروں گا نا؟''

''ظاہر ہے! لیکن ٹھاکر! کچھ فیصلوں میں تو اس کی مرضی کی اہمیت ہوگی۔''

''ہاں......! اتنا تو میں سمجھتا ہوں۔''

''بس تو کل گیارہ بجے داتا دربار کے صحن میں ملاقات ہوگی۔''

''انشاء اللہ!''

✿ ✿ ✿

نوربانو اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اس نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ!''

''ایک ضروری کام سے جانا پڑا۔''

''کم از کم مجھے بتا تو دیتے جانے سے پہلے۔''

''اتنا موقع ہی نہیں تھا۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی تھی۔''

نوربانو اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔ لیکن وہ مزید کچھ کہنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''کون تھے وہ بزرگ، جو آپ کو لینے آئے تھے؟''

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔

"وہ صادق نے مجھے بتایا تھا۔" وہ جلدی سے بولی۔

"خود سے تو نہیں بتایا ہوگا، تم نے پوچھا ہوگا۔" عبدالحق نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کوئی جرج ہے اس میں؟" نوربانو نے معصومیت سے پوچھا۔

"یہ تو تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ صادق نے کیا سمجھا ہوگا۔"

"کیا سمجھا ہوگا؟"

"یہی کہ ہم دونوں ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے، اور ایک دوسرے سے اپنے معاملات چھپاتے ہیں۔"

"اللہ! یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا..... سچ!" نوربانو نے اٹھلا کر کہا۔ پھر بولی۔

"مگر آپ خود دیکھیں، آپ نے تو مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"تم نے موقع ہی کب دیا؟ آتے ہی تفتیش شروع کر دی۔" عبدالحق نے کہا۔

"ورنہ مجھے تو بتانا ہی تھا۔"

"اچھا بابا! معاف کر دیں، اب بتائیں تو....."

"اس وقت نہیں۔ کل بات کریں گے اس پر۔"

"کیوں؟ اس وقت کیوں نہیں؟"

"بھئی! پہلے اماں کو بتاؤں گا۔ ان سے اجازت لوں گا۔"

نوربانو کو بہت برا لگا۔ لیکن اس کا تجسس اور بھڑک اٹھا۔ عبدالحق نے حمیدہ سے اجازت لینے کی بات کی تھی۔ ایسی کیا بات ہے؟ ایسے موقعوں پر وہ حمیدہ سے بری طرح چڑنے لگتی تھی۔

عبدالحق نے دیکھا۔ رات کی رانی کچھ مرجھا سی گئی تھی۔ یہ اس کی خفگی کی علامت تھی۔ لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اماں سے بات کرنے سے پہلے وہ نوربانو سے کیسے بات کر سکتا تھا۔

لیکن پھر رات کی رانی خود ہی مہک اُٹھی۔ نازک بیل درخت سے لپٹ گئی۔ وہ ایک سحر تھا، جس نے اسے جکڑ لیا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد نوربانو نے بھاری سانسوں کے درمیان بکھرتی سرگوشی میں پوچھا۔

"بتایئے نا! کہاں گئے تھے آپ؟"

اور نہ جانے کیسے، مگر سحر ٹوٹ گیا۔ عبدالحق کو لگا کہ کسی نے اس کے سر پر بالٹی بھر کے ٹھنڈا پانی اُنڈیل دیا ہے۔

"کہا نا! پہلے اماں کو بتاؤں گا۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

نوربانو کو لگا کہ اس کا جادو تاثیر میں کچھ کم ہو گیا ہے۔

***

پہلے تو نادرہ نے سوچا کہ وہ ارجمند کو سرپرائز دے گی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ اسے تو ارجمند کو سمجھانا تھا، بہت کچھ بتانا تھا۔

ناشتے کے بعد اس نے ارجمند سے کہا۔

"تمہارے لئے ایک خوش خبری ہے گڑیا!"

ارجمند نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔

"مگر آج تو سولہ تاریخ ہے پھپھو!" اس نے حیرت سے کہا۔

نادرہ کو حیرت ہوئی۔ کیا وہ بھی ایک ایک دن گن رہی ہے؟

"یہ خوش خبری تمہارے لئے ہے..... بہت بڑی۔ اوتار سنگھ، جنہیں تم نے دیکھا تھا، جن کی تم تصویریں بناتی ہو، وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ اب ان کا نام عبدالحق ہے۔"

ارجمند کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"آپ کو کیسے پتا چلا پھپھو!"

"آپ بے فکر رہی پھپھو! مجھے تو ان سے بھی محبت ہے۔"

"کس سے.....؟"

"آغا جی کی بیوی سے۔"

اس جواب نے نادرہ کو اور حیران کر دیا۔

"تو تمہیں یہ بھی معلوم ہے؟"

"جی پھپھو! مجھے معلوم ہے کہ وہ ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اسی لئے تو مجھے بھی ان سے محبت ہوگئی ہے۔"

نادرہ کو لگا کہ یا تو وہ پاگل ہوگئی ہے، یا ارجمند کا دماغ اُلٹ گیا ہے۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق جانتا تھا کہ یہ ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اس بچی ارجمند کو گھر لانے سے پہلے گھر میں موافقت کی فضا تیار کرنا ضروری تھا۔ اماں کو تو اس نے سب کچھ بتا دیا تھا اور اماں تو جگت اماں تھیں۔ ان کے پاس تو ساری دُنیا کے لئے ماتا تھی۔ وہ سب کے لئے دردمند تھیں، سب سے محبت کرتی تھیں۔ بلکہ وہ تو خوش ہوئیں کہ ان کی تنہائی دور ہوگی۔

لیکن نوربانو ٹیڑھی کھیر تھی۔ دُشواری یہ تھی کہ اسے سب کچھ بتایا نہیں جا سکتا تھا۔ خاص طور پر کوٹھے سے تعلق کے بارے میں۔ اور اسے مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ جبکہ اس کے لئے جھوٹ بولنا بھی آسان نہیں تھا۔ بلکہ وہ جھوٹ بولنے سے بچتا تھا۔

لیکن کسی کی عزت کے لئے تو جھوٹ بولنے سے نہیں بچا جا سکتا۔ اس کے دل نے کہا۔

"اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ رات کو میں کہاں گیا تھا۔" اس نے نوربانو سے کہا۔

نوربانو کے لئے تو وہ زخم تھا۔ دل میں اس نے سوچا۔ اماں کو بتا آئے تو اب مجھے بتا رہے ہیں۔ تاہم اس نے اپنا ردِعمل ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"جی...... بتایئے! کیا بات ہے؟"

"دہلی میں کالج میں میری ایک ہم جماعت تھی...... نادرہ...... رات اس نے مجھے بلوایا تھا۔"

یہ نوربانو کے لئے اور تشویش کی بات تھی۔

"پاکستان آتے ہوئے نادرہ کا پورا خاندان ختم ہوگیا۔" عبدالحق نے مزید کہا۔

"اس کے اور اس کی بھتیجی کے سوا کوئی نہیں بچا۔ جو شاید اس وقت چار پانچ سال کی ہوگی۔"

اور اب گیارہ بارہ سال کی ہوگی۔ نوربانو نے سوچا۔ اور وہ ہم جماعت نادرہ تو ان کے ہی برابر ہوگی۔

"میں سمجھ گئی۔" اس نے کہا۔

"اب ان کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اس لئے آپ انہیں اپنے گھر لا کر رکھیں گے۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں؟"

عبدالحق کو کرنٹ سا لگا۔ بات بہت سخت تھی۔ لیکن لہجہ نہ تو سخت تھا نہ طنزیہ۔ اور یہ خوش آئند بات تھی۔ پھر بھی اس موقع پر اپنے لہجے میں قطعیت اختیار کرنا بہت ضروری تھا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ دراصل نادرہ کی شادی ہو رہی ہے۔"

نوربانو نے واضح طور پر سکون کا سانس لیا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ اسے سرپرست بن کر رخصت کیجئے گا۔"

عبدالحق نے اسے غور سے دیکھا۔ لیکن چہرے کا تاثر طنزی غمازی نہیں کر رہا تھا۔

"ہاں! انشاء اللہ!" اس نے کہا۔

"یہ نادرہ کی خوش نصیبی ہے کہ اس کا گھر بسنے کا سامان ہوگیا۔ لیکن اب اسے اپنی بھتیجی ارجمند کی فکر ہے۔"

"کیوں بھئی؟"

"جس سے نادرہ کی شادی ہو رہی ہے، وہ اسے جانتی نہیں۔ اسے اندازہ نہیں کہ بڑی ہوتی ہوئی ارجمند وہاں محفوظ ہوگی یا نہیں؟"

''یہ تو شہر کے اندیشے والی بات ہے۔'' نور بانو نے کہا۔

''ایسا ہوتا ہے نور بانو! اصل میں مسئلہ ہمارا نہیں۔ اس لئے ہم اسے اس طرح نہیں سمجھ سکتے۔'' عبدالحق نے بے حد تحمل سے کہا۔

''نادرہ نے یہاں جو سات آٹھ سال گزارے ہیں، وہ آسان نہیں تھے۔ اس لئے وہ عدم تحفظ کا شکار ہے۔ بھتیجی کی طرف سے وہ خاص طور پر پریشان ہے۔ وہ کسی اجنبی پر اپنے معاملے میں تو بھروسہ کر سکتی ہے۔ لیکن ارجمند کے لئے نہیں۔''

''تو پھر ....؟''

''وہ چاہتی ہے کہ ارجمند کچھ دن ہمارے ہاں رہے۔ پھر جب وہ اپنے شوہر کی طرف سے مطمئن ہو جائے گی تو ارجمند کو اپنے گھر لے جائے گی۔''

''اور وہ مطمئن نہ ہوئی تو ؟''

''تو ارجمند ہمارے ہاں ہی رہے گی۔'' عبدالحق نے اندر کی جھنجلاہٹ کو دباتے ہوئے کہا۔

''تو پھر سنیں! وہ کبھی مطمئن نہیں ہوگی۔'' نور بانو نے غصے سے کہا۔

''وہ اپنی بلا ہمارے سر منڈھ رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''جوان لڑکی کو وہ اپنے ساتھ رکھے، تاکہ شوہر ہی ہاتھ سے نکل جائے۔ وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے۔ اس لئے اپنے مسئلے کو ہمارا مسئلہ بنا رہی ہے۔''

عبدالحق کو بھی غصہ آ گیا۔ لیکن وہ غصہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''سب عورتیں تمہاری طرح نہیں ہوتیں۔''

''لو.....! میں کہاں سے بیچ میں آ گئی۔'' نور بانو نے معصومیت سے کہا۔

''اس معصوم بچی کو بلا کہہ رہی ہو۔ اور ہمارے سر منڈھنے کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ تم سمجھتی ہو، میں تمہارے ہاتھ سے نکل جاؤں گا۔'' عبدالحق کے لئے اب برداشت کرنا ممکن نہیں تھا۔

''میں جانتا ہوں، تم تنگ دل ہو، زرینہ سے، آپا سے، معصوم بچوں تک

سے تمہیں رقابت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن آج جو تم نے کہا، وہ تو میرے کردار پر حملہ ہے۔ کیا سمجھتی ہو تم مجھے۔ میں ناقابل اعتبار ہوں۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ!'' نور بانو کا انداز مدافعانہ ہو گیا۔

''میں نے ایسا کب کہا؟ میں تو دنیا کی بات کر رہی تھی۔ کیا کیا ہوتا ہے دنیا میں ....؟''

''دنیا دیکھی ہی تو نہیں ہے تم نے۔ ورنہ یہ ناشکرا پن کیوں کرتیں؟ تمہیں کیا پتا ہے دنیا ہے؟ دیکھتی کہ دنیا میں کیسے کیسے مظلوم لوگ پڑے ہیں تو دل بڑا ہوتا۔ تب دوسروں سے ہمدردی اور غم گساری کا جذبہ پیدا ہوتا۔''

عبدالحق کے جارحانہ انداز نے نور بانو کو سیدھا کر دیا۔ نہ صرف وقتی طور پر، بلکہ آگے کے لئے بھی۔ اس نے جلدی سے موضوع بدلا۔

''ارے یہ بتائیں کہ اتنے برسوں کے بعد نادرہ نے آپ کو کیسے ڈھونڈ نکالا۔''

''وہ امتحان کے رزلٹ کے ساتھ تصویر بھی چھپی تھی نا میری ''

نور بانو چند لمحے سوچتے رہی۔

''مگر وہ تو آپ کو اوتار سنگھ کی حیثیت سے جانتی ہوگی۔ جبکہ اخبار میں نام عبدالحق کا تھا۔''

''اس نے خط میں یہی لکھا تھا کہ اگر میں کبھی اوتار سنگھ رہا ہوں تو خط پڑھوں ورنہ واپس کر دوں۔''

''اوہ......! اللہ کیسے ملاتا ہے لوگوں کو۔'' نور بانو نے بے حد خلوص سے کہا۔ پھر بولی۔

''تو اب آپ اس بچی کو لینے جا رہے ہیں؟''

''ہاں!'' عبدالحق نے کہا۔ اور پھر سنجیدہ ہو گیا۔

''دیکھو نور بانو! اس بچی نے پانچ سال کی عمر میں ماں باپ، بہن بھائی، دادا دادی، چچا تایا، سب رشتے کھو دیئے۔ ایسے لوگ بڑے نازک ہوتے ہیں۔ انہیں تو دل جوئی اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم اس پر مہربان کرو گی تو

اللہ خوش ہوگا۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ میں یہ درد سمجھتی ہوں۔ میں اس کا دل میلا نہیں ہونے دوں گی۔ میں اس کا ہر طرح خیال رکھوں گی۔"

"اور یہ ذہن میں رکھو کہ مجھ پر شک کرو گی تو میں کبھی برداشت نہیں کروں گا۔"

نور بانو دن میں ہی رات کی رانی بن گئی۔

"آپ پر شک کون بد بخت کرے گا؟ ایک آپ ہی پر تو یقین ہے ہمیں۔ بس آپ اتنے قیمتی ہیں ہمارے لئے کہ آپ کو کھونے کے تصور سے بھی ڈر لگتا ہے۔" اس نے اٹھلا کر کہا اور عبدالحق سے لپٹ گئی۔

ہمیشہ کی طرح عبدالحق موم ہوگیا۔

"صرف موت ہی مجھے تم سے جدا کر سکتی۔"

نور بانو نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بس.....! ایسی باتیں نہ کریں۔"

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو احساس تھا کہ نور بانو کی وجہ سے وہ کچھ لیٹ ہوگیا ہے۔ داتا دربار کے صحن میں کھڑا وہ ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ عقب سے کسی نے اسے سلام کیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو نادرہ اس کے سامنے تھی۔ وہ برقع میں تھی، اور اس کے ساتھ بارہ تیرہ سال کی ایک بچی تھی، جس نے بڑے اہتمام اور سلیقے سے خود کو دوپٹے میں چھپا رکھا تھا۔ بچی کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔

عبدالحق نے سلام کا جواب دیا اور کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"چلو تو.....!"

باہر عبدالحق کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور بچی سے کہا۔

"ارجمند! آپ آگے بیٹھیں گی میرے ساتھ۔"

ارجمند نے حیرت اور خوشی سے اسے دیکھا۔

"آپ کو میرا نام معلوم ہے؟"

"جی ہاں! بیٹھئے!"

ارجمند بیٹھ گئی تو عبدالحق نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر نادرہ کو بٹھایا اور پھر خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" نادرہ نے پوچھا۔ اسے ڈر تھا کہ عبدالحق انہیں اپنے گھر نہ لے جائے۔

"وہاں، جہاں سکون سے بیٹھ کر بات کر جا سکے۔"

"داتا دربار سے زیادہ سکون کہاں ہوگا؟" نادرہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ارجمند کے ساتھ وہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ تم فکر نہ کرو۔"

ڈرائیو کرتے ہوئے عبدالحق کو احساس ہوا کہ ارجمند ٹکٹکی باندھے، پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی ہے۔ اس نے سر گھمائے بغیر دھیرے سے کہا۔

"کیا بات ہے ارجمند! کیا میں آپ کو جانا پہچانا لگ رہا ہوں؟"

"لگنا کیسا؟ آپ تو ہیں ہی جانے پہچانے۔" ارجمند نے بے ساختہ کہا۔ پچھلی نشست سے نادرہ کھنکھاری تو اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔

"آپ مجھے اجنبی نہیں لگتے۔"

عبدالحق نے سوچا، شاید مجھ میں اس کے کسی بچھڑی ہوئی محبوب ہستی کی مشابہت ہوگی۔ کوئی چچا، بھائی، ماموں ..... اور کون جانے باپ کی ہی ہو۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مجھے اس بات کی بڑی فکر تھی۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر ارجمند نے اچانک کہا۔

"ایک بات بتائیں۔ آپ پھپھو کو تو تم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، اور مجھے آپ کہتے ہیں جبکہ پھپھو مجھ سے بڑی ہیں۔"

عبدالحق ہنس دیا۔

"واقعی! آپ کو تو عجیب لگے گی یہ بات۔ دراصل میں اور آپ کی پھپھو کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ تو ہم بے تکلف ہیں۔ اور آپ سے میں آج ہی ملا ہوں نا۔"

"تو پھر آپ مجھ سے بھی بے تکلف ہو جائیے۔"

اس بار عبدالحق اسے دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت تھی۔

"آپ مجھے بھی تم ہی کہیں۔ آپ کہتے ہیں تو لگتا ہے، بہت دور سے بات کر رہے ہیں۔"

نادرہ بہت زور سے کھنکھاری۔

"ارجی! تم بہت بول رہی ہو گڑیا!"

"بولنے دو۔ اچھا لگتا ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"بہت پیاری باتیں کرتی ہے ماشاءاللہ!"

"میری باتیں بھی یاد ہیں نا ارجی؟" نادرہ نے کہا۔

"جی پھپھو! سب یاد ہے۔ سوری پھپھو!"

اسی لمحے عبدالحق نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روک دی۔

❁ ❁ ❁

ارجمند کو ایسی خوشی کبھی نہیں ملی تھی۔ وہ تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

اس بات کا تو اسے یقین تھا کہ اس کے آغا جی اسے ملیں گے۔ لیکن وہ یہ ضرور سوچتی تھی کہ یہ کیسے ہوگا؟ اور کب ہوگا؟

اس نے انہیں صرف ایک بار دیکھا تھا، اور وہ بھی بازار کی مصنوعی روشنیوں کے درمیان۔ اس کے بعد اس نے بارہا سوچا تھا کہ کیا ان کے چہرے کی وہ روشنی بازاری روشنیوں کی وجہ سے تو نہیں تھی۔ کیا ان کا چہرہ واقعی ایسا ہی روشن ہوگا؟

اور اب وہ دن کی روشنی میں اس کے سامنے تھے، اور ان کا چہرہ اس

رات سے بھی زیادہ روشن تھا۔ اور ان کی آواز، بات کرنے کا اپنائیت اور محبت بھرا انداز، اس چہرے کو اور روشن کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں وہ تہذیب اور شائستگی تھی، جو ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ ہاں بابا جان اور دادی بھولی بسری یاد ابھرتی تھی۔

وہ اداس ہو گئی۔ مدتوں کے بعد اسے اپنا گھر، اپنے لوگ یاد آئے تھے۔ لیکن خوشی کے اس دن وہ اداس ہونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتی رہی۔ انہیں احساس ہوا، انہوں نے پوچھا کہ کیا وہ اسے جانے پہچانے لگتے ہیں۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی۔ اس نے جو کہا، اس پر پھپھو کھنکھاریں۔ وہ اسے احساس دلا رہی تھیں، کہ یاد دلا رہی تھیں۔

پھر گاڑی رکی۔ وہ ایک ریسٹورنٹ تھا۔ آغا جی نے پہلے اس کے لئے دروازہ کھولا اور پھر پھپھو کے لئے۔ وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے، جو خاصا خوب صورت تھا۔ آغا جی انہیں ایک فیملی کیبن میں لے گئے۔

ارجمند نے بہت پہلے پرانی باتوں کو یاد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ دل بند ہو جائے گا۔ لیکن آغاز جی سے مل کر وہ سب یاد آنے لگا تھا۔ اس وقت بھی اسے وہ دن یاد آ گیا۔ جب بابا جان اسے اور امی کو کناٹ پیلس کے ایسے ہی ریسٹورنٹ میں لے گئے تھے۔

لیکن ایک فرق تھا۔ آج ماضی کی یادوں سے اسے گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ اچھا لگ رہا تھا۔

وہ بیٹھ گئے۔ آغا جی نے اس سے پوچھا۔

"کیا لیں گی آپ...؟" پھر شاید انہیں اس کی بات یاد آ گئی۔ انہوں نے جلدی سے کہا۔

"سوری بھئی! خیر، یہ بتاؤ، کیا لو گی...؟"

"جو آپ لیں گے۔"

"ہم تو بھئی کڑوی چیزیں لیتے ہیں۔ تم اپنے لئے کچھ میٹھا پسند کر لو۔"

"جو آپ منگوائیں گے، وہی مجھے اچھا لگے گا۔"

آغا جی پھپھو کی طرف مڑے۔

"کافی منگوائیں۔"

پھپھو کے چہرے سے لگتا تھا کہ انہیں بھی کچھ بھولی ہوئی باتیں یاد آ گئی ہیں۔ انہوں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"ضرور.....!"

کافی آئی تو پھپھو نے کہا۔

"ریتا پارسن کی پارٹی یاد آ گئی۔"

"اور کالج کی کینٹین....."

"اور وہاں ہونے والے مباحثے....."

"اور محمود کی شہادت....."

ارجمند کو لگا کہ وہ وہاں محض ایک مداخلت کار ہے۔ لیکن نہیں، یہ بات نہیں۔ ان کے نزدیک تو وہ وہاں موجود ہی نہیں۔ وہ تو اسے بھول چکے ہیں۔ لیکن اسے برا نہیں لگا۔ بس اسے پھپھو پر رشک آنے لگا۔

"چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی بعض اوقات کتنا پیچھے لے جاتی ہیں آدمی کو۔" آغا جی نے کہا۔

"اور کتنا اچھا لگتا ہے۔" پھپھو بولیں۔

"تمہارا خط پڑھنے کے بعد، تم سے ملنے کے بعد مجھ سے سویا نہیں گیا۔ سب کچھ یاد آتا رہا۔"

"حالانکہ ہمارے درمیان ایسا گہرا تعلق نہیں تھا۔"

آغا جی چند لمحے سوچتے رہے، جیسے ایک ایک لفظ کو تول رہے ہوں۔

"تعلقات کا تعین عرصے پر نہیں، معاملات کی نوعیت پر ہوتا ہے۔" انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بعض اوقات چند لمحوں کا تعلق کسی کو کسی کے لئے اتنا اہم بنا دیتا ہے کہ وہ ساری زندگی اسے نہیں بھولتا۔" وہ کہتے کہتے رکے۔ پھر گہری سانس لے کر بولے۔

"تمہارے لئے ہمارا تعلق چھوٹا اور غیر اہم ہوگا۔ لیکن میرے لئے......"

"یہ درست نہیں۔" پھپھو نے احتجاج کیا۔

"میرے لئے وہ بہت بڑا تعلق ہے۔ تم سے میرا احسان کا رشتہ ہے۔ جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔"

ارجمند سحرزدہ سی سب کچھ سن رہی تھی۔ اس گفتگو سے وہ ان دونوں کو سمجھ رہی تھی۔ وہ زور سے سانس بھی نہیں لے رہی تھی کہ کہیں انہیں اس کی موجودگی کا احساس نہ ہو جائے۔

"یہ ظرف کی بات ہے۔ عالی ظرف آدمی ایک سرسری بات کو بھی احسان سمجھ لیتا ہے۔"

"وہ سرسری اور معمولی بات نہیں تھی۔" آغا جی نے احتجاج کیا۔

"تم نے مجھے بہت کچھ دیا تھا اس رات۔ تم نے مجھے اللہ کے اور شرک کی خوف ناکی کے بارے میں بتایا تھا۔ تم نے مجھے کلمے سنائے تھے۔"

"اور عربی میں ہونے کے باوجود تم نے ان کا مطلب بتا دیا تھا۔"

پھپھو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہاں! اور وجہ یہ تھی کہ میں بہت اچھے استاد سے عربی پڑھتا رہا تھا۔" آغا جی نے کہا۔

"اب احسان کی بات یہ ہے کہ تم سے وہ کلمے سننے کے بعد وہ کلمے میرا معمول بن گئے۔ ناپاکی کا احساس ہوتا تو میں کلمہ طیبہ پڑھتا۔ اللہ کی قدرت دیکھتا تو کلمہ شہادت پڑھتا۔ یہ معمول تھا میرا۔ اور جس رات میں نے اسلام قبول کیا، کسی کو مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بلکہ بتانے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ میں نے خود اللہ کی وحدت کی گواہی دی۔ یہ تمہارا احسان تھا مجھ پر، اور کوئی چھوٹا احسان نہیں تھا۔ اللہ سے دعا ہے کہ تمہیں اس کا اعلیٰ ترین اجر عطا فرمائے۔"

"یہ بتاؤ، تمہیں اسلام قبول کرنے کا خیال کیسے آیا؟"

"سورۂ ملک کی آیات سن کر اور آسمان کو دیکھ کر۔" آغا جی نے کہا اور

تفصیل بتانے لگے۔

''تم شروع ہی سے غیر معمولی انسان تھے ٹھاکر...... عبدالحق!'' پھپھو نے کہا۔

''نہیں......! یوں کہو کہ مجھ پر ابتداء ہی سے اللہ کا خاص فضل و کرم تھا، الحمدللہ!''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن یہ بات سمجھتا کون ہے؟ خود کو بڑی سادگی سے سیلف میڈ کہنے والوں کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اللہ کے فضل کی نفی کر رہے ہیں، اور خود پر غرور کر رہے ہیں۔''

''اللہ نے اپنے فضل سے یہ بات مجھے سمجھا دی۔ میں پہلے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور پھر اس کے بنائے ہوئے وسیلے کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جس نے کسی بندے کے احسان کو نہیں مانا، وہ نظر نہ آنے والے مگر ہر جگہ موجود اللہ کا شکر کیسے ادا کر سکتا ہے۔ اسی لئے تو میں تمہیں محسن مانتا ہوں۔ میں تمہارے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''میں نے اپنا سب کچھ تمہیں سونپ دیا ہے۔ اس معصوم بچی کے ذریعے۔'' پھپھو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''غلطیاں تو بڑوں سے بھی ہوتی ہیں، یہ تو بچی ہے۔ اس کی غلطیوں سے درگزر کرتے رہنا، اور یہ محروم ہے، اس کی محرومیوں کو دور کرنا۔''

''تم فکر نہ کرو، میں محبت کی دنیا کا آدمی ہوں، اور غیر ذمہ دار نہیں، ذمہ دار ہوں۔ اب چلیں؟''

وہ باہر آئے۔ عبدالحق کا اصرار تھا کہ وہ نادرہ کو اپنی گاڑی میں چھوڑ کر آئے گا۔ لیکن نادرہ اس کے لئے تیار نہیں تھی۔

''یہ مناسب نہیں ہے ٹھاکر عبدالحق! میں خود ہی چلی جاؤں گی۔''

وہ نادرہ اور ارجمند کو الوداعی ملاقات تھی۔ نادرہ نے ارجمند کو لپٹا لیا اور بے تابانہ اسے پیار کرنے لگی۔

''ارجی! میری جان! میری ہر بات یاد رکھنا۔ ایثار اور قربانی اور سچائی

سے اللہ کو خوش کرنے سے عزت ملتی ہے آدمی کو۔ عاجزی سے رہنا میری بچی۔ خدمت کو شعار بنانا۔ اپنی غرض اور ضرورتوں کو بھول جانا۔ میری دُعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔''

ارجمند بڑی مشکل سے آنسو روکے ہوئے تھی۔

''ہم پھر ملیں گے نا پھپھو!''

''ہاں میری بچی! زندگی رہی تو ضرور ملیں گے۔ اب تم جاؤ۔''

عبدالحق اپنی آنکھیں بھگونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے منہ پھیر لیا تھا۔

''اچھا عبدالحق، خدا حافظ!'' نادرہ نے اس سے کہا۔

''خدا حافظ نادرہ! فی امان اللہ!''

وہ دونوں نادرہ کو جاتے دیکھتے رہے۔ نادرہ سائیکل رکشہ میں بیٹھ گئی تو عبدالحق نے بڑی اپنائیت سے ارجمند کو پکارا۔

''چلیں ارجی!''

ارجمند نے چونک کر اسے دیکھا۔ ارجی پہلے کبھی کسی کے منہ سے اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اور لہجے میں کیسی محبت تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عبدالحق نے اس کے لئے دروازہ کھولا، اور اس کے بیٹھنے کے بعد بند کر دیا۔ پھر وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا۔

راستے میں ارجمند کی عجیب متضاد کیفیات تھیں۔ وہ خوشی تھی کہ اپنے آغا جی کے ساتھ جا رہی تھی۔ وہ خوف زدہ تھی کہ ایک اجنبی دیس میں، اجنبی لوگوں کے درمیان جا رہی تھی۔ اور وہ غم زدہ تھی کہ پہلی بار پھپھو سے دور ہو رہی تھی۔

اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

عبدالحق نے اس کے آنسو دیکھے تو تڑپ گیا۔ اس نے گاڑی سائیڈ میں روکی اور پھر اس کی طرف مڑا۔

''تم تو ابھی سے رو رہی ہو ارجی! میں نادرہ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟''

''آپ کو پھپھو کا بہت خیال ہے؟'' ارجمند نے سسکیوں کے درمیان کہا۔

''اب اس سے زیادہ تمہارا خیال ہے۔ میں تمہارے آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔'' عبدالحق کے لہجے میں سچائی تھی۔

''انہیں روکنے کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''کچھ بھی؟''

''ہاں! بس تم رونا کبھی نہیں۔''

''مجھ سے شادی کریں؟'' ارجمند کے منہ سے بے سوچے سمجھے نکلا۔ وہ جیسے بہت چھوٹی سی بچی بن گئی تھی۔

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے نادرہ کی بات یاد آ گئی۔ اس نے برابر والی سیٹ پر خود کو دوپٹے میں اچھی طرح لپیٹ کر سمٹی ہوئی لڑکی کو دیکھا۔ وہ بچی تھی، اور اس نے بات بھی بچوں کے انداز میں کی تھی۔ اسے ہنسی آ گئی۔

''ابھی تو تم بہت چھوٹی ہو۔'' اس نے بھی بے سوچے سمجھے جواب دیا۔ بلکہ کہنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔

ارجمند اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو جیسے ہمیشہ کے لئے پونچھ دیئے۔ پھر اس نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''جی..... ! ٹھیک ہے۔''

''بس میرے سامنے.....'' وہ کہتے کہتے رکا۔

''نہیں..... ! بس تم کبھی بھی نہیں رونا۔ ورنہ میرے لئے یہ بوجھ ہوگا۔''

''جی..... ! اب کبھی نہیں روؤں گی میں۔'' ارجمند نے کہا۔

عبدالحق نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

❁ ❁ ❁

نادرہ کی عجیب کیفیت تھی۔ سب لڑکیاں ابھی تک سو رہی تھیں۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ بس ایک ارجمند نہیں تھی تو کوٹھا سونا سونا لگ رہا تھا۔ سینہ بھی خالی خالی سا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی کیفیت اس ماں کی سی ہوگی، جو اپنی بیٹی کو وداع کر کے بیٹھی ہو۔ یہ وہ قیاس ہی کر سکتی تھی۔ کیونکہ اسے خوشی

بھی تھی کہ ایک بھاری بوجھ سر سے ہٹ گیا۔ اور افسردگی بھی تھی کہ اب اس کے پاس زندگی کا کوئی جواز نہیں رہا۔ وہ متاع جسے وہ برسوں سے دل سے لگائے بیٹھی تھی، وہ اب اس کی نہیں رہی۔ اس نے سوچا، اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ پھر اس نے سوچا، اچھا ہی ہوا۔ میں اس قابل تھی بھی کہاں؟

خوشی کے ساتھ اسے یہ اطمینان ہی تھا کہ ارجمند محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔

اسے اس کیفیت سے اچھو میاں نے نکالا، جو اس کے پاس آ بیٹھے تھے۔ اس نے غور سے انہیں دیکھا۔ وہ بہت اُجڑے اُجڑے لگ رہے تھے۔ اپنی کیفیت بھول کر اس نے کہا۔

''کیا بات ہے نواب صاحب! اتنے اداس کیوں ہیں؟''

''ارجی کیا گئی کہ لگتا ہے، سینے میں دل ہی نہیں رہا۔'' اچھو میاں نے اداسی سے کہا۔

''آپ جب چاہیں، جا کر اس سے مل سکتے ہیں۔''

اچھو میاں نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں بیٹا! اب تو وہ پرائی ہو گئی۔ بیٹیاں تو ہوتی ہی پرائی ہیں۔''

''یہی حال میرا بھی ہے۔''

اچھو میاں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

''تم تو ازل سے اکیلے تھے۔ پھر اللہ نے کرم کر دیا۔ تم اور ارجی مل گئے ہمیں، اب سوچتے ہیں، آدمی کتنی جلدی عادی ہو جاتا ہے رشتوں کا۔ چاہے وہ عارضی ہوں۔'' پھر انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''آج وہ گئی، کل تم بھی چلی جاؤ گی۔ تو پھر ہم رہیں پہلے کی طرح اکیلے۔''

اس بات پر نادرہ کو عارف یاد آیا۔ اور یاد آیا کہ آج سولہ تاریخ ہے، اور کل سترہ ہوگی..... فیصلے کا دن!

''تم کیوں اداس ہوتی ہو؟ کل عارف میاں آئیں گے اور تم ان کے

ساتھ چلی جاؤ گی۔"

"کون جانے نواب صاحب!" نادرہ نے آہ بھر کے کہا۔

"جو اللہ کو منظور!"

"اب ایسی مایوسی کی باتیں زیب نہیں دیتیں تمہیں۔" اچھو میاں نے فہمائش کی۔

"ذرا سوچو، پرسوں تک ارجی کی طرف سے کیسی پریشان تھیں تم! پھر اللہ نے وہ کر دکھایا جو تم سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ بچھڑے ہوئے لوگ کہیں یوں ملتے ہیں اتنی آسانی سے؟ اب وہ بہتری فرما رہا ہے تو تم ناشکرا پن کر رہی ہو۔"

"نہیں نواب صاحب! میں تو آج شکرانے کے نفل ادا کروں گی۔ سچ میں بڑی مدد کی ہے اللہ نے۔"

"کل اس کا اور کرم ہوگا تم پر انشاء اللہ!"

نادرہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

"اگر کل میں عارف کے ساتھ جاتی ہوں تو آپ بھی چلیں گے میرے ساتھ؟"

"نہیں بیٹا! اللہ تمہارا گھر آباد کرے۔ ہماری تو منزل پہلے سے طے ہے۔"

"آپ کو میری اور ارجمند کی کمی نہیں محسوس ہوگی؟"

"بالکل ہوگی۔ تمہاری یادیں ہمارے دل میں رہیں گی۔ لیکن ہم اس کے ہو جائیں گے، جو انسانوں کا واحد سہارا ہے۔ کسی کا بھی اس کے سوا کوئی نہیں۔ بس آدمی اس بات کو سمجھ نہیں پاتا بدنصیبی سے۔"

"کبھی کبھی ملنے تو آئیں گے ہم سے؟"

"باپ بیٹیوں کے گھر کب جاتے ہیں؟ بیٹیاں آتی ہیں باپ سے ملنے۔ یاد رکھنا، ہمارا گھر داتا دربار کا صحن ہوگا۔ جب جی چاہے، ملنے کے لئے آجانا۔"

اچھو میاں چلے گئے۔ نادرہ وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ تو کل سترہ تاریخ

ہے۔ جو کچھ ہوا، کیسا ناقابل یقین ہے۔ اس نے سوچا۔ اسے یاد تھا کہ ایک ماہ پہلے اس نے عارف سے کیا کہا تھا .... اگر ایک ماہ کے عرصے میں کوئی ارجمند کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے نہیں آیا تو میں آپ سے شادی کر لوں گی۔ ارے! اللہ کیسا رحیم و کریم ہے۔ دو دن پہلے .... صرف دو دن پہلے اس نے ارجمند کے لئے نجات دہندہ بھیج دیا۔ کیسے اس کی تصویر نظر آئی، کیسے اس کا پتا چلا، معجزہ سا لگتا ہے۔

اس کے کانوں میں عارف کی آواز گونجی .... اور اگر اللہ نے ارجمند کے لئے کوئی نجات دہندہ بھیج دیا تو .... ؟

اسے یاد تھا کہ اس سوال پر وہ گم سم ہوگئی تھی۔ جواب اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ اپنے عہد کی زنجیر بھی تو تھی اس کے پاؤں میں۔ لیکن پھر وہ جواب اس کے اندر سے ہی ابھرا تھا۔ تب اسی تاریخ کو میں زندہ ہوئی تو خود کو آپ کے سپرد کر دوں گی۔

اور کل وہی تاریخ تھی۔ کل وہ زندہ ہوئی تو وعدے کے مطابق عارف کے ساتھ چلی جائے گی۔ لیکن اس سے پیچھے ایک وعدہ اور تھا.... اس وعدے سے بھی بڑا .... اللہ کو گواہ بنا کر کیا ہوا وعدہ۔ عارف سے وعدہ نبھا کر وہ عہد شکنی کی مرتکب ہوگی۔ تو کیا اس کے بعد وہ صحیح معنوں میں کبھی خوش رہ سکے گی؟

پھر اس نے سوچا، اب اس پر پریشان ہونے کا کیا فائدہ؟ اللہ جو فیصلہ بھی فرمائے گا، اسی میں میرے لئے بہتری اور سکون ہوگا۔

* * *

نور بانو حمیدہ کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عبدالحق آنے والی کو سب سے پہلے اماں سے ملوائے گا۔ اور وہ خود اس سے ملنا چاہتی تھی۔ دیکھے تو، وہ کون ہے؟ کیسی ہے؟

مگر عبدالحق اس بچی کو لے کر کمرے میں آیا تو وہ اسے دیکھ کر دم بخود ہوگئی۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔ وہ بس ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔

حمیدہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
''یہ میری اماں ہیں ارجی!'' عبدالحق نے ارجمند سے کہا۔
ارجمند نے بے بسی سے عبدالحق کو دیکھا۔
''کیا بات ہے؟''
''میرا رونے کو جی چاہ رہا ہے۔'' ارجمند نے سادگی اور معصومیت سے کہا۔
''کیوں؟''
''اماں بالکل میری دادی جیسی ہیں۔ انہیں دیکھ کر دادی یاد آ گئیں۔''
اتنی دیر میں حمیدہ نے اسے لپٹا لیا۔
''تو میں بھی تیری دادی ہی ہوں نکی!''
ارجمند نے لپٹے لپٹے چپکے سے اپنے آنسو پونچھ لئے۔
حمیدہ نے اسے الگ کر کے پیچھے ہٹایا اور غور سے اسے دیکھا۔
''لگتا ہے، دن میں چاند نکل آیا۔ تیرا نام کیا ہے نکی!''
''میرا نام ارجمند ہے دادی اماں!'' ارجمند نے کہا۔
''اور دادی اماں! نکی کا کیا مطلب ہے؟''
''چھوٹی کو کہتے ہیں۔'' عبدالحق نے جلدی سے وضاحت کی۔
''آپ مجھے نکی ہی کہا کریں دادی اماں! اچھا لگتا ہے۔''
''اور یہ میری بیوی نور بانو!'' عبدالحق نے تعارف کرایا۔ پھر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نور بانو رو رہی ہے۔
''ارے! تمہیں کیا ہوا؟''
''کچھ نہیں! کوئی یاد آ گیا تھا۔'' نور بانو نے کہا۔ وہ اب بھی ٹکٹکی باندھے ارجمند کو دیکھے جا رہی تھی۔ کیسی غیر معمولی مشابہت ہے۔ اس نے سوچا۔ وہی سرخ و سفید رنگت، ویسی یہ ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور ترشے ہوئے ہونٹ اور عمر بھی وہی تھی، جس میں گلنار اس سے بچھڑی تھی۔ اس کی آخری دید اس کی آنکھوں میں تازہ ہوگئی تھی۔ اس کی کم سن معصوم بہن، جو بے لباس تھی،

جسے درندے بھنبھوڑ رہے تھے۔ وہ بہن جس کے حسن و جمال سے وہ حسد کرتی تھی۔ لیکن اسے کھو کر اس نے جانا کہ وہ چھوٹی بہن اسے کس قدر محبوب تھی۔
وہ اس لڑکی کو غور سے دیکھتی رہی۔ اسے احساس ہوا کہ مشابہت تو ہے لیکن یہ لڑکی گلنار کے مقابلے میں دراز قد ہے۔ وہ جو گلنار کو حسن کا معیار سمجھتی تھی، یہ تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکی کہ یہ لڑکی گلنار سے کہیں زیادہ حسین ہے۔ اس کم سنی میں بھی اس کی شخصیت میں شہزادیوں کا سا وقار اور تمکنت تھی، جو اس کے حسن کو اور بڑھا رہی تھی۔
''کون یاد آ گیا؟'' عبدالحق نے اسے چونکا دیا۔
اسے احساس ہوا کہ لڑکی بھی اسے بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ اس نے دھیرے سے کہا۔
''میری چھوٹی بہن گلنار...... ارجمند کی صورت اس سے بہت ملتی ہے۔''
''تو میں آپ کو باجی کہہ سکتی ہوں؟'' ارجمند اس سے مخاطب ہوئی۔
''نہیں!'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔
عبدالحق نے گھبرا کر اسے دیکھا۔
چند لمحوں کے توقف کے بعد نور بانو نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔
''تم مجھے آپی کہا کرو۔ گلنار مجھے آپی ہی کہتی تھی۔''
''ٹھیک ہے آپی!'' ارجمند نے خوش ہو کر کہا۔ اس لمحے وہ بہت چھوٹی سی، ننھی سی بچی لگی۔ وہ خوش تھی۔ بچوں کی طرح خوش۔ کتنے عرصے کے بعد اسے ایک گھر اور کچھ رشتے نصیب ہوگئے تھے۔
مگر پھر وہ اداس ہوگئی۔ اسے پھپھو یاد آ گئی تھیں۔
''آؤ! میں تمہیں گھر دکھاتی ہوں۔'' نور بانو نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔
وہ چلی گئیں تو عبدالحق نے سکون کا سانس لیا۔ خلافِ توقع صورتِ حال خراب نہیں تھی، بلکہ بہت اچھی تھی۔
''بہت پیاری بچی ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔

"مجھے اسے دیکھ کر ایسا لگا کہ برسوں سے جانتی ہوں۔"

ادھر ارجمند بہت خوش تھی۔ ایک تو یہ کہ اسے آتے ہی وہ اپنائیت اور محبت ملی تھی، جس کی اسے امید نہیں تھی۔ دوسرے گھر بہت بڑا اور بہت خوب صورت تھا۔ خاص طور پر عبدالحق کا مطالعے کا کمرہ اسے بہت اچھا لگا۔ پر باغیچے نے تو اسے مسحور ہی کر دیا۔ درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں، بہت ترتیب سے بنی پھولوں کی کیاریاں، اور جھولے۔

"یہاں تھوڑی دیر بیٹھیں آپی!" اس نے نوربانو سے کہا۔

"کیوں نہیں! آؤ!"

وہ سنگ مرمر کی خوب صورت بینچ پر بیٹھ گئیں۔

نوربانو کو ماضی کو یاد کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ دکھی ہونا کسے اچھا لگتا ہے۔ لیکن ارجمند آج اسے زبردستی کھینچ کر ماضی میں لے گئی تھی۔ اور بہنوں کے، اور خاص طور پر گلنار کے آخری لمحوں کے تصور نے وہ زخم کرید ڈالے تھے، جن کے بارے میں وہ سمجھتی تھی کہ بھر چکے ہیں۔

اور اب اس نے اس وقت ارجمند کو جھولوں کی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے پایا تو وہ پھر ماضی میں چلی گئی۔

دہلی میں ان کے گھر میں باغیچہ تو نہیں تھا، لیکن برسات کے موسم میں باجی اور گلنار برآمدے میں جھولا ڈال لیتی تھیں۔ ان دونوں کو برسات سے عشق تھا۔ جبکہ اسے نہ برسات سے کوئی دلچسپی تھی نہ جھولوں سے۔ وہ تو پہلی بار حق نگر میں جھولے پر بیٹھی تھی۔ تب اسے پتا چلا تھا کہ لڑکیوں کے دلوں کا جھولوں سے کیا ناطہ ہے۔

اسے یاد تھا۔ باجی بڑی ہونے کے ناطے جھولے پر پہلی باری لیتیں، اور پھر اُترتی ہی نہیں تھیں۔ گلنار کہتی رہتی کہ باجی بھئی! یہ تو بے ایمانی ہے۔ پھر باجی اُترتیں تو دو چار پینگیں دے کر کھسک لیتیں اور گلنار اکیلی ہی پینگیں بڑھانے کی کوشش کرتی رہتی۔ ہر بار یہی کچھ ہوتا تھا۔ اور اس دوران وہ خود بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوتی تھی۔ گلنار اس کے پاس آتی اور جھولے کے لئے کہتی تو وہ صاف

انکار کر دیتی۔ نہیں بھئی! مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو پڑھ رہی ہوں۔ اور گلنار تنک کر کہتی۔ آپی! حد ہے آپ سے بھئی! آپ تو بڈھی روح ہیں۔

یہ سب یاد کرتے ہوئے نوربانو نے سوچا، کتنی بدل گئی ہوں میں۔ اب تو کسی کتاب کو ہاتھ لگائے مہینوں ہو جاتے ہیں۔ مطالعے کی عادت ختم ہوگئی۔ ہاں برسات اچھی لگتی ہے۔ جھولا جھولنا اچھا لگتا ہے۔ خیر یہ تو اچھی تبدیلی ہے۔ لیکن اندر سے میں ویسی ہی ہوں۔ خودغرض، جل ککڑی، ہر وقت محبت مانگنے والی اور محبت دینے کے نام پر صفر..... خوداعتمادی سے محروم اور خوف زدہ۔

اس کی نظر پھر ارجمند پر پڑی۔ جو جھولوں کو تک رہی تھی۔

"جھولا جھولو گی؟" اس نے بے ساختہ اس سے پوچھا۔

ارجمند چند لمحے جھجکتی رہی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو آؤ!" نوربانو اسے جھولے کی طرف لے گئی۔

"بیٹھو! میں تمہیں پینگ دوں گی۔"

ارجمند بیٹھ تو گئی لیکن پھر گھبرا کر بولی۔

"مجھے ڈر لگے گا آپی! کب سے میں جھولے پر نہیں بیٹھی۔"

"ڈرنے کی تو کوئی بات ہی نہیں۔" نوربانو نے اسے دلاسہ دیا۔

"الٹا مزہ آئے گا۔ اور پھر اترنا ہی نہیں چاہو گی۔"

نوربانو نے ہلکے ہلکے پینگ دی۔ شروع میں ارجمند کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلیں۔ مگر پھر اس کا اعتماد بحال ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی نوربانو اونچی پینگیں دینے لگی۔

اس لمحے نوربانو کو اپنے اندر ایک غیرمعمولی خوشی کا احساس ہوا، جسے وہ گلنار کو پینگ دے رہی ہو۔ جیسے وہ ماضی کی کسی کوتاہی کا ازالہ کر رہی ہو۔ شاید گلنار کی روح خوش ہوگی اس سے۔

"بس آپی!"

نوربانو نے ہاتھ روکا۔ ارجمند نیچے اُتر آئی۔

"اب آپ بیٹھیں آپی!"

نور بانو بے جھجک بیٹھ گئی۔ ارجمند اسے پینگ دینے لگی۔ اس لمحے نور بانو کو سچ مچ ایسا لگا، جیسے وہ ارجمند نہیں، گلنار ہی ہے۔

چند منٹ جھولنے کے بعد اس نے جھولا روکا اور نیچے اُتر آئی۔

''آؤ! اب دونوں ساتھ جھولیں گے۔''

وہ دونوں جھولے پر ایک دوسرے کے روبرو کھڑی ہوگئی۔ اس طرح جھولنا نور بانو کو اور اچھا لگا۔

''ارے! یہ تو گلنار ہی ہے۔ اس نے سوچا۔

عبدالحق نے اپنی اسٹڈی کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھا تو اس کا دل خوش ہوگیا۔ وہ پھر حمیدہ کے کمرے میں چلا گیا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آئیں۔

''آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے۔'' ارجمند نے عبدالحق سے کہا۔

''ہمارا گھر کھونا اسے۔ گھر ایک آدمی کا تو نہیں ہوتا۔''

''میں ارجمند کے لئے کمرہ ٹھیک کرا دوں۔'' نور بانو نے کہا اور جانے کے لئے مڑی۔

''ذرا رک تو......!'' حمیدہ نے اسے پکارا۔ پھر وہ ارجمند کی طرف مڑی۔

''نکی! ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتائے گی نا؟''

''جی دادی اماں!''

''تجھے اکیلے سوتے ہوئے ڈر تو نہیں لگے گا؟''

''ڈر تو لگے گا دادی اماں!'' ارجمند نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''میں تو پھپھو کے ساتھ سوتی تھی۔ ان سے لپٹ کر۔''

''بس تو اب میرے ساتھ سویا کر۔ مجھ سے لپٹ کر۔''

اور ارجمند یوں خوش ہوئی، جیسے کوئی بہت بڑی دولت مل گئی ہو۔

''شکریہ دادی اماں!''

''چلیں! یہ تو اور بھی اچھا ہے۔'' نور بانو نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس رات سونے سے پہلے نور بانو نے عبدالحق سے کہا۔

''سنیں! ارجمند اپنے ساتھ کپڑے نہیں لائی ہے۔ کل ہی اس کے لئے ہر طرح کے کپڑوں کا بندوبست کریں۔''

''یہ ہر طرح کے کپڑوں سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

''بھئی! گھر میں پہننے کے عام کپڑے، اور باہر جانے یا کسی تقریب کے لئے بہت اچھے کپڑے۔''

''تم کل یعقوب کے ساتھ چلی جانا بازار۔ یہ کام تو تم ہی کو کرنا ہوگا۔''

اور نور بانو خوش ہوگئی۔

❁ ❁ ❁

اس رات نادرہ کا دل چاہتا تھا کہ نوافل ادا کرتی رہے۔ اللہ نے جو کرم کیا تھا، اس کا شکر ادا کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ سوچ کر اس کا دل خوش ہوتا تھا کہ آج ارجمند اس چھت کے نیچے نہیں، بلکہ اس کے سر کے اوپر عزت کی چھت ہے۔

مگر جب وہ بستر پر لیٹی تو اسے ایسی مہیب تنہائی کا احساس ہوا، جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ نیلم بائی کی موت کے بعد سے ہر رات ارجمند اس سے لپٹ کر سوتی رہی تھی۔ ابتداء میں تو اسے الجھن ہوئی، کیونکہ وہ اس وقت تک ہر طرح کے لمس سے متنفر ہو چکی تھی۔ ایک طرف اسے لمس سے کراہت آتی تھی، تو دوسری طرف اپنی غلاظت کا احساس ستاتا تھا۔

لیکن پھر اللہ نے اسے غلاظت کے احساس سے نجات عطا فرما دی۔ ارجمند کا لپٹ کر سونا اسے نعمت معلوم ہونے لگا۔ وہ اس کی عادی ہوگئی اور اب اسے اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بار بار اس جگہ پر ہاتھ رکھتی، اسے سہلاتی، جہاں ہر رات ارجمند لیٹتی تھی۔ لیکن بستر کا وہ حصہ حدت سے محروم، بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ ارجمند کے بغیر کیسے سو سکے گی؟

پھر اس نے سوچا، یہ آج [illegible]ت ہی کی تو بات ہے، صبح عارف آجائیں

گئے۔ لیکن اندر ایک بے یقینی تھی، کون جانے؟ اس نے سوچا۔ اللہ کا فیصلہ کیا ہو
اور یہ تو وہ ارادہ کر چکی تھی کہ عارف اسے اللہ کی رحمت سے مل جائیں تو اور بات
ہے۔ وہ خود عارف کی قربت کا تصور نہیں کرے گی۔ اسے تو بس اللہ کو گواہ بنا کر
اپنا کیا ہوا عہد یاد رکھنا تھا۔

یوں وہ رات اس کے لئے اور مشکل ہوگئی۔ وہ عارف کے ساتھ اپنے
خوش گوار مستقبل کا تصور کرتی تو وقت آسانی سے گزر جاتا، اور شاید وہ سو بھی
جاتی۔ لیکن یوں نیند آنا محال تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ارجمند اکیلی سو رہی
ہوگی؟ کیا اسے ڈر لگے گا؟

ارجمند کی خالی جگہ کو چھوتے، سہلاتے، کروٹیں بدلتے وہ جاگتی رہی۔
ایسی بیداری میں بڑی اذیت ہوتی ہے۔ اور پھر اس کوٹھے کے ہر گوشے سے
ابھرتی گناہ گار سرگوشیاں۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ نیند کتنی بڑی نعمت ہے۔
ہر رات وہ سو جاتی تھی تو ان سرگوشیوں کا اسے پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ مگر رات کے
سناٹے میں وہ چیختی ہوئی سرگوشیاں اسے ڈس رہی تھیں۔ اس رات سے پہلے اسے
احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوٹھے پر ہے۔ مگر اس رات میں تو تمام عمر کی
اذیتیں پنہاں تھیں۔

اس سے سویا نہیں گیا تو اس نے جا کر وضو کیا، اور قرآن پڑھنے بیٹھ
گئی۔ اللہ نے کرم فرمایا۔ ایسی محویت اور ارتکاز عطا فرمایا کہ وہ گرد و پیش سے
بے خبر ہوگئی۔ اس کے بعد فجر کی اذان کی آواز نے ہی اسے چونکایا۔

وہ صبح کا وقت تھا۔ باہر پرندوں کے چہچہے گونج رہے تھے۔ لیکن کوٹھے پہ
اس سناٹے کا راج تھا جو دنیا پر آدھی رات کو قابض ہوتا ہے۔ اسے یاد آیا کہ گناہ
کی اس چار دیواری میں راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں، اور دن رات کا
ایک ایک لمحہ نحوست سے ملبوس ہوتا ہے۔

اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ بے یقینی اور بے چینی ہوا ہوگئی۔ یہ سترہ
تاریخ کی صبح ہے۔ اس نے خوشی سے سوچا۔ آج مجھے اس نحوست سے، اس کوٹھے
سے نجات مل جائے گی؟ چاہے زندگی کے ساتھ ملے، چاہے موت کے ذریعے۔

آج بہرحال یوم نجات ہے۔

فجر کی نماز پڑھ کر اس نے عارف کے دونوں جوڑے نکالے اور ان پر
استری کرنے لگی۔ وہ کپڑے اس نے سیے بھی محبت سے تھے اور اب ان پر
استری بھی محبت سے کر رہی تھی۔

استری کئے ہوئے کپڑے اس نے بڑی احتیاط سے پرانے اخبار میں
پیک کئے، اور انہیں تھیلے میں رکھ دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ استری ٹوٹے، اور
کپڑوں پر شکنیں پڑیں۔

اتنی دیر میں اچھو میاں نماز پڑھ کر آئے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہے
تھے۔

''کیا بات ہے، آج آپ بہت خوش ہیں؟'' نادرہ نے ان سے پوچھا۔

''کیوں نہ ہوں؟ یہ تو عید جیسا مبارک دن ہے ہمارے لئے۔'' اچھو
میاں نے کہا۔

''یہ یوم نجات ہے۔''

''آپ خوش رہیں گے نا؟''

''خوش ہیں، اور اس سے بھی زیادہ خوش رہیں گے۔'' اچھو میاں نے
بڑے یقین سے کہا۔

''اب کسی بھی وقت عارف میاں آ جائیں گے۔''

نادرہ نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ پھر چند لمحے بعد وہ بولی۔

''کون جانے؟'' پھر کچھ توقف کے بعد وہ بولی۔

''میں ناشتہ بناتی ہوں آپ کے لئے۔''

''آج تو کچھ کھایا ہی نہیں جائے گا۔ بس چائے بنا دو۔''

''سلائس تل لیتی ہوں۔ دیکھیں گے تو بھوک لگے گی اور کھا لیا جائے
گا۔''

''کچھ زیادہ کر لینا۔ ہمیں یقین ہے کہ عارف میاں ناشتہ کئے بغیر
آئیں گے۔''

نادرہ بغیر کچھ کہے باورچی خانے میں چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

عارف کا کراچی میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو کراچی جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ لاہور میں رہا تو وعدہ نبھانا مشکل ہو جائے گا۔ اور وہ نادرہ سے ملنے ضرور آئے گا۔ جبکہ یہ نادرہ کو گوارا نہیں ہوگا۔

کراچی میں اس نے ایک ایک دن گن گن کر کاٹا تھا۔ کام میں بھی اس کا دھیان نہیں تھا۔ وہ تو بس دن رات نادرہ کی قربت کے تصور میں جی رہا تھا۔ یہ نہ ہوتا تو وہ وقت گزرتا ہی نہیں۔

وہ رات کو ہی لاہور پہنچا تھا۔ اس میں اس کے لئے آسانی تھی۔ اب صبح سترہ تاریخ تھی۔ اسے بس یہی ایک رات تو گزارنا تھی۔ لیکن یہ بھی آسان نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک رات میں شاید کئی لاکھ لمحے ہوتے ہیں۔

اس سے سویا ہی نہیں گیا۔ وہ نیچے ہوٹل کے استقبالیہ پر گیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھا کلرک اونگھ رہا تھا۔ ہوٹل کا دروازہ بند تھا۔ عارف کو اس بیچارے کی بے آرام نیند خراب کرنا اچھا نہیں لگا۔ لیکن مجبوری تھی۔

''ذرا سنو!'' اس نے بہت دھیمی سرگوشی میں کہا۔

کلرک سوتا رہا۔ وہ سرگوشی اس کی سماعت تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

عارف کو حیرت ہوئی کہ اتنی بے میں بھی کوئی اتنی گہری نیند سو سکتا ہے۔ شاید اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ نیند کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے، اور یہ سچ ہے۔

اس نے نرمی سے کلرک کو ہلایا۔ وہ ہڑبڑا کر بیدار ہوا۔ چند لمحے تو جیسے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ پھر اس نے عارف کو دیکھا تو گھبرا کر پوچھا۔

''کیا بات ہے سر!''

''مجھے قرآن پاک مل سکتا ہے؟''

''قرآن پاک؟'' کلرک نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ جیسے وہ قرآن پاک کو جانتا ہی نہ ہو۔

''ہاں بھئی! مجھے قرآن پاک چاہئے۔''

''مشکل ہے سر!''

''کیا بات کرتے ہو؟''

''یہ ہوٹل ہے سر! یہاں قرآن کون طلب کرتا ہے۔''

عارف کو غصہ آ گیا۔

''یہاں کام کرنے والے کیا مسلمان نہیں ہیں؟''

''ہیں سر! لیکن......'' کلرک کہتے کہتے رکا، جیسے کچھ خیال آ گیا ہو۔

''ایک منٹ سر! میں اسٹاف روم میں دیکھتا ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''ایک ساتھی ہمارا قرآن پڑھتا تو ہے۔''

کلرک چلا گیا۔ دو منٹ بعد وہ مسکراتا ہوا آیا تو اس کے ہاتھ میں قرآن پاک کا ایک نسخہ تھا۔

''یہ لیجئے سر!'' اس نے فخریہ لہجے میں کہا، اور سکون کی سانس لی۔ جیسے اس نے اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا ہو۔

عارف نے آدھا پارہ ہی پڑھا تھا کہ نیند آنے لگی۔ ہمیشہ اس کے ساتھ یہی ہوتا تھا۔ ترجمے کے ساتھ سمجھ کر پڑھتا تو اور بات تھی لیکن قرأت کرتا تو ذرا دیر میں ہی نیند آنے لگتی۔ وہ اس پر ہمیشہ شرمندہ ہوتا تھا۔ ایک بار اس نے کسی کے سامنے کہا بھی کہ میرے اندر شاید کوئی شیطان ہے۔ قرآن پڑھوں تو وہ مجھے سلاتا ہے۔ اس پر ایک بار اس کے چچا نے اسے ٹوک دیا تھا کہ ایسے نہیں کہنا چاہئے۔

''یہ اللہ کا کلام ہے بیٹے!'' انہوں نے کہا تھا۔

''یہ آدمی کی ہر کمی پوری کرتا ہے۔ اندر بے سکونی ہو تو سکون دیتا ہے۔ پریشانیوں کو کم کر دیتا ہے۔ مسائل کی بلاضرورت بڑھی ہوئی اہمیت کو کم کر کے ان کا حل سمجھاتا ہے۔ اور میاں! جب آدمی پُرسکون ہو جائے تو قدرتی بات ہے کہ اسے نیند آ جاتی ہے۔''

عارف نے قرآن پاک سرہانے رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذرا دیر میں وہ سو گیا۔

لیکن وہ بہت گہری نیند نہیں تھی۔ دو بار اس کی آنکھ کھلی، شاید اس لئے کہ وہ تو محض وقت گزاری کر رہا تھا۔ صبح کے انتظار میں۔ دونوں بار اس نے گھڑی دیکھی اور دل میں سوچا کہ جہاں اسے جانا ہے، یہ اس کے لئے مناسب وقت نہیں۔

تیسری بار اس کی آنکھ کھلی تو سات بجے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ کوٹھوں پر راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ نادرہ فجر کے وقت اُٹھتی ہے، اور پھر سوتی نہیں۔

طویل اور اعصاب شکن انتظار ختم ہو گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

ارجمند حمیدہ سے لپٹی تو ایسے سوئی کہ اسے پتا بھی نہ چلا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے دہلی والے گھر میں ہے۔ اور سچ مچ اپنی دادی اماں کے ساتھ ہے۔ اور وہ بہت گہری اور بہت میٹھی نیند تھی۔

مگر فجر کے وقت حمیدہ نے بڑی نرمی سے اسے خود سے علیحدہ کیا تو وہ اُٹھ بیٹھی۔ آنکھیں پوری طرح کھلی نہیں تھیں کہ اس نے کلمہ شہادت پڑھا، پھر بڑی محبت سے کہا۔

"السلام علیکم دادی اماں!"

حمیدہ نے اسے جواب دیا۔ وہ بہت خوش ہو گئی تھی۔

"تو سو جاگی!" اس نے شفقت سے کہا۔

"نہیں دادی اماں! میں تو روز اسی وقت اُٹھتی ہوں۔" ارجمند نے کہا۔

"اور خود ہی اُٹھتی ہوں۔ آج نہ جانے کیوں آنکھ نہیں کھلی۔"

"اپنی دادی کے پاس تھی نا!"

"جی دادی اماں! یہی بات ہے۔"

حمیدہ اُٹھنے لگی تو ارجمند نے اسے روک دیا۔

"آپ یہیں بیٹھیں دادی اماں! میں ابھی آئی۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

حمیدہ کو حیرت ہو رہی تھی۔ عبدالحق نے اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا، سب کچھ بتا دیا تھا۔ مگر اس لڑکی کے طور طریقے دیکھ کر وہ حیران ہو رہی تھی۔ چار پانچ سال کی عمر کے بعد کوٹھے پر پلی بڑھی بچی ایسی ہو سکتی ہے؟ فجر کے وقت اُٹھنا، سب سے پہلے اپنے ربّ کی گواہی دینا، اور پھر بڑوں کو سلام کرنا؟ ایسا تو کبھی نور بانو نے بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ پہلے تو وہ جلدی اُٹھتی تھی۔ اور اب تو وہ دن چڑھے ہی سو کر اُٹھتی تھی۔ بلکہ اس نے تو عبدالحق کی عادت بھی خراب کر دی تھی۔

ضرور اس لڑکی کا تعلق کسی بہت اچھے خاندان سے ہے۔ کسی بہت اچھے گھر کی بچی ہے یہ۔ اور صرف یہی نہیں، اس کی پھپھو بھی بہت نیک ہو گی جو اس نے کوٹھے پر بھی اس بچی کو ایسی تربیت کی۔ ورنہ پانچ سال کی بچی کوٹھے پر گزرے ہوئے سات برسوں میں ایسی نہ ہوتی کچھ اور ہوتی۔

یااللہ! حمیدہ نے بڑے دکھ سے سوچا۔ کیسے کیسے لوگ اس پاکستان میں آ کر کہاں پہنچ گئے، تیری مصلحتیں تو ہی جانے......

ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

"یہ لیجئے دادی اماں! وضو کر لیجئے۔"

حمیدہ نے دیکھا، وہ وضو کا لوٹا ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔

"یہ کیا؟ تو کہاں گئی تھی نکی!"

"وضو کے لئے پانی گرم کرنے گئی تھی دادی اماں!"

"گرم پانی؟ لیکن موسم اتنا ٹھنڈا تو نہیں ہے نکی!"

ارجمند مسکرائی۔

"پھپھو کہتی ہیں، آدمی کو صبح کے وقت احتیاط کرنی چاہئے۔ گرم پانی کی ضرورت نہ ہو، تب بھی کنکنا ضرور کر لو۔"

"کنکنا؟"

"جی دادی اماں! بس اتنا گرم کہ پانی کی ٹھنڈک مر جائے۔ اسے کنکنا

کہتے ہیں۔"

حمیدہ نے وضو شروع کیا تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پانی گرم ہرگز نہیں تھا۔ وہ سردی کے موسم میں کنویں سے نکلنے والے پانی جیسا تازہ تھا۔ اور واقعی، وضو کرتے ہوئے اسے بہت اچھا لگا۔

وہ وضو کر کے نکلی تو ارجمند بھی وضو کر چکی تھی، اور نماز کے لئے کھڑی ہو رہی تھی۔ حمیدہ نے سوچا، اللہ کی رحمت آ گئی ہے ہمارے گھر میں۔

دونوں نے نماز پڑھی۔ پھر حمیدہ ارجمند کے سلام پھیرنے کا انتظار کرتی رہی۔

ارجمند اُٹھنے لگی تو حمیدہ نے کہا۔

"ایک بات تو بتا نکی! تیری پھپھو نے یہ بھی بتایا کہ پانی گرم کیوں ہونا چاہئے۔"

"جی دادی اماں! وہ کہتی ہیں کہ حرارت زندگی ہوتی ہے۔ آدمی کے جسم کو نہ بہت گرم ہونا چاہئے اور نہ ٹھنڈا۔ زندگی ختم ہو جائے تو جسم ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس لئے جسم کو کبھی ٹھنڈا نہیں ہونے دینا چاہئے۔ وہ کہتی ہیں، یہ اللہ کا نظام ہے۔ اسی لئے تو کنویں میں سے گرمی میں پانی ٹھنڈا اور سردی میں گرم نکلتا ہے۔"

واقعی، یہ تو سچ ہے۔ حمیدہ نے دل میں سوچا۔ اس کی پھپھو کتنی عقلمند ہے۔

ارجمند اب قرآن کی تلاوت کر رہی تھی۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی، اور وہ پڑھ بھی بہت اچھا رہی تھی۔

"ذرا زور سے پڑھو نکی! تجھے تو بہت اچھا قرآن پڑھنا آتا ہے۔"

"جی ...... ! مجھے پھپھو نے پڑھایا ہے۔"

حمیدہ سوچتی رہی، وہ کیسی لڑکی ہوگی، جس نے کوٹھے پر بیٹھ کر یہ سب کچھ کیا ہے۔

ارجمند پڑھ رہی تھی، اور حمیدہ بڑے اشتیاق اور خوشی سے سن رہی تھی۔

ذرا دیر بعد اچانک ارجمند کی آواز بکھرنے لگی۔ اگلے ہی لمحے وہ رو رہی تھی۔ ضبط

کے باوجود اس کے حلق سے بھنچی بھنچی آوازیں نکل رہی تھیں۔

حمیدہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا ہوا نکی! تجھے کیا ہوا؟"

ارجمند کے ہونٹ لرزے۔ لیکن آواز نہیں نکلی۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا۔

"پھو...... پھپھو......"

"پھپھو یاد آ رہی ہیں؟" حمیدہ نے اسے لپٹاتے ہوئے پوچھا۔

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔

حمیدہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اسے لپٹا کر تھپکیاں دیتی رہی۔

"کچھ تو بتا نکی! بات کیا ہے؟"

کچھ دیر بعد ارجمند کی طبیعت سنبھلی تو اس نے کہا۔

"میری پھپھو بہت بڑی تکلیف میں ہیں دادی اماں!"

"تجھے کیسے پتا؟" حمیدہ نے حیرت سے کہا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا، لیکن بس مجھے معلوم ہے۔"

"پہلی بار دور ہوئی ہے پھپھو سے، اس لئے ایسا لگ رہا ہے نکی!"

"نہیں دادی اماں! مجھے معلوم ہے، انہیں یہاں درد ہو رہا ہے۔" ارجمند نے سینے پر بائیں جانب ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

حمیدہ کے خیال میں وہ اس کی پھپھو سے جدائی کا ردِعمل تھا لیکن اس نے اصرار نہیں کیا۔

"تو اپنی پھپھو کے لئے اللہ سے دعا کر نکی! سکون آ جائے گا۔" اس نے ارجمند سے کہا۔

ارجمند نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔

❁ ❁ ❁

نادرہ کو گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ سانس لینے میں یوں دشواری ہو رہی

تھی، جیسے گرد و پیش میں آکسیجن کی کمی ہوگئی ہو۔ وہ گھبرا کر کھنکھاری۔ اسی لمحے اس کے سینے میں درد کی افقی لہریں اٹھنے لگیں۔

اس نے سنبھلتے ہوئے ٹوسٹ پلیٹ میں رکھے۔ اس پلیٹ کو مکھن کے پیالے کے ساتھ ٹرے پر رکھا، جس پر چائے دانی پہلے ہی موجود تھی۔ ٹرے اس نے اُٹھا لی۔ سوچا، پیالیاں اور دوسری چیزیں وہ بعد میں لے جائے گی۔

ٹرے لے کر باورچی خانے سے نکلنے لگی۔ اسی لمحے درد کی ایک تند لہر نے جیسے اس کے سینے کے اندر کچھ کاٹ دیا۔ وہ لہر اتنی اچانک اور اتنی شدید تھی کہ اس کے دماغ میں اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ پاؤں جواب دے گئے۔ پہلے ہاتھوں سے ٹرے چھوٹی اور پھر اس کی بے جان ہوتی ہوئی ٹانگوں نے جسم کا بوجھ اُٹھانے سے انکار کر دیا۔

اسے لگا کہ وہ لٹو کی طرح گھوم رہی ہے۔ پھر وہ نیچے گر گئی۔

اچھو میاں نے پہلے تو گرتے ہوئے برتنوں کی آواز سنی، پھر دوسری آواز...... کسی جسم کے گرنے کی آواز۔ وہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف لپکے۔ ان کا دل اندیشوں سے بھر گیا تھا۔

بکھرے ہوئے برتنوں کی طرف تو ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔ نادرہ نیچے گری ہوئی تھی۔ اس کا ہاتھ سینے پر تھا اور چہرہ اذیت کی شدت سے چیخ رہا تھا۔ انہوں نے اسے سہارا دے کر اُٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کے لئے نادرہ کا تعاون بھی ضروری تھا جو وہ نہیں کر پا رہی تھی۔ یہ بات ان کے نکتہ نظر سے اور تشویش ناک تھی۔

''کیا ہوا بیٹا! اُٹھو تو......'' انہوں نے متوحش لہجے میں کہا۔

نادرہ کے ہونٹ ہلے، مگر بے آواز۔ چہرے پر موجود اذیت کے تاثر میں بے بسی بھی گھل مل گئی۔ اس میں بولنے کی طاقت ہی نہیں تھی۔

''ہمت تو کرو بیٹا!'' اچھوں میاں نے شفقت سے کہا۔

لیکن نادرہ اُٹھ نہیں سکی۔ اب اسے گھسیٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ جیسے تیسے اسے کمرے کی طرف گھسیٹنے لگے۔ اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی۔

ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اپنے کام میں لگے رہے۔

وہ کمرے کے دروازے پر پہنچے تھے کہ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ اس بار آواز ذرا تیز تھی۔

اچھو میاں کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ عارف کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

لیکن نادرہ کو بستر تک پہنچانا پہلی ترجیح تھی۔ اور وہ مشکل کام تھا۔

تیسری دستک، دستک دینے والے کی بے تابی اور دستک کی مظہر تھی۔

اچھو میاں نے جیسے تیسے نادرہ کو بستر پر ڈال دیا۔

''میں دروازہ کھول دوں، عارف میاں آ گئے ہیں۔'' اچھو میاں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''تم خود کو سنبھالو بیٹا!''

اتنی دیر میں دروازے پر چوتھی، پانچویں دستک بھی ہو چکی تھی۔ اچھو میاں نے دروازہ کھولا۔ وہاں عارف کے سوا کون ہو سکتا تھا؟

عارف دروازہ نہ کھلنے کی وجہ سے پہلے ہی پریشان تھا۔ ان کے چہرہ دیکھ کر وہ اور متوحش ہو گیا۔

''کیا ہوا نواب صاحب!'' اس نے دروازے پر کھڑے ہی پوچھا۔

''اندر آ جاؤ میاں! بٹیا کی طبیعت اچانک ہی بہت خراب ہو گئی ہے۔''

وہ دونوں کمرے کی طرف لپکے۔ کوٹھے کا دروازہ بند کرنے کا انہیں خیال بھی نہیں رہا۔

کمرے میں عارف نے نادرہ کا ہاتھ بے تابی سے تھاما، جو ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا نادرہ؟''

اسے دیکھ کر نادرہ کی آنکھوں میں چمک اُبھری۔

''آج...... فیص...... لے کا...... دن ہے...... نا......؟'' اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

عارف کا دل ڈوبنے لگا۔

"میں تمہیں لینے کے لئے آ گیا ہوں۔"

نادرہ نے اچھو میاں کو کپڑے اٹھانے کا اشارہ کیا، جو پرانے اخبار میں لپٹے ہوئے تھے۔ اچھو میاں نے وہ اُٹھائے تو نادرہ نے عارف کی طرف اشارہ کیا۔ اچھو میاں نے وہ عارف کو دے دیئے۔

"یہ کیا؟" عارف نے پوچھا۔

"آپ کے دو جوڑے...... وعدے کے مطابق......" نادرہ نے کہا۔ یہ خود اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی طبیعت بہتر ہوئی ہے یا وہ قوتِ ارادی کے زور پر بول رہی ہے۔

"تمہارا کیا حال ہے؟" عارف کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"میرا خیال ہے...... اللہ کا حکم آ گیا ہے۔"

نادرہ نے اٹک اٹک کر کہا۔

"اور میں یہاں مرنا نہیں چاہتی۔" وہ اچھو میاں کی طرف مڑی۔

"نواب صاحب! ثمن کو جگا دیجئے۔"

اچھو میاں تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔

"کچھ بتاؤ تو، کیا ہوا ہے؟" عارف کے لہجے میں وحشت تھی۔

"درد ہے، بہت شدید درد ہے سینے میں۔ سانس لینی بھی مشکل ہو رہی ہے۔"

عارف اس کے ہاتھوں کو سہلا کر گرم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نادرہ کی پیشانی پسینے میں بھیگ گئی تھی۔

ثمن گھبرائی ہوئی آئی۔

"کیا ہوا باجی!"

"میں نے رات تم سے کہا تھا نا، تو وقت آ گیا ہے۔ میں یہاں سے رخصت ہو رہی ہوں۔ اب تمہیں یہ سب سنبھالنا ہے۔"

ثمن رونے لگی۔

"میں...... باجی...... یہ سب......" اس سے بولا نہیں گیا۔

"خدا کے لئے، مجھے یہاں سے نکالیں۔" نادرہ نے عارف سے کہا۔

"میں یہاں مرنا نہیں چاہتی۔"

عارف نے اچھو میاں کی طرف دیکھا۔

"میں ابھی ٹیکسی لاتا ہوں۔" اچھو میاں نے کہا اور باہر کی طرف لپکے۔

✿ ✿ ✿

عارف اگلی سیٹ پر تھا۔ نادرہ عقبی نشست پر لیٹی تھی۔ اس کا سر کونے میں بیٹھے ہوئے اچھو میاں کی گود میں تھا۔

"نواب صاحب! میرے کفن کے پیسے ہیں نا آپ کے پاس؟" نادرہ نے کہا۔

"بیٹا! خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔" اچھو میاں نے کہا اور رونے لگے۔

وہ اسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نادرہ کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔ عارف اور اچھو میاں کاریڈور میں ٹہلتے رہے۔

"یہ سب کیا ہو گیا؟" عارف نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"بس دعا کرو عارف میاں!"

اتنی دیر میں ڈاکٹر آ گیا۔

"دل کا شدید درد ہے۔" اس نے کہا۔

"دو گھنٹے خیریت سے گزر جائیں تو بہتری کی اُمید ہے۔"

"کچھ کریں ڈاکٹر! خدا کے لئے، اسے بچا لیں۔"

"زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے عارف صاحب! ہم تو بس کوشش کر سکتے ہیں۔" پھر وہ اچھو میاں کی طرف مڑا۔

"وہ آپ کو بلا رہی ہیں نواب صاحب!" اس نے ان سے کہا۔

اچھو میاں اندر چلے گئے۔

عارف نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑوں کو اخبار ہٹا کر دیکھا۔ استری

کئے ہوئے نفیس کپڑے، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے اس پر حیرت تھی کہ وہ تو کوٹھے سے نکلتے ہوئے انہیں بھول گیا تھا۔ لیکن نادرہ نے کہا تھا...... یہ کپڑے یہاں نہ چھوڑیں عارف! انہیں ساتھ لے لیجئے۔ یہ میرے ایفائے عہد کا ثبوت ہیں۔ آپ کے لئے میری محبت۔

اور عارف نے سوچا، یہ وہیں رہ جاتے تو شاید پھر کبھی ملتے ہی نہیں۔

وہ اس وقت اپنے اندر موجود ایک خوف ناک یقین سے لڑ رہا تھا۔ یہ یقین کہ نادرہ بچے گی یا نہیں؟ اس وقت اس کے دل کی ہر دھڑکن، اس کی ہر سانس نادرہ کے لئے زندگی کی دعا کر رہی تھی۔ لیکن اس خوف ناک یقین کی لو کسی طرح مدھم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

اچھو میاں باہر آئے تو بہت پریشان اور دل گرفتہ تھے۔

''وہ ارجمند کو بلا رہی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

ارجمند! عارف کو حیرت ہوئی کہ اسے ارجمند کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

''کہاں ہے ارجمند؟''

''آپ یہاں کا خیال رکھیں عارف میاں! میں اسے لینے جا رہا ہوں۔''

اچھو میاں نے کہا اور چلے گئے۔

عارف کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ارجمند کوٹھے پر نہیں تھی۔ ہوتی تو نادرہ اسے ساتھ لئے بغیر کبھی نہیں نکلتی۔ وہ جسے اتنی اذیت میں بھی اس کے کپڑے یاد رہے تھے، اس ارجمند کو کیسے بھول سکتی تھی؟ جس کے لئے وہ زندہ تھی۔

تو گویا اس ایک مہینے میں بہت کچھ ہوا تھا۔ نادرہ کی امید کے مطابق۔ کوئی ایسا شخص آ گیا تھا، جس پر وہ اعتبار کر سکتی تھی، جسے وہ ارجمند کو بے فکری کے ساتھ سونپ سکتی تھی۔

عارف کو نادرہ کی آخری باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے کہا تھا، سترہ تاریخ کو اگر وہ زندہ ہوئی تو اس کی ہو جائے گی۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ اسے بڑی حد تک یقین تھا کہ اسے کچھ ہو جائے...... حالانکہ وہ بیمار بھی نہیں ہوتی تھی۔

ہوتی تو اسے ضرور بتاتی۔

اسے اپنے عہد کی بہت فکر تھی۔ اور اب اس سے وعدے کے بعد اس عہد کے پورے ہونے کی ایک ہی صورت تھی۔ اس کی موت......! اور اس نے فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔

عارف جھرجھری لے کر رہ گیا۔ سب کچھ اتنا عجیب اور ناقابل یقین تھا، جو ہو چکا تھا، وہ بھی اور جو ہو رہا تھا وہ بھی۔ اور جو کچھ ہو چکا تھا، وہ ابھی اس کے علم میں بھی نہیں تھا۔ وہ بس یہ جانتا تھا کہ ارجمند کوٹھے پر موجود نہیں تھی۔

وہ پریشان ادھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ دعا کے لئے اس کے پاس لفظ نہیں تھے۔ لیکن اس کی سانسیں، اس کی دھڑکنیں لفظوں کے بغیر، خیال کی شکل میں دعا کر رہی تھیں۔

❁ ❁ ❁

اس کی ہر سانس سینے میں چلنے والی دودھیا تلوار تھی۔ درد کی افقی لہریں اس کے سینے کو دونوں طرف سے کاٹ رہی تھیں۔ اذیت ایسی تھی کہ اس کے لئے کچھ سوچنا بھی مشکل تھا۔

لیکن سوچ تو خود کار عمل ہے۔ اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ اس کا آخری وقت ہے۔ وہ بچے گی نہیں۔ اس یقین کے تحت اسے سوچنا تھا۔ یہ بات خوش آئند تھی کہ اللہ کی مہربانی سے تمام معاملات نمٹ گئے تھے۔ کوٹھے سے اس کی جان ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی تھی۔ اب کوٹھے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ارجمند کو اس نے عبدالحق کے محفوظ ہاتھوں میں دے دیا تھا۔ اس کی موت کے بعد نواب صاحب بھی آزاد ہو جائیں گے۔ جو سوچا ہے، وہ سب کر سکیں گے۔ کتنے مسائل تھے، جو اللہ نے اپنے فضل و کرم سے حل کر دیئے۔ اب وہ سکون سے مر سکتی ہے۔

اس نے حیرت سے سوچا۔ اپنی موت کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ کتنی پُرسکون ہے۔ یہ اللہ کی رحمت ہے، اور رہی یہ اذیت، تو یہ ذرا دیر کی بات ہے۔ یہ سب تو زندگی کے بکھیڑے ہیں۔ موت ابدی سکون ہے۔

سب کچھ ٹھیک تھا، سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا۔ لیکن ایک پہلو دکھ کا تھا۔ عارف ...... وہ بہت اچھا انسان، جو اس سے محبت کرتا تھا، جو آج اس کے ساتھ زندگی بھر کا ساتھ حاصل کرنے کے لئے بڑی امیدیں لے کر آیا تھا، کتنا مایوس، کتنا دکھی ہوگا وہ اسے کھوکر۔ بس یہ ایک ملال تھا اس کے دل میں۔

مرتے وقت آدمی سچا ہوتا ہے۔ وہ کسی فریب، کسی بہلاوے کا سہارا نہیں لیتا۔ نادرہ اس حقیقت سے کیسے انکار کرسکتی تھی کہ اسے بھی عارف سے محبت ہوگئی تھی۔

اس نے سوچا، کہیں یہ ملال بھی دو دھاری تلوار تو نہیں۔ اس نے خود کو بہت گہرائی میں جا کر ٹٹولا کہ کہیں وہ اپنے لئے بھی تو مایوس اور دکھی نہیں، کہ اسے عارف کا ساتھ، اور اس کے قرب کی سچی خوشیاں نہیں مل سکیں۔ زندگی کا پل اس وقت ٹوٹ رہا ہے، جب خوشیاں اور زندگی کی رعنائیاں باہیں پھیلائے بڑھتے بڑھتے اس کے بہت قریب آگئی ہیں۔

لیکن اس سچے لمحے نے اس کی اذیت سے بوجھل وجود کو سکون اور طمانیت سے بھر دیا۔ اسے اپنا کوئی غم نہیں تھا۔ بلکہ خوشی تھی کہ وہ اللہ کے سامنے سرخ رو ہوگی۔ ورنہ وہ ساری عمر اپنی عہد شکنی پر کڑھتی رہتی۔ وہ خوشیوں میں بھی خوش نہ رہتی۔ وہ تو اب خوش تھی۔ اللہ نے سارے مسئلے حل کر دیئے تھے۔ وہ بوجھل نہیں، ہلکی تھی۔ اللہ کا فیصلہ اٹل، سچا اور بہترین ہوتا ہے۔

مگر وہ عارف کے لئے افسردہ تھی۔ یہی تو محبت ہے۔ وہ اس کے لئے کچھ نہیں کرسکتی تھی اور کڑھ رہی تھی۔ وہ جو آس لے کر آیا تھا، مایوس جائے گا تو اس پر کیا گزرے گی؟ کیا وہ یوں ہی محروم رہے گا؟ کاغذ کے پھولوں میں خوشبو کی جستجو کرتا رہے گا؟ کیا اتنا اچھا انسان ضائع ہو جائے گا؟

اسے اس لمحے عارف پر ایسی محبت آئی کہ وہ خود بھی حیران ہوگئی۔ اس نے دھیرے سے ڈاکٹر کو پکارا۔ ڈاکٹر آیا تو اس نے کہا۔

''پلیز! عارف صاحب کو بلا دیجئے۔''

''بی بی! آپ کو اس وقت صرف تنہائی اور آرام کی ضرورت ہے۔''

ڈاکٹر نے کہا۔

''آپ ڈاکٹر ہیں، لیکن آپ نہیں سمجھ سکتے، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ آپ انہیں بلا دیجئے۔''

ڈاکٹر چند لمحے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ وہ اس مریضہ سے سب کچھ پوچھ چکا تھا۔ اسے اس سے پہلے کبھی ایسی کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ کوئی ایسی علامت بھی کبھی ظاہر نہیں ہوئی تھی، جو مسئلہ دل کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ پھر اس عمر میں دل کا دورہ! بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لیکن حقیقت تھی، اور اب وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہے۔

ان آنکھوں میں ڈاکٹر کو وہ نقاہت ...... شدید نقاہت نظر آئی، جو اس نے مرنے والوں کی آنکھوں میں اکثر دیکھی تھی۔

اس نے خاموشی سے سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔ چند لمحے بعد عارف اندر آ گیا۔

''یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ اور میرا ہاتھ تھام لو۔'' نادرہ نے کہا۔

عارف نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اب تم بہتر محسوس کر رہی ہونا؟'' اس کے لہجے میں اُمید بھی تھی اور التجا بھی۔

''نہیں عارف! سچ یہ ہے کہ ہم جدا ہونے والے ہیں۔ ابھی کچھ دیر میں نواب صاحب ارجمند کو لے کر آ جائیں گے۔ تب تک کا وقت میں تمہارے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔ بس یہی وقت ہے ہمارے پاس۔''

''تم بلاوجہ......''

''اس وقت کا ضائع نہ کرو عارف! تمہاری ایک امانت ہے میرے پاس۔ وہ تمہیں دینی ہے۔ عارف! میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ لیکن اللہ کو ہمارا ساتھ منظور نہیں تھا۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ جو بھی تھوڑا بہت وقت تمہارے ساتھ گزرا، وہ میری زندگی کا خوب صورت ترین عرصہ تھا۔ میں اس کے لئے تمہاری شکرگزار ہوں۔''

"تم نے تو مجھے سب کچھ دے دیا نادرہ!" عارف نے کہا۔

"یہ اللہ کا کرم ہے۔ اس پر میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

"تم یہ کبھی نہیں بھولنا کہ میں تم سے محبت کرتی تھی۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے کیا امید کرتی ہو، کیا چاہتی ہو؟ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی کوئی سہارا تلاش نہیں کروں گا۔ میرے لئے تمہاری محبت بہت کافی ہے۔ اب میری محفل میں تمہاری یادوں کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔"

نادرہ نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"شکریہ عارف! اب میں سکون سے مرسکوں گی۔"

"لیکن یہ ضروری نہیں ہے، کون جانے......"

"بس اب ہم لمس اور آنکھوں سے باتیں کریں گے عارف! اور یہ باتیں تمہیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ یہ لمحے تمہیں ہمیشہ خوشی دیں گے۔ تمہیں کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیں گے۔ بس میرا ہاتھ تھام کر میری آنکھوں میں دیکھتے رہو عارف!"

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے کہا۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے ارجی!"

ارجمند گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

"کیا ہوا میری پھپھو کو؟"

عبدالحق کو حیرت ہوئی، لگا جیسے وہ پہلے ہی سے اس بات کی توقع کر رہی تھی۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کچھ طبیعت خراب ہے نادرہ کی۔ اس نے تمہیں بلایا ہے۔"

"تو وہ وہاں نہیں ہیں۔" ارجمند نے دھیمی آواز میں خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"وہاں ہوتیں تو نہ، وہ مجھے بلاتیں اور نہ آپ مجھے ان سے ملانے لے

کر جاتے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"پتر عبدالحق! میں بھی چلوں۔" حمیدہ نے کہا۔

"ضرور اماں! بس آجایئے۔"

وہ باہر نکلے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اچھو میاں پہلے ہی اگلی نشست پر موجود تھے۔ ارجمند نے انہیں سلام کیا۔ عبدالحق نے حمیدہ اور اچھو میاں کا تعارف کرایا۔

راستے میں ارجمند نے اچھومیاں سے پوچھا۔

"نانا! پھپھو کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہے بیٹا! بس تمہیں یاد کر رہی ہیں۔" اچھو میاں نے جواب دیا۔

اس کے بعد راستے بھر خاموشی رہی۔

❁ ❁ ❁

اچانک نادرہ نے کہا۔

"ہمارا وقت ختم ہوگیا عارف!"

عارف نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

"کیا......؟ کیا کہہ رہی......"

"وہ لوگ آگئے ہیں۔" نادرہ نے دھیرے سے کہا۔

عارف نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اچھومیاں اور ارجمند کو تو وہ پہچانتا تھا، ان کے ساتھ ایک جوان لڑکا اور بوڑھی عورت بھی تھی۔ اس نے نادرہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"الوداع عارف!"

عارف جانے کے لئے پلٹا تو نادرہ نے اسے پکارا۔ عارف نے پلٹ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جاؤ نہیں! میرے سامنے ہی رہو۔"

عارف وہیں رُک گیا۔ اتنی دیر میں وہ لوگ قریب آگئے۔ ارجمند اتنی

متوحش تھی کہ عارف کو دیکھ بھی نہیں سکی۔ وہ نادرہ پر جھک گئی۔

''کیا ہوگیا پھپھو!'' اس نے نادرہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''اللہ کا حکم! اللہ کا فیصلہ گڑیا!'' نادرہ نے کہا۔ پھر اس نے عبدالحق کے ساتھ کھڑی ہوئی بوڑھی عورت کو دیکھا۔

''یہ کون ہیں؟'' اس نے عبدالحق سے پوچھا۔

''یہ میری اماں ہیں۔''

''اماں ..... یہ بالکل میری امی جیسی ہیں۔ آپ میرے پاس بیٹھئے اماں!''

حمیدہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''یہ بات نکی نے بھی کہی تھی کہ میں اس کی دادی جیسی ہوں۔''

''جی اماں! آپ میری شہید امی سے بہت ملتی ہیں۔'' نادرہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اب میں اور مطمئن ہوگئی۔ مائیں ہی بیٹیوں کے دل کو سمجھ سکتی ہیں۔ میں اپنی ارجی کو اللہ کے بعد آپ کی امان میں دے رہی ہوں۔''

''سر آنکھوں پر بیٹی! لیکن مایوسی کی باتیں نہیں کرتے۔'' حمیدہ نے کہا۔

''شاید بندے کو پتا چل جاتا ہے اماں! میں جانتی ہوں۔''

حمیدہ کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ نادرہ کے یقین نے اسے ہلا دیا تھا۔

''اللہ آپ کو صحت کے ساتھ بڑی عمر دے اماں! میری ارجی کو اپنے سائے میں رکھیئے گا۔ بچی ہے، غلطیاں بھی کرے گی، پھر بھی آپ اسے دھوپ سے بچاتی رہئے گا۔''

''تو فکر نہ کر دھیے! یہ میری پوتی ہی ہے۔''

''ارجی! سب کا خیال رکھنا گڑیا! اور یاد رکھنا، خدمت اور فرمانبرداری سے ہی دل جیتے جاتے ہیں۔'' نادرہ نے ارجمند سے کہا۔

ارجمند سے بولا بھی نہیں گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''اور عبدالحق! ...... دوست! میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کروں گی۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو نادرہ!''

''لیکن اس بند ہوتے دل کی ہر دھڑکن تمہارے لئے، نواب صاحب کے لئے، اور عارف کے لئے دُعا بن گئی ہے۔ نواب صاحب! میرے پاس بیٹھئے ذرا۔''

ارجمند جلدی سے ہٹ گئی اور اس نے اچھو میاں کو جگہ دے دی۔

''نواب صاحب! اب مجھے وہاں نہ لے جایئے گا۔ عبدالحق کے گھر سے وداع کیجئے گا مجھے۔''

اچھو میاں کا چہرہ پتھر کا ہوگیا تھا۔ انہوں نے خاموشی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''اور میرے کفن کے پیسے تو ہیں نا، آپ کے پاس؟ انہی سے کفن دیجئے گا مجھے۔''

''تم بے فکر رہو بیٹا!'' اچھو میاں نے بڑی مشکل سے کہا۔

''عارف! اپنا وعدہ یاد رکھئے گا۔''

عارف نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ حیران تھا، نادرہ سے اس کا کوئی ظاہری رشتہ نہیں تھا۔ لیکن نادرہ نے کتی خوب صورتی سے اسے بے نام تعلق کے بارے میں سب کو بتا دیا تھا۔ عبدالحق اور نواب صاحب کے ساتھ دُعاؤں میں اسے شامل کرے۔ وہ کیسی عقل مند اور سمجھ دار عورت تھی۔

''ارجی! دیکھو تو، میں کتنے سارے لوگ تمہیں دے کر جا رہی ہوں۔ اللہ کی مہربانی ہے۔ ایک پھپھو کے بدلے اتنے لوگ۔'' یہ کہتے کہتے نادرہ کی رنگت متغیر ہوگئی۔ اس کی سانس اٹکنے لگی، اور کھڑکھڑاہٹ نمایاں ہوگئی۔

عارف تیزی سے ڈاکٹر کی طرف لپکا۔

نادرہ کے ہونٹ بھی اٹک اٹک کر جنبش کر رہے تھے۔ حمیدہ کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ بلکہ اس کی گرفت اور سخت ہوگئی تھی۔ حمیدہ نے صاف

سنا۔ اکھڑتی ہوئی سانسوں کے درمیان وہ اٹک اٹک کر کلمۂ شہادت پڑھ رہی تھی۔

ڈاکٹر آیا تو اس نے کہا۔

''پلیز! آپ سب یہاں سے ہٹ جائیں۔''

وہ سب باہر آ گئے۔ سب اپنے اپنے طور پر اکیلے تھے۔ کسی کو کسی کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔

دو منٹ بعد ڈاکٹر عارف کے پاس آیا۔

''آئی ایم سوری مسٹر عارف!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

❁ ❁ ❁

اس رات عبدالحق عارف اور نواب صاحب کے ساتھ لان میں بیٹھا تھا۔

عارف نے عبدالحق سے کہا۔

''اب میں اجازت چاہوں گا عبدالحق صاحب!''

''اور میں بھی۔'' اچھو میاں بولے۔

عبدالحق نے ان دونوں کو دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

''دیکھیں عارف بھائی! میں آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا، لیکن نادرہ ہمیں ملا کر گئی ہے۔ تو یہ ایک تعلق قائم ہو چکا ہے ہمارے درمیان۔ آپ میرے ساتھ کچھ دن گزاریں، تاکہ ہم ایک دوسرے کو جان سکیں۔'' پھر وہ اچھو میاں کی طرف مڑا۔

''اور نواب صاحب! آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ کا ہی گھر ہے۔ اب آپ کہاں جائیں گے؟ اور ارجمند تو ویسے بھی آپ سے مانوس ہے۔ اس کا دل بہلا رہے گا۔''

''اب مجھے نواب صاحب نہ کہیں..... میں تو اچھو میاں ہوں..... نادرہ نے مجھے دوبارہ نواب صاحب بنا دیا تھا۔'' اچھو میاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اور دوسری بات یہ کہ میں رک نہیں سکتا۔ میں تو وہاں ایک ڈیوٹی پر تھا، سمجھ لیں اصل ڈیوٹی سے مجھے عارضی رخصت دی گئی تھی نادر بیٹی کے لئے۔ اب یہ ڈیوٹی ختم ہوتے ہی میری اصل ڈیوٹی شروع۔ مجھے تو جانا ہی ہے۔''

''اچھا تو سوئم تک تو رک جائیں۔''

عبدالحق نے ایسے کہا کہ اچھو میاں انکار نہیں کر سکے۔

''یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ کراچی میں ہوتے ہیں۔'' عبدالحق نے عارف سے کہا۔

''یہاں آپ کا قیام کہاں تھا؟''

''ریجنٹ ہوٹل میں۔''

''بس تو آپ کمرہ نمبر بتائیں، میں اپنے ڈرائیور کو بھیج کر سامان منگوا لیتا ہوں۔''

''میں پورے گھر کو آپ کی زحمت نہیں دینا چاہتا۔''

''آپ یقین کریں کہ میرے گھر والوں کے لئے یہ ہرگز ہرگز کوئی زحمت نہیں ہوگی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن آپ کو زحمت سے بچانے کے لئے میں نے آپ کے ٹھہرنے کا بندوبست انیکسی میں کر دیا ہے۔''

''چلیں، ٹھیک ہے۔'' عارف نے کہا۔

عبدالحق ان دونوں کو انیکسی میں لے گیا۔

''یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' اس نے کہا۔

''اب آپ کمرہ نمبر بتائیں۔''

''میں خود ہی لے آؤں گا سامان۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔ ڈرائیور لے آئے گا۔ آپ اتنی دیر میں نہا دھو کر تازہ دم ہو جائیں۔ میں یہ کام نمٹا کر آتا ہوں۔ پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ بہت سی خالی جگہیں پر کرنی ہیں۔''

''ٹھیک ہے!''

عبدالحق کمرہ نمبر معلوم کر کے باہر نکل آیا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق معمول کے مطابق حمیدہ کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ وہاں سے انیکسی کی طرف جانے کے لئے اٹھنے لگا تو ارجمند نے کہا۔

''آغا جی! وہ .... مجھے نانا سے ملنا ہے۔''

''تو چلو میرے ساتھ۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔''

''ایک منٹ رکیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔

''چلئے!'' اس نے کہا۔

انیکسی میں ماحول سوگوار تھا۔ اچھو میاں مضطربانہ انداز میں ادھر اسے اُدھر اور اُدھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ عارف کرسی میں بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ اسے تو ان کے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ لیکن ٹہلتے ہوئے اچھو میاں رک گئے۔

ارجمند جا کر ان سے لپٹ گئی۔ اچھو میاں اس کا سر تھپ تھپانے لگے۔

''نانا! کیا پھپھو سچ مچ چلی گئی ہیں؟'' ارجمند نے ان سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا! اللہ کی یہی مرضی تھی۔''

ارجمند اچانک ہی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ اب تک وہ روئی ہی نہیں تھی۔ اسپتال سے آنے کے بعد وہ اب پہلی بار اچھو میاں سے ملی تھی اور شاید ایک وہی تھے، جن سے لپٹ کر وہ رو سکتی تھی۔

پھر اسے تسلیاں دیتے ہوئے اچھو میاں کا اپنا ضبط بھی جواب دے گیا۔ وہ بھی رونے لگے۔

عبدالحق نے عارف کو دیکھا، جو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس لمحے عبدالحق کو احساس ہوا کہ وہ کتنا تنہا ہے۔ وہ عارف کے برابر جا بیٹھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں آپ کا دکھ سمجھ سکتا ہوں ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں بھائی! یہ بس آدمی کا گمان ہوتا ہے۔ کوئی کیسے سمجھ سکتا ہے کسی کا دُکھ؟'' عارف نے کہا۔

''اور یہ گمان وہ اپنے ہی کسی دکھ کے حوالے کے بل پر کرتا ہے۔ لیکن دنیا میں ایک جیسے دو حوالے ہوتے ہی نہیں دوست! ہر تعلق ایک منفرد اکائی ہوتا ہے۔''

عبدالحق کو اس کی گہرائی پر رشک آنے لگا۔ اس نے سوچا، کاش! کاش نادرہ زندہ ہوتی۔

''بہرحال یہ میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کی محرومی بہت بڑی ہے۔''

''ہاں! یہ تو ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جو ہوا، وہی بہتر تھا۔'' عارف نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''میں کتنی ہی کوشش کر لیتا، نادرہ کو خوش نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور ایسے میں میں خود بھی خوش نہیں رہتا۔''

عبدالحق نے کچھ نہیں کہا، سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''ایسے زندہ ضمیر والے لوگ میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔'' عارف نے کہا۔

''وہ بڑی شاندار عورت تھی، سچی عورت، جسے جھوٹ کی دنیا میں پھینک کر خدا نے آزمایا کہ وہ کتنی سچی ہے۔ اس نے اللہ کو گواہ بنا کر جو وعدہ کیا تھا، وہ اور اس کی حرمت اسے بہت عزیز تھی۔ عزت کی زندگی سے بھی زیادہ، زندگی کی سچی خوشیوں سے بھی بڑھ کر.....'' وہ چونکا اور بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ ارجمند اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''میں نے پھپھو سے کہا تھا کہ میں آپ کو پھپھا کہوں گی۔'' ارجمند نے اس سے کہا۔

''لیکن پھپھو نے منع کر دیا۔ کہنے لگیں، ایسے زبردستی رشتے جوڑنا بری بات ہوتی ہے۔''

عارف کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

"اب پھپھو چلی گئیں، میں آپ کو کیا کہوں؟"

"جو جی چاہے کہو! بھائی کہو، چچا کہو۔"

"یہ بھی تو جوڑے ہوئے رشتے ہوں گے۔"

"تم اپنی پھپھو کی بات بھی نہیں۔ اصل میں پھپھا تو پھپھو کا شوہر ہوتا ہے نا۔ اور نادرہ نہیں چاہتی تھی کہ مجھ سے اس کی شادی ہونے سے پہلے تم مجھے پھپھا کہو۔ اب تم مجھے جو چاہو کہہ سکتی ہو۔"

"میں تو پھپھا ہی کہنا چاہتی ہوں۔"

"تو یہی کہو۔ مجھے بھی یہ زیادہ اچھا لگے گا۔"

"مگر پھپھو کو برا لگے گا۔"

"انشاء اللہ اب برا نہیں لگے گا۔"

"پھپھا جان! یہ میں آپ کی امانت لائی ہوں۔" ارجمند نے اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس کی طرف بڑھائی۔

عارف نے حیرت سے اسے دیکھا مگر وہ لے لیا۔ اس نے اخبار ہٹا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"شکریہ بیٹا! میری گڑیا!"

عبدالحق نے حیرت سے عارف کو دیکھا۔ صبح سے وہ پہلا موقع تھا کہ اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔

ارجمند وہاں بیٹھ کر اچھو میاں اور عارف سے باتیں کرتی رہی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں۔ عبدالحق کو احساس ہوا کہ وہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتی ہے۔

"آپ مجھ سے ملنے آیا کریں گے نانا!" ارجمند نے اچھو میاں سے پوچھا۔

"نہیں بیٹا! یہ تو بہت پہلے کا عہد ہے ہمارا۔ جب اس کے ہو گئے تو ہو گئے۔" اچھو میاں نے چھت کی طرف اُنگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

ارجمند اداس ہو گئی۔

"تمہارا جب جی چاہے، ملنے آجانا۔" اچھو میاں بولے۔

"تمہیں تو معلوم ہے نا کہ ہم کہاں ہوں گے؟"

ارجمند نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن میں تم سے ملنے یہاں آتا رہوں بیٹا!" عارف نے اس کی اداسی کم کرنے کے لئے کہا۔

"شکریہ پھپھا جان!"

تھوڑی دیر بعد ارجمند اٹھ گئی۔ اچھو میاں نے اسے لپٹا کر پیار کیا۔

"میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" عبدالحق نے کہا اور ارجمند کے ساتھ چلا گیا۔

وہ واپس آیا تو عارف اس تصویر کو دیکھ رہا تھا، جو ارجمند اسے دے کر گئی تھی۔ اور اچھو میاں یوں بیٹھے تھے، جیسے انہیں کسی نے کرسی سے باندھ دیا ہو۔ عبدالحق ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

وہ تینوں خاموش بیٹھے ایک ہی ہستی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ جس نے انہیں ایک چھت کے نیچے یکجا کیا تھا ورنہ شاید زندگی میں وہ کبھی ایک دوسرے سے ملتے اور نہ ہی واقف ہوتے۔

پھر عارف نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"میں بہت خوش نصیب ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔"

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا، جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ کر رہا ہو۔

عارف نے اس کی نگاہوں میں یہ بات پڑھ لی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"مجھے وہ سب کچھ ملا، جو مجھے مل سکتا تھا۔ اور جو نہیں ملا، وہ میرے لئے بہتر نہیں تھا۔ اس سے اللہ نے مجھے بچا لیا۔"

"کیا ملا آپ کو؟ مجھے بتائیں گے؟"

"مجھے نادرہ کی محبت ملی۔ سچی اور خالص محبت، اور جاتے جاتے وہ اپنی محبت کی نشانی مجھے دے گئی۔ یہ کپڑے دیکھ رہے ہو۔" اس نے میز پر رکھے

کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

''انتظار اور فیصلے کے اس ایک مہینے میں یہ اس نے بہت محبت سے میرے لئے سیئے۔ یہ میں اتنے یقین سے اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ شدید ترین اذیت میں اس جہنم سے نکلتے ہوئے بھی وہ انہیں نہیں بھولی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ یہ کپڑے لے لیں۔ یہ اس نے سیئے اپنے ہاتھ سے، ان پر کڑھائی کی۔ ان کے ایک ایک ٹانکے اور ایک ایک کلی میں اس کی محبت چھپی ہے۔ یہ تو خزانہ ہے، خزانہ۔''

''عارف میاں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اچھو میاں نے تائید کی۔

''میں نے اسے ان کپڑوں پر کام کرتے دیکھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں محبت نمایاں ہوتی تھی۔ آج صبح فجر پڑھتے ہی اس نے ان پر استری کی تھی۔''

''یہ میں عمر بھر سنبھال کر رکھوں گا۔ جب وہ یاد آئے گی تو انہیں چھولوں گا۔ ان پر سے اس کے ہاتھوں کا لمس کبھی نہیں مٹے گا۔'' عارف کہتے کہتے رکا، اور ایک گہری سانس لے کر پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔

''اس نے مجھ پر بڑے احسان کئے۔ اس کی محبت نے مجھے بدل ڈالا۔ میری اصلاح کر دی۔ مجھے سچا راستہ دکھا دیا۔ اب انشاء اللہ میں کبھی نہیں بھٹکوں گا۔ اس نے برائی کے جنگل میں رہتے ہوئے مجھے بھلائی کا راستہ دکھا دیا۔ اور ابھی ارجمند مجھے ایک خزانہ دے گئی۔ یہ دیکھو۔''

عبدالحق اور اچھو میاں اس تصویر کو دیکھتے رہے۔ وہ تصویر لگ ہی نہیں رہی تھی۔ نادرہ کی آنکھوں میں زندگی اور محبت کی چمک تھی۔ نیم وا ہونٹوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ ابھی بول پڑے گی۔ وہ خوش بھی تھی، لیکن شرما رہی تھی۔

''عجیب عورت تھی وہ، جیسے کیچڑ میں کنول کا پھول۔'' عارف نے کہا۔

''بہت پاکیزہ، بہت حیا والی، اب کہو، میں خوش نصیب ہوں یا نہیں؟''

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ارجمند! کمال کی ڈرائنگ کرتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں! قدرتی صلاحیت ہے۔ آدمی کا باطن بھی تصویر میں اجاگر کر دیتی

ہے۔'' عارف نے کہا۔

''آج سے پہلے میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ مجھے تمہارا نام معلوم نہیں تھا۔ پھر بھی میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔''

عبدالحق نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ منہ سے کچھ نہیں کہا۔

''ارجمند کی ڈرائنگ کے ذریعے۔'' عارف نے وضاحت کی۔

''اس کی ڈرائنگ کی کاپیوں میں تمہارے سوا کسی کی تصویر نہیں تھی۔''

عبدالحق کا چہرہ تمتما اُٹھا۔

''وہ میرا تم سے تعارف تھا۔'' عارف نے کہا۔

''تمہارے اندر کی نیکی ان تصویروں میں پوری طرح اجاگر تھی۔ اور ایک بات کسی کے بتائے بغیر میں نے سمجھ لی۔ وہ بچی ہے، لیکن تم سے بڑوں جیسی محبت کرتی ہے۔ اور جس عمر میں اسے وہ محبت ہوئی، وہ اس عمر کے بچے کے لئے ممکن ہی نہیں۔ میرے میرے نزدیک اس بات کا ایک ہی مطلب ہے۔ یہ کہ وہ محبت اللہ کی دی ہوئی ہے۔''

''بچے بڑے ہوتے ہیں، شعور آتا ہے تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''تم بھی ابھی کم عمر ہو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے عبدالحق! بچوں کی عام محبت میں اتنی پختگی، ٹھہراؤ اور خاموشی نہیں ہوتی۔ یہ تو ان لوگوں کو ملتی ہے، جو محبت کے دکھ خوشی سے سہنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔'' عارف نے کہا۔ پھر گفتگو کا رخ بدلا۔

''تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ عبدالحق!''

''میں نے ابھی بی۔ اے کیا ہے اور سی۔ ایس۔ پی کے امتحان میں بیٹھ رہا ہوں۔''

''تمہارے رہن سہن سے لگتا نہیں کہ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔''

''بنیادی طور پر تو میں گاؤں کا آدمی ہوں۔ اللہ کی دی ہوئی زمین بہت ہے، جو بظاہر میری ہے، لیکن میرے نزدیک ہر ضرورت مند کی ہے۔ تو مجھے واقعی

ملازمت کی ضرورت نہیں۔ لیکن میرے ایک بزرگ کا حکم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کو مجھ جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔''

''وہ بزرگ ٹھیک کہتے ہیں۔'' عارف نے کہا۔

''یہ بتاؤ کہ نادرہ نے تمہیں تلاش کیسے کیا؟''

عبدالحق شرمندہ سی ہنسی ہنسنے لگا۔

''وہ دراصل میں نے بی۔ اے میں ٹاپ کیا ہے۔ تو اخبار میں میری تصویر چھپی۔ وہ نادرہ نے دیکھی پھر بھی وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ میں ہوں۔ کیونکہ وہ جب آخری بار مجھ سے ملی تھی تو اس وقت میں ہندو تھا اور میرا نام ٹھاکر اوتار سنگھ تھا۔''

''اوہ! لیکن اخبار میں چھپنے والی تصویر سے پتا کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے؟''

''کمال ہے! یہ بات تو میں نے نواب صاحب سے پوچھی بھی نہیں۔ مجھے خیال بھی نہیں آیا۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ کسی طرح مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں میرے گھر آئے تھے۔'' عبدالحق نے اچھو میاں کی طرف اشارہ کیا۔

عارف نے سوالیہ نظروں سے اچھو میاں کو دیکھا۔

''آپ نے کیسے تلاش کر لیا انہیں؟''

''اخبار کے دفتر سے تو کچھ بھی نہیں معلوم ہوا۔ پھر مجھے اس رقعے کا خیال آیا، جو آپ مجھے دے کر گئے تھے۔''

''مسعود صاحب کے نام؟'' عارف نے پوچھا۔ وہ اچھو میاں کی طرف متوجہ تھا۔ عبدالحق کی حیرت نوٹ نہیں کر سکا۔

''جی ہاں! بس ایک امکان تھا، میں نے سوچا، وہ اِدھر اُدھر بات کر کے شاید کسی طرح معلوم کر لیں۔''

''اور انہوں نے ان کا پتا معلوم کر کے بتا دیا۔'' عارف کے لہجے میں حیرت تھی۔

''معلوم کرنا کیا، وہ تو انہیں جانتے تھے۔ انہوں نے تھوڑی سی تفتیش

کی، اور پھر ان کا پتا بتا دیا۔''

''تو آپ کو چچا جان سے میرا پتا ملا تھا؟'' اب عبدالحق سے نہیں رہا گیا۔ وہ بھی حیران تھا۔

عارف اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''مسعود صاحب تمہارے چچا ہیں؟''

''نہیں! وہی تو مجھے سول سروس میں لانا چاہتے ہیں۔'' عبدالحق نے شرمیلے لہجے میں کہا۔

''میں انہیں چچا جان کہتا ہوں۔ لیکن آپ انہیں کیسے......''

''وہ میرے استاد ہیں۔'' عارف نے کہا، پھر بتایا کہ کس طرح وہ اچھو میاں کو وہ رقعہ دے کر گیا تھا۔

''اب دیکھو! اللہ نے لوگوں کو کیسے ملایا ہے؟ ارجمند کو تم تک پہنچنا تھا، نادرہ کا جنازہ یہاں سے اُٹھنا تھا۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ یوں ہوگا؟''

''ٹھیک کہتے ہیں آپ!''

''میں تم سے مل کر خوش ہوا تھا عبدالحق!'' عارف نے کہا۔

''لیکن اب یہ خوشی دوچند ہوگئی ہے۔ میرے استاد کے پاس جوہر شناس نگاہیں ہیں۔ انہوں نے تمہیں منتخب کیا ہے، تو تم کچھ ہو۔''

عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب آپ لوگ آرام کریں۔ کل بیٹھ کر بات کریں گے۔ اب تو آپ سے ایک اور تعلق نکل آیا ہے۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے روک لیا۔'' عارف نے کہا۔

''صبح کس وقت اُٹھتے ہیں آپ!''

''مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ میں سو بھی سکوں گا یا نہیں؟''

''اللہ آپ کو سکون عطا فرمائے، شب بخیر!''

✿ ✿ ✿

عبدالحق اس روز سویرے ہی اُٹھ گیا تھا۔ اس نے رات کو صادق سے

کہہ دیا تھا کہ مہمانوں کا خیال رکھے۔ وہ اٹھ جائیں تو اسے بھی اٹھا دے۔ وہ ناشتہ ان لوگوں کے ساتھ ہی کرے گا۔

مگر صادق نے اسے نہیں اٹھایا۔ آٹھ بجے کے قریب خود ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ نور بانو اب بھی سو رہی تھا۔ وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں سے تازہ دم ہو کر نکلا تو وہ صادق سے ملا۔

''مہمان ابھی نہیں اٹھے؟'' اس نے اس سے پوچھا۔

''بڑے صاحب تو فجر کے وقت اٹھ کر چلے گئے تھے۔ کہتے تھے، نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔''

''واپس نہیں آئے ابھی تک؟''

''نہیں صاحب!''

عبدالحق کو یقین ہوگیا کہ اب وہ نہیں آئیں گے۔ وہ تو رکنا ہی نہیں چاہ رہے تھے۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کہیں جانے کے لئے بے تاب ہیں۔ شاید وہ اپنے لئے کسی راستے اور منزل کا تعین پہلے ہی کر چکے تھے۔

''ٹھیک ہے! تم دوسرے مہمان کا خیال رکھو۔ وہ اٹھ جائیں تو مجھے بتا دینا۔'' یہ کہہ کر عبدالحق حمیدہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔

مگر کچھ پیچھے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ حمیدہ کے کمرے سے قرآن پڑھنے کی خوب صورت آواز آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے کا منظر عجیب تھا۔ ارجمند بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھی، اور اماں اس محویت سے سن رہی تھیں کہ انہیں اس کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

وہ ان کے قریب کھڑا ہو کر سنتا رہا۔

فَسَحَقَ الْاَصْحَابِ السَّعِیْرِ ۝ اسے احساس ہوا کہ ارجمند سورۃ الملک پڑھ رہی ہے۔

وہ ایسی مقدس فضا تھی کہ ہر طرف نور برستا محسوس ہو رہا تھا۔ ارجمند کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی، اور قرأت بھی۔ اور اللہ کا کلام تو پتھروں کو بھی رُلا دیتا ہے۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

اگلے ہی لمحے سورۃ الملک کے حوالے سے اسے کچھ یاد آ گیا۔ دہلی میں رمضان کی وہ پہلی شب، جس نے اس کی زندگی بدل دی تھی اور وہ بے چین ہوگیا۔ اس کیفیت میں مداخت کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن اندر کی خواہش بہت شدید تھی۔ اس سے رہا نہیں جا رہا تھا۔

ارجمند نے ایک آیت مکمل کی تو اس نے دھیرے سے پکارا۔

''ارجمند!''

اور سب کچھ جیسے بکھر کر رہ گیا۔ اماں اور ارجمند، دونوں نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر حمیدہ کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا۔

''میں معافی چاہتا ہوں اماں! کوشش کے باوجود مجھ سے رہا نہیں گیا۔'' اس نے معذرت کی۔ پھر ارجمند سے بولا۔

''سورۃ ملک شروع سے سناؤ۔''

ارجمند چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر سر جھکا کر پڑھنے لگی۔

''بہت بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے بادشاہی......''

عبدالحق کھڑکی کی طرف بڑھ گیا، جہاں سے اسے صبح کا روشن آسمان صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ آسمان کو تکنے لگا۔ لیکن اس کی سماعت ارجمند کی آواز پر مرکوز تھی۔ اس کے دل میں ایک آواز تھی، جو ارجمند کی پڑھی ہوئی آیات کا ترجمہ سنا رہی تھی۔

''اور وہ ہر چیز پر قادر ہے......''

''وہ ذات جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو، تاکہ آزمائش کرے تمہاری کہ کون تم میں سے زیادہ اچھا ہے عمل میں......''

''اور وہ ہے زبردست، بے انتہا معاف فرمانے والا......''

''وہ ذات جس نے بنائے سات آسمان تہہ بہ تہہ......''

عبدالحق کی نگاہیں آسمان کو ٹٹول رہی تھیں۔ لیکن اسے صرف آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ اسے مایوسی ہوئی، اور پھر شرمندگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"نہیں دیکھو گے تم رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بے ربطی......"

بے شک! سامنے سے بلند ہوتے ہوئے، اور آگے، بہت آگے اپنی بلندی کی انتہا کے نکتے کو چھونے کے بعد جھکتے ہوئے آسمان میں کہیں کوئی بے ربطی نہیں تھی۔ کیسی خوب صورت اور بے عیب تخلیق ہے یہ......

"ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھو، بھلا نظر آتا ہے تم کو کوئی خلل......"

نہیں! کوئی خلل نہیں، کوئی بے ربطی نہیں۔

"پھر دوڑاؤ نظر۔ بار بار پلٹ آئے گی تمہاری طرف نگاہ تھک کر۔ اور وہ نامراد ہوگی اپنی تلاش میں......"

عبدالحق کی نگاہ جھک گئی۔ نہیں میرے رب! میں یہ گستاخی نہیں کروں گا۔ ایسا ہموار آسمان بنایا ہے آپ نے، اور آپ نے مجھے ایمان عطا فرمایا ہے۔

پھر اس نے بلند آواز میں گواہی دی۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

ارجمند اور حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ واپس آیا اور کرسی کھینچ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

ارجمند نے دوبارہ قرأت شروع کر دی۔ سورہ ختم ہوئی تو عبدالحق نے جزاک اللہ کہا۔ پھر عبدالحق نے ارجمند سے پوچھا۔

"قرآن تم نے دہلی میں پڑھا تھا۔"

"جی نہیں! اس وقت تو میں بہت چھوٹی تھی۔ وہاں تو بس بسم اللہ ہوئی تھی میری۔"

"تو یہاں پڑھا ہے تم نے؟"

اس لفظ "یہاں" میں سوال سے زیادہ بے پناہ حیرت تھی، اور بھی بہت کچھ تھا، جو ارجمند نے ہی نہیں، حمیدہ نے بھی سمجھ لیا تھا اور حمیدہ خود بھی حیران تھی۔ گناہ کے بازار میں، کوٹھے پر قرآن!

ارجمند نے سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"جی ہاں! مجھے قرآن یہیں پڑھایا گیا ہے۔"

"کس نے پڑھایا ارجی؟"

"پھپھو نے...... مجھے بھی اور نانا کو بھی۔" ارجمند نے کہا اور رونے لگی۔

"بلاشبہ اللہ جسے چاہے اور جہاں چاہے عزت دے۔ عزت ذلت اس کے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری پھپھو کو اللہ نے بڑائی دی تھی۔" عبدالحق نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اس قرآن کو کبھی نہیں چھوڑنا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

کمرے کی طرف آتے ہوئے صادق نے اس سے کہا۔

"صاحب! مہمان اٹھ گئے ہیں۔"

"نواب صاحب واپس آئے۔"

"جی نہیں!"

"ٹھیک ہے، میں وہاں جا رہا ہوں۔ ناشتہ لے آؤ۔"

✿ ✿ ✿

عارف نہا کر باہر نکلا تھا اور تولیے سے بال خشک کر رہا تھا کہ عبدالحق آ گیا۔

"رات کیسی گزری؟" اس نے سلام کے بعد پوچھا۔

"گزرنے کے لئے ہوتی ہے۔ گزر ہی گئی۔ نیند بھی آ گئی۔"

"اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ کانٹوں پر، انگاروں پر بھی آرام عطا فرما دیتا ہے اپنے بندوں کو۔"

"بے شک!" عارف نے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔

"نواب صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو چلے گئے۔ فجر پڑھنے گئے تھے، تب سے واپس نہیں آئے۔"

"مجھے حیرت نہیں ہوئی۔" عارف نے کہا۔

"وہ تو بس مروّت میں رک گئے تھے۔ رات بھر اضطراب کے عالم میں

ٹہلتے رہے تھے وہ۔ کہیں جانے کے لئے کسی کو ایسا بے تاب میں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

"کہاں جانا تھا انہیں؟"

"داتا دربار!"

"ہاں! یاد آیا۔ نادرہ نے مجھے بتایا تو تھا۔"

"کیسے اللہ لوگوں کو ملاتا ہے۔ کیسے انہیں ایک دوسرے سے فیض پہنچاتا ہے۔"

"واقعی! یہ حیران کن مثال ہے۔"

صادق ناشتہ لے آیا۔ وہ ناشتے میں مصروف ہوگئے۔

ناشتے کے بعد ان کے درمیان مسعود صاحب کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔

"آج ملنے چلیں ان سے۔" عبدالحق نے کہا۔

"نہیں! اگلی بار لاہور آؤں گا تو چلیں گے۔"

"آج کیوں نہیں؟"

"مجھے ان سے ملے چار سال ہوگئے۔" عارف نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"بہت جی چاہتا ہے ملنے کا۔ لیکن ہمت نہیں ہوتی۔"

"ایسی کیا بات ہے؟"

"اب تمہیں کیا بتاؤں۔ زندگی میں سب کچھ ان سے ہی سیکھا ہے۔ وہ ایسے استاد ہیں میرے۔ وہ بھی مجھ پر بہت فخر کرتے تھے۔ مگر میں اپنی نفسانی کمزوریوں کی وجہ سے غلط رات پر نکل گیا۔ غلط افسروں میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ ایسے میں ان کے سامنے کیا منہ لے کر جاتا۔ بس چور سا بن گیا تھا۔ پھر نادرہ نے مجھے بدل ڈالا۔ اب میں پہلے والا عارف ہوں۔ اگلی بار لاہور آؤں گا تو تمہارے ساتھ ہی ان سے ملنے چلوں گا۔"

"چلیں، ٹھیک ہے۔"

"دیکھو عبدالحق، ہم کل ہی ملے ہیں۔" عارف نے کہا۔

"لیکن اتنے حوالوں کے ساتھ کہ اب تم میرے لئے چھوٹے بھائی کی طرح ہو۔ میں اگر تم سے ذاتی گفتگو کروں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا؟"

"کیسی باتیں کرتے ہیں عارف بھائی! میں تو بھائی سے محروم ہوں۔ یہ میرے لئے بڑا اعزاز ہے۔"

"میں نے کل تمہیں پہلی بار دیکھا۔ لیکن میں تمہیں پہلے سے جانتا تھا۔ یہ الگ بات کہ مجھے تمہارا نام معلوم نہیں تھا۔"

"کیسے؟"

"ارجمند کی ڈرائنگ کی کاپی میں تمہاری تصویریں دیکھی تھیں میں نے۔"

عبدالحق کھسیا گیا۔

"اوہ......!"

"وہ صرف تمہاری ہی تصویریں بناتی رہی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ تم جیسا آدمی اس بازار میں کیسے پہنچا؟"

"نادرہ جیسی ہی کسی لڑکی کی تلاش میں اس بازار میں گھومتا پھرا تھا میں۔"

"اور جب ارجمند نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو تم اس کوٹھے کے سامنے والے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔"

"جی ہاں!"

"اللہ کی شان ہے۔" عارف نے آہ بھر کے کہا۔

"اس کے ہاں ہر چیز کا، ہر بات کا وقت مقرر ہے۔ اس دن تم نادرہ کو یا نادرہ تمہیں دیکھ لیتی تو یہ سب کچھ یوں نہ ہوتا۔"

"جی ہاں! میں نادرہ اور ارجمند کو اسی وقت نکال کر لے جاتا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"پانچ سال تو ہو ہی گئے ہیں۔"

"اور تم انہیں لے گئے ہوتے تو میں نادرہ سے کبھی نہ ملتا۔"

''اور آپ اتنے دکھی بھی نہیں ہوتے۔''

''ایسے نہ کہو۔ وہ مجھے نہ ملتی تو میں ویسا ہی اوباش کا اوباش رہتا۔ تم نہیں جانتے۔ میں دکھی ضرور ہوں۔ لیکن اس سے زیادہ خوش ہوں۔ میرے اندر سینے میں کئی خلا تھا، جسے نادرہ نے اپنی محبت سے بھر دیا۔ اور نادرہ سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ وہ کوٹھے پر بیٹھ کر بھی پاک صاف تھی۔ اور میں معزز ہو کر بھی آوارگی کرتا تھا۔ یقین کرو، وہ میری ہر محرومی کا ازالہ کر گئی۔ اور اس نے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا۔ وہ میرے لئے اللہ کی رحمت تھی۔ میں اب انشاء اللہ اچھا ہی رہوں گا۔''

''واقعی اپنی مصلحتیں اللہ ہی جانتا ہے۔ اس رات میں اس کوٹھے کے سامنے دیر تک بیٹھا رہا۔'' عبدالحق جیسے کھو سا گیا۔

''شاید نظر اٹھا کر دیکھتا تو وہ نظر آ جاتی یا وہ ہی مجھے دیکھ لیتی اور ایسا ہوتا تو آپ کی زندگی میں انقلاب کبھی نہ آتا اور اچھو میاں نواب اشرف علی خان کبھی نہ بنتے۔ نہ ہی ان کی زندگی بدلتی۔''

''اللہ جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ اس کے بندوں کے لئے بہترین ہوتا ہے۔'' عارف نے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔

''ایک بات آؤ! پانچ سال پہلے جب تم اس کوٹھے کے سامنے ہوٹل میں بیٹھے تھے تو ارجمند نے پہلی بار تمہیں دیکھا۔ اس وقت اس کی عمر کیا ہوگی۔''

''زیادہ سے زیادہ سات آٹھ سال۔''

''اس کے بعد وہ صرف تمہاری ہی تصویریں بناتی رہی، کیوں؟''

عبدالحق اس کا جواب جانتا تھا۔ لیکن اس نے کہا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ شاید میں اسے اچھا لگا تھا۔''

''شاید تم سمجھنا اور کہنا نہیں چاہتے۔ لیکن یہ بات بہت اہم ہے۔ میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔''

''کم عمر بچیوں کو بعض لوگ اچھے لگتے ہیں۔ وہ ان سے محبت کرتی ہے۔ لیکن بعد میں سمجھ جاتی ہیں کہ وہ ان کے لئے نہیں۔''

''میں تم سے اختلاف کروں گا۔'' عارف نے کہا۔

''ارجمند میں کوئی غیر معمولی بات ہے۔ میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ لیکن کچھ ہے اس میں۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے ایک ہی تصویر بار بار کیوں بنائی ہے تو اس نے کہا تھا...... یہ مجھے اچھے لگے تھے، اس لئے خود بخود بار بار ان کی تصویر بن جاتی ہے۔ اس پر نادرہ نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ نادرہ یہ بات جانتی تھی۔''

''نادرہ نے ارجمند کو مجھے سونپنے سے پہلے ہی یہ بات بتا دی تھی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور تم نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔''

''جی ہاں! میں نے کہا نا کہ بچے بالآخر بچپن کی حماقت کو بھول جاتے ہیں۔''

''مگر میں یقین سے کہتا ہوں کہ ارجمند کے اندر تمہارے بارے میں ایک بہت گہرا یقین اور اعتماد ہے۔ اس کا سبب تو مجھے نہیں معلوم، مگر یہ ہے حقیقت۔ اور یہ بھی طے ہے کہ ارجمند کا یہ جذبہ ختم ہونے والا نہیں۔ یہ تمہارے لئے مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔ ویسے یہ امکان اس لئے کمزور ضرور ہے کہ اس لڑکی میں گہرائی اور رکھ رکھاؤ ہے۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس میں وہ دانش ہے، جو عام طور پر لوگوں کو بڑی عمر میں نصیب ہوتی ہے۔ پھر بھی محبت کو چھپانا آسان نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ تو ہے۔''

''انشاء اللہ! اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔'' عبدالحق نے کمزور لہجے میں کہا۔

''تم سوچو گے کہ میں نے تم سے یہ بات کیوں کی؟'' عارف نے کہا۔

''دیکھو! ارجمند کو کوئی تکلیف، کوئی دکھ ہوا تو نادرہ کی روح تڑپے گی۔ میں یہ بات تمہارے بڑے بھائی کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ کوئی مسئلہ بنے تو مجھے آواز دے لینا۔ میں تمہیں اپنا پتا دے کر جاؤں گا۔ اور ہم رابطے میں رہیں گے۔''

"جی! ٹھیک ہے!"

"میں ہر طرح سے ارجمند کا خیال رکھ سکتا ہوں۔"

عبدالحق کو برا تو لگا۔ لیکن عارف کی طرف سے اس کا دل میلا نہیں ہوا۔ اس نے مروّتاً اقرار تو کر لیا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ارجمند کو کسی اور کو سونپ دے؟ نادرہ خود بھی تو ارجمند کو عارف کے سپرد کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اور اس نے جو کچھ ارجمند کے بارے میں اس سے کہا تھا، وہ ایک طرح کی وصیت تھی۔ تو ارجمند اس کی ذمہ داری تھی۔

"آیئے! لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" اس نے عارف سے کہا۔

صادق ناشتے کے برتن سمیٹنے آ گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

عارف نے تین دن عبدالحق کے ہاں قیام کیا۔ اور پھر کراچی واپس چلا گیا۔ عبدالحق اسے مزید رکنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے اصرار نہیں کیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ تین بھی محض مروّت کی وجہ سے اسے ملے ہیں۔

ادھر مقابلے کے امتحان کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ وہ سب کچھ بھول کر اس کی تیاری میں لگ گیا۔

ارجمند بہت خوش تھی۔ بس کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے پھپھو اسے یاد آتیں تو اس کے دل میں ہوک سی اُٹھتی۔ ایسا لگتا کہ دل بند ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ مگر ایسا اکیلے میں ہی ہوتا تھا۔ اور اکیلی وہ بہت کم ہی ہوتی تھی۔

وہ سوچتی کہ پھپھو اس سے کیسی محبت کرتی تھیں۔ ان سے اس کی کبھی بات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ بہت سی باتیں وہ خودبخود سمجھ جاتی تھی۔ اور بہت سی باتیں اللہ میاں اسے سمجھا دیتے تھے۔

اس نے پھپھو کے بتائے بغیر سمجھ لیا تھا کہ جہاں وہ رہ رہی تھی، وہ کوئی اچھی جگہ نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پھپھو مجبور ہیں۔ مجبور نہ ہوتیں تو وہاں سے اسے لے کر بھاگ چکی ہوتیں۔ اور اب آخر میں تو وہ اسے جیسے سب سے چھپا کر رکھنے لگی تھیں۔ وہاں بھرا ہوا گھر تھا۔ لیکن وہ پھپھو اور نانا کے سوا کسی سے بات

نہیں کر سکتی تھی۔

اور اس نے دیکھا تھا کہ بوا کے مرنے کے بعد کوٹھا تو نہیں بدلا تھا۔ لیکن پھپھو کی دُنیا بدل گئی تھی۔ ان کے چہرے پر اب وحشت نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ وہ پُرسکون لگتی تھیں۔ وہ وہاں کی مالک بن گئی تھیں، سب سے بڑی۔ لیکن وہ وہاں ہر چیز سے بےتعلق ہوگئی تھیں۔ ان سے شادی کا کوئی امیدوار اب وہاں نہیں آتا تھا۔ آتا بھی ہوگا تو بہرحال وہ اس سے نہیں ملتی تھیں۔ وہ ہر رات اس کے ساتھ سوتی تھیں۔ اسے یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ پھپھو سے لپٹ کر سوتی، اور سوچتی کہ کتنا اچھا ہوا کہ بوا مر گئیں۔ پہلی بار اسے پتا چلا تھا کہ کسی کا مرنا بھی اچھا بھی ہوتا ہے۔

اسے یاد تھا، اس نے یہ بات پھپھو سے کہی تھی تو وہ بگڑ گئی تھیں۔

"کبھی کسی کے لئے ایسی بات نہیں کرتے ارجمند!" انہوں نے سخت لہجے میں کہا تھا۔

"مرنے والوں کے لئے تو بس مغفرت کی دعا کی جاتی ہے اور بوا نے تو ہم پر احسان کیا۔ ورنہ تم اکیلی ہی سوتی رہتیں۔"

اس نے بحث نہیں کی تھی۔ اسے خیال آ گیا تھا۔ پھپھو کی بات سچی تھی۔ پھپھو تو بوا کی زندگی میں ہی اس کے ساتھ سونے لگی تھیں۔

اور بوا کے بعد سب کچھ پھپھو کے ہاتھ میں تھا۔ کسی کو بھی کوئی ضرورت ہوتی تو وہ پھپھو سے مانگتا۔ اور پھپھو کبھی منع نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ زیادہ ہی دے دیا کرتی تھیں۔ لیکن اپنے اور اس کے لئے وہ نہ جانے کیوں سخت ہوگئی تھیں؟

اسے یاد تھا، ایک بار اس نے رنگوں کے لئے کہا تو پھپھو نے منع کر دیا۔ اس نے شکایتی لہجے میں پھپھو سے کہا۔

"اتنے پیسے تو ہیں آپ کے پاس۔ سب کو دیتی ہیں، تو مجھے رنگ کیوں نہیں منگا کر دیتیں؟"

"دیکھو بیٹا! تم اللہ سے دعا کرو۔ یہ پیسے تو اپنے نہیں ہیں۔ امانت ہیں ہمارے پاس، اور امانت بھی اچھی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو، یہ پیسہ اچھا نہیں ہے۔ میں یہ خرچ نہیں کرنا چاہتی۔"

"مگر پہلے تو اسی سے آپ مجھے سب کچھ دلاتی تھیں۔"

"پہلے کی بات اور تھی ارجی! اب ہم مجبور ہیں۔ اب ہمارے پاس اختیار ہے۔"

ارجمند کی سمجھ میں تو بات نہیں آئی لیکن اس نے بحث نہیں کی۔

پھر اس نے دیکھا، کھانے پینے میں بھی فرق پڑ گیا تھا۔ اب تو وہ اچھے کھانے کو ترسنے لگی تھی۔ زیادہ تر دال ہی ملتی، اور وہ بھی کم۔ اس نے شکایت کی تو پھپھو نے کہا۔

"بس تم دُعا کرو اللہ سے کہ وہ ہمارے لئے عزت کا رزق جاری کر دے۔"

اور پھپھو نے کپڑے سینے شروع کر دیئے تو حالات بہتر ہوگئے۔

اسے یاد تھا کہ پہلی بار اس نے کوٹھے پر خود کو پرسکون اور محفوظ سمجھا تھا۔ اور پھپھو بھی پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوگئی تھیں۔ اور نانا، جنہیں وہ پہلے اچھو میاں کہتی تھی، وہ تو بالکل ہی بدل گئے تھے۔ پہلے ان کے چہرے پر، ان کی آنکھوں میں کیسی وحشت ہوتی تھی۔ بولتے تو جھنجلائے ہوئے لگتے۔ لیکن جب سے انہوں نے پھپھو کو بیٹی کہا تھا، ان کے چہرے پر نرمی آگئی تھی۔ پھر جب انہوں نے داڑھی رکھ لی تو ان کا چہرہ جگمگاتا ہوا، روشن روشن لگنے لگا تھا۔ وہ بہت خوب صورت ہوگئے تھے۔

"یہ نانا اتنے خوب صورت کیسے ہوگئے پھپھو!" اس نے پوچھا تھا۔

"جو لوگ دل سے، اللہ کو خوش کرنے کے لئے نماز پڑھتے ہیں، اور قرآن پڑھ کر سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ انہیں خوب صورت بنا دیتا ہے۔"

"قرآن پر عمل کیسے کیا جاتا ہے پھپھو!"

"قرآن میں اللہ نے جو کام کرنے کا حکم دیا ہے، وہ کرو۔ اور جن

کاموں سے روکا ہو، وہ نہ کرو۔ یہ قرآن پر عمل ہوتا ہے۔"

"مگر مجھے تو معلوم ہی نہیں پھپھو! کہ قرآن میں کیا لکھا ہے؟ مجھے تو عربی نہیں آتی نا۔"

"ترجمے والا قرآن پڑھو گی تو پتا چلے گا۔"

"اس سے اچھا یہ نہیں کہ میں عربی سیکھ لوں۔"

"اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے؟ مگر مجھے عربی نہیں آتی۔"

"تو جب تک مجھے ترجمے والا قرآن دے دیں۔"

"ابھی نہیں! ابھی تم چھوٹی ہو۔ قرآن تو بڑوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا۔"

"تو پھر پڑھنے والوں کو کیسے سمجھ میں آتا ہوگا؟"

"بھئی! قرآن پڑھنے والے کو اللہ کو خوش کرنا چاہئے اور اس سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ اسے سمجھا دے، تو اللہ چاہے تو اس کے لئے قرآن آسان کر دیتا ہے۔ اور بھئی! موٹی موٹی باتیں تو سب کو معلوم ہیں۔ جھوٹ کبھی نہیں بولو، بڑوں کا ادب کرو، کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ، کسی سے تکلیف پہنچے تو اسے معاف کر دو، لوگوں کی خدمت کرو، ان کے کام آؤ، ان سب باتوں سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ اور خوش ہو کر وہ چاہے تو ایسے لوگوں کے سینوں کو قرآن کے لئے کھول دیتا ہے۔ بس ابھی تم ان باتوں پر عمل کرنا سیکھ لو۔"

اور وہ بات ارجمند کے دل میں اتر گئی تھی۔

اور ارجمند کو لگتا تھا کہ وہ پہلے پھپھو کو اتنا نہیں سمجھتی تھی، جتنا اب سمجھنے لگی ہے۔ پھپھو سامنے تھیں تو وہ بس انہیں دیکھتی تھی۔ ان کے بارے میں سوچتی نہیں تھی۔ اب وہ انہیں دیکھ نہیں سکتی تھی تو ان کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتی تھی۔ اور ان کے بارے میں سوچتی تھی، تو اب وہ انہیں زیادہ بہتر طور پر سمجھنے لگی تھی۔

اسے پھپھو کا پرانا معمول یاد تھا۔ وہ دیر سے سو کر اُٹھتیں، نماز پڑھتیں، قرآن پڑھتیں، اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتیں، پھر وہ اسے بھی پڑھانے لگی

تھیں۔

مگر بوا کے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی سب کچھ بدل گیا تھا۔ پھپھو صبح سویرے اُٹھتی، نماز اور قرآن کے بعد وہ اسے اور نانا کو قرآن پڑھاتیں۔ پھر ناشتہ بناتیں، اور دوپہر کا کھانا تیار کرنے کے دوران اسے پڑھاتیں۔ انگریزی، اُردو اور حساب۔ کہتی تھیں، کبھی یہ تمہارے کام آئے گا۔

اور بوا کی موت کے بعد تو وہ مشین ہوگئی تھیں۔ کپڑے سینے اور ان پر کڑھائی کرنے کا کام جو زیادہ ہوگیا تھا۔ تب تو جیسے ان کے پاس وقت ہی نہیں رہا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ کتنا تھک جاتی ہوں گی۔ اس وقت تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

ایک دن اس نے دیکھا، پھپھو نے سوئی دھاگہ اور وہ کرتا جس پر وہ کڑھائی کر رہی تھیں، ایک طرف رکھ دیا اور اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگیں۔ مگر آنسو پھر آجاتے تھے۔

''یہ کیا پھپھو! آپ رو رہی ہیں؟'' اس نے تڑپ کر کہا۔

''ارے نہیں پگلی! اللہ کا شکر ہے، رونے کا وقت تو گزر گیا۔ روئیں ہمارے دُشمن!''

''تو پھر یہ آنسو.....؟''

''یہ آنسو نہیں ہیں۔ بہت نظر جما کر کام کرنا پڑتا ہے تو آنکھوں میں پانی آجاتا ہے۔''

''تو آپ اتنا کام نہ کیا کریں۔''

''زیادہ کام کرنا ضروری ہے ارجی! میں تمہاری تمام ضرورتیں پوری کرنا چاہتی ہوں۔ اور چاہتی ہوں کہ تمہیں تمہاری پسند کا کھانا ملے۔ رزقِ حلال کے لئے محنت تو کرنی پڑتی ہے۔''

''مجھے اچھا کھانا نہیں چاہئے۔ میں دال بھی کھا سکتی ہوں۔''

''زیادہ کام کر کے مجھے خوشی بھی تو ہوتی ہے۔ اللہ نے کرم فرمایا ہے تو کام کر کے ایک طرح سے میں اس کا شکر ادا کرتی ہوں۔ کاش! کاش میں تمہیں

اسکول بھیج سکتی۔''

''تو بھیج دیں نا! میرا بھی جی چاہتا ہے۔''

''نہیں بھیج سکتی گڑیا!'' پھپھو نے افسردگی سے کہا تھا۔

''میں تمہیں باہر نہیں بھیج سکتی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم پر کسی کی نظر بھی پڑے۔ کوئی سنبھالنے والا نہ ہو تو یہ دنیا بہت بری جگہ ہے گڑیا!''

پھپھو نے پوری زندگی میرے لئے گزاری۔ اس نے سوچا۔ کتنی اکیلی تھیں وہ۔ میں تو چھوٹی تھی، سو وہ دل کی بات کسی سے بھی تو نہیں کہہ سکتی تھیں۔ کیسے بڑے بڑے لوگ ان سے شادی کرنے کے لئے آتے تھے۔ اچھا ہوا کہ انہوں نے ان سے شادی نہیں کی۔

پھر اس کی آنکھوں میں عارف کی صورت پھر گئی اور جب کوئی اچھا نہیں ملا تو اللہ میاں نے ان سے زندگی چھین لی۔ یہ تو بڑا ظلم ہو، بڑی بے انصافی کی اللہ میاں نے ....''

''نہ ایسا کہتے ہیں، نہ ایسا سوچتے ہیں۔'' اس کے اندر بیٹھے ہوئے اللہ میاں نے خفگی سے کہا۔

''اللہ جو کرتا ہے، اس میں اس کے بندوں کی بہتری ہوتی ہے۔''

''تو مجھے بتائیں کہ اس میں کیا بہتری تھی۔ پھپھو زندہ رہتیں تو پھپھا کے ساتھ کتنی خوش رہتیں۔'' وہ بڑبڑائی۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔ تمہیں کیا معلوم؟''

واقعی، یہ بات تو سچ ہے۔ ارجمند نے سوچا۔ میں یہ یقین سے کیسے کہہ سکتی ہوں۔

''صرف اللہ ہی ہے، جو سب کچھ جانتا ہے۔'' اللہ میاں نے کہا۔

''وہی بہتری کو سمجھتا ہے، کیونکہ شروع سے آخر تک ہر بات ..... سب کچھ جانتا ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ ابھی ایک پل بعد کیا ہوگا؟''

اس نے سوچا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''ابھی آپی آئے گی اور تم سے بات کرے گی۔ یاد رکھو، اللہ سے بحث

نہیں کرتے۔ صرف مانتے ہیں اس کی بات، اسی میں بھلائی ہے۔ اس کی بات مانو، اور اسے خوش رکھو۔ وہ خوش ہو کر تمہیں نعمتیں دے گا۔ کیا اس نے تمہیں آغا جی سے نہیں ملوایا؟ شکر ادا کیا کرو اس کا۔"

"اللہ میاں آپ کا شکر ہے۔" ارجمند نے بڑے خلوص سے کہا۔

اور اسی لمحے آپی آ گئیں۔

اللہ شروع سے آخر تک سب کچھ جانتا ہے، اور بندوں کو ایک پل کا بھی پتا نہیں ہوتا۔ ارجمند نے سوچا۔

❁ ❁ ❁

نوربانو کو ارجمند پر بڑی محبت آتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی سے بغیر کسی خوف اور دھڑکے کے محبت کر رہی تھی۔ کوئی ڈر نہیں تھا اسے۔ بس یہ خیال تھا کہ کھوئی ہوئی چھوٹی بہن خوش قسمتی سے اسے مل گئی ہے، جو اس کی محبت کو ترستی رہی تھی۔ اسے تلافی کا موقع مل گیا تھا۔

وہ دروازے میں کھڑی خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

ارجمند کسی گہری سوچ میں تھی۔ کبھی وہ بڑبڑاتی، پھر اس کے چہرے کے تاثر سے لگتا کہ کسی کی بات بڑے دھیان سے سن رہی ہے۔ ایک بار اس نے سر بھی جھٹکا۔ پھر کا چہرہ پُرسکون ہو گیا۔

نوربانو کمرے میں چلی گئی۔

"کیا بات ہے ارجی! اکیلی بیٹھی ہو۔ اماں کہاں ہیں؟"

"غسل خانے میں ہیں۔"

"اور تم اتنی محویت سے کیا سوچ رہی تھی؟"

"وہ میں آپی! اللہ میاں سے بات کر رہی تھی۔"

جواب اتنا غیر متوقع تھا کہ نوربانو سناٹے میں آ گئی۔ اسے سنبھلنے میں چند لمحے لگے۔ پھر اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"اللہ میاں تم سے بات کرتے ہیں؟"

"جی آپی!"

"کیسے؟"

"وہ میری آواز میں مجھ سے بات کرتے ہیں۔ کبھی مجھے ڈانٹتے ہیں، کبھی پیار سے سمجھاتے ہیں۔"

"تو اللہ میاں کیوں، یہ سمجھو کہ تم خود سے باتیں کرتی ہو۔ ایسا ہوتا ہے سب کے ساتھ۔"

"نہیں آپی! وہ اللہ میاں ہی ہیں۔"

"ابھی کیا بات ہو رہی تھی ان سے؟"

"میں سوچ رہی تھی کہ اب تو پھپھو کی شادی ہونے والی تھی......"

ارجمند نے پوری تفصیل اسے سنا دی۔ پھر بولی۔

"اب دیکھیں، اللہ میاں ہی تو سب کچھ جانتے ہیں۔"

"بندوں کو بھی تو سمجھ دی ہے اللہ نے۔"

"لیکن آپی! آخر میں اللہ میاں نے پوچھا، تمہیں پتا ہے کہ ایک پل بعد کیا ہونے والا ہے۔ میں نے انکار میں جواب دیا تو انہوں نے کہا کہ ایک پل بعد تمہاری آپی آنے والی ہیں، اور دیکھ لیں، آپ آ گئیں۔ مجھے تو نہیں معلوم تھی یہ بات۔" ارجمند نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

نوربانو متاسف ہوگئی۔ ارجمند کو جھوٹا سمجھنے کو تو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ یہ ضرور نفسیاتی بیماری ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔ اکیلی رہی ہے بیچاری بچی، اس لئے......

"تم کمرے میں بند کیوں رہتی ہو؟ چلو! باہر باغیچے میں چلیں۔"

وہ دونوں باہر لان میں آ گئیں۔

کچھ دیر جھولا جھولنے کے بعد وہ ستانے کے لئے بینچ پر بیٹھ گئیں۔

"تم کبھی باہر گھومنے جاتی تھیں ارجمند!" نوربانو نے پوچھا۔

"نہیں آپی! تین چار سال سے تو میں گھر سے نکلی ہی نہیں۔"

"کیوں؟"

"پھپھو کو بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ مجھے سب سے چھپا کر رکھتی تھیں۔ وہ نہیں

چاہتی تھیں کہ مجھ پر کسی کی نظر پڑے۔''

نوربانو نے غور سے اسے دیکھا، اوردل میں سوچا، ٹھیک ہی کرتی تھی وہ۔

''گھر میں صحن تھا تمہارے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں آپی! ہاں کوٹھا تھا۔ مگر میں وہاں بھی نہیں جاتی تھی۔''

نوربانو کو اس پر ترس آنے لگا۔

''توبہ! بند دیواروں کے بیچ دم گھٹنے لگتا ہوگا تمہارا؟''

''پھپھو کی خوشی میں میری خوشی تھی آپی!''

''کبھی دل نہیں چاہتا تھا باہر جانے کو؟'؛

''باہر جانے کو تو نہیں، ہاں اسکول جانے کو بہت دل چاہتا تھا۔''

''تو تم اب تک اسکول نہیں گئیں؟'' نوربانو نے حیرت سے پوچھا۔

''مگر تم تو انگریزی بھی پڑھ لیتی ہو۔''

''پھپھو گھر پر ہی مجھے پڑھاتی تھیں، قرآن، اُردو، انگریزی اور حساب۔''

نوربانو چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔

''اسکول جانا چاہتی ہو تم؟''

''جی آپی!''

''میں عبدالحق صاحب سے بات کروں گی۔ تم اسکول ضرور جاؤ گی۔''

''شکریہ آپی!''

''بہنیں بہنوں کے لئے سب کچھ کرتی ہیں۔ اس میں شکریہ کی ضرورت نہیں۔ اور ہاں! آج ہم گھومنے بھی چلیں گے۔''

دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر ارجمند کو احساس ہوا کہ نوربانو کچھ بے چین ہے۔

''کیا بات ہے آپی!'' اس نے پوچھا۔

''بہت زور کی پیاس لگی ہے، اور اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔''

یہ سنتے ہی ارجمند اندر کی طرف دوڑی۔

''ارے.....! کیا ہوا ارجی! کہاں جا رہی ہو؟'' نوربانو نے اسے پکارا۔

''ابھی آئی آپی!''

اور ذرا دیر بعد وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں دھری ٹرے پر پانی کا جگ اور گلاس موجود تھا۔ اس نے گلاس میں پانی انڈیل کر بڑے ادب اور تمیز سے نوربانو کو پیش کیا۔ نوربانو نے سوچا، اس لڑکی کی بہت اچھی تربیت کی ہے اس کی پھپھو نے۔

پانی پی کر اس نے گلاس ارجمند کو دیا اور بولی۔

''شکریہ ارجی!''

''ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ بہنیں بہنوں کے لئے سب کچھ کرتی ہیں۔'' ارجمند نے اسے یاد دلایا۔

''اس میں شکریہ کی ضرورت نہیں۔ اور میں نے آپ کو بس پانی ہی تو پلایا ہے، جو ویسے بھی ثواب کا کام ہے۔''

''تم بہت اچھی ہو ارجمند!''

کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ کر گھر میں جاتے ہوئے نوربانو نے کہا۔

''ایک بات کہوں؟ برا نہ ماننا۔''

''میں آپ کی بات کا برا کیسے مان سکتی ہوں؟''

''یہ اللہ میاں والی بات تمہارا وہم ہے۔ اللہ اپنے بندوں سے کلام نہیں کرتا۔ ہر انسان کے اندر ایک اچھائی ہوتی ہے، جو اس کی راہنمائی کرتی ہے۔ اسے ضمیر کہتے ہیں۔ آدمی اچھا ہو تو اس کا ضمیر بہت طاقتور ہوتا ہے، اور آدمی برائی میں بڑھتا جائے تو ضمیر کمزور ہوتا جاتا ہے۔ پھر برائی بالکل اسی طرح آدمی کو غلط راستہ دکھانے لگتی ہے۔

ارجمند نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

❁ ❁ ❁

اب تو صرف مقابلے کے امتحان کی تیاری رہ گئی تھی۔

عبدالحق اپنی اسٹڈی میں پڑھائی میں مصروف تھا کہ نور بانو اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ وہ ایک بار بس چائے دینے کے لئے یہاں آتی تھی۔

''کیا بات ہے نور! خیریت تو ہے؟''

''مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے؟'' نور بانو نے خشک لہجے میں کہا۔

''تو وہ بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ یہ تو پڑھائی کا وقت ہے۔''

''ہر وقت پڑھائی اور صرف پڑھائی......''

''تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں امتحان میں۔''

''ایسا بھی کیا کہ پڑھائی کی وجہ سے آپ جیسا ذمہ دار آدمی غیر ذمہ دار ہو جائے۔''

عبدالحق کو جھٹکا لگا۔ اس نے کتاب اُلٹ کر رکھ دی۔

''کوئی غیر ذمہ داری ہوئی مجھ سے؟''

''تو اور کیا؟ آپ ایسے تو نہیں تھے، آپ تو دوسروں کا...... سب لوگوں کا خیال رکھنے والے تھے۔''

''پتا تو چلے کہ ہوا کیا ہے؟''

''ارجمند کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں۔'' نور بانو نے افسردگی سے کہا۔

''سوائے ہمارے، اب وہ ہماری ذمہ داری ہے۔ اور سب سے بڑھ کر آپ کی۔''

عبدالحق گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا اسے؟''

''بیٹھ جائیے، اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔ آپ سکون سے میری بات سنئے!''

عبدالحق بیٹھ تو گیا لیکن اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ تو

ارجمند کو اماں کو سونپ کر مطمئن ہو گیا تھا۔ مگر اب اسے احساسِ جرم ہو رہا تھا۔ وہ تو کبھی ارجمند سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ اس سے ڈرتا تھا۔ اس کے بچپنے سے جسے وہ محبت سمجھتی تھی۔

''کچھ بتاؤ تو! ہوا کیا ہے؟'' اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''بھئی! دنیا کی بچیاں اسکول جاتی ہیں۔ اس بیچاری نے تو آج تک اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ اس بات کا خیال بھی نہیں آیا آپ کو حالانکہ آپ کو اس کی فکر کرنی چاہئے تھی۔''

عبدالحق کو افسوس ہوا کہ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟

''اب اسکول کی پہلی جماعت کے حساب سے تو وہ بہت بڑی ہے۔'' اس نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

''ایسی بات نہیں۔ اس کی پھپھو اسے گھر پر انگریزی، اُردو اور حساب پڑھاتی رہی تھیں۔ اسے لکھنا پڑھنا آتا ہے۔ بس اسکول کبھی نہیں گئی وہ۔''

''تو پھر مسئلہ کیا ہے؟''

''عمر کے حساب سے اسے ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تو داخلہ ملنا چاہئے۔''

''داخلہ ٹیسٹ میں کامیابی کے بغیر تو نہیں ملے گا۔'' عبدالحق نے پرخیال لہجے میں کہا۔

''یہی تو فکر ہے، جو آپ کو کرنی چاہئے تھی۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم! اسے گھر پر تیاری کرانی ہوگی۔ پھر داخل کا امتحان دلوانا ہوگا۔''

''یہ تیاری تو آپ کو ہی کرانی ہے۔''

''لیکن میری مصروفیت......'' عبدالحق کہتے کہتے رک گیا۔ اسے کچھ خیال آ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے! اس کے لئے ٹیچر کا انتظام کر دوں گا میں۔'' یہ کہتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اس کے اور ارجمند کے درمیان یہ ایک قدر مشترک ہے۔

اس کے ماں باپ نے اسے جدا نہ کرنے کے خیال سے اسکول نہیں بھیجا تھا۔ پھر اسکول میں داخلے کے امتحان کی تیاری کے لئے اسی طرح پاپا جی نے اس کے لئے ٹیچر کا بندوبست کیا تھا۔ یوں اسے ماسٹر جی ملے تھے اور اسی طرح زیادہ نے ارجمند کو چھپا کر رکھا تھا، اور اسکول نہیں بھیجا تھا۔ اب وہ اس کے لئے ٹیچر کا بندوبست کرے گا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ!" نادرہ نے اسے چونکا دیا۔

"وہ بھی اپنا سب کچھ کھو کر ہمارے پاس آئی ہے۔ اسے ہم سے اپنائیت، محبت اور خود اعتمادی چاہئے۔ اور پھر بڑی ہوتی ہوئی بچی کو ٹیچر سے پڑھوانا مجھے مناسب نہیں لگتا۔"

"تو پھر؟"

"اسے آپ ہی پڑھائیں گے۔ اس کے لئے وقت نکالنا پڑے گا آپ کو۔"

"مگر میں کیسے نکالوں گا وقت؟"

"گیارہ بجے اپنی پڑھائی شروع کرتے ہیں آپ!" نوربانو نے کہا۔

"دیر تک سوتے ہیں۔ جلدی اُٹھ جائیں تو اسے دو گھنٹے دے سکتے ہیں آپ؟"

"ہاں! یہ تو ہے۔ چلو ٹھیک ہے۔ کوشش کریں گے۔"

"کوشش نہیں! بس کل سے یہ کام کرنا ہے آپ کو۔"

"جو حکم سرکار کا!"

"ایک بات اور......"

"اور کچھ بھی ہے؟"

"جی ہاں! وہ بیچاری چار دیواری میں قید رہی ہے۔ ایسا گھر جہاں صحن بھی نہیں تھا، جہاں سے آسمان بھی نظر نہیں آتا تھا۔"

عبدالحق نے سکون کی سانس لی۔

"تو یہاں تو کھلی فضا ہے سانس کے لئے۔"

"اتنا کافی نہیں ہے۔ وہ کبھی گھر سے نکلی ہی نہیں۔ اس نے باہر کی دنیا کبھی نہیں دیکھی۔"

"تو پھر؟"

"شام کو اسے سیر کے لئے لے جانا چاہئے۔ لاہور دکھایا جائے اسے۔ یہاں تاریخی مقامات بھی بہت ہیں اور یہی نہیں، اگلی بار حق نظر جائیں تو اسے بھی ساتھ لے کر جائیں۔"

"اب بھئی! سیر کرانے تو اسے تم بھی لے جا سکتی ہو۔ یعقوب موجود ہے نا!"

"پھر وہی بات! ہمیں اس کو اپنائیت اور محبت دینی ہے۔ آپ کا ہونا ضروری ہے۔ دیکھیں نا! آپ ہی لائے ہیں اسے، اور میں آپ کے بغیر کہیں جاتی ہوں بھلا۔ آپ کو شام کا وقت ہمارے لئے نکالنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے بھئی! اب تو مجھے پڑھنے دو۔"

"بس تو شام کو لارنس گارڈن چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے! اب جاؤ بھی۔"

اس کے جانے کے بعد عبدالحق نے سکون کا سانس لیا۔ وہ حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ اسے تو ابتداء سے یہ خوف تھا کہ ارجمند کی وجہ سے اس کے اور نوربانو کے درمیان تلخی رہا کرے گی۔ ورنہ وہ کہاں کسی کا ایسا خیال رکھنے والی تھی۔ اسے تو ہمیشہ اس سے یہی شکایت رہتی تھی کہ وہ دوسروں کو اس سے زیادہ توجہ اور اہمیت دیتا ہے۔

اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکریہ ادا کیا۔ اب وہ آسانی سے اس محروم بچی کی دلجوئی کر سکے گا، اس کے زخموں پر مرہم رکھ کر انہیں مندمل کرنے کی کوشش کر سکے گا۔

وہ پھر پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔

❁ ❁ ❁

نوربانو ارجمند کو اپنے کمرے میں لے گئی۔

''شام کو تیار ہو جانا۔ ہم سیر کے لئے چلیں گے۔''

''سچ آپی!'' ارجمند کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''تو اور کیا؟ یہ کوئی بڑی بات ہے۔''

ارجمند کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''میرے لئے تو بڑی بات ہے آپی!'' اس نے کہا۔

''میں نے تو کبھی جی بھر کے آسمان بھی نہیں دیکھا۔ میں تو تازہ ہوا کو بھی ترستی رہی ہوں آپی!''

''میں تمہارے ہر دُکھ، ہر محرومی کی تلافی کروں گی ارجی! اور ہاں! کل سے عبدالحق تمہیں پڑھائیں گے۔ تاکہ آنے والے دو سال اسکول میں تمہارا داخلہ بھی ہو جائے۔''

یہ ارجمند کے لئے اور بڑی بات تھی۔

''آغا جی پڑھائیں گے......؟...... مجھے......؟''

''ہاں! اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟''

''آغا جی خود ہی پڑھتے رہتے ہیں ہر وقت۔ انہیں فرصت کہاں؟''

''میرا کہنا ٹال نہیں سکتے وہ۔ دیکھ لینا کل۔'' پھر کچھ خیال آیا تو اس نے ارجمند کو غور سے دیکھا۔

''یہ تم انہیں آغا جی کیوں کہتی ہو؟''

ارجمند پہلے تو گڑبڑائی۔ پھر اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''پتا نہیں کیوں؟ بس آغا جی کہنا اچھا لگتا ہے۔''

نور بانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

ارجمند کو اس کی نظروں سے گھبراہٹ ہونے لگی۔

''وہ مجھے آغا جی ہی لگتے ہیں آپی!''

''سمجھی! کسی کو گھر میں آغا جی کہتی ہوگی نا! کسی بہت پیارے کو...... اپنے بابا کو...... چچا کو......''

ارجمند نے سکون کی سانس لی۔ لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بولنا

چاہتی تھی۔

نور بانو نے اس کے چہرے کی گھبراہٹ کو اداسی اور افسردگی پر محمول کیا۔

''چلو......! تمہیں کوئی کھویا ہوا مل گیا۔'' اس نے چہک کر کہا۔

''اب تم پچھلی باتیں سب بھول جاؤ۔ خوش رہا کرو۔ افسردہ ہوگی تو میں خفا ہو جاؤں گی۔''

نور بانو کے لہجے میں ایسی محبت تھی کہ ارجمند شرمندہ ہوگئی۔ یہ کیسی محبت مل گئی ہے مجھے۔ اس نے دل میں کہا۔ کیا میں اس محبت کرنے والی ہستی کو دکھ دے سکتی ہوں، جو مجھ میں اپنی مرحوم بہن کو دیکھتی ہے۔

اسی لمحے اس کے دل میں اللہ میاں نے کہا۔

''کوئی کسی کو دکھ نہیں دے سکتا۔ یہ سب تو اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اور وہ چاہے تو کسی کے لئے اس کے دکھ کو بھی سکھ بنا دے۔''

اور وہ مطمئن ہوگئی۔

✿ ✿ ✿

وہ ارجمند کے لئے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

ایسی شام اس کی زندگی میں دہلی کے بعد سے اب تک نہیں آئی تھی۔

آغا جی گاڑی چلا رہے تھے۔ آپی آگے ان کے ساتھ تھیں، اور وہ دادی اماں کے ساتھ پیچھے بیٹھی تھی۔ دل میں یہ یقین تھا کہ وہ سب اس کے اپنے ہیں اور پچھلا زمانہ ابھی سے یادوں میں دھندلانے لگا تھا۔ بس ایک پھپھو کی یاد تازہ تھی۔ ان کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ افسردہ ہوگئی۔ کاش وہ بھی ساتھ ہوتیں۔ لیکن نہیں، وہ پھپھا جان کے ساتھ ہوتیں تو اور اچھا ہوتا۔

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ سب کچھ بھول سکتی ہے، لیکن پھپھو کو نہیں بھول سکتی۔ یہاں وہ پھپھو ہی کی وجہ سے تو پہنچی تھی۔ پھپھو ہی تو آغا جی کو جانتی تھیں۔ ورنہ وہ آغا جی تک کیسے پہنچتی۔ اور آغا جی کی وجہ سے اسے دادی اماں کا نعم البدل ملا، ایسی محبت کرنے والی بہن ملی، اور یہ پرسکون اور آزاد زندگی۔ ایسی

ہوا میں تو اس نے کبھی سانس نہیں لیا تھا۔

وہ باہر دیکھتی اور گہری گہری سانس لیتی رہی۔ کون جانے، پھر یہ ہوا اس سے چھن جائے۔ جتنی ہوا پھیپھڑوں میں بھر سکو، بھر لو۔

اور لارنس گارڈن دیکھ کر تو وہ حیران رہ گئی۔ اتنا بڑا باغ...... پوری دنیا جتنا بڑا، اور اتنا خوب صورت، درمیان میں وہ چھوٹی سی جھیل اسے بہت ہی اچھی لگی۔

وہ گھاس پر بیٹھ گئے۔

''کیسا لگ رہا ہے اماں!'' عبدالحق نے حمیدہ سے پوچھا۔

''بہت اچھا پتر! یہاں تو کبھی کبھی لایا کر بچوں کو۔''

''بالکل اماں!''

اسی وقت اس کی نظر دس بارہ سال کے ایک لڑکے پر پڑی۔ اس کے ہاتھوں پر ایک بہت بڑی تھالی تھی، جس میں تلی ہوئی چنے کی دال تھی۔ وہ ادھر ادھر آواز لگاتا پھر رہا تھا۔

''خستہ کراری دال لے لو۔'' عبدالحق نے اسے آواز دے لی۔

لڑکا ان کی طرف چلا آیا۔

''یہاں بیٹھو۔'' عبدالحق نے کہا۔

لڑکا بیٹھ گیا۔ تھالی اس نے سامنے رکھ لی۔ تھالی پر دال کے علاوہ ایک چوڑے منہ کا ڈبہ تھا، جس کے اُوپری ڈھکنے میں کئی سوراخ تھے۔ اس کے علاوہ وہ کاغذ کے تکونی ساخت کے پڑے تھے، جو ایک اندر ایک رکھے تھے۔

''کیسی ہے تمہاری دال؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''کھا کر دیکھ لیں آپ!'' لڑکے نے دال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ایسے نہیں! کتنے کی دیتے ہو ایک پڑیا''

''ایک پیسے کی جناب!''

لب و لہجے سے لڑکا مقامی نہیں لگ رہا تھا۔ عبدالحق نے پوچھا۔

''تم ہندوستانی ہو؟''

''نہیں جناب! میں پاکستانی ہوں۔''

عبدالحق کھسیا گیا۔

''تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں پوچھ رہا ہوں، تم لوگ ہندوستان سے آئے ہو؟''

''جی جناب! ہم میرٹھ سے آئے تھے۔ لیکن میرے اور اماں کے سوا کوئی نہیں بچا۔''

''کہاں رہتے ہو؟''

''ایک جھونپڑی ڈال لی ہے جناب!''

اُف یہ ہجرت کی الم ناک کہانیاں۔ عبدالحق نے سوچا۔ اتنا سا بچہ کیسے بڑوں کی طرح بات کر رہا ہے۔ ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں، اور غم روزگار میں الجھا ہوا ہے۔

''تم پڑھتے نہیں ہو؟''

''پڑھتا ہوں جناب! صبح سرکاری اسکول میں جاتا ہوں۔ تیسری جماعت میں ہوں۔'' لڑکے نے فخر سے کہا۔

''اماں تمہاری کیا کرتی ہیں؟''

ارجمند بہت غور سے دیکھ اور سن رہی تھی۔

''اماں کچھ نہیں کرتی جناب! وہ زخمی آئی تھیں۔ اسپتال میں ایک ٹانگ کاٹ دی گئی۔ اب بیساکھی سے چلتی ہیں۔''

''اور تم کیا کرتے ہو؟''

''میں اسکول سے آ کر پڑھتا ہوں، کچھ آرام کرتا ہوں، اور شام کو یہ کام کرتا ہوں۔''

''کیا مل جاتا ہے؟''

''کبھی ایک، کبھی ڈیڑھ روپیہ۔''

''روز یہاں آتے ہو؟''

''جی ہاں جناب! ہاں کبھی اپنے جیسے بچوں کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے تو

کسی بستی میں چلا جاتا ہوں۔ مگر یہاں کمائی زیادہ ہوتی ہے۔"

اتنا سا بچہ اور کمائی کی فکر؟ عبدالحق کا دل دکھنے لگا۔

"سنو! تمہارا نام کیا ہے؟"

"شاکر، جناب!"

"تو شاکر! تم مجھے بھائی جان کیوں نہیں کہتے؟" عبدالحق نے کہا۔ پھر اسے کچھ بدلنے کا موقع دیئے بغیر بولا۔

"یہ پوری دال کتنے کی ہوگی؟"

"دو ڈھائی روپے کی تو ہوگی جناب!"

"پھر وہی جناب؟" عبدالحق نے اسے ٹوکا۔

"اب اتنی سی دیر کا ملنا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے جناب!"

اس بات سے عبدالحق کھسیا گیا۔ کیسی تلخی، کیسی حقیقت پسندی تھی اس جواب میں۔ اس نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر شاکر کی طرف بڑھایا۔

"یہ لو! یہ دال میری ہوئی۔"

"میرے پاس کھلا نہیں ہے جناب!"

"میں تم سے پیسے واپس نہیں مانگ رہا ہوں۔ رکھ لو۔"

"آپ میری مدد کر رہے ہیں اور اتنی دال کا آپ کیا کریں گے؟ کھا تو نہیں سکتے، نہیں جناب! اماں کہتی ہیں، دوسروں کی مدد سے اپنی محنت کی کمائی اچھی ہوتی ہے، میں یہ پیسے نہیں لوں گا۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو شاکر! دیکھو، تم چار پڑے تو ہمیں دو، پھر کسی بھی غریب بستی میں جاؤ، وہاں ایسے بچے ہوتے ہوں گے، جن کا جی چاہتا ہوں دال خریدنے کو مگر ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے ہوں گے۔ دال دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آتا ہوگا۔ تم نے دیکھے ہوں گے ایسے بچے......"

"جی...... میں کبھی کبھی انہیں تھوڑی سی دال دے دیتا ہوں۔" شاکر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم آج وہاں جاؤ، اور یہ دال تمام بچوں کو مفت

دو۔"

"یہ ٹھیک ہے جناب! لیکن دال تو زیادہ سے زیادہ ڈھائی......"

"دیکھو! دال تو میں نے تم سے ڈھائی روپے میں لے لی۔ اب یہ میری ہے نا؟" عبدالحق نے کہا۔ شاکر نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اب میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ اسے کہیں لے جا کر بانٹ دو، تو اس کام کی مزدوری بھی تو ہوگی نا؟ تو ڈھائی روپے اس کی مزدوری۔ اس میں مدد کی کیا بات ہے؟ تم میرا کام کرو گے تو میں تمہیں اس کی اجرت دوں گا۔"

لڑکے نے چار پڑے انہیں بنا کر دیئے اور خاموشی سے تھال اٹھا کر چلا گیا۔

وہ لوگ خاموش بیٹھے دال ٹونگتے رہے۔ دال بہت خستہ تھی، اور مسالے نے اس کا لطف دوبالا کر دیا تھا۔

ذرا دیر بعد حمیدہ نے کہا۔

"ارے تم لوگ گھومو پھرو نا، میں یہیں بیٹھی ہوں، جاؤ۔"

"آپ کو اکیلا چھوڑنا اچھا نہیں لگتا اماں!" عبدالحق نے کہا۔

"ارے! اتنے لوگوں کے بیچ کوئی اکیلا ہوتا ہے بھلا؟ پگلا کہیں کا۔"

عبدالحق اور نوربانو اٹھ کھڑے ہوئے۔ نوربانو نے ارجمند کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا۔

"چلو ارجی!"

"نہیں آپی! میں دادی اماں کے پاس رہوں گی۔"

"لو! ہم تو تمہیں سیر کرانے کے لئے آئے ہیں۔ چلو ایسا کرو، اماں کے پاس میں رک جاتی ہوں۔ تم چلی جاؤ ان کے ساتھ۔"

ارجمند کا گلا خشک ہوگیا۔

"نہیں آپی! آپ جائیں نا، میرا دل بھی نہیں چاہ رہا ہے۔ بیٹھ کر یہاں سب کچھ دیکھنا زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔"

"یہاں بیٹھے بیٹھے تمہیں نہیں معلوم ہو سکتا کہ یہ کتنا بڑا باغ ہے۔ خیر،

اگلی بار سہی۔"

وہ دونوں چلے گئے۔ ارجمند بیٹھی آغا جی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کے ذہن میں ایک الجھن تھی۔ آپی نے کہا تھا، اللہ میاں کسی سے بات نہیں کرتے۔ یہ اس کا وہم ہے۔ اور اسے یاد تھا، اللہ میاں نے اس سے کہا تھا کہ وہ آغا جی کو بڑا بنائے گی، وہ اس سے شادی کے بعد بڑے ہوں گے۔ لیکن ان چند دنوں میں اس نے دیکھ لیا تھا، اور ابھی اس دال بیچنے والے کے معاملے میں بھی دیکھا تھا۔ آغا جی تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ وہ تو پہلے ہی بڑے آدمی ہیں۔ اس سے شادی کے بعد کیا بڑے ہوں گے۔

اس کا یقین متزلزل ہونے لگا کہ اللہ میاں اس سے بات کرتے ہیں۔ شاید آپی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔

لیکن اسی لمحے اسے کچھ یاد آ گیا۔

وہ تو آغا جی کو جانتی بھی نہیں تھی۔ اس نے تو بس ایک بار انہیں دیکھا تھا، اور ان کی تصویر بنا لی تھی۔ اسے ان کے بارے میں کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کے لئے بہت اپنے ہوگئے تھے، دل میں بس گئے تھے۔ مگر پھپھو تو انہیں بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ تو ان کے ساتھ کالج میں پڑھی تھیں۔ انہوں نے اس کی بنائی ہوئی تصویر دیکھ کر انہیں پہچان لیا تھا۔ اور ان کے منہ سے آغا جی کا نام نکلا تھا ..... اوتار سنگھ، اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ بہت اچھے ہیں۔ مگر ہندو ہیں۔ لیکن اس کا دل نہیں مانا تھا۔

پھر اس نے اللہ سے دعا کی تھی کہ آغا جی مسلمان ہو جائیں تو اللہ میاں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ہندو نہیں، مسلمان ہیں۔ اور جب پھپھو نے ان کے سپرد کرنے سے پہلے اسے بتایا تھا کہ وہ مسلمان ہو چکے ہیں، اور اب وہ ان کے پاس رہے گی۔

اس نے محض تصدیق کے لئے حمیدہ سے پوچھا۔

"دادی اماں! کیا آغا جی پہلے ہندو تھے۔"

حمیدہ کو یہ بات ناگوار لگی۔

"مجھے تو وہ کبھی ہندو نہیں لگا۔ ہاں وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باپ بھی مرنے سے پہلے ایمان لے آئے تھے۔ ارے میں نے اسے دودھ پلایا ہے نکی!"

"ان کا نام پہلے اوتار سنگھ تھا دادی اماں؟"

"ہاں نکی! ٹھاکر اوتار سنگھ!"

ارجمند کھل اٹھی۔ آغا جی وہی تھے، جو پھپھو نے انہیں سمجھا تھا۔ پھپھو انہیں جانتی تھیں، اور وہ نہیں جانتی تھی۔ پھپھو کو نہیں معلوم تھا، لیکن اللہ میاں نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ تو یہ اس کا وہم نہیں، اللہ میاں اس سے بات کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ ورنہ اسے کیسے معلوم ہوتا کہ وہ مسلمان ہیں۔

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوشی دیکھ کر اسے بھی خوشی ہوئی۔

"پر تو نے یہ بات کیوں پوچھی نکی!" اس نے پوچھا۔

"پھپھو کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ لیکن مجھے معلوم تھی دادی اماں!"

حمیدہ کو حیرت ہوئی۔

"پر تو تو اسے جانتی بھی نہیں تھی۔"

"جی دادی اماں! میں نے تو بس ایک بار دور سے انہیں دیکھا تھا۔"

"پھر تجھے کیسے معلوم ہوا نکی!"

"مجھے اللہ میاں نے بتایا تھا دادی اماں!" ارجمند نے بے ساختہ کہا، اور کہتے ہی ڈر گئی کہ اب وہ بھی اسے سمجھائیں گی کہ یہ اس کا وہم ہے۔

لیکن حمیدہ کا ردِعمل حوصلہ افزاء تھا۔ وہ مسکرائی۔

"تو اللہ میاں تجھ سے باتیں کرتے ہیں نکی! کیسے؟"

اس مسکراہٹ نے ارجمند کو سب کچھ بتانے کا حوصلہ دیا۔

حمیدہ خاموشی سے سنتی رہی۔ کچھ بولی نہیں۔

"آپی کہہ رہی تھیں کہ یہ میرا وہم ہے۔ مگر دادی اماں! یہ وہم ہوتا تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ آغا جی مسلمان ہیں۔"

"آپی تیری کو کیا پتا ان باتوں کا۔ وہ تو بس اپنی دنیا میں مگن ہے۔"

"تو دادی اماں! اللہ میاں لوگوں سے باتیں کرتے ہیں نا؟"

"ہاں نکی! وہ تو ہم سب کے اندر ہی ہوتے ہیں نا...... یہاں......"

حمیدہ نے حلقوم پر انگلی رکھی، اور پھر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"اور یہاں، دل میں۔ پر نکی! بندے کو ڈرنا چاہئے۔ کیونکہ ہر ایک کے اندر شیطان بھی ہوتا ہے۔ اور وہ بھی اس کی ہی آواز میں باتیں کرتا ہے۔"

یہ بالکل نئی بات تھی۔ ارجمند کو ڈر لگنے لگا۔

"تو یہ کیسے پتا چلے گا دادی اماں! کہ کون سی بات اللہ میاں نے کہی ہے اور کون سی شیطان نے؟"

"یہ بات تو بس دل ہی بتا سکتا ہے۔ اسی لئے تو دل کا صاف اور روشن رہنا ضروری ہے۔" حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اللہ میاں نے تو خود ہی تجھے سمجھا دی ہے یہ بات۔ انہوں نے کہا تھا نا کہ جب تک تو سچی اور پاک صاف رہے گی، اور ان کا کہنا مانے گی تو وہ تیرے دل میں رہیں گے ورنہ چلے جائیں گے۔ اب جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں، اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں تو دل سیاہ ہونے لگتا ہے۔ پھر کسی موقع پر آدمی کو کسی معاملے میں مشورے کی ضرورت ہوتی ہے تو شیطان اسے مشورہ دیتا ہے، اور دل کی سیاہی کی وجہ سے وہ اسے اللہ کا مشورہ سمجھتا ہے۔ یوں وہ اور برا ہو جاتا ہے اور برا ہوتا رہتا ہے۔ پھر وہ اللہ سے اور اس سے دور ہو جاتا ہے۔ اور وہ بس شیطان کا ہو جاتا ہے۔"

ارجمند جھرجھری لے کر رہ گئی۔

"اللہ کی نافرمانی سے کیسے بچتے ہیں دادی اماں!"

"اللہ نے جس کام کو منع کیا ہے، وہ نہ کرے، اور اللہ کے سارے حکم مان کرے۔"

"اور یہ پتا کیسے چلے گا دادی اماں!"

"قرآن کو پڑھ کر سمجھا کر نکی!"

یہی بات پھپھو نے کہی تھی۔ اور اس نے سوچا تھا کہ وہ عربی ضرور پڑھے گی۔

"اب دیکھو، میرا عبدالحق قرآن پڑھتا بھی ہے، اور سمجھتا بھی ہے۔"

"آغا جی کو عربی آتی ہے؟"

"قرآن سے بھی پہلے اس نے عربی پڑھی اور سیکھی تھی۔"

چلو، عربی پڑھانے والا گھر میں ہی مل گیا۔ ارجمند نے خوش ہو کر سوچا۔

اسی لمحے ارجمند کے روشن چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے حمیدہ کے دل میں خیال آیا کہ کاش یہ لڑکی اس کی بہو ہوتی۔ اس میں کوئی بہت اچھی بات ہے۔ اللہ بہت مہربان ہے اس پر۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے؟ اللہ مہربان نہ ہوتا تو وہ بھلا ایسی ہوتی۔ اور پھر نور بانو جیسی شکی عورت اس سے ایسی محبت کرتی۔

لیکن بہت چھوٹی ہے ابھی۔ حمیدہ نے دل میں کہا۔ اور پھر عبدالحق شادی شدہ ہے، اور نور بانو سے بہت محبت کرتا ہے۔ پھر بھی...... کون جانے...... اللہ نے تو چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ اور اولاد تو مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ بات تو بہت دور کی، بہت ناممکن لگتی ہے...... کون جانے۔ اللہ نے ہی تو ملایا ہے۔ کیا ضروری تھا کہ یہ ہمیں ہی ملتی۔ اور جیسے یہ عبدالحق کو ملی، یہ بھی تو اللہ کی قدرت ہے۔ ایسے کہیں لوگ ملتے ہیں بھلا......

اسی لمحے عبدالحق اور نور بانو واپس آ گئے۔

✿ ✿ ✿

جیسے ہی الارم کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی، عبدالحق کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے نور بانو کو نیند میں کسمساتے دیکھا تو جلدی سے الارم بند کر دیا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے الارم کیوں لگایا تھا۔

دیر تک سونے کی عادت ہوگئی تھی، اس لئے لگتا تھا کہ نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ وہ سوچتا رہا، یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ الارم لگانے کا کیا سبب تھا۔ لیکن نیند کے غلبے کی وجہ سے ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔

وہ سونے کے ارادے سے دوبارہ لیٹ گیا۔ اسی وقت ایک جھٹکا سا لگا، اور اسے یاد آ گیا۔ ارے......! اسے تو ارجمند کو پڑھانا ہے، اور یہ نور بانو کا حکم ہے۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔

❁ ❁ ❁

ارجمند قرآن پڑھ کر بیٹھی حمیدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ بات کرنا کیا، وہ بولتی بہت کم تھی۔ البتہ حمیدہ کی باتیں بہت غور سے سنتی تھی۔ وہ اس کی دادی سے صرف مشابہ نہیں تھیں، بلکہ باتیں بھی ویسی ہی کرتی تھیں۔ وہی بات بات میں عقل اور حکمت، وہی سمجھانے والا انداز، وہی دل میں اتر جانے والا لہجہ۔ اسے حمیدہ کی باتیں سننا بہت اچھا لگتا تھا۔

لیکن اس صبح اس کا دھیان حمیدہ کی باتوں میں نہیں تھا۔ وہ عبدالحق کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آپی نے اسے بتایا تھا کہ اب آغا جی اسے ہر روز پڑھایا کریں گے۔ وہ ان کی منتظر تھی۔

کئی بار اس نے سوچا کہ باہر نکل کر دیکھے۔ کیا پتا، آغا جی اٹھ گئے ہوں، اور اس کا انتظار کر رہے ہوں۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ ان کے معمول سے واقف تھی۔ وہ اٹھ کر سب سے پہلے دادی اماں کے پاس سلام کے لئے آتے تھے، اور کچھ دیر ان سے باتیں کرتے تھے۔ پھر وہ ناشتہ کرتے اور اس کے بعد ان کی پڑھائی شروع ہو جاتی۔

پھر باہر سے قدموں کے قریب آتی ہوئی وہ چاپ سنائی دی، جسے اب وہ خوب پہچانتی تھی۔

چند لمحے بعد عبدالحق کمرے میں داخل ہوا۔ حمیدہ کو سلام کر کے اس نے سر جھکایا۔ حمیدہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''کیا بات ہے پتر! آج اتنے سویرے کیسے اُٹھ گیا؟'' اس نے پوچھا۔

عبدالحق کھسیا گیا۔

''وہ اماں! ارجمند کو پڑھانا ہے نا!'' پھر اس نے جلدی سے گویا صفائی پیش کی۔

''نور بانو نے پابند کر دیا ہے اماں! ورنہ میں نے سوچا تھا کہ اپنے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد ارجمند کی پڑھائی کی فکر کروں گا۔''

اس کی پہلی بات سن کر ارجمند افسردہ ہوئی تھی، آپی نہ کہتیں تو آغا جی مجھے نہ پڑھاتے۔ لیکن بعد کے لفظ سن کر اس کی شکایت دور ہو گئی۔

''چل پتر! یہ تو بہت اچھا ہے۔ اسے پڑھائے گا تو تیری پڑھائی میں اللہ برکت اور آسانی پیدا کرے گا۔''

''انشاء اللہ! ایسا ہی ہو گا اماں!''

تھوڑی دیر وہ حمیدہ سے باتیں کرتا رہا، پھر ارجمند کی طرف مڑا۔

''اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا کچھ آتا ہے؟''

لیکن ارجمند کے کچھ کہنے سے پہلے ہی حمیدہ نے مداخلت کر دی۔

''نا پتر! پڑھائی ایسے تو نہیں ہوتی۔ تو اسے اپنے پڑھائی والے کمرے میں پڑھایا کر، میز کرسی پر بٹھا کر۔''

عبدالحق گڑبڑا گیا۔ بے شک، نور بانو نے ہی یہ فرمائش کی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ وہ کتنی شکی طبیعت کی ہے۔ خوامخواہ کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔ دوسری طرف ارجمند بھی یہ سن کر گھبرا گئی تھی۔

''اب دیکھ کیا رہا ہے پتر! جا اور اسے پڑھا۔'' حمیدہ نے کہا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا تو بولی۔

''تو نے تو ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا ہو گا۔''

''وہیں اسٹڈی میں کر لوں گا اماں!'' عبدالحق نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ چلیں، میں آپ کا ناشتہ لاتی ہوں۔'' ارجمند بھی اٹھ گئی۔

عبدالحق اسٹڈی میں چلا گیا۔ ذرا دیر بعد ارجمند اس کا ناشتہ لے آئی۔ ٹوسٹ، فرائی انڈے اور چائے۔ ٹرے اس نے میز پر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لیں آغا جی! توس میں نے جلا تو نہیں دیئے ہیں۔"

عبدالحق نے توسٹ اٹھا کر دونوں طرف سے دیکھا۔

"تم نے سینکے ہیں؟"

"جی ہاں!"

"نسیمہ سے کہہ دیتی۔"

"مجھے بھی کام کرنا آتا ہے۔ لایئے مکھن لگا دوں۔"

"مجھے بتاؤ، حساب میں تمہیں کیا کچھ آتا ہے؟" عبدالحق نے ناشتے کے دوران پوچھا۔

"آپ پہلے سکون سے ناشتہ کر لیں۔"

ناشتے کے بعد عبدالحق نے اس کا مختصر سا انٹرویو کیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ نادرہ نے بڑی محنت اور محبت سے اسے پڑھایا تھا۔ بلکہ اس کی انگریزی استعداد تو غیر معمولی تھی۔ وہ اس کی اپنی انگریزی کی کتابوں کو روانی سے پڑھ رہی تھی۔ البتہ سمجھ نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اس کا ذخیرۂ الفاظ محدود تھا۔

"کاپیاں ہیں تمہارے پاس؟" اس نے ارجمند سے پوچھا۔

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ ڈرائنگ کی کاپیوں، اپنی اسکیچ بک اور رنگوں کے سوا کچھ بھی نہیں لائی تھی۔ اور ڈرائنگ کی کاپیاں تو اس نے دادی اماں کی الماری میں سب سے نیچے چھپا دی تھیں۔

عبدالحق نے اپنا رجسٹر اٹھایا اور جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کے کچھ سادہ سوال اسے کرنے کے لئے دیئے۔ ارجمند نے وہ بغیر کسی غلطی کے بہت تیزی سے حل کر دیئے۔

جس دوران وہ اس کا کام چیک کر رہا تھا، ارجمند ٹکٹکی باندھے اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ مگر اسی لمحے اللہ میاں نے اسے ٹوک دیا۔

"کسی کو ایسے نہیں دیکھتے۔ اپنی نظریں نیچی رکھا کرو۔ اللہ کو حیا پسند ہے،"

اور ارجمند نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

عبدالحق بہت خوش تھا، ارجمند کی اردو اور انگریزی کی رائٹنگ بھی بہت اچھی تھی، اور املا بھی درست تھی۔ حساب میں، اسے بیس تک کے پہاڑے یاد تھے۔ اور کسر کے اور اشاریہ کے سوال بھی حل کر لیتی تھی۔ بس دوسرے مضامین میں ذرا زیادہ محنت کرانی تھی۔

"تھوڑی سی تیاری کی ضرورت ہے۔ پھر انشاء اللہ تمہارا داخلہ آٹھویں جماعت میں ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔

ارجمند نے خوشی سے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"اب ہمیں تمہارے لئے آٹھویں کا پورا کورس، کاپیاں اور قلم پنسل وغیرہ خریدنے ہوں گے۔ کل سے تمہاری باقاعدہ پڑھائی شروع۔"

"شکریہ آغا جی!"

"ایسا کیوں کہتی ہو؟ یہ تو میرا فرض ہے۔"

"اور شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔" ارجمند نے نگاہیں جھکائے جھکائے کہا۔

"ٹھیک کہتی تھیں وہ۔"

ان دونوں کو احساس نہیں تھا کہ نور بانو دروازے میں کھڑی انہیں دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہوں میں پسندیدگی تھی۔ ارجمند کی جھکی ہوئی نظریں، اس کا انداز اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا۔

"میں اندر آسکتی ہوں؟" اس نے کھنکھانے کے بعد کہا۔

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آجاؤ نا! تمہیں اجازت کی ضرورت کب سے پڑ گئی؟"

"دیکھو نا! آپ ارجی کو پڑھا رہے ہیں، اور میں مخل ہو رہی ہوں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ آپی!" ارجمند نے شکایتی لہجے میں کہا۔

نور بانو ذرا دور صوفے پر بیٹھ گئی، جبکہ ارجمند عبدالحق کے سامنے بیٹھی تھی۔

"یہ تو اصول کی بات ہے۔ جب یہ پڑھ رہے ہوتے ہیں، میں اس

وقت بھی سوائے ان کے لئے چائے لانے کے کبھی اس کمرے میں نہیں آتی۔ پوچھ لو ان سے۔'' اس نے کہا۔

''یہ سچ ہے، لیکن کبھی کبھی چائے کا وقفہ طویل ضرور ہو جاتا ہے۔'' عبدالحق نے ہنس کر کہا۔

''یہ بتائیں! کیسی رہی ارجمند؟''

''فرسٹ کلاس! تھوڑی سی تیاری کرانی ہوگی۔ اگلے تعلیمی سال میں انشاء اللہ اس کا داخلہ آٹھویں میں ہو جائے گا۔''

''ابھی پڑھا رہے ہیں اسے؟''

''نہیں بھئی! آج پڑھائی کا دن نہیں تھا۔ آج تو میں اسے تول رہا تھا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''پڑھائی تو انشاء اللہ کل سے شروع ہوگی۔ ابھی تو اسے کتابیں اور کاپیاں ولانی ہیں۔''

''تو جائیے، ولا لائیے۔''

''تم بھی چلو نا!''

''نہیں بھئی! آپ ہی چلے جائیں۔ مجھے تو ابھی ناشتہ کرنا ہے اور پھر آپ کی پڑھائی کا وقت ہو جائے گا۔ بس فوراً ہی چلے جائیے۔''

''آپ بھی چلیں نا آپی!'' ارجمند نے کہا۔

''نہیں گڑیا! تم ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ مجھے تیار ہونے میں دیر لگے گی۔ اور پھر ان کی پڑھائی کا حرج ہوگا۔''

''تو چلو ارجمند!'' عبدالحق نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اور ارجمند بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

✿ ✿ ✿

ارجمند کو دیر سے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی اہم بات آغا جی سے کرنی تھی، جو وہ بھول گئی ہے۔ کچھ یاد آتے آتے رہ جاتا تھا۔ لیکن راستے میں گاڑی میں بیٹھے ہوئے اسے اچانک وہ بات یاد آ گئی۔

''آغا جی! ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی۔''

''تو اب بتا دو!''

''میں چاہے کچھ بھی نہ پڑھوں، لیکن عربی ہر قیمت پر پڑھنا اور سیکھنا چاہتی ہوں۔''

گاڑی چلاتے ہوئے عبدالحق نے ایک لمحے کو سر گھما کر اسے حیرت سے دیکھا۔

''تو یہ کیا مشکل ہے؟''

''دادی اماں نے مجھے بتایا تھا......''

''ہاں! اللہ کا شکر ہے، میں تمہیں عربی بھی پڑھا سکتا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن ایک بات بتاؤ، عربی پر اتنا زور کیوں دے رہی ہو؟'' اسے اپنا خیال آ گیا تھا۔ یہ ارجمند کے ساتھ ایک اور قدرِ مشترک نکل آئی تھی...... عربی کی محبت۔

''میں قرآن کو صرف پڑھنا نہیں سمجھنا بھی چاہتی ہوں۔''

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔ یہ چھوٹی سی بچی اس پر سبقت لے گئی تھی۔ اس نے تو نور بانو کی آواز سنی تھی، اور اسے آواز اور آواز والی، دونوں سے محبت ہو گئی تھی۔ مگر زبان نامانوس تھی۔ پھر جب اس پتا چلا کہ وہ عربی ہے تو اس نے عربی سیکھی، اور اللہ کے فضل و کرم سے بڑی محبت سے سیکھی۔ لیکن بہرحال اس کی غرض دنیاوی تھی۔ جبکہ یہ بچی خالص قرآن کی محبت میں عربی سیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے دل میں اس بچی کے لئے احترام سے ملتے جلتے کسی جذبے نے سر اٹھایا۔ عمر سے کیا ہوتا ہے، اس نے سوچا، بڑائی تو اللہ دیتا ہے۔ جسے جب چاہے، دے دے۔''

اس نے آزمانے کے خیال سے کہا۔

''اس کے لئے عربی سیکھنے اور پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ترجمے والا قرآن پڑھ لیا کرو۔''

"نہیں آغا جی! میں چاہتی ہوں کہ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے ان آیات کا مطلب میرے ذہن میں موجود ہو، جو میں پڑھ رہی ہوں۔"

"بہت خوب! تب تو تم بہت جلدی سیکھ لو گی۔"

"کیوں؟"

"اللہ خوش ہوگا نا، تو آسان کر دے گا تمہارے لئے۔" عبدالحق نے کہا اور دل میں تاسف سے سوچا۔

میں تو اپنے دل کی خوشی کے لئے پڑھتا تھا۔ اور جس آواز کی محبت میں عربی سیکھی تھی، وہ مل گئی ہے۔ مگر اس سے سب کچھ سن سکتا ہوں، سوائے قرآن کے۔

"آپ اداس کیوں ہو گئے آغا جی!" ارجمند اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"یوں ہی......! اپنی محرومی کا خیال آ گیا تھا۔"

"اللہ نہ کرے۔ آپ کبھی محروم ہو ہی نہیں سکتے۔" ارجمند نے تڑپ کر کہا۔

عبدالحق نے سر گھما کر ایک پل اسے غور سے دیکھا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میں ہمیشہ دعا جو کرتی ہوں آپ کے لئے۔"

"ضروری تو نہیں کہ ہر دُعا قبول ہو۔"

"لیکن جب اللہ میاں وعدہ کریں تو وہ تو پورا ہو کر رہتا ہے۔"

"اللہ نے کسی سے وعدہ نہیں کیا کہ اس کی ہر دعا قبول فرمائے گا۔"

ارجمند گھبرا گئی۔ نور بانو کا ردِّعمل وہ دیکھ چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب آغا جی بھی اسے پاگل سمجھنے لگیں۔ یہ اللہ میاں والی بات دادی اماں کے سوا کسی کے سمجھ میں نہیں آئے گی۔

"پھپھو کہتی تھیں آغا جی! کہ سچے دل کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ خاص طور پر اگر وہ اپنے لئے نہیں، کسی اور کے لئے کی جائے۔"

"نہیں ارجی! یہ ہرگز ضروری نہیں۔ ہاں! کہتے ہیں کہ جو دُعا دنیا میں قبول نہ ہو، اس کا اجر آخرت میں ملتا ہے۔ اور دعا سے کہیں بڑھ کر ملتا ہے۔"

"تو اس میں بھی آپ کا فائدہ ہے۔" ارجمند نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔

"ہاں! دنیا کے فائدے تو وقتی طور پر بڑے لگتے ہیں، اصل فائدہ تو آخر کا ہی فائدہ ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اتنی چھوٹی بچی سے وہ اتنی بھاری گفتگو کر رہا ہے۔ چنانچہ اس نے موضوع بدلا۔

"ایک بات ہے۔ اب میں تمہیں پڑھاؤں گا تو تمہیں مجھے فیس بھی تو دینی ہوگی۔"

ارجمند اداس ہوگئی۔

"میں بھلا آپ کو کیا دے سکتی ہوں؟ مجھے تو کتابیں بھی آپ ہی دلا رہے ہیں۔"

عبدالحق تڑپ گیا۔

"ایسی بات آئندہ کبھی نہ کہنا۔ میں جو کچھ بھی تمہیں دلاؤں گا، وہ دراصل تمہاری پھپھو دلا رہی ہوں گی۔"

"کیسے......؟"

"تمہیں نہیں معلوم کہ میں تمہاری پھپھو کا کتنا مقروض ہوں۔ تم جانتی ہو نا کہ تمہاری پھپھو خوددار تھیں۔ وہ کسی کا احسان نہ لیتی تھیں کبھی؟"

ارجمند کو پانی سے بھری وہ آنکھیں یاد آ گئیں۔ اتنی محنت اس لیے تو کرتی تھیں وہ۔ کوٹھے پر سب کچھ ان کے اختیار میں تھا، مگر وہ اپنی اور اس کی ضرورتوں کے لئے سلائی کڑھائی کرتی تھیں۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جی......! میں جانتی ہوں۔"

"تو سوچو کہ انہوں نے تمہیں میرے سپرد کیوں کیا؟"

"وہ کہتی تھیں کہ آپ کے سوا یہاں ان کا کوئی ہے ہی نہیں۔"

عبدالحق کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ نادرہ تو نہیں جانتی تھی کہ وہ مسلمان

ہو چکا ہے۔ پھر بھی وہ یہاں بس اسے ہی اپنا سمجھتی تھی۔

"یہ بات نہیں ہے ارجی! دیکھو نا، وہ عارف صاحب سے شادی کر رہی تھیں نا؟"

ارجمند نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"تو آدمی جس سے شادی کرے، وہ اس کے نزدیک سب سے معتبر ہوتا ہے۔"

ارجمند نے کچھ نہیں کہا، وہ اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔

"اور عارف صاحب جب نادرہ کو ملے تو میں تو اسے ملا بھی نہیں تھا۔ اب تم سوچو کہ نادرہ نے تمہیں عارف کے سپرد کیوں نہیں کیا؟ میرے سپرد کیوں کیا؟"

اس لئے کہ وہ جانتی تھیں کہ آپ میرے شہزادے ہیں۔ ارجمند نے دل میں کہا۔ لیکن یہ بات وہ کہہ نہیں سکتی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم، یہ تو آپ ہی مجھے بتائیں۔"

"بتا تو رہا ہوں۔ وہ خوددار تھی، عارف پر اس کا کوئی احسان نہیں تھا، اور مجھ پر تھا۔ وہ تمہیں عارف کو سونپتی تو اس پر عارف کا احسان ہوتا۔ لیکن میری بات دوسری تھی اور ہے۔ میں تو جو کچھ بھی کروں گا، وہ اس کے احسان کے جواب میں ہوگا۔ اور احسان اتنا بڑا ہے کہ اس کا حق پھر بھی ادا نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے آغا جی! میں سمجھ گئی۔"

"تو اب آئندہ ایسا نہیں کہنا۔ تمہارے لئے کچھ بھی کرنا میرے فرائض میں شامل ہے اور وہ احسان نہیں، تمہاری پھپھو کے احسان کے صلے کی معمولی سی قسط ہوگی۔"

"جی، ٹھیک ہے۔"

وہ اُردو بازار پہنچ گئے۔

ارجمند تو صرف دیکھتی رہی۔ عبدالحق نے ہر چیز اپنی مرضی سے خریدی۔

کتابیں، کاپیاں، قلم، پنسل، شارپنر، ربڑ، اور ہر چیز دکان پر موجود اعلیٰ ترین چیز تھی۔

ارجمند بہت خوش تھی۔

عبدالحق نے تمام چیزیں پچھلی سیٹ پر رکھیں اور اس کے لئے اگلا دروازہ کھولا۔ پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ گاڑی آگے بڑھانے سے پہلے اس نے ارجمند کو غور سے دیکھا۔

"میں نے تم سے پوچھے بغیر تمہارے لئے ہر چیز پسند کی، تمہیں برا تو نہیں لگا؟"

"مجھے تو اچھا لگا آغا جی! میری پسند آپ کی پسند سے اچھی تو نہیں ہو سکتی۔"

"ہو بھی سکتی ہے۔ اصل میں بات تو آدمی کی پسند کی ہے۔"

"آئندہ ایسا سوچئے گا بھی نہیں۔ جو کچھ بھی آپ کو پسند ہے، وہ میرے نزدیک بہترین ہے۔"

عبدالحق نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ اب مایوس ہونے لگی تھی۔ شہر کا کوئی مزار، کوئی بزرگ ایسا نہیں تھا، جہاں وہ عبدالحق کے لئے بیٹا مانگنے نہ گئی ہو۔ لیکن بات کسی طرح بن ہی نہیں رہی تھی۔

مگر مایوسی کے باوجود اس کے دل کی اُمید ختم نہیں ہوتی تھی۔ وہ سوچتی، اللہ کا کوئی کام بے سبب نہیں ہوتا۔ اس نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ پر کرم فرمایا اور اسے بڑھاپے میں بیٹے سے نوازا۔ اور وہ کوئی عام بیٹا نہیں تھا۔ وہ ایسا بچہ تھا، جس نے مشرک ماں کا دودھ قبول نہیں کیا۔ ننھے بچے کی جان پر بن گئی، مگر اس نے ضد نہیں چھوڑی۔ اور اللہ نے اسے یہ اعزاز عطا فرمایا کہ ٹھاکروں کی گڑھی میں وہی ایک مسلمان عورت تھی، اور اللہ کی قدرت کہ اس کی گود میں ایک دودھ

پیتا بچہ بھی تھا۔ یعنی اس کی چھاتیوں میں دودھ بھی تھا۔ ننھے ٹھاکر کے لئے۔ یہ سب اللہ کا ہی تو انتظام تھا۔

اور اللہ نے اس بچے کو کیسا مبارک بنایا تھا۔ اس کی پوری زندگی حمیدہ کے سامنے تھی۔ وہ کیسے کیسے سوال کرتا تھا، کیسی جستجو تھی اس کے اندر۔ اور وہ خود تو مسلمان ہوا ہی، لیکن اس سے پہلے اس کا راج پوت باپ مسلمان ہوگیا تھا۔ کیسی عجیب بات تھی۔

اللہ کسی پر فضلِ عظیم فرماتا ہے تو اس کی نسلوں کے لئے صراطِ مستقیم آسان کر دیتا ہے۔ وہ فضلِ عظیم تو نسلوں تک جاتا ہے۔ بڑے ٹھاکر کو کسی انسان نے اسلام کی طرف راغب نہیں کیا تھا۔ اس نے تو کبھی کسی سے اس بارے میں بات بھی نہیں کی تھی۔ اسے تو اللہ نے ہی راستہ دکھایا تھا۔ بس اسے اس کا اعلان کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

اس اعتبار سے عبدالحق اس نسل میں اللہ کے دین سے رجوع کرنے والا دوسرا شخص تھا۔ حمیدہ نے سوچا، یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ اتنا بڑا فضل فرمائے اور پھر اسے روک دے۔ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ عبدالحق اولاد سے محروم رہے گا۔ اسے یقین تھا کہ اللہ کا وہ فضل عبدالحق کی آنے والی نسلوں تک جائے گا۔

بس یہ یقین تھا، جو اسے مکمل مایوسی سے بچائے ہوئے تھا۔ ورنہ ہر ناکامی کے بعد وہ یہی سوچتی تھی کہ شاید اللہ کو یہ منظور نہیں۔ لیکن اللہ کے فضل کا خیال پھر سے اُمید جگا دیتا تھا۔

اس روز بھی وہ نسیمہ کے ساتھ کہیں گئی، اور وہاں سے پڑھا ہوا پانی لے کر آئی۔ مگر اس نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اب اس کے بعد وہ کسی در پر نہیں جائے گی۔ وہ اس پانی کو مہینوں چلائے گی۔ اللہ کو منظور ہوا تو نور بانو کی گود ہری ہو جائے گی۔

وہ پانی کی خاصی بڑی بوتل تھی۔ اس نے سوچا، عبدالحق کے کمرے میں رکھی صراحی میں ہر روز وہ اس بوتل میں دو گھونٹ پانی شامل کر دیا کرے گی۔

وہ واپس آئی تو ارجمند اس کے کمرے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس

نے اسے سلام کیا۔

”کہاں گئی تھیں دادی اماں!“ اس نے پوچھا۔

”ایک کام سے گئی تھی نکی!“ حمیدہ نے کہا اور پانی کی بوتل مسہری کے سرہانے پر رکھ دی۔

”دادی اماں! آپ تو ہر دوسرے تیسرے دن کہیں نہ کہیں جاتی ہیں۔“

”ہاں نکی! اپنی غرض کے لئے ماری ماری پھرتی ہوں۔“

ارجمند نے تجسس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھے ساتھ کیوں نہیں لے کر جاتیں دادی؟“

”تو بچی ہے ابھی، اس لئے۔“ حمیدہ نے بے ساختہ کہا۔ پھر جلدی سے بولی۔

”اور پھر تو تو اس وقت پڑھ رہی ہوتی ہے۔ تو محنت نہیں کرے گی تو تیرا داخلہ کیسے ہوگا؟“

”لیکن دادی! آپ کی کیا غرض ہو سکتی ہے، آپ کے پاس تو اللہ کا دیا سبھی کچھ ہے۔“

”سب کچھ تو کسی کو بھی نہیں ملتا نکی! بادشاہوں کو بھی نہیں۔“

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی۔ وہ کیسی نایاب چیز ہوگی کہ دادی اس کے لئے ماری ماری پھرتی ہیں، اور انہیں نہیں ملتی۔ اتنے بڑے بڑے بازار ہیں، سینکڑوں دُکانیں ہیں، مگر وہ چیز نہیں ملتی۔ ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے؟ پھر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ دادی کو پتا ہی نہیں ہوگا کہ وہ چیز کس دکان پر ملے گی۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے۔

”آپ آغا جی سے کہیں نا دادی! وہ لا دیں گے آپ کو۔ آپ کو دکانوں کا کیا پتا؟ آغا جی کو سب کچھ معلوم ہے۔“

حمیدہ اداس ہوگئی۔

”عبدالحق بھی نہیں لا سکتا وہ چیز۔ لاسکتا ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔“

ارجمند کا تجسس اور بڑھ گیا۔

''اور ضرورت تو اصل میں وہ عبدالحق ہی کی ہے۔ اسی کے لئے تو پھرتی ہوں میں۔''

آغا جی کو کس چیز کی ضرورت ہے؟ اور دادی اس کی تلاش میں پھرتی ہیں۔ ارجمند نے حیرت سے سوچا۔ اگر وہ آغا جی کو نہیں ملتی تو دادی کو کیسے ملے گی؟ اور ایسی کون سی چیز ہے؟ اب تجسس کے ساتھ وہ چیز ارجمند کے لئے اہم بھی ہوگئی۔ وہ کچھ نہیں کرسکتی تو اللہ سے دعا تو کر ہی سکتی ہے۔ اور جو چیز کہیں سے نہیں ملتی، وہ اللہ چاہے تو کہیں سے بھی بھی دے دے۔

مگر یہ تو پتا چلے کہ وہ چیز کیا ہے؟

''آپ مجھے بتائیں نا دادی اماں! کیا چاہئے آغا جی کو؟ جو انہیں نہیں مل رہا ہے۔'' اس نے حمیدہ سے کہا۔

''تو چھوٹی ہے نکی! تجھ سے کیا بات کروں؟'' حمیدہ نے کہا۔ پھر اچانک اسے ایک خیال آیا۔

''یہ تو عبدالحق کو آغا جی کیوں کہتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

سوال ارجمند کے لئے خلافِ توقع تھا، وہ گم سم ہوگئی۔

''بس دادی اماں! یوں ہی......''

حمیدہ اب اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ کوئی رشتہ تو نہیں ہے نا؟''

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو اسے بھائی جان بھی کہہ سکتی ہے، چاچا، ماموں بھی کہہ سکتی ہے۔ پھر یہ آغا جی کیوں؟''

''بس دادی اماں! وہ مجھے آغا جی ہی لگتے ہیں۔ میرے دل کو یہی کہنا اچھا لگتا ہے۔''

حمیدہ کو خیال آیا، ارجمند نے اسے بتایا تھا کہ اللہ میاں اس سے باتیں کرتے ہیں۔

''یہ تجھ سے اللہ میاں نے تو نہیں کہا؟'' اس نے پوچھا۔

ایک لمحے کو ارجمند نے سوچا کہ ہاں کہہ دے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ جھوٹ اللہ میاں کو بہت ناپسند ہے۔ اس نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر......؟''

''اب دیکھیں نا دادی اماں! نہ وہ میرے بھائی ہیں، نہ چچا نہ ماموں۔ تو میرے دل نے کہا، انہیں آغا جی کہا کروں، بس!''

حمیدہ کا دل خوش ہوگیا۔ بچی جھوٹ نہیں بولتی۔ اسی لئے تو اللہ میاں اس سے بات کرتے ہیں، ضرور کرتے ہوں گے۔ اس پر اس کے ذہن میں ایک بات آرہی تھی۔ لیکن ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

''مجھے بتائیں نا دادی! ایسا کیا ہے آغا جی کو جو انہیں کہیں نہیں مل رہا ہے؟''

''اولاد چاہئے تیرے آغا جی کو، بیٹا چاہئے، نسل بڑھانے والا پتر۔'' حمیدہ کے منہ سے نکل گیا۔

ارجمند حیران رہ گئی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں، اسے خیال ہی نہیں آیا۔ جیسے وہ اپنے بابا کی اولاد تھی، جیسے بابا اور پھپھو، دادا جان اور دادی جان کی اولاد تھے، ویسے ہی آغا جی کو بھی...... ہاں! ہونا تو چاہئے تھا۔ لیکن یہ دادی آغا جی کے لئے بیٹے کی تلاش میں کہاں ماری ماری پھرتی ہیں؟ بچے کوئی بازار میں...... دکانوں پر ملتے ہیں بھلا؟''

اس نے یہ بات دادی اماں سے کہہ بھی دی۔

حمیدہ ہنسنے لگی۔

''تو تو جھلی ہے نکی! میں دکانوں پر نہیں، مزاروں پر جاتی ہوں، بزرگوں کے پاس جاتی ہوں۔''

''آپ کو اللہ میاں سے مانگنا چاہئے دادی اماں!''

''وہ تو ہر وقت مانگتی رہتی ہوں۔ پر بزرگوں کے پاس اس لئے جاتی ہوں کہ وہ اللہ کے ولی ہوتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ تو اللہ ان کی سنے گا نا!''

''اللہ تو سب کی سنتا ہے دادی!''

"یہ تو ٹھیک ہے۔" حمیدہ نے کہا۔ پھر اسے وہ خیال آ گیا، جو ارجمند کے چونکانے سے وہ بھول گئی تھی۔ اس نے سوچا، یہ بچی بن ماں باپ کی ہے، معصوم بھی ہے اور نیک اور سچی بھی۔ اور اللہ اس سے باتیں بھی کرتا ہے۔ تو کیوں نہ اس سے کہے۔

"سن نکی! اللہ میاں تجھ سے باتیں کرتے ہیں نا؟"

"جی دادی اماں!"

"تو تو ان سے پوچھنا کہ اتنی دعا کرنے پر بھی عبدالحق کو پتر کیوں نہیں دیتے؟ پوچھے گی نا؟"

"جی دادی اماں!"

"اور تو دعا بھی کرنا ان سے۔"

"ضرور کروں گی دادی!" ارجمند نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

"اچھا! اب جا کر عبدالحق کے کمرے سے صراحی لا، اور اس میں تازہ پانی بھر، مگر بھر کر پہلے میرے پاس لانا۔"

ارجمند کی سمجھ میں بات تو نہیں آئی، مگر ایسے میں وہ بس عمل کرنے کی قائل تھی۔ صراحی میں پانی بھر کر وہ حمیدہ کے پاس لائی۔ حمیدہ نے سرہانے رکھی بوتل میں سے چند قطرے صراحی میں ڈال دیئے۔

"جا! اب یہ اس کے کمرے میں رکھ دے۔"

"یہ پانی کیسا ہے اماں!" ارجمند نے بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا

"ایک بزرگ نے دم کر کے دیا ہے...... دعا کا پانی ہے۔ پر نکی! نور بانو کو یہ پتا نہ چلے۔"

"ٹھیک ہے دادی اماں!" ارجمند نے کہا اور صراحی لے کر کمرے سے نکل گئی۔

✿ ✿ ✿

عبدالحق ارجمند کی بے پناہ ذہانت پر حیران تھا۔ کوئی بات دوسری بار

سمجھانے کی اسے ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بغیر کسی پریشانی کے ارجمند کو اسکول میں داخلہ مل جائے گا۔

عربی کے معاملے میں وہ اور زیادہ حیران تھا۔ اسے یاد تھا کہ اس کی عربی سمجھنے اور سیکھنے کی صلاحیت پر مولوی صاحب حیران ہوتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے، لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی وجہ اس کی لگن ہے۔ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ ارجمند کی لگن اس کی لگن سے بھی زیادہ ہے۔ اور اس کی لگن دنیاوی تھی، جبکہ ارجمند قرآن سمجھنے کے لئے عربی پڑھ رہی تھی۔ اس لئے اس پر اللہ کی رحمت اور زیادہ تھی۔ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

لیکن ارجمند کا اصل راز اسے معلوم نہیں تھا۔

ارجمند جب پہلی بار اس سے پڑھنے کے لئے بیٹھی تو اس کی عجیب کیفیت تھی۔ نہ وہ کچھ سن رہی تھی، نہ کچھ سمجھ رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بس وہ عبدالحق کو تکتی رہے۔

مگر پھر ابتدائی لمحوں میں ہی اس کے اندر تنبیہ اُبھری۔

"نگاہ نیچی رکھو۔"

"میں بے بس ہوں۔" اس نے کہا۔

"بے بسی سے لڑو، اس سے جیتو، اسی میں بہتری ہے۔"

"دل نہیں مانتا۔"

"جو دل نہیں مانتا، پھر اس میں سیاہی کا پہلا نقطہ پڑ جاتا ہے۔ پھر دل سیاہ ہوتا جاتا ہے۔"

"لیکن میں ان سے محبت کرتی ہوں تو انہیں دیکھوں گی بھی۔"

"دیکھو گی تو محبت محبت نہیں رہے گی۔"

"کیوں؟"

"بغیر حق کے کسی کو یوں نہیں دیکھنا چاہئے۔ ورنہ محبت حقیر ہو جاتی ہے۔ حقیر ہوتے ہوتے مٹ جاتی ہے۔ پھر محبت نہیں رہتی، کچھ اور، خراب چیز ہو جاتی ہے۔ اور آدمی اسے محبت ہی سمجھتا رہتا ہے۔ یہ تو محبت کو خراب کرنا ہوا۔"

"جب مجھے دیکھنے کا حق نہیں تو محبت کا حق کیسے مل گیا؟"

"وہ تمہیں اللہ نے دیا ہے۔"

"اور انہیں دیکھنے کا حق نہیں دیا۔"

"ہاں!"

"تو اب میں کیا کروں؟ میں تو مشکل میں پھنس گئی۔"

"بری بات، جو اللہ دے، اس پر شکر ادا کرنا چاہئے اور جو نہ ملے، اس پر صبر کرنا چاہئے۔ شکایت تو شکر کو ضایع کر دیتی ہے۔ ابھی تمہیں معلوم نہیں کہ محبت کتنی بڑی نعمت ہے۔"

"اللہ آپ کا شکر ہے، مگر مجھے دیکھنے کا حق کب ملے گا؟"

"وقت آنے پر، اس سے پہلے کا وقت آزمائش ہے۔ جیسے اسکول میں داخلے کے لئے امتحان پاس کرنا ضروری ہے، ویسے ہی حق پانے کے لئے صبر کا امتحان بھی ہوگا۔"

اور ارجمند نے سوچا، محبت تو اللہ نے ہی دل میں ڈالی ہے، اور واقعی یہ بڑی نعمت ہے۔ یہ محبت نہ ہوتی تو اس کوٹھے پر جہاں پھپھو ہمیشہ ناخوش رہیں، میرا وقت کیسے گزرتا؟ وہ تو برسوں کی قید تھی، ہر دن، ہر رات پھر ہر دن اور ہرات کی مسلسل قید۔ اسی کی وجہ سے تو میں وہاں بھی خوش رہی۔ اور اللہ میاں نے وعدہ پورا کیا۔ مجھے آغا جی تک پہنچا دیا۔ اس کا بھی ایک وقت ہی تھا۔ کتنے برس لگے اس میں، لیکن اللہ کے بھروسے پر گزر گئے۔ سو یہ حق بھی وقت پر ہی ملے گا اور چاہے اس میں برسوں لگیں۔ لیکن یہ برس بھی گزر ہی جائیں گے۔

اور اس کا دل سکون اور یقین سے بھر گیا۔

اس نے عہد کر لیا کہ آغا جی کو کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ اس کے بعد جیسے اس کی تمام حسیں سماعت میں مرتکز ہوگئیں۔ وہ آغا جی کے سامنے ہوتی تو سر جھکائے ان کی بات دھیان سے سنتی رہتی۔ اور سب کچھ جیسے دل میں اُتر جاتا۔ یہ تھا اس کی ذہانت کا راز۔ اس نے اللہ کی رضا کو تسلیم کر کے خوش رہنے کا، بے سکونی سے نجات پانے کا راز پالیا تھا۔

اور وہ بہت خوش تھی۔

اور عبدالحق بھی بہت خوش تھا۔ ابتداء میں وہ ڈر رہا تھا۔ اسے نادرہ نے بھی ڈرایا تھا، اور بعد میں عارف نے بھی کہ یہ بچی، جو بہت چھوٹی ہے، اس سے دیوانہ وار محبت کرتی ہے۔ اب کوئی کسی کو جواب میں محبت نہ دے سکتا ہو تو بھی کسی سے محبت کرنے کا حق تو نہیں چھین سکتا۔ مگر نور بانو کی تنگ دلی اور حسد سے وہ واقف تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نور بانو سے اس بچی کو کوئی تکلیف پہنچے، جو چھوٹی سی عمر میں ہر رشتے اور ہر سچی خوشی سے محروم ہوگئی تھی۔ اس لئے وہ بہت خوفزدہ تھا۔

لیکن اب وہ سمجھ رہا تھا۔ اللہ نے کرم فرمایا تھا اور ہر مشکل کی جگہ آسانی عطا فرما دی تھی۔ ارجمند کو دیکھ کر نور بانو کے دل میں اپنی چھوٹی بہن کی یاد تازہ ہو چکی تھی، اور وہ اس سے اپنی بہن جیسی محبت کرنے لگی تھی۔ اسے سیر کرانے کا خیال بھی نور بانو ہی کو آیا تھا، اور اسے پڑھانے کی فرمائش بھی نور بانو نے ہی کی تھی۔

اور اب ارجمند کا طرزِ عمل!

اسے یاد آیا کہ جب وہ اپنی کار میں اسے گھر لا رہا تھا تو وہ رو رہی تھی، اور اسے چپ کرانے کے لئے اس نے کہا تھا کہ وہ اس کے آنسو روکنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے تو اس بچی نے کہا تھا۔ مجھ سے شادی کریں گے۔ وہ سٹ پٹا گیا تھا، اور اسی نے بے ساختہ کہا تھا کہ ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے۔ اس پر ارجمند نے بس اتنا کہا تھا۔ جی ٹھیک ہے۔ اور وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی نہیں روئے گی۔

اور اب یہ وہی بچی ہے کہ اس کی موجودگی میں نگاہ بھی نہیں اٹھاتی ہے۔

ارجمند کے معاملے میں عبدالحق کے ذہن میں یہ بات ہمیشہ رہتی تھی کہ اس کے اور اس بچی کے درمیان بہت کچھ مشترک ہے۔ نادرہ نے اسے ارجمند کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ ایسا بہت کچھ جو حیران کن تھا اور اس نے سوچا تھا کہ جیسے اس پر اللہ کی خاص رحمت ہے، ویسے ہی ارجمند پر بھی ہے۔ بلکہ شاید

ارجمند پر اس سے بھی زیادہ ہے۔ اللہ نے ہمیشہ اس کی راہنمائی کی تھی، اسے گمراہی سے نکال کر اپنا سیدھا راستہ دکھایا تھا، اسے جستجو اور پھر منزل عطا کی تھی۔
لیکن ارجمند کا کہنا تھا کہ اللہ میاں اس سے باتیں کرتے ہیں۔ یہ بتاتے ہوئے نادرہ کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ ارجمند کی ذہنی صحت پر شبہ کر رہی ہو۔ مگر جس نے اللہ کی رحمت دیکھی بھی ہو، اور اسے یاد بھی رہتی ہو، وہ اس بات کو سمجھ سکتا تھا اور عبدالحق ایسا ہی تھا۔ اس نے سوچا، جب نادرہ کو اس کے مسلمان ہونے کا علم نہیں تھا تو ارجمند کو کیسے ہوگیا؟ جو اسے جانتی بھی نہیں تھی، جس نے بس ایک بار اسے دیکھا تھا، تو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اللہ اس بچی کے دل پر القا فرماتے ہیں۔ اب بچی تو یہی سمجھے گی، یہی کہے گی کہ اللہ میاں اس کی آواز میں اسی سے باتیں کرتے ہیں۔ وہ کم عمر بچی ہی تو ہے۔ اور بچی بھی ایسی، جس نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں...... معصیت اور خطا سے دور، اور معصوم۔ اللہ ایسے ہی دلوں میں تو رہتا ہے۔

بہرحال عبدالحق بہت خوش تھا۔ اس کے تمام خدشے اور وسوسے دور ہوگئے تھے۔ اور اس کی کم محنت بہت اچھے نتائج لا رہی تھی۔ عربی پڑھانے کا فائدہ تو اسے بھی پہنچ رہا تھا۔ اس کی عربی تازہ ہو رہی تھی۔ مگر اسے لگتا تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ارجمند کی اور اس کی عربی کی استعداد برابر ہو جائے گی۔ تب وہ اسے عربی پڑھا نہیں سکے گا۔ ہاں! وہ دونوں مل کر عربی پڑھ سکیں گے۔
ادھر اس کا مقابلے کا امتحان بھی اب سر پر آ چکا تھا۔

❁ ❁ ❁

نوربانو کو ارجمند سے ایسی محبت ہوگئی تھی کہ اسے دیکھے بغیر اس کی صبح ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ دیر سے اُٹھتی تھی۔ ناشتے کے لئے نکلتی تو عبدالحق کی اسٹڈی کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ وہاں رک جاتی۔ وہ ارجمند کے پڑھنے کا وقت ہوتا تھا۔ وہ کچھ دیر دروازے میں کھڑی ہو کر اسے دیکھتی رہتی۔ اسے گلنار یاد آتی۔ وہ گلنار سے محبت کرتی تھی، لیکن اس نے کبھی گلنار کو محبت دی نہیں تھی۔ اس بات کا اسے پچھتاوا تھا۔ اب قدرت نے ارجمند کے روپ میں اسے وہ محبت

لٹانے کا موقع دیا تھا، اور وہ اس سے استفادہ کر رہی تھی۔
عبدالحق اور ارجمند دونوں ہی کا ارتکاز بلا کا تھا۔ وہ دیر تک کھڑی انہیں دیکھتی رہتی اور انہیں پتا بھی نہیں چلتا۔ مگر وہاں کھڑے ہو کر دیکھتے ہوئے اس کی نگاہوں کا مرکز و محور ارجمند ہوتی تھی، عبدالحق نہیں۔ ان لمحوں میں اس کی نظروں سے جیسے محبت برستی۔
ارجمند کی ایک بات اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ پڑھتے ہوئے اس کی نظریں ہمیشہ جھکی رہتی تھیں۔ وہ نظر کبھی اٹھاتی ہی نہیں تھی۔ اور چہرے پر نظر آنے والے ارتکاز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ عبدالحق کی ہر بات بہت غور سے سن رہی ہے...... بلکہ ذہن نشین کر رہی ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی پاکیزگی ہوتی کہ اس سے روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔
وہ کچھ دیر انہیں دیکھتی تھی، پھر خاموشی سے چلی جاتی تھی۔ اور انہیں پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ اس روز بھی وہ جانے ہی والی تھی کہ ایک دلچسپ بات نے اسے روک لیا۔
پڑھائی کے دوران شاید عبدالحق نے ارجمند سے کوئی ایسی بات پوچھی تھی، جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ ارجمند نہیں جانتی تھی، لیکن ارجمند نے اسے درست جواب دے دیا۔
عبدالحق کے چہرے پر حیرت اُبھری۔ چند لمحے وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔
''یہ تمہیں کیسے معلوم ہے ارجمند؟''
''پتا نہیں کیسے آغا جی! بس مجھے معلوم ہے۔'' ارجمند نے سر جھکائے ہوئے کہا۔
''یہ کیا بات ہوئی؟ کسی نے تمہیں بتایا ہوگا؟''
''نہیں آغا جی! کسی نے نہیں بتایا۔''
''تو پھر کتاب میں پڑھا ہوگا؟''
''نہیں آغا جی!''

"تو پھر کیسے معلوم ہوا تمہیں؟"
"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔"
اب عبدالحق کچھ جھنجلا گیا۔
"یہ کیسے ممکن ہے؟ ہو ہی نہیں سکتا۔"
"اللہ کا شکر ہے آغا جی! میں جھوٹ کبھی نہیں بولتی۔" لفظوں کے برعکس ارجمند کے لہجے میں عاجزی تھی۔
"اچھا! تم میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو کہ نا! یہ تم نے کسی کتاب میں پڑھا، نہ کسی نے تمہیں بتایا۔"
"یہ تو میں نہیں کر سکتی آغا جی!" ارجمند کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔
"کیوں نہیں کر سکتیں؟ میں تمہارا اُستاد ہوں اور تمہیں حکم دے رہا ہوں۔"
ارجمند نے بڑی مشکل سے صرف ایک لمحے کے لئے اسے دیکھا، مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔
"میں سچ کہہ رہی ہوں آغا جی!"
"تم یہ بات میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو۔"
"یہ میں نہیں کر سکتی آغا جی!"
"کیوں؟"
"اللہ نے منع کیا ہے نا! اس لئے......"
عبدالحق کے چہرے پر پھر حیرت اُبھری۔ مگر وہ فوراً ہی مسکرا دیا۔
"چلو ٹھیک ہے! میں مان لیتا ہوں۔ لیکن مجھے یقین نہیں ہے۔"
"میں جھوٹ نہیں بولتی آغا جی!"
اور نور بانو خاموشی سے، دبے پاؤں کمرے سے نکل آئی۔
ناشتہ کرتے ہوئے وہ اس بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بھی حیرت تھی، لیکن عبدالحق کی حیرت سے مختلف۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ عبدالحق نے کیا پوچھا تھا

اور ارجمند نے کیا جواب دیا تھا۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ ارجمند نے وہ جواب کیوں نہیں دیا؟ جس کی اسے یقین کی حد تک اُمید تھی۔ ارجمند کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ یہ بات اسے اللہ میاں نے بتائی ہے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ شاید یہ اس کے سمجھانے کا اثر ہے۔
دوسری بات اسے اور اچھی لگی تھی کہ ارجمند نے عبدالحق کو نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اور کیسے اس نے کہا تھا کہ اللہ نے منع کیا ہے۔ اتنی چھوٹی لڑکی اور اتنی بڑی بات؟ یہ ایک غیر معمولی لڑکی ہے۔ اس نے سوچا۔ جھوٹ نہیں بولتی۔
مگر اس نے سوچا کہ اس پر وہ ارجمند سے بات کرے گی۔
سہ پہر کو وہ دونوں لان میں بڑے جھولے پر بیٹھی تھیں کہ نور بانو نے بات شروع کی۔
"ارجی! تم نظر اٹھا کر بات نہیں کرتی، کیوں؟"
"کرتی تو ہوں آپی!" ارجمند نے معصومیت سے کہا اور نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔
"پتا نہیں کیوں؟ میرا یہ خیال تھا۔" نور بانو بولی۔
"ہاں! عبدالق کے سامنے میں نے تمہیں کبھی نظر اٹھاتے نہیں دیکھا۔"
"وہ اور بات ہے آپی! اور صرف آغا جی سے ہی نہیں، میں تو غفور اور یعقوب سے بھی نظر نیچی کر کے ہی بات کرتی ہوں۔"
"اچھا! لیکن کیوں؟"
"اللہ کا حکم ہے نا آپی!"
نور بانو کو اس پر پیار آ گیا۔
"تم بہت اچھی ہو ارجی!"
"لیکن آپ سے اچھی نہیں ہوں آپی!" ارجمند نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
"اور شاید کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔"

نور بانو اس کے لہجے کو سمجھ نہیں سکی۔ لیکن وہ شرمندہ ہوگئی۔ وہ کتنی اچھی تھی، یہ وہ خوب جانتی تھی۔

❁ ❁ ❁

اب ارجمند ہر نماز کے بعد عبدالحق کے لئے اولاد کی دُعا کرتی تھی۔ اور وہ بھی بیٹے کی۔ اور ہر روز وہ تنہائی میں اللہ میاں سے پوچھتی کہ انہوں نے آغا جی کو اب تک اولاد کیوں نہیں دی؟ لیکن اسے جواب نہیں ملتا تھا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ اسے جواب نہیں مل رہا تھا۔ اللہ میاں جواب نہیں دے رہے تھے۔ پہلی بار اس نے سوچا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے۔ اسے اپنے اندر کسی کمی کا احساس ستانے لگا۔ اسے لگا، جیسے اس سے کوئی بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے، اور اس کے نتیجے میں اللہ میاں اس سے خفا ہو گئے ہیں۔

اسے بہت ڈر لگا۔ جب بھی وہ اس پر سوچتی، اندر باہر سے بری طرح کانپنے لگتی۔ اس نے اللہ میاں کو خفا کر دیا۔ اب وہ کیا کرے؟ انہیں کیسے منائے؟ اسے کسی کو منانا آتا ہی نہیں تھا۔ نہ کبھی کوئی اس سے روٹھا تھا، اور نہ ہی اسے کبھی کسی کو منانے کی ضرورت پڑی تھی۔

یہ اس کے لئے بہت بڑی خلش بن گئی۔ جب بھی اسے فرصت ہوتی، وہ بڑی اُمید سے اللہ سے وہی سوال کرتی کہ شاید اس بار اسے جواب مل جائے گا۔ اور جواب نہ ملتا تو وہ خوفزدہ اور اُداس ہو جاتی۔

وہ سوچتی، اللہ میاں تو ہر چیز کے مالک ہیں، سب کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ لیکن وہ ہر چیز سے خود بے نیاز ہیں۔ انہیں کسی سے کچھ نہیں چاہئے۔ تو پھر انہیں کیسے منایا جا سکتا ہے؟ کیسے خوش کیا جا سکتا ہے؟ یہ سوچتے سوچتے اس کی سمجھ میں یہ تو آ گیا کہ انسان روٹھ جائے تو اسے کیسے منایا جا سکتا ہے۔ انسانوں کی کچھ ضرورتیں ہوتی ہیں، کچھ طلب ہوتی ہے ان کو۔ پھر پسند ناپسند بھی ہوتی ہے ان کی۔ تو انہیں خوش کر کے منایا جا سکتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ پسند ناپسند تو اللہ کی بھی ہے۔ بندوں کا قرآن پڑھنا، نماز

پڑھنا، جھوٹ نہ بولنا، برے کام نہ کرنا، اللہ کی بات ماننا۔

اس نے سوچا، وہ اللہ کو خوش کرنے کے لئے نفل پڑھے گی۔

وہ ہر روز عشاء کے بعد دو زائد نفل پڑھنے لگی۔ اللہ کو خوش کرنے کے لئے۔ لیکن بات نہیں بنی۔ اس نے نفل چار کر دیئے۔ بات پھر بھی نہیں بنی۔ اب اسے تشویش ہونے لگی۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے یوں ہی اسے خیال آیا کہ ممکن ہے، وہ غلط سمجھ رہی ہو، اور اللہ میاں اس سے خفا ہی نہیں ہوں۔

''اللہ میاں! آپ اب بھی میرے دل میں رہتے ہیں نا؟'' اس نے پوچھا۔

جواب ہاں میں ملا تو وہ خوش ہوگئی۔

''تو پھر میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے آپ؟''

''کون سی بات کا؟''

''یہی کہ آپ آغا جی کو اولاد کیوں نہیں دیتے؟''

''اس کا تم سے کوئی تعلق جو نہیں ہے۔''

ارجمند اُداس ہوگئی۔ سچ تو ہے، اس بات کا اس سے کیا تعلق؟ اس نے سوچا۔ مگر پھر میں دعا کیوں کرتی ہوں ان کے لئے؟ یہ تو دادی اماں نے کہا ہے نا! اس لئے۔

اور دادی اماں منع کر دیں تو......؟

وہ دیر تک اس پر سوچتی رہی، خود کو ٹٹولتی رہی۔ اسے جواب ملا تو حیرانی بھی ہوئی۔ اسے معلوم ہوگیا کہ اب دادی اماں بھی اسے منع کر دیں، تب بھی وہ یہ دعا کرتی رہے گی۔ اس لئے کہ اس میں آغا جی کی خوشی ہے۔

پھر ایک دن حمیدہ نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''نکی! تو عبدالحق کے لئے بیٹے کی دعا کرتی ہے نا؟ بھول تو نہیں گئی؟''

''کیسے بھول سکتی ہوں دادی! ہر روز دعا کرتی ہوں۔''

''اور تو نے اللہ میاں سے پوچھا تھا......؟''

"جی دادی اماں! مگر انہوں نے جواب نہیں دیا۔"

"کیوں......؟"

"وہ کہتے ہیں، اس بات سے میرا تعلق نہیں ہے۔"

حمیدہ سوچ میں پڑ گئی۔

"یہ کہا انہوں نے؟"

"جی دادی اماں! لیکن میں دعا تو پھر بھی کرتی رہوں گی۔"

"تو بہت اچھی ہے نکی! پر ایک بات کہوں، تو ہر روز ان سے یہ بات پوچھا کر۔ کبھی نہ کبھی تو وہ جواب دیں گے ہی۔"

"لیکن دادی اماں! اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑتا ہے نکی! اگر کسی غلطی یا گناہ کی سزا ہے تو توبہ کرنے سے بات بن سکتی ہے۔"

ارجمند کو یہ نیا نکتہ معلوم ہوا۔

"سچ دادی اماں!"

"ہاں نکی! توبہ سچی ہو تو اللہ بڑے سے بڑا گناہ معاف کر دیتا ہے۔"

"توبہ کیسے کرتے ہیں دادی اماں!"

"گڑگڑا کر اللہ سے اپنے کئے پر معافی مانگتے ہیں، روتے ہیں، بخشش کی دُعا کرتے ہیں اور یہ اللہ کو بہت اچھا لگتا ہے۔"

"ٹھیک ہے دادی اماں! میں روز پوچھتی رہوں گی۔"

✿ ✿ ✿

ارجمند کے لئے زندگی معمولات میں ڈھل گئی تھی۔ کوٹھے پر تو وہ ایک ایک دن گنتی تھی، حالانکہ وہاں پر دن ایک سا ہوتا تھا۔ جبکہ یہاں تنوع تھا۔ سب سے بڑھ کر آزادی کا احساس۔ باغیچہ تو گھر میں ہی موجود تھا، جہاں جا کر آسمان کی بے کرانی کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن باہر بہت بڑی دنیا تھی۔ اور اب اسے احساس ہوتا تھا کہ اس میں اس کا بھی حصہ ہے۔ وہ اس کے لئے بھی ہے۔ کوٹھے پر تو اس کی پوری دنیا بس ایک کمرہ تھا۔

تو یہاں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ دن پھسلتے جاتے تھے اور پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ آغا جی کے امتحان بھی ہو گئے، نتیجہ بھی نکل آیا۔ بی۔ اے کی طرح انہوں نے اس امتحان میں بھی پہلی پوزیشن لی تھی۔

اس روز آغا جی بہت خوش تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ خبر دادی اماں کو سنائی۔ وہ بھی وہاں موجود تھی۔

"اب اماں! ہمیں مٹھائی لے کر چچا جان کے ہاں چلنا چاہئے۔" انہوں نے کہا۔

"ہاں! کیوں نہیں؟"

ارجمند کو مسعود صاحب اور ان کے گھر کے سب لوگ بہت اچھے لگتے تھے۔ دونوں گھروں کا ایک دوسرے کے ہاں جانا آنا لگا رہتا تھا۔ مسعود صاحب ارجمند سے بہت لاڈ کرتے تھے۔ وہ انہیں تایا کہا کرتی تھی۔ شاہانہ باجی سے تو اس کی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ حالانکہ عمر میں وہ اس سے چار پانچ سال بڑی تھیں۔

وہ لوگ جانے کے لئے تیار ہو ہی رہے تھے کہ مسعود صاحب خود ہی پوری فیملی کے ساتھ آ گئے۔ وہ مٹھائی بھی لائے تھے۔ مٹھائی حمیدہ کی گود میں رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"مبارک ہو آپ کو، آپ کا بیٹا اوّل آیا ہے۔"

"شکریہ پتر! اس کی کامیابی میں تمہارا بھی بڑا ہاتھ ہے۔" حمیدہ نے کہا۔

"ارے نہیں اماں! آپ کا بیٹا لائق بھی ہے اور محنتی بھی۔"

"مگر آپ ہمیشہ زیادتی کرتے ہیں ہمارے ساتھ۔" عبدالحق نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"ہمیں آپ کے گھر آنا تھا مٹھائی لے کر۔ اب ہم نکلنے ہی والے تھے کہ آپ خود آ گئے۔"

مسعود صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، جیسے ناراض ہو گئے ہوں۔

"تمہیں ہمارا آنا اچھا نہیں لگا تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔"

"ارے نہیں بیٹا! کیوں ناراض ہوتے ہو؟ جم جم آؤ! سر آنکھوں پر۔" حمیدہ جلدی سے بولی۔

"پر پتر! عبدالحق بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ چھوٹا ہے۔"

"تو میں بڑا ہوا نا! اور مٹھائی تو مٹھائی ہے، وہ بھی خوشی کی۔ میں لے آیا تو کیا حرج ہے؟" مسعود صاحب نے کہا۔

"بلکہ سچ پوچھیں تو یہ میرا فرض ہے۔ عبدالحق کو سرکاری نوکری کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے تو مجھ پر احسان کیا ہے، میری بات مان کر۔"

"اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" عبدالحق نے کہا۔

"سچی بات کہہ رہا ہوں۔"

"آپ پر احسان کیسا؟ میں اگر ملک و قوم کے کسی کام آسکوں تو انکار کروں گا کیا؟"

"اچھا! اب باتیں چھوڑو۔ پہلے منہ میٹھا کر لو۔" مسعود صاحب نے اپنے ہاتھ سے پہلے حمیدہ کو اور پھر عبدالحق کو مٹھائی کھلائی۔

"خوش رہو پتر!" حمیدہ نے انہیں دعا دی۔

"میں تو سچ مچ بہت خوش ہوں اماں!" مسعود صاحب بولے۔

"یہ بتاؤ! اب کیا ہوگا؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"اب کچھ دن بعد شہزادے کی پوسٹنگ ہو جائے گی۔" مسعود صاحب نے عبدالحق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جو مسکرا رہا تھا۔

"اور اس کے بعد میری طرح کام شروع۔"

"پھر یہ ہر روز کام پر جایا کرے گا؟" حمیدہ کے لہجے میں استعجاب تھا، جیسے یہ کوئی آن ہونی ہو۔

"ہاں اماں! پھر یہ آزاد نہیں رہے گا۔" مسعود صاحب نے کہا۔

"بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی تبادلہ ہو جائے تو کسی دوسرے شہر میں جا کر رہنا پڑے۔"

اس پر حمیدہ بری طرح چونکی، جبکہ نور بانو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"یہ...... یہ تو غلط ہوگا۔ کیا سامان سر پر اُٹھائے پھریں گے ہم؟" حمیدہ نے کہا۔

"اب یہ تو نوکری ہے اماں! چاہے نام افسری کا ہو۔" مسعود صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اور آپ کو فکر کی کیا ضرورت ہے؟"

"دیکھو! اب میری نکی کا اسکول میں داخلہ ہوگا۔" حمیدہ نے ارجمند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا اس کے ساتھ یہاں سے وہاں پھرتے رہیں گے۔ تعلیم کیسے مکمل ہوگی اس کی۔ ہر بار نیا سکول......"

"تو اماں! آپ کو کیا ضرورت ہے اس کے ساتھ مارے مارے پھرنے کی؟ آپ کا گھر تو موجود ہے نا! آپ شہزادی کے ساتھ یہیں رہیں، اور اسے پھرنے دیں۔ آپ کا خیال رکھنے کے لئے ہم سب ہیں نا!"

"اس کے بغیر کیا اچھا لگے گا۔ خیر......!" حمیدہ نے سرد آہ بھری۔

"کیوں اماں! تمہیں گاؤں چھوڑ کر دہلی بھی تو جاتا تھا۔ تب تو ایسا نہیں کہا کبھی تم نے؟" عبدالحق نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

"تب کی بات اور تھی۔"

"اور ابھی کچھ عرصہ پہلے جو میں لاہور آیا تھا تمہیں چھوڑ کر۔"

"کہا نا، تب کی بات اور تھی۔ پر اب میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔"

"ہم لوگ وقت سے پہلے ہنگامہ کر رہے ہیں۔" مسعود صاحب نے مداخلت کی۔

"فی الحال تو ایسا کچھ نہیں، میں تو اسے اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ بعد میں جو ہو سو ہو۔"

لیکن حمیدہ کا ملال کم ہونے والا نہیں تھا۔

"میں تو شروع ہی سے اس نوکری کے خلاف تھی۔"

مسعود صاحب منہ سے نکلنے والی بات پر پچھتانے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ انہوں نے مثبت پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی۔

''اب اماں، اسکول میں داخلہ آسانی سے نہیں ہوتا۔ اب یہ شہزادہ افسر بن جائے گا تو شہزادی کا داخلہ یہی کرائے گا نا! فائدے بھی تو ہیں نا نوکری کے اماں!''

ارجمند کو مسعود صاحب کی یہ بات بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ آغا جی کو شہزادہ اور اسے شہزادی کہتے تھے۔

''ارے! داخلہ تو تم بھی کرا دیتے نا!'' حمیدہ کے لہجے میں اب بھی ملال تھا۔

''اور بھی فائدے ہیں اماں! گاؤں کے دسیوں کام کرا دے گا آپ کا بیٹا!'' مسعود صاحب بھی ہار ماننے والے نہیں تھے۔

''اور گاؤں کیسا؟ اب تو حق نگر اچھا خاصا شہر بن گیا ہے۔''

''ہاں! میرے پتر کے خلوص کی برکت ہے۔'' حمیدہ سب کچھ بھول کر فخریہ لہجے میں بولی۔

''ریت میں سے نکالی ہے اس نے وہ بستی، سچا تھا، سو اللہ نے ہاتھ تھام لیا اس کا۔''

مسعود صاحب نے سکون کا سانس لیا کہ حمیدہ کا دھیان کچھ بٹا۔ انہوں نے حمیدہ کے پیچھے کھڑی ارجمند سے کہا۔

''ارے! وہاں کہاں چھپی ہوئی ہے شہزادی! ادھر آ، تجھے مٹھائی کھلاؤں۔''

ارجمند ان کے پاس چلی آئی۔ وہ مٹھائی اسے بہت اچھی لگی۔ آغا جی کی کامیابی کی جو تھی۔

✿ ✿ ✿

کسی بھی فرد کی زندگی میں آنے والی بڑی تبدیلی اس کے پورے گھر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گھر کے ہر فرد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور ابتداء میں وہ سبھی

کے لئے بہت بڑی تبدیلی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بہت بڑا، ناقابل تلافی کوئی فرق پڑ گیا ہے۔ مگر یہ زندگی کا نظام ہے اور آدمی کی فطرت کہ غیر محسوس طور پر وہ خود بخود اس سے ہم آہنگ ہونے لگتا ہے۔ زندگی اس تبدیلی کے ساتھ مطابقت پیدا کر لیتی ہے۔

عبدالحق نے ملازمت جوائن کر لی تھی۔ اس کی پوسٹنگ مسعود صاحب کے ساتھ ہی ہوگئی تھی۔

ابتداء میں وہ حیران تھا۔ وقت کی پابندی تو اس کے لئے مسئلہ نہیں تھی۔ بس ایسا لگتا تھا، جیسے کالج کا زمانہ، یونیورسٹی کا زمانہ لوٹ آیا ہے۔ لیکن اس سے آگے وہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ اس سے پہلے وہ آزاد تھا۔ لیکن اب اس پر ذمہ داریاں تھیں۔ کچھ لوگ اسے جواب دہ تھے، اور وہ بھی کچھ لوگوں کو جواب دہ تھا۔ اسے احساس تھا کہ اگر اسے مسعود صاحب کے ماتحتی کی نعمت حاصل نہ ہوتی تو یہ تبدیلی اس سے بھی بڑی لگتی۔ بلکہ اس صورت میں اس سے مطابقت آسان نہ ہوتی۔ جبکہ ان کے ہوتے ہوئے بھی مطابقت کا عمل آسان ثابت نہیں ہو رہا تھا۔

بہرحال اسے عارف کی بات یاد تھی کہ مسعود صاحب اس کے استاد ہیں۔ پہلے ہی دن اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کیسے استاد ہیں۔ بلکہ اس کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ عارف کس پائے کا افسر ہوگا۔ اب اس کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ عارف مسعود صاحب سے ملے بغیر کیوں چلا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگلی بار انشاء اللہ وہ اس کے ساتھ ہی مسعود صاحب سے ملے گا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ پرانا ہونہار شاگرد اپنے استاد اور محسن کا سامنا کرنے سے کیوں کترا رہا تھا۔

مسعود صاحب بہت اصول پرست افسر تھے، اور وہ بہت سخت استاد تھے۔ یہ بات پہلے دن ہی ثابت ہوگئی۔ اس نے جو اسٹلنگ رپورٹ دی، اس کے جواب میں مسعود صاحب نے اسے بلوا لیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے لہک کر کہا۔

''السلام علیکم چچا جان!''

جواب میں مسعود صاحب نے بے حد خشک لہجے میں کہا۔

"تو آپ ہیں مسٹر عبدالحق! تشریف رکھیئے پلیز!"

عبدالحق کے لئے تو وہ لمحہ شاک کا تھا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے مسعود صاحب کے چہرے کو دیکھا، مگر وہاں اجنبیت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"سول سروس میں خوش آمدید مسٹر عبدالحق!" مسعود صاحب نے کہا۔ "آپ یہاں سیکشن آفیسر کی حیثیت سے آئے ہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ پہلے میرے اسپیشل اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کریں۔ میں جس حد تک آپ کی راہنمائی کر سکا، ضرور کروں گا۔ تاکہ آپ اس ملک کے لئے ایک قیمتی اثاثہ بن سکیں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔"

"نو..... نو سر.....!" عبدالحق نے جلدی سے کہا۔ "یہ تو میرے لئے سعادت ہوگی سر!"

"گڈ! تو پہلی بات آپ نے سمجھ لی ہوگی۔ آفس میں ڈسپلن کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے افسر کا رشتہ اور تعلق صرف اپنے کام سے ہوتا ہے۔ قوم کا مفاد ذاتی تعلقات اور رشتوں سے بالاتر ہوتا ہے۔"

عبدالحق کے دل میں ایک موج سی اٹھی۔ وہ مسعود صاحب کو بہت اچھا انسان سمجھتا تھا۔ لیکن آج پہلی بار ان کی بلندی اس کی سمجھ میں آئی تھی۔

"جی سر! یہ بات تو میں بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔"

"گڈ! تو برابر والا کمرہ آپ کا ہے۔ آپ کو اپنی میز پر کچھ فائلیں رکھی ملیں گی۔ آپ جا کر ان کا جائزہ لیں۔ سرسری طور پر۔ میں آدھے گھنٹے کے بعد انٹرکام پر آپ سے رابطہ کروں گا۔"

"رائٹ سر! تھینک یو سر!" عبدالحق نے کہا، اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کا کمرہ نسبتاً چھوٹا تھا۔ بیرونی حصے میں ایک اسٹول پر باوردی چپڑاسی اور ایک میز پر ٹائپسٹ بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے سلام کیا۔ وہ جواب دیتا ہوا اندرونی کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں ایک خاصی بڑی میز تھی۔ ایک بڑی کرسی اور سامنے ملاقاتیوں کے لئے تین عام کرسیاں۔ اس کی کرسی کے عقب میں دیوار پر قائد اعظم محمد علی جناح کا ایک پورٹریٹ آویزاں تھا۔ پہلو کی ایک دیوار کے ساتھ دو فائلنگ کیبنٹ تھے۔

وہ گھوم کر کرسی کی طرف گیا اور کرسی پر بیٹھ کر میز کا جائزہ لیا۔ سامنے ہی چند فائلیں رکھی تھیں۔ ان کے آگے ایک قلم دان تھا۔ اس میں دو قلم رکھے تھے۔ قلم دان کے کناروں پر موجود دو چھوٹے پیالی نما گڑھوں میں روشنائی موجود تھی۔ میز پر داہنی جانب ایک گھنٹی رکھی تھی۔

عبدالحق نے محسوس کیا کہ وہ نروس ہو رہا ہے۔ کیا وہ اس مقام، اس منصب کا اہل ہے؟ اس کا سچا جواب ..... فی الحال نہیں ..... تھا۔ لیکن کیا وہ آگے اس کا اہل ثابت ہو سکے گا؟ اس کا جواب تو آنے والا وقت ہی دے سکتا ہے۔

اسے پہلے ان فائلوں کا سرسری جائزہ لینا تھا۔

اس نے فائلوں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا اور باہر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے دونوں افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"سر! میں آپ کا اسسٹنٹ ہوں، ایل ڈی سی ذوالفقار" ٹائپسٹ نے کہا۔

"تشریف رکھیئے۔" عبدالحق نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

ذوالفقار کے چہرے پر بے یقینی اور گھبراہٹ نظر آئی۔ چند لمحے وہ ہچکچاتا رہا۔ پھر بیٹھ گیا۔

عبدالحق نے باوردی چپڑاسی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں سر! آپ کا پٹے والا شمریز خان۔"

"آپ بھی بیٹھیے۔"

لیکن چپڑاسی میں اتنی جرأت نہیں تھی۔

"میں ٹھیک ہوں سر!" اس نے جسم کا بوجھ ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا! میں تو سمجھا تھا کہ آپ کا فرض میرا حکم ماننا ہے۔" عبدالحق کے لہجے میں مصنوعی حیرت تھی۔

شمریز خان کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا۔

"سوری سر!" اس نے گھبرا کر کہا اور جلدی سے بیٹھ گیا۔

عبدالحق خود بھی مخمصے میں تھا۔ اس کے استاد مسعود احمد صاحب نے اسے پہلا سبق ڈسپلن کا سکھایا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس نے پہلے ہی لمحے میں اپنے دفتر میں خراب ڈسپلن کی بنیاد ڈال دی ہے۔

لیکن وہ کیا کرتا؟ یہ خوش اخلاق اس کا مزاج تھا، اس کی فطرت تھی۔

اگلے ہی لمحے وہ مطمئن ہوگیا۔ اپنے مزاج کے خلاف جائے بغیر اسے ڈسپلن قائم رکھنا تھا۔ یہ توازن قائم کرنا مشکل سہی، ناممکن نہیں۔

"دیکھو بھئی! ہمارے عہدے الگ الگ ہیں، لیکن مقصد ایک ہی ہے۔ اپنی اپنی حیثیت میں ہم کو ملک وقوم کی، عوام کی خدمت کرنی ہے۔ لیکن عزت تو ہم تینوں کی ہی ہے نا! میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ ہمیں عزت کام سے ملے گی، عہدے یا خوشامد سے نہیں۔"

"جی سر! ہم سمجھ گئے۔" ذوالفقار نے کہا۔

"ہم عزت افزائی پر آپ کے شکرگزار ہیں۔"

"بس! اب آپ جائیں۔ مجھے کچھ کام دیکھنا ہے۔"

وہ دونوں اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ پھر شمریز خان جاتے جاتے پلٹا۔

"میں یہ پوچھنے آیا تھا سر! کہ آپ چائے پئیں گے؟"

"فی الحال تو ضرورت نہیں۔"

"کوئی بھی کام ہو سر! تو مجھے بلانے کے لئے گھنٹی بجا دیں۔" شمریز خان نے گھنٹی کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے شمریز خان!"

ان کے جانے کے بعد عبدالحق نے فائلیں اپنی طرف سرکائیں اور اُوپر والی فائل کا جائزہ لیا۔

چند ہی لمحوں میں اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے؟ کتنا اہم مقام ہے یہ، یہ اکنامک پلاننگ ڈویژن کا دفتر تھا۔ یہاں اس نوزائیدہ مسلم ملک کے مستقبل کی بہتری کے لئے منصوبے سوچے جاتے تھے اور پھر انہیں قابل عمل بنانے کے بارے میں غور کیا جاتا تھا۔ یہ ملک اور قوم کی ترقی کے لئے کام کرنے والا تھنک ٹینک تھا، اور مسعود صاحب اس کے سربراہ تھے ... ڈائریکٹر جنرل۔

مسعود صاحب کی عظمت اس پر اور عیاں ہوئی۔ وہ ملک اور قوم سے محبت کے معاملے میں کتنے سچے اور مخلص تھے، انہوں نے اسے قائل کیا، اس راستے پر لائے اور کہا کہ یہ اس کا ان پر احسان ہے۔ حالانکہ احسان تو ان کا تھا کہ انہوں نے اس بیکار کو کارآمد بنایا تھا۔

پانچوں فائلوں کا جائزہ لیتے لیتے وہ خواب دیکھنے لگا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ وہ اس مشین کا ایک پرزہ تھا، معمولی سا سہی، جو اس ملک کو ترقی اور خوش حالی کی طرف لے جانے کے لئے کام کر رہی تھی۔

انٹرکام کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"جی سر!"

"وہ فائلیں دیکھ لیں تم نے؟" دوسری طرف سے مسعود صاحب نے پوچھا۔

"جی سر!"

"تمہیں ان میں سے کسی ایک کو ترجیحی بنیاد پر کام کرنے کے لئے منتخب کرنا ہے۔"

"یہ تو سبھی اہم ہیں جناب!"

"مگر سب پر بیک وقت تو کام کیا جا سکتا۔ ارتکاز کی بہت اہمیت

ہے۔"

"تو ٹھیک ہے سر! میں ویج کمیشن ایوارڈ کو ترجیح دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب اس کی فائل کو بہت باریک بینی سے اسٹڈی کرو۔ پھر ہم اس پر ڈسکس کریں گے۔ اور ہاں! انٹرکام پر ون دبا کر تم مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔ کسی مدد یا مشورے کی ضرورت ہو تو ہچکچانا نہیں۔"

"تھینک یو سر!"

اس نے ریسیور رکھا اور فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دو تین گھنٹے میں فائل کا سسٹم اس کی سمجھ میں آ گیا۔ دائیں جانب مجوزہ دستاویزات تھیں اور بائیں جانب ان کے متعلق ہونے والی نوٹنگ اور ڈرامنٹنگ۔ اس میں خوب صورتی یہ تھی کہ ہر بات تحریری طور پر سامنے آ جاتی تھی۔ زبانی کچھ بھی نہیں تھا۔

ایک بجے انٹرکام کا بزر پھر چیخا۔ اس نے ریسیور اُٹھایا۔

"لیس سر!"

"ایک بجے سے دو بجے تک یہاں لنچ ہوتا ہے۔" دوسری طرف سے مسعود صاحب نے اسے مطلع کیا۔

اس نے حیرت سے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیا۔ ایک بج چکا تھا۔ وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا اور اس نے تو چائے بھی نہیں پی۔

"ہیلو!" مسعود صاحب نے اسے پکارا۔

"لیس سر!"

"میرے کمرے میں آ جاؤ!" یہ کہہ کر مسعود صاحب نے رابطہ منقطع کر دیا۔

❁ ❁ ❁

بیرونی کمرے میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ عبدالحق چند لمحے ہچکچایا، پھر اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

"آ جاؤ بھئی! اب تکلف کیسا؟" اندر سے مسعود صاحب نے بے

تکلفانہ لہجے میں پکارا۔

وہ حیرت زدہ سا، دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ مسعود صاحب ٹفن کھول رہے تھے۔ میز پر پانی کی ایک بڑی بوتل اور دو خالی گلاس رکھے تھے۔

وہ ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"لیس سر!"

"پاگل ہو گئے میاں! بیٹھ جاؤ سکون سے۔" مسعود صاحب نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"اور تم نے مجھے چچا جان کیوں نہیں کہا؟"

وہ ایک ہی دن میں، ایک ہی مقام پر عبدالحق کے لئے دوسرا شاک تھا۔

"وہ سر ....! آفس ڈسپلن.....؟"

"ارے میاں! یہ لنچ بریک ہے۔ یہ ہمارا اپنا وقت ہے۔ اس وقت نہ میں افسر ہوں اور نہ تم میرے ماتحت۔ اس وقت تو میں اپنے چپڑاسی کے ساتھ بھی ہنسی مذاق کر لیتا ہوں۔"

"جی سر! میرا مطلب ہے، چچا جان!" عبدالحق بری طرح گڑبڑا گیا۔

مسعود صاحب نے ٹفن کھول کر سامنے رکھے۔ ایک میں سالن تھا، دوسرے میں کباب اور تیسرے اور چوتھے میں پراٹھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر عبدالحق کو دیکھا، جو اب بھی کھڑا تھا۔

"ارے میاں! تم تو ابھی تک کھڑے ہو، بیٹھو نا!"

عبدالحق بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک سنبھلا نہیں تھا۔

"کنفیوز ہو؟ چند روز میں عادی ہو جاؤ گے۔ ایک اچھے افسر کے لئے وقت اور مقام کا شعور بہت ضروری ہے۔ جو وقت اپنا ہے، اس میں میں مسعود احمد ہوں۔ جو وقت سرکار کا ہے، اس میں میں ڈائریکٹر جنرل ہوں۔ اس میں مجھے یہ خیال رکھنا ہے کہ کس ماتحت سے کیا کام لینا ہے، اور کس طرح لینا ہے، اور جنہیں میں جواب دہ ہوں، ان کا سامنا کس انداز میں کرنا ہے۔ یہی ایک

اچھے افسر کی خوبی ہے۔"

عبدالحق کا ذہن جیسے روشن ہوگیا۔

"آپ نے مجھے بہت اچھی طرح سمجھا دیا چچا جان! لیکن یہ سب کچھ اختیار کرنے میں مجھے چند روز لگیں گے۔ پہلی بار تو میں نے یہ بات سمجھی ہے کہ آدمی کو ایک ہی دن میں کئی کردار ادا کرنے ہوتے ہیں۔"

"حالانکہ یہ بات تم پہلے سے جانتے ہو، ہر شخص جانتا ہے۔"

"نہیں چچا جان! مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔"

"معلوم تھا بیٹے! اور تم اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ لیکن پابند نہیں تھے۔ اس لئے پتا نہیں چلتا تھا۔" مسعود صاحب نے کہا۔

"دیکھو نا! تم اماں سے جس طرح بات کرتے ہو، نور بانو سے ویسے نہیں کرتے اور جیسے نور بانو سے کرتے ہو، ویسے شہزادی سے نہیں کرتے۔"

ارجمند کے حوالے پر عبدالحق کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وجہ البتہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس وقت غور کرنے کا موقع بھی نہیں تھا۔

اس کی کیفیت سے بے خبر مسعود صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اور جیسے تم شہزادی سے بات کرتے ہو، ویسے اپنی ملازمہ نسیمہ سے نہیں کرتے۔"

"نہیں چچا جان! میں تو نسیمہ سے بھی بڑی شفقت اور عزت سے بات کرتا ہوں۔"

"تو تم نے مان لیا نا کہ اپنے کئی رول سے تم آگاہ تھے۔" مسعود صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا! اب کھانا شروع کرو۔ وقت تیزی سے گزر جاتا ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا۔ سرکاری وقت شروع ہوگا تو میں تم سے ہاتھ کا لقمہ بھی رکھوا لوں گا۔"

عبدالحق کو بھی ہنسی آ گئی۔ دونوں کھانا کھانے لگے۔

"تم نے کہا کہ تم نسیمہ سے بھی بہت اچھی طرح بات کرتے ہو۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔ البتہ توازن اور اعتدال ضروری ہے۔ وہ قائم نہیں رکھو گے تو

خود بھی نقصان میں رہو گے اور دوسرے بھی۔"

"لیکن چچا جان! ملازم بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔"

"میں نے کب کہا کہ نہیں ہوتے؟ لیکن بیٹے! یہ مناسب اور درجات اللہ کی طرف سے ہیں۔ ان کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ میں ڈی جی اس لئے ہوں کہ یہ اللہ کی مرضی تھی۔ تمہیں اللہ نے مجھ سے زیادہ دولت عطا فرمائی، لیکن تم میرے ماتحت ہو، اس لئے کہ اللہ کی یہی مرضی ہے۔ جو کچھ ہم زندگی میں بغیر سوچے سمجھے کرتے ہیں، اس لئے ہم سے کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں۔ سول سروس ہمیں وہی سب کچھ ڈسپلن کے ساتھ کرنا سکھاتی ہے۔ میں اپنے چپڑاسی سے نرمی اور شفقت سے پیش آتا ہوں۔ لیکن اسے بے تکلف نہیں کرتا۔ کروں گا تو کسی دن وہ کہہ دے گا کہ سر اس وقت تو میرا کام کا موڈ نہیں ہے۔ اس میں اس کا بھی نقصان ہوگا، میرا بھی اور سرکار کا بھی۔"

"آپ نے تو ایک ہی دن میں مجھے بہت کچھ سکھا دیا۔"

"نہیں! میں نے تو تمہیں بس بنیادی باتوں سے متعارف کرایا ہے۔ باقی تو وقت خود ہی تمہیں سکھا دے گا۔ ہاں! یہ جو تعارف میں کرا رہا ہوں، اس کی وجہ سے تمہیں سیکھنے میں نسبتاً آسانی ہوگی۔"

"جی! میں سمجھ رہا ہوں۔"

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود صاحب نے ٹفن باکس کو بند کیا اور اُٹھے۔

"اب وضو کرلیں نماز کے لئے۔"

"نماز کہاں پڑھیں گے؟"

"یہیں دفتر میں۔ وہ رکھی ہے میری جاء نماز۔" مسعود صاحب نے فائلنگ کیبنٹ کے ٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔

عبدالحق کو افسوس ہونے لگا کہ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟

"تمہارے لئے میں آج ہی نئی جاء نماز لایا ہوں۔ وہیں رکھی ہے، لے لو! اپنے دفتر میں نماز پڑھو گے تو تمہارے اسٹاف کے لئے تبلیغ بھی ہوگی۔ آفس

میں بھی خیر و برکت ہوگی۔"

عبدالحق اُٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے عرصے میں اسے کبھی یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ مسعود صاحب نمازی ہیں۔

"یہاں چھٹی پانچ بجے ہوتی ہے۔ موسم گرما میں میں عصر پڑھ کر گھر جاتا ہوں۔ سردیوں میں گھر جا کر پڑھ لیتا ہوں۔"

"لیکن چچا جان! جماعت......"

"مسجد یہاں سے خاصی دور ہے۔ آنے جانے میں ہی ایک گھنٹہ لگ جائے اور سرکاری وقت میں مستعار لینا نہیں چاہتا۔"

عبدالحق نے اپنی جاءنماز اُٹھائی اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

وہ دن ہی شاید ایسا تھا۔ اس سے پہلے اس نے ایک ایسا دن گزارا تھا..... دہلی میں، جب مجذوب نے قبولِ اسلام کے بعد اسے ایک دن میں بہت کچھ سکھایا تھا۔ اس کے بعد یہ دن تھا کہ جس میں اس نے اتنا کچھ سیکھ لیا تھا۔

اور دن ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

شام کو یعقوب حسب ہدایت اسے لینے کے لئے آیا۔ لیکن مسعود صاحب کے کہنے پر عبدالحق نے اسے واپس بھیج دیا۔

"تم میرے ساتھ چلنا، میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔" انہوں نے کہا تھا۔

جب وہ نکلے تو ان کا رخ گھر کی طرف نہیں تھا۔

"کہاں کا ارادہ ہے چچا جان!" عبدالحق نے پوچھا۔

"کچھ دیر لارنس گارڈن میں گزاریں گے۔"

عبدالحق سمجھ گیا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

ڈرائیور گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ وہ دونوں باغ میں چلے گئے۔ بیٹھنے کے لئے مسعود صاحب نے قریب ترین بینچ کا انتخاب کیا۔ اس سے عبدالحق کے اندازے کی تائید ہوتی تھی۔ مقصد چہل قدمی نہیں، اسے کچھ سمجھانا تھا۔

اور مسعود صاحب نے بغیر کسی تمہید کے بات شروع کر دی۔

"دیکھو بیٹے! یہ سول سروس ایماندار اور مخلص لوگوں کے لئے کانٹوں کا بستر ہے اور بدعنوان لوگوں کے لئے پھولوں کی سیج۔ میں تمہیں یہاں لایا ہوں، اس لئے تمہیں سمجھانا بھی میری ذمہ داری ہے۔"

"جی چچا جان!"

"جو کچھ میں نے سیکھا اور سمجھا، وہ تمہیں منتقل کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی.....!"

"میرے پاس تمہارے جتنی دولت تو نہیں، لیکن الحمدللہ! مجھے بھی اس ملازمت کی ضرورت نہیں تھی۔" مسعود صاحب نے کہا۔

"ابا جان اس پر مجھ سے بہت خفا ہوئے تھے۔ اس وقت یہ ہندوستان تھا۔ پاکستان بننے کے آثار کم از کم واضح ہرگز نہیں تھے۔ لیکن اللہ میری راہنمائی کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پاکستان بنے گا۔ اور میاں جانتا تھا کہ اس نئے ملک کو، جس میں افراتفری اور بدنظمی ہوگی، ایک منظم انتظامیہ کی اشد ضرورت ہوگی، جو تجربہ کار، ایماندار، مخلص افسروں پر مشتمل ہو۔ یہ سوچ کر ہم چند دوست اس طرف آئے۔ حالانکہ مسلمان ملازمت کو برا سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ تو انگریزی تعلیم کے بھی خلاف تھے۔ آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ قدرت کی راہنمائی کبھی غلط نہیں ہوتی۔

"میں نے انگریزوں کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ وہ اپنے ملک کو اور طرح سے چلاتے ہیں اور اپنی نوآبادی کو اور طرح۔ ہمارے ہاں انہوں نے دانستہ کرپشن کو فروغ دیا۔ یہاں انہوں نے بیوروکریسی کو افسر شاہی بنا ڈالا۔ کچھ تو ان کی ضرورت تھی کہ وہ ہزاروں افسروں کے ذریعے کروڑوں کی آبادی پر حکومت کرنا چاہتے تھے۔ یہ شارٹ کٹ تھا ان کے لئے۔ مگر مجھے شک ہے کہ ان کا دوسرا مقصد بھی تھا۔ انہیں یقین تھا کہ جلد یا بہ دیر دیگر نوآبادیوں کی طرح انہیں یہ ملک بھی چھوڑنا ہوگا۔ وہ یہاں فساد چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہاں ایک بنائے فساد تو پہلے سے تھی، وہ یہ کہ یہاں ہندو بھی تھے، مسلمان اور سکھ بھی۔ نفاق کی صورت پہلے ہی سے موجود تھی۔ دوسرا فساد انہوں نے اس کمزور اور کرپٹ بیورو

کریسی کی شکل میں چھوڑا، جس کے نزدیک اس سرزمین پر دو قانون مروّج تھے۔ ایک آقاؤں کے لئے اور دوسرا غلاموں کے لئے۔ اور انہیں انگریزوں نے عہدوں کی طاقت سے فائدہ اٹھانا بھی سکھا دیا۔ نذرانوں کی رشوت، خوشامد موقع پرستی، مکاری اور سیاسی جوڑ توڑ۔ میں انگلستان میں رہ کر دیکھ چکا ہوں۔ وہاں یہ سب نہیں تھا، جو یہاں ہے۔ اور یہ انہوں نے دانستہ کیا۔

''خیر یہ تو بڑی لمبی کہانی ہے۔ مجھے تم کو کچھ سمجھانا تھا۔ تم صاحب ثروت آدمی ہو۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے تمہارے پاس۔ تمہارے لئے ابتداء ہی سے اس کا اظہار مزدوری ہے۔''

''میں سمجھا نہیں چچا جان!''

''دیکھو، میں اور الحمدللہ میرے اہل خانہ بھی سادگی پسند ہیں۔ گاڑی رکھنا ہماری ضرورت نہیں۔ لیکن پھر بھی میں نے خریدی اور ڈرائیور بھی رکھا۔ صرف اس لئے کہ کبھی خاندانی عزت پر حرف نہ آئے۔ جواز کے ساتھ کرپشن کا الزام نہ لگے مجھ پر۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا۔''

مسعود صاحب نے گہری سانس لی۔

''یہاں جو لوگ معاشی طور پر کمزور ہوتے ہیں، وہ اپنے اور اپنی نسلوں کے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے سول سروس کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں عہدہ اور اختیارات ملتے ہیں۔ پھر انہیں کیش کرایا جاتا ہے۔ غلط اور ناجائز کام کئے جاتے ہیں۔ درست اور جائز کاموں میں رکاوٹ ڈالی جاتی ہے۔ دو وجوہات کے تحت۔ ایک اپنے سے بڑے افسروں کو خوش کرنے اور ان کی خوشامد کے لئے۔ دوسرے عام لوگوں سے مالی منفعت حاصل کرنے کے لئے۔ انہیں ملک و قوم کی بہتری سے کوئی غرض نہیں۔ صرف چند برس کی ملازمت میں وہ معاشی طور پر مجھ جیسے لوگوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ گاڑیاں، بنگلے، دولت کی ریل پیل۔

''تو یہ بہتی گنگا ہے، جس میں جسے موقع ملتا ہے، ہاتھ دھونے کے لئے ہی نہیں، نہانے کے لئے چلا آتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں بدنامی بڑھتی جا

رہی ہے۔ میں تمہیں یہاں لایا ہوں .... خلوص اور دردمندی کے ساتھ۔ تم میری ذمہ داری میں نہیں چاہتا کہ دس سال بعد کوئی منہ کھول کر کہے کہ عبدالحق صاحب نے سول سروس میں جتنا مال بنایا ہے، کسی نے نہیں بنایا۔ اس لئے کہ پوری دُنیا اس پر یقین کر لے گی۔''

''اس سے کوئی فرق پڑتا ہے۔'' عبدالحق نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں پڑتا ہے۔ آدمی اپنے خلوص، اپنی سچائی اور خدمت کرنے کے جذبے سے بے زار ہو جاتا ہے۔''

''تو پھر....؟''

''ابتدا ہی سے اپنی ثروت کا اظہار کرو۔ یہ تاثر اچھی طرح لوگوں پر قائم کر دو کہ تم کو اللہ نے سب کچھ دیا ہے۔ تم یہاں سے کچھ لینے کے لئے نہیں، بلکہ بہت کچھ دینے کے لئے آئے ہو۔''

''بات تو معقول ہے، لیکن یہ میں کیسے کروں؟''

''وہی بتانے کے لئے تو یہاں لایا ہوں۔'' مسعود صاحب مسکرائے۔

''ایک اور کار خریدو۔ اس میں دفتر آیا کرو۔ وہ یہاں کھڑی رہے دن بھر۔ اور وہ شاندار اور مہنگی کار ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ جہاں موقع ملے، زمین جائیداد خریدو۔ سال میں ایک بار یہاں اثاثوں کا فارم بھرا جاتا ہے۔ تمہارا نام بھرا جائے تو ایسا ہو کہ اس کے ساتھ جائیداد اور بینک اکاؤنٹس کی تفصیل کئی صفحات پر مشتمل ہو۔ تاکہ سرکاری ریکارڈ پر تمہاری اصل حیثیت آجائے۔ کوئی تمہاری کسی چیز کو دیکھ کر یہ نہ کہے کہ یہ حرام کی کمائی ہے۔ میں یہ سننا پسند نہیں کروں گا۔ خدانخواستہ ایسا ہوا تو میں خود سے بھی شرمسار رہوں گا۔''

عبدالحق کو ان پر بہت پیار آیا۔ اس نے بڑی محبت سے ان کا ہاتھ تھاما۔

''آپ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تو اللہ کا ہے۔ میں تو اسے اپنا سمجھتا بھی نہیں۔''

"نہ سمجھو، پوری دنیا کو بانٹتے رہو۔ کہلائے گا تو تمہارا ہی۔" مسعود صاحب نے خفگی سے کہا۔

"اگر تمہاری بے پرواہی کی وجہ سے لوگوں نے اللہ کے فضل کو حرام کا مال کہا تو اللہ تم سے خوش ہوگا؟"

بات ایسی تھی کہ عبدالحق اندر سے لرز کر رہ گیا۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"جی! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ویسے بھی آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے حکم سے انحراف نہیں کر سکتا۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔" مسعود صاحب نے اطمینان کی سانس لی۔

"اور ہاں! میری بات یاد رکھنا۔ زمین ایسی چیز ہے، جس کی قیمت ہمیشہ بڑھتی ہے۔ باقی ہر چیز کی قیمت وقت کے ساتھ کم ہوتی جاتی ہے۔ سو جہاں موقع ملے، زمین ہو، دکان ہو یا مکان، خرید لیا کرو۔"

"لیکن آپ نے تو وہ بنگلہ مجھے دلوا دیا، جو آپ خود لے سکتے تھے۔ بلکہ اس کی قیمت تو آپ نے ہی ادا کی تھی۔"

"وہ اور بات تھی بیٹے! لیکن تمہیں بتا دوں کہ زرعی زمین کافی ہے میرے پاس۔ کچھ آبائی ہے اور کچھ میری خریدی ہوئی۔"

"اب میں بھی آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور پوچھو!"

"جب میں پہلی بار کیمپ میں آپ سے ملا تو آپ تین پیروں والی کرسی پر بیٹھے تھے اور وزٹرز چیئرز کی جگہ خالی کھوکھے تھے۔ اور آپ کے دفتر کا دروازہ سب کے لئے کھلا تھا۔ آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی تھی اور لہجے میں تپاک......"

"مسکراہٹ تو اب بھی ہے میرے ہونٹوں پر۔ دیکھو لو!" مسعود صاحب مسکرائے۔

"آج وہی تاثر لئے میں آپ کے کمرے میں داخل ہوا تو صورتِ حال مختلف تھی۔"

"جیسا دیس ویسا بھیس!" وہ پھر مسکرائے۔

"وہاں کیمپ میں میں خود اصرار کر کے گیا تھا۔ وہاں میں ڈی جی نہیں تھا، لٹ پٹ کر، زخم کھا کر آنے والوں کا میزبان تھا۔ ان کی خدمت، ان کے مسائل کے حل کے لئے وہاں بیٹھا تھا، افسر نہیں، خدمت گار۔ کیمپ کا ڈسپلن اور تھا، دفتر کا اور ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کہاں مجھے کیسا ہونا چاہئے۔ دوسرے میں آج صرف اپنے ڈیپارٹمنٹ کا ڈی جی ہی نہیں، تمہارا اُستاد بھی تھا۔ سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا سر! اور سیکھنے کی کوشش بھی کروں گا۔" عبدالحق نے انہیں سلیوٹ کیا۔

"تو اب چلیں!"

"جی سر!"

اور وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

✿ ✿ ✿

گھر میں اس بہت بڑی تبدیلی کا سب سے کم اثر حمیدہ پر ہوا تھا۔ شاید اس لئے کہ گھر میں وہی سب سے زیادہ جہاں دیدہ تھی۔ اور اس لئے بھی کہ قابض ہو جانا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ برسوں پہلے ..... بہت پہلے اس نے جان لیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ شوہر ہوں یا بیٹے، مردوں کا تعلق باہر کی دنیا سے بھی ہوتا ہے۔ وہ پھیلنے والے ہوتے ہیں۔ بلکہ انہیں تو چھا جانے والا ہونا چاہئے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ عورت کا کام مرد کو بنانا اور سنوارنا ہے، قابض ہونا نہیں۔ انہیں مردوں کو خود اعتمادی اور مضبوطی فراہم کرنی ہوتی ہے۔ تا کہ وہ باہر نکلیں، اپنے فرائض انجام دیں اور اللہ کے حکم کے مطابق باہر پھیلیں، دوسروں کو متاثر کریں اور چھا جائیں۔ وہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ لیکن جانتی تھی کہ عورت کا کام شوہر کو اپنی زُلفوں کا اسیر کر کے ان کے سائے میں سلا کر ان پر قابض ہو جانا نہیں ہے۔ اور بیٹے کو پلّو سے باندھ کر رکھنا نہیں ہے۔ عورت کو تو اپنے مردوں کو ہر

طرح کا سکون فراہم کرنا، ان کی دل بستگی کرنا ہے، ان سے تقاضے اور مطالبے کر کے بے سکون کرنا نہیں ہے۔

یہ بات نہ ہوتی تو گاؤں پر حملے والے دن وہ جمال دین اور وصال دین کو گھر سے نہ نکلنے دیتی۔ کم از کم وصال دین کو تو روک ہی لیتی۔ لیکن جیسے وہ یہ جانتی تھی کہ ان کے واپس آنے کا امکان بہت کم ہے، ویسے ہی وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اپنا فرض نبھانے جا رہے ہیں۔ وہ مردوں کا کام تھا، ان کی ذمہ داری تھی۔ اسے گھر میں رہ کر اپنی ذمہ داری نبھانی تھی، اور وہ اس نے نبھائی۔ نہ تو اسے شوہر اور بیٹے کو ان کا فرض یاد دلانے کی ضرورت تھی، اور نہ یہ ان دونوں کو اسے اس کا فرض یاد دلانے کی۔ لوگ اپنے اپنے فرض کا خیال رکھنے لگیں تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں رہتا۔ جانے والے اور رخصت کرنے والے، دونوں ایک دوسرے کو رب راکھا کہتے ہیں اور بس، آگے جو رب کی مرضی۔

اس نے نماز کے بعد عبدالحق کے لئے خاص طور پر کامیابیوں اور آسانیوں کے لئے دعا کی۔ اور جب ناشتے کے بعد وہ رخصت ہونے لگا تو اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

''اللہ تجھے ہمیشہ کی طرح وہاں بھی عزت دے پتر! اللہ تجھے تیرے مقصد میں کامیاب کرے۔''

پھر ارجمند تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پھپھا جی بڑے افسر ہیں۔ اور تایا جان تو ان سے بھی بڑے افسر ہیں۔ اور اب اس کے آغا جی بھی اس راستے پر قدم رکھ رہے ہیں، اور انشاء اللہ سب سے بڑے افسر بنیں گے۔ اس کے لئے اس نے دعا بھی کی تھی۔

لیکن تھوڑی دیر بعد اسے ان کی کمی محسوس ہونے لگی۔ یہ وہ وقت تھا، جس میں وہ ان سے پڑھتی تھی۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ وہ وقت اسے کتنی خوشی دیتا تھا اور یہ کہ اب وہ وقت اسے کبھی نہیں ملے گا۔ اب اس وقت میں وہ کبھی ان کے سامنے نہیں بیٹھے گی۔

اسے یاد تھا، گزشتہ روز آغا جی نے اس سے کہا تھا۔

''کل سے میں دفتر جایا کروں گا۔ اور تمہیں پڑھا نہیں سکوں گا۔''

کس شدت سے اس کا جی چاہا تھا کہ وہ نظریں اٹھا کر انہیں دیکھے۔ لیکن وہ اللہ میاں کی نافرمانی کر کے انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

آغا جی کو شاید اس کی خاموشی میں شکایت یا دل گرفتگی محسوس ہوئی ہوگی۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

''لیکن تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں آغا جی!'' اس نے احتجاج کیا تھا۔

''فرق تو بہت پڑے گا۔'' اسی وقت اس کے اندر سے آواز آئی۔ زیادہ باتیں کرنے میں یہی تو نقصان ہوتا ہے۔ آدمی اللہ کو بھول جاتا ہے۔ اور وہ سہم گئی۔

''مجھے معلوم ہے نا! تم نے ماشاء اللہ ثابت کر دیا ہے کہ اب تمہیں میری مدد کی ضرورت نہیں۔ اب تمہیں ویسے بھی داخلہ مل جائے گا۔''

اس بار وہ اندر کی ڈانٹ کی وجہ سے خاموش رہی۔

''فرق نہیں پڑے گا، کا ایک مطلب تو یہ تھا۔'' اسے خاموش دیکھ کر آغا جی نے جلدی سے وضاحت کی۔

''اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں عشاء کے بعد ایک گھنٹہ تمہیں پڑھا دیا کروں گا۔''

اور وہ خوش ہوگئی۔

''شکریہ آغا جی!''

تو یہ وقت نہ سہی، دوسرا وقت سہی۔ وہ محروم تو نہیں ہوئی ہے۔ اس نے سوچا۔ اور اس وقت کے لئے بھی ترکیب تھی اس کے پاس۔ اس نے کتابیں اُٹھائیں اور حمیدہ سے کہا۔

''میں پڑھنے کے لئے جا رہی ہوں دادی جان!''

''ٹھیک ہے بچی! خوب دل لگا کر پڑھو۔''

وہ کمرے میں چلی گئی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ فرض صرف اتنا تھا کہ

سامنے آغا جی نہیں تھے۔ اس نے کاپی کھولی اور آغا جی کے دیئے ہوئے سوال حل کرنے میں مصروف ہوگئی۔ انہماک ایسا تھا کہ تمام سوال حل کرنے کے بعد اس نے نگاہیں نیچی کئے کئے کاپی سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لیجئے آغا جی! میں نے سارے سوال حل کر لئے۔''

چند لمحے ایسے ہی گزر گئے۔ نہ آغا جی نے ویل ڈن کہا اور نہ ہی اس کے ہاتھ سے کاپی لی۔ تب اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا، اور خالی کرسی کو دیکھ کر اسے یاد آیا کہ آغا جی تو دفتر گئے ہیں۔

اس کا دل اداس ہوگیا۔

پڑھنا بھول کر وہ آغا جی کے بارے میں سوچتی رہی۔ چند گھنٹوں ہی کی تو بات ہے۔ شام کو آغا جی واپس آ جائیں گے۔ پھر یہ کمرہ اتنا بدلا بدلا، اتنا سونا سونا کیوں لگ رہا ہے۔ اور میں اداس کیوں ہوں؟

لیکن سچی بات یہ ہے کہ اداسی کی کیفیت اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

پھر اسے خیال آیا، تایا نے کہا تھا کہ آغا جی کا کسی دوسرے شہر تبادلہ بھی ہو سکتا ہے۔ تو ایسا ہوا تو کیا ہوگا؟ دادی اماں تو تڑپ گئی تھیں۔ انہیں اس کی تعلیم کی کتنی فکر تھی۔ اور تایا نے کہا تھا، آپ اطمینان سے شہزادی کے ساتھ یہاں رہئے گا۔ اپنے گھر میں، آپ کا خیال رکھنے کے لئے ہم سب ہیں نا!

اس خیال سے تو اسے ایسا لگا کہ اس کی جان نکل گئی ہے۔ ارے! تو آغا جی دور چلے جائیں گے...... کسی اور شہر...... اور جانے کب تک وہاں رہیں...... ہو سکتا ہے، کئی سال! اس کا دم گھٹنے لگا، سانس رکنے لگی۔ نہیں بھئی نہیں! میں تو مر ہی جاؤں گی۔ وہ بڑبڑائی۔

''کوئی نہیں مرتا کسی کے بغیر۔ موت تو اللہ کے حکم سے آتی ہے۔'' اندر سے تبصرہ آیا۔

''لیکن میں خوش تو نہیں رہوں گی۔''

''یہ تو اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تجھے یہاں پہنچا دیا، اس سے ملوا دیا۔ ایسا نہ ہوتا تو تو کہاں ہوتی، ذرا سوچ تو سہی!''

اور ارجمند کو تھرتھری چڑھ گئی۔ واقعی! وہ کہاں جاتی پھپھو کے بعد؟

''تو سمجھ لے کہ یہ ملنا تو بس تیری بہتری تھا، تیری ضرورت تھی۔ ابھی وہ تجھے ملا کہاں ہے؟ اور ملا نہیں تو حق بھی تیرا کوئی نہیں۔ نہ دیکھنے کا، نہ کوئی آس لگانے کا۔ تو پھر قربت میں خوشی کیسی اور جدائی کیسی، دکھ کیسا؟''

''لیکن آپ نے تو وعدہ کیا ہے مجھ سے؟'' اس نے تڑپ کر شکایت کی۔

''بچی ہے نا ابھی! شکایت بھی کرنے لگی۔ در در بھٹکنے سے بچایا تو اس پر شکر نہیں، الٹی شکایت؟ وعدہ یاد دلاتی ہے۔ وہ تو وعدہ ہی پورا کرنے کے لئے کرتا ہے۔ پر تجھے تو شکر کرنا بھی سیکھنا ہے اور صبر کرنا بھی۔ اس سے راستے آسان اور منزل قریب ہوتی ہے اور شکایت تو راستے کو لمبا بھی کر دیتی ہے اور کٹھن بھی، اور منزل بھی دور ہو جاتی ہے۔

اس بار تو ارجمند پوری جان سے لرز کر رہ گئی۔ ہر بات جیسے اس کے دل و دماغ میں اتر گئی تھی۔ کیسے اسے سمجھایا جا رہا تھا۔ سچ ہے، وہ یہاں نہ پہنچی ہوتی تو در در بھٹکتی۔ اور اسے تو کچھ بھی نہیں پتا، نہ دنیا کا اور نہ لوگوں کا۔ اللہ نے اس پر احسان کیا، اور وہ شکایت کر رہی ہے۔

اس نے معصومیت سے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑے، پھر رخساروں پر طمانچے لگائے۔

''اللہ میاں! آپ کا شکر ہے۔ میں توبہ کرتی ہوں اللہ میاں! اب کبھی شکایت نہیں کروں گی۔ اب میں صبر بھی کروں گی، اور آپ کا شکر بھی ادا کروں گی۔ مجھے معاف کر دیں۔ اللہ میاں! آپ ہی راستہ دکھانے والے ہیں، آپ ہی راستہ دکھاتے ہیں۔ غلطیوں پر ٹوکتے رہئے، لیکن اللہ میاں! نرمی سے، دیکھیں نا! آپ کے سوا میرا کون ہے۔ کوئی بھی تو نہیں۔ سب کو آپ نے بلا لیا...... بابا کو، امی کو، دادی کو...... سب کو۔ اور اب پھپھو کو بھی۔'' یہ کہتے کہتے اسے احساس ہوا کہ وہ پھر شکایت کر رہی ہے۔ اس نے پھر کان پکڑ لئے۔

''نہیں! میں شکایت نہیں کر رہی ہوں اللہ میاں! آپ کا شکر ہے۔ مجھے

یاد ہے پھپھو کہتی تھیں، ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اللہ کی طرف سے صرف بہتری ہوتی ہے، چاہے ہماری سمجھ میں نہ آئے، آپ کا شکر ہے اللہ میاں! میں بھول جاؤں، غلطی کروں تو مجھے معاف کر دیا کریں، سمجھا دیا کریں۔ دیکھیں نا! میں تو چھوٹی سی بچی ہوں اور آپ کے سوا مجھے کوئی سمجھانے والا بھی نہیں۔''

''جس کا اللہ ہے، اس کی ساری کائنات ہے نادان بچی!''

اس وقت دروازے کی طرف سے آواز آئی۔

''اے ارجی! اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟ آغا جی کہاں ہیں تمہارے؟''

ارجمند نے سر گما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں نور بانو کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

نور بانو کے لئے وہ ایک عام سا دن تھا...... اور دنوں کی طرح۔

وہ سو کر اٹھی، معمول کے مطابق غسل خانے میں گئی۔ وہاں سے نکلی، سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر بالوں میں کنگھی کی۔ پھر وہ کمرے سے نکل آئی۔ اس وقت اسے ناشتے کی بڑی شدید طلب ہوتی تھی۔

عبدالحق کی اسٹڈی کے سامنے سے گزرتے ہوئے عادت کے مطابق وہ رکی اور اندر دیکھا۔ ایک ثانیے میں ہی اسے کئی تبدیلیوں کا احساس ہوگیا۔ پہلی بات تو یہ کہ ارجمند کی نظریں خلافِ معمول اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ادھر دیکھ رہی تھی، جہاں عبدالحق ہوتا تھا۔ دوسری تبدیلی تھی کہ وہاں عبدالحق موجود نہیں تھا۔ ہاں یہ وہ کہہ سکتی تھی کہ اگر وہ موجود ہوتا تو اس وقت ارجمند کی نظریں اس کے چہرے پر ہوتیں۔

اب بھی، ان تبدیلیوں کے باوجود اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوا۔ اس نے بس یہ سوچا، یہ عبدالحق اس وقت کہاں چلے گئے؟

''اے ارجی!'' اس نے ارجمند کو پکارا۔

''اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟ آغا جی کہاں ہیں تمہارے؟''

ارجمند نے سر گھما کر اسے دیکھا، اور پہلے سلام کیا۔ پھر بولی۔

''آغا جی تو چلے گئے آپی!''

نور بانو کمرے میں داخل ہوگئی۔

''کہاں چلے گئے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کو یاد نہیں آپی! انہیں تو آج سے دفتر جانا تھا۔''

نور بانو کو شرمندگی سی ہوئی۔ وہ کھسیا گئی۔

''ارے......! مجھے یاد ہی نہیں رہا۔'' اس نے کہا۔

''تو تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ وہ تمہیں پڑھانا تو نہیں چھوڑیں گے۔ اب رات کو پڑھایا کریں گے۔''

''جی آپی! مگر ان کا دیا ہوا کام تو کرنا ہے۔''

''وہ تم کہیں بھی کر لیتیں۔ یہاں آؤ گی تو وہ یاد آئیں گے نا!'' نور بانو کو احساس بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''وہ تو ہر جگہ یاد آئیں گے آپی!'' ارجمند نے معصومیت سے کہا۔

''اب یہاں کی عادت ہوگئی ہے نا! یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔''

''ہاں! یہ تو ہے۔ ٹھیک ہے، تم کام کرو۔'' نور بانو نے کہا اور پلٹ کر کمرے سے نکل آئی۔

تو آج سے زندگی میں یہ تبدیلی آگئی۔ نور بانو نے سوچا۔ ناشتہ کرتے ہوئے وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ اس کے نزدیک یہ تبدیلی خوش آئند تھی۔ بلکہ وہ تو آئندہ کے امکانات کی راہ تک رہی تھی، وہ امکانات، جن کی راہنمائی مسعود صاحب نے کی تھی۔

عبدالحق کا تبادلہ کسی دوسرے شہر بھی ہوسکتا ہے۔

جب سے اس نے یہ سنا تھا، یہ اس کا وہ خواب بن گیا تھا، جس کی تعبیر کا اس نے پہلے ہی لمحے سے انتظار شروع کر دیا تھا۔

اگر تبادلہ ہوتا اور وہ سب ساتھ جاتے تو اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ صرف گھر، شہر اور گرد و پیش ہی تو بدلتا۔ نئے شہر کا خیال تو بہر حال اچھا لگتا ہے۔ لیکن اپنا یہ گھر نور بانو کو بہت پسند تھا۔

مگر جب تبادلے کے امکان پر بات آگے بڑھی تو وہ اسی کا خواب بن گیا۔ اس امکان میں پہلی اچھائی تو نوربانو کے تعصب کی وجہ سے تھی، کیونکہ حمیدہ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اور نہ جانے کیوں؟ نوربانو کو حمیدہ کی مخالفت کرنا اچھا لگتا تھا۔

لیکن یہاں مخالفت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تبادلے پر نہ کسی کا اختیار تھا، اور نہ ہی کوئی اسے روک سکتا تھا۔ حمیدہ کو ارجمند کی تعلیم کی فکر تھی۔ اور مسعود صاحب نے یہ کہہ کر مسئلہ حل کر دیا تھا کہ حمیدہ اور ارجمند کو یہاں سے کہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور حمیدہ کی خاموشی بتاتی تھی کہ اس نے اس بات کو قبول کر لیا ہے۔

اندر کی بات یہ تھی کہ نوربانو کے خیال میں حمیدہ کی موجودگی میں اس کا اقتدار مکمل نہیں ہوتا تھا۔ اور مکمل اقتدار اس کا خواب تھا۔ اس کے لئے تو وہ حمیدہ کے لئے بدترین بدخواہ بھی بن جاتی تھی، ایسی کہ کبھی غور کرنے پر اسے خود بھی اس پر شرم آتی تھی۔

کبھی وہ سوچتی کہ حمیدہ تو اس کی محسن ہے۔ وہ نہ ہوتی تو عبدالحق سے اس کی شادی کیسے ہوتی؟ یہ ناقابل تردید حقیقت تھی کہ یہ شادی حمیدہ نے ہی کرائی تھی۔ ورنہ عبدالحق تو منہ سے کچھ کہنے والا نہیں تھا۔ اور اعتماد سے محروم نوربانو کو بھی حوصلہ حمیدہ نے ہی دیا تھا۔

لیکن حمیدہ میں ایک بہت بڑی خرابی تھی۔ وہ ہر معاملے میں دخل اندازی کرنے کی عادی تھی۔ نوربانو کو اس کی نصیحتوں کی وجہ سے اس سے چڑ ہوگئی تھی اور عبدالحق حمیدہ کا مطیع تھا۔ نوربانو کو احساس ہوتا تھا کہ اس کا اقتدار صرف رات کا ہے...... ادھورا اور محدود اقتدار۔

پھر حمیدہ کے دماغ پر اولاد کا بھوت چڑھ گیا۔ اس سلسلے میں اس نے جو جو کچھ کیا، اس نے نوربانو کی چڑ اور بڑھا دی۔ حمیدہ جانے کہاں کہاں سے کیا اٹھا لاتی تھی، اور پھر اس سے فرمائشیں ہوتیں۔ یہ کھالے، یہ پی لے، یہ پہن لے۔ اس میں نوربانو کو توہین کا احساس ہوتا تھا۔

پھر یہ سلسلہ اچانک ہی رک گیا۔ شاید...... نہیں، یقیناً...... ارجمند کے آنے کے بعد۔ شاید بڑی بی کو صبر آ گیا۔ اس نے مرغی کی طرح ارجمند کو اپنے پروں میں چھپا لیا اور عبدالحق کے بچے کے معاملے میں صبر کر بیٹھی۔

لیکن نوربانو کا دل تو برا ہو چکا تھا۔

ویسے پہلے کی بات اور تھی۔ اب تو نوربانو کا بھی جی چاہتا تھا کہ اس کا کوئی بچہ ہو۔ وہ اس سے محبت کرے، اس کو پالے، اسے بڑا ہوتا دیکھ کر خوش ہو۔ اب اسے احساس ہوتا تھا کہ یہ تو بہت بڑی خوشی ہوتی ہوگی۔

لیکن اس معاملے میں وہ ڈرتی بھی تھی۔ اسے وہ بات معلوم تھی، جو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

حمیدہ ہر بار کسی بزرگ سے، کسی مزار سے کچھ لے کر آتی اور پورے یقین سے استعمال کرتی۔ ہر بار اسے یقین ہوتا کہ اس بار نتیجہ برآمد ہوگا۔ لیکن ہوتا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ نوربانو جانتی تھی۔ رمضان کی طاق راتوں میں اولاد نہ ہونے کی دعا تو اس نے کی تھی، اور بڑی سچائی کے ساتھ کی تھی۔ قبولیت کی راتوں میں قبول ہونے والی اس کی وہ دعا اب کوئی اور کیسے ردّ کرا سکتا تھا۔

اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ دعا اس کی نادانی تھی۔ اولاد کی اہمیت تو اس کی سمجھ میں اب آئی تھی۔ وہ خود بھی اس کی ضرورت محسوس کرتی تھی بلکہ وہ جان گئی تھی کہ اس محرومی کی وجہ سے عبدالحق بھی اس سے دور ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اس کی قربت کی خاطر اس نے وہ دعا کی تھی۔

جب اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور حمیدہ نے اسے جتا بھی دیا کہ اولاد کی خاطر تو وہ عبدالحق کو دوسری شادی پر بھی مجبور کر سکتی ہے، تو وہ ڈر گئی۔ اس نے نہ صرف یہ کہ اولاد کے لئے دعا شروع کر دی، بلکہ وہ اپنی پچھلی احمقانہ دعا پر توبہ بھی کرنے لگی۔ لیکن اب اتنے دن گزر جانے کے بعد اسے یقین ہوگیا کہ اس کی قبول ہوئی دعا اب منسوخ ہونے والی نہیں۔

عبدالحق کی طرف سے تو اسے یقین تھا۔ کسی بھی چیز کے ملنے یا نہ ملنے

کو اللہ کی طرف سے سمجھنا اور اسے قبول کرنا اس کا ایمان تھا۔ اور وہ اس سے ایسی محبت کرتا تھا کہ کسی اور سے محبت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن حمیدہ کی طرف سے تو خطرہ تھا۔ عبدالحق حمیدہ کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا، اور حمیدہ کسی بھی وقت اسے دوسری شادی کا حکم دے سکتی تھی۔

شاید یہی سب سے بڑی وجہ تھی کہ نوربانو کو تبادلے کا خیال اچھا لگا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ حمدیہ سے دور، بہت دور رہ کر زندگی گزار دیتی۔ بہرحال اسے ایک دُعا اور مل گئی۔ عبدالحق کے تبادلے کی۔

❁ ❁ ❁

دوپہر کا کھانا تو سب ساتھ ہی کھاتے تھے۔ آغا جی کا خیال آیا تو ارجمند کی بھوک اُڑ گئی۔ ان کے بغیر کھانا کیا اچھا لگے گا۔ پھر دوسرے خیال نے اسے تڑپا دیا۔ پتا نہیں، آغا جی نے وہاں کھانا کھایا ہو یا نہیں۔ وہ کچھ لے کر بھی تو نہیں گئے۔

سو کھانے کے وقت اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔

"کیا بات ہے نکی! کھانا کیوں نہیں کھاتی؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے ارجی؟" نوربانو کے لہجے میں تشویش تھی۔

"مجھے جلدی بھوک لگ گئی تھی۔ تو میں نے پہلے ہی کھا لیا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل آئی۔

باہر ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر وہ سوچنے لگی کہ آغا جی اس وقت کیا کر رہے ہوں گے۔ مگر ڈائننگ روم سے آنے والی آوازیں اسے ڈسٹرب کر رہی تھیں۔ وہ وہاں سے اُٹھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ وہاں ہونے والی گفتگو سننے پر مجبور ہوگئی۔

"کیا ہوا اماں! ہاتھ کیوں روک لیا تم نے؟" نوربانو نے کہا۔

"نا دھیے! کھایا نہیں جائے گا مجھ سے۔ نوالے حلق میں پھنس رہے ہیں۔" حمیدہ نے جواب دیا۔

"ایسا کیا ہوگیا اماں؟"

"عبدالحق کے ساتھ کھانے کی عادت ہے نا! اس کی یاد آ رہی ہے۔"

اور ڈرائنگ روم میں بیٹھی ارجمند کی آنکھیں یہ سن کر نم ہوگئیں۔ اس کا اور دادی اماں کا ایک سا حال تھا۔

"اب ایسا کیا اماں! مرد تو باہر جاتے ہی ہیں نا!" نوربانو نے کہا۔

"میں بھی ان کی کمی محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن کھانا پینا تو نہیں چھوڑ بیٹھوں گی۔ یہ تو روز کی بات ہے۔"

"دو چار دن میں عادی ہو جاؤں گی دھیے! تو کھا آرام سے۔"

چند لمحے خاموشی رہی، پھر نوربانو نے کہا۔

"تم پریشان کیوں ہو اماں؟"

"پتا نہیں، وہاں اسے کھانے کو کچھ ملا بھی ہوگا یا نہیں۔" حمیدہ کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"ارے اماں! بلاوجہ پریشان ہوتی ہو۔" نوربانو ہنسنے لگی۔

"بھئی! وہاں چچا جان ہیں۔ وہ بھی تو کھاتے ہوں گے نا۔ تو ان کے ہوتے ہوئے کیا وہ اکیلے کھانا کھا لیں گے۔"

"ہاں! یہ تو ہے۔ پر دھیے! تجھے بھی خیال تو کرنا چاہئے۔"

"کیسا خیال اماں! کس بات کا خیال؟"

"یہی کہ نہ تجھے اس کے ناشتے کی فکر ہے، نہ کھانے کی۔"

"تو کیا وہ ناشتہ کر کے نہیں گئے؟"

باہر بیٹھی ارجمند اب ہر بات بڑے غور سے، بڑے دھیان سے سن رہی تھی۔

"وہ تو نسیمہ نے اسے دے دیا تھا۔ پر بیوی تو تو ہے اس کی۔" حمیدہ کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"تو روز نسیمہ ہی دیتی تھی انہیں ناشتہ۔"

"وہ بھی غلط تھا۔ کام تو یہ تیرا ہے دھیے!"

"پہلے کبھی نہیں کہا تم نے؟" نوربانو نے چڑ کر کہا۔

"گھر میں ہوتا تھا نا، اس لئے۔" حمیدہ نے اداسی سے کہا۔

"پر دھیے! بیوی کو شوہر کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔"

"یہ بھی تو بتاؤ کہ خیال کیسے رکھا جاتا ہے؟"

"اللہ بخشے وصال دین کے ابا کو، انہیں سویرے ہی کھیتوں پر جانا ہوتا تھا۔" حمیدہ کی آواز جیسے بہت دور سے آ رہی تھی۔

"میں صبح اٹھ کر ان کے لئے ناشتہ بناتی۔ ناشتہ کرا کے انہیں بھیجتی۔ پھر دوپہر کا کھانا تیار کرتی اور خود جا کر انہیں دے کر آتی۔ پھر وصال دین بڑا ہوگیا تو وہ کھانا لے جانے لگا۔ مگر پھر وہ دلّی چلا گیا تو میں نے دوبارہ یہ کام سنبھال لیا۔"

نور بانو کی نگاہوں میں خاموش طبع وصال دین کی صورت پھر گئی۔ مگر اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

"تو یہ کام تو میں بھی کر لوں گی اماں! میں کھانا لے کر ان کے دفتر چلی جایا کروں گی۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں دھیے! بات تو خیال رکھنے کی ہے۔" حمیدہ شاید کھسیا گئی تھی۔

"مردوں کے دل ایسے ہی جیتے جاتے ہیں۔ خیال رکھ کر انہیں محبت کا احساس دلایا جاتا ہے۔"

"اس کے اس سے بھی بہتر طریقے ہیں اماں!" نور بانو شوخی سے ہنسی۔

اس ہنسی میں کوئی بھید، کوئی اسرار تھا، جو ارجمند سمجھ نہیں سکی۔

"تو نہیں سمجھے گی دھیے! اللہ نے میرے پتر کے دل کو تیری اتنی محبت ویسے ہی دے رکھی ہے نا! اس لئے تجھے قدر نہیں اس کی۔" حمیدہ نے کہا۔ پھر اچانک اس کے لہجے میں ملامت آگئی۔

"اور جن طریقوں کی تو نے بات کی، وہ تو ہر عورت کو آتے ہیں۔ اگر ان سے گزارا ہوتا نا! تو دنیا کی کوئی عورت اپنے مرد کی خدمت نہیں کرتی۔ لیکن نہیں! جسے اپنے مرد سے محبت ہوگی، وہ تو خدمت کرے گی ہی....."

"اماں! سچ کہہ رہی ہوں، تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" اب

نور بانو کے لہجے میں کچھ شرمساری تھی۔

"تیرے ابا بھی تو سرکاری نوکر تھے نا!" حمیدہ کو جیسے یاد آگیا۔

"جی اماں!"

"تو تو نے اپنی امی کو ان کا خیال رکھتے نہیں دیکھا؟"

"نہیں اماں!" نور بانو نے اداسی سے کہا۔

"ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے تو ابا رخصت ہوگئے تھے۔"

"پھر تیرا قصور نہیں میری بیٹی!" حمیدہ نے بہت خلوص اور محبت سے کہا۔

"بیٹیاں یہ سب کچھ دیکھ کر ہی تو سیکھتی ہیں۔ اور پھر میری امی کو تو وقت ہی نہیں ملا کہ تجھے یہ سب سکھاتیں۔" اس نے کچھ توقف کیا، پھر بولی۔

"اب میں تجھے سکھا رہی ہوں نا؟"

"اچھا اماں! اب کوشش کروں گی۔"

باہر بیٹھی ارجمند نے دل میں سوچا کہ اس کی تربیت کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا، اللہ نے یہ سب باتیں اس تک پہنچا دیں۔ ہر ہر بات اس نے اپنے حافظے پر نقش کر لی تھی۔ ویسے اسے یاد تھا، اس کی امی بابا کی بہت خدمت کرتی تھیں۔ ان کے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ اور سونے سے پہلے منع کرنے کے باوجود وہ بابا کی ٹانگیں دباتی تھیں۔ کبھی سر میں تیل لگاتی تھیں۔

تو یہ ہوتی ہے محبت، اور یہ ہوتی ہے خدمت، اچھا ہوا، مجھے معلوم ہوگیا۔ اس نے طمانیت سے سوچا۔

"اور دیکھ، کھانا تو یعقوب کے ہاتھ بھی تو دفتر بھجوا سکتی ہے۔" اندر حمیدہ نے نور بانو سے کہا۔

"ٹھیک ہے اماں!"

❁ ❁ ❁

شام ہوگئی، اور یعقوب عبدالحق کو لانے کے لئے گاڑی لے کر نکلا تو نور بانو نے سوچا کہ جو خیال رکھنا آسان ہے، وہ تو رکھا جائے۔ اس خیال کے

تحت اس نے نسیمہ کو چائے تیار رکھنے کی ہدایت کی اور خود ارجمند کے ساتھ باہر لان میں چلی آئی۔

''کوئی خاص بات ہے آپی!'' ارجمند نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

نوربانو اسے لے کر لان میں صدر دروازے کے عین سامنے والی بینچ پر بیٹھ گئی۔

''ابھی تمہارے آغا جی آئیں گے نا، ان کا استقبال کریں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارجمند نے حمیدہ کی گفتگو سن کر یاد ہی نہیں رکھی تھی، بلکہ اپنے طور پر اسے آگے بھی بڑھایا تھا۔ اس نے دل میں سوچا، اس سے تو بہتر یہ ہوتا کہ آپی غسل خانے میں آغا جی کے کپڑے تیار کرکے لٹکا تیں۔ وہ باتھ روم سے تازہ دم ہو کر نکلتے تو وہ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چائے لے کر کمرے میں ان کی منتظر ہوتیں، اور کون جانے، آغا جی کہتے ...... یہ کیا، ارے بھئی لان میں سب ساتھ بیٹھ کر چائے پئیں گے۔ دیکھو نا، دوپہر کا کھانا تو ہم ساتھ نہیں کھا سکے۔ اب شام کی چائے تو ساتھ پی لیں۔

لیکن اس نے نوربانو سے کچھ کہا نہیں۔ یہ اس کا معاملہ تھا ہی نہیں۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی واپس آئی۔ مگر عبدالحق اس میں نہیں تھا۔ نوربانو پریشان ہوگئی۔ اس نے آواز دے کر یعقوب کو بلایا۔

''یعقوب! تیرے صاحب نہیں آئے؟'' اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''جی میم صاحب! وہ مسعود صاحب کے ساتھ کہیں چلے گئے۔ بولا، میں ان کے ساتھ ہی آجاؤں گا، تم جاؤ۔''

یہ سن کر نوربانو کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ وہ پیر پٹختی ہوئی گھر کی طرف چل دی۔ ارجمند اس کے پیچھے تھی۔

پھر نوربانو تو ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی، اور ارجمند اپنے کمرے میں چلی

گئی، جو درحقیقت دادی اماں کا کمرہ تھا۔ آپی بالکل سمجھدار نہیں ہیں۔ اس نے تاسف سے سوچا۔ غصہ بہت کرتی ہیں۔ ذرا غور کرنے پر یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ نوربانو کسی کو کچھ دینے سے زیادہ لینے کی فکر کرتی ہیں۔ البتہ اس کے معاملے میں اس کا رویّہ مختلف ہے۔

''کیا ہوا نکی! کیا سوچ رہی ہے؟'' حمیدہ نے اسے گہری سوچ میں دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں دادی اماں! ایسے ہی......''

تھوڑی دیر بعد عبدالحق کمرے میں آیا۔ اس نے آتے ہی حمیدہ کو سلام کیا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ حمیدہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور دعا دی۔

''تم کیسی ہو ارجی!'' عبدالحق نے اس سے پوچھا۔

''ہوم ورک کرلیا نا تم نے؟''

''جی آغا جی!''

''پتر! کیسا رہا تیرا یہ پہلا دن؟'' حمیدہ نے پوچھا۔

''بہت اچھا اماں! چچا جان نے ایک دن میں اتنا کچھ سکھا دیا کہ میں برسوں میں نہیں سیکھ سکتا......'' وہ جملہ پورا نہ کر سکا۔ کیونکہ نوربانو آندھی طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا اور جسم لرز رہا تھا۔

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اس کے سامنے کھڑی ہوگئی تھی۔

''کیا ہوگیا، اتنی برہم کیوں ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ پوچھیں، کیا نہیں ہوا؟'' نوربانو نے تنک کر کہا۔

''پہلے تو میں جناب کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ پھر یعقوت نے آکر بتایا کہ آپ مسعود صاحب کے ساتھ چلے گئے ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔''

''دیکھو نوربانو! میں اس پر معذرت نہیں کروں گا۔'' عبدالحق نے بڑے تحمل سے کہا۔

''ابھی میں ٹھیک سے نہیں جانتا، لیکن سمجھ سکتا ہوں کہ دفتر میں کسی بھی وقت کوئی کام پڑ سکتا ہے۔ اس لئے تم اپنے طور پر مجھ پر آنے کے وقت کی پابندی لگانے کے کوشش نہ کرو۔ مجھے دیر بھی ہوسکتی ہے۔''

''تو پھر یعقوب کو کیوں بلایا تھا؟''

''پہلا دن تھا نا، میں نے تو دفتر کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''مجھے کیا پتا تھا کہ دیر بھی ہوسکتی ہے۔''

لیکن نوربانو کا پارہ نیچے نہیں آیا۔ ارجمند سر جھکائے بیٹھی تھی، اور حمیدہ حیرت اور افسوس سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تو پھر یعقوب کو واپس کیوں بھیج دیا؟''

''نہ بھیجتا تو تم اور پریشان ہوتیں۔''

''مجھ بات پوری کرنے دیں۔ اور آپ کسی دفتری کام سے نہیں رکے تھے۔ آپ تو مسعود صاحب کے ساتھ تھے۔''

اب عبدالحق کے چہرے پر سختی اور سنگینی اُبھر آئی۔

''سنو نوربانو! یہ باہر کے معاملات ہیں، جن پر میں گھر میں بات کرنا کبھی پسند نہیں کروں گا۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''بس آج اس پر آخری بار بات ہو رہی ہے۔ چچا جان دفتر میں میرے افسر ہیں، اور میں ان کا ماتحت۔ انہوں نے مجھے دفتری کام سے ہی روکا تھا، لیکن ذاتی طور پر بھی میں ان کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ میں اپنی کسی ذاتی کام سے بھی دفتر کے بعد کہیں جا سکتا ہوں۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم میرا انتظار نہ کیا کرو۔''

ذلت کے احساس سے نوربانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''چلیں ٹھیک ہے۔ دیر ہوگئی، آپ آئے تو میں ڈرائنگ روم میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے سلام کیا، آپ نے جواب تک نہیں دیا اور سیدھے یہاں چلے آئے۔ جیسے میں کچھ ہوں ہی نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ باقاعدہ رونے لگی۔

''مجھے یہ رونا دھونا اچھا نہیں لگتا، اور وہ بھی بلاوجہ کا۔'' عبدالحق نے جھنجلا کر کہا۔

''میں نے سلام کا جواب دیا تھا لیکن غصے میں آدمی کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور سماعت معطل۔ تم نے نہیں سنا تو میں کیا کروں؟ اور دوسری بات یہ کہ گھر آ کر میں سب سے پہلے اماں کو سلام کروں گا۔ یہ اماں کا حق اور میرا فرض ہے۔ اس پر کبھی مجھ سے شکایت نہ کرنا۔''

نوربانو اندر ہی اندر صدمے سے بے حال ہوگئی۔ حمیدہ کی یہ فوقیت ہی تو اسے کھٹکتی تھی۔ کاش تبادلہ ہو جائے جلدی سے۔

''نوربانو! تو بھی بچی بن جاتی ہے دھیے! چل ادھر آ! میرے پاس بیٹھ۔'' حمیدہ نے ماحول کی کشیدگی کم کرنے کی کوشش کی۔

نوربانو کے لئے وہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا۔ وہ اس کے پاس جا بیٹھی۔

اسی لمحے نسیمہ ہدایت کے مطابق چائے لے آئی۔ ٹرالی پر چند پلیٹوں میں بسکٹ بھی تھے۔

''نہیں بھئی! دن بھر میں آپ سب کو مس کرتا ہوں۔'' عبدالحق نے یوں ہلکے پھلکے انداز میں کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''اوپر کا کھانا ہم ساتھ نہیں کھا سکتے۔ مگر شام کی چائے تو ساتھ پی سکتے ہیں، اور وہ بھی لان میں۔ بس میرے آنے کے بعد شام کی چائے کا اہتمام لان میں کیا کرو۔''

ارجمند خوش ہوگئی۔ بالکل یہی تو اس نے سوچا تھا۔ اللہ کا شکر ہے۔ وہ آغا جی کو سمجھنے لگی ہے۔

''لیکن آپ کے آنے کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہوگا۔'' نوربانو اب بھی باز نہیں آئی۔

عبدالحق کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔

''جس سے صبر نہ ہو، وہ پہلے ہی پی لے۔ اور جس کا جی چاہے، میری

آمد کا انتظار کرلے۔''

حمیدہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو باغیچے میں، نسیمہ چائے وہیں لے آؤ۔''

نور بانو بھی سب کے ساتھ تھی۔ مگر اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

✿ ✿ ✿

حمیدہ نے اسی رات نور بانو کو اپنے پاس بٹھا کر سمجھایا۔

''دیکھ دھیے! میں تیری ماں ہی ہوں۔ اسی لئے تجھے سمجھاتی ہوں۔ تجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ تو عبدالحق کا خیال رکھنا سیکھ لے۔''

''اب کیا ہے اماں!'' نور بانو جھنجلا گئی۔

''مرد کام سے واپس آتا ہے تو تھکا ہارا اور چڑچڑا ہوتا ہے۔ گھر سے دوری، کام کی تھکن اور دس باتیں ایسی ہوئی ہوتی ہیں جو اس کی مرضی کے خلاف ہوں تو ایسے میں گھر آ کے اسے شکایت سننا اچھا نہیں لگتا۔''

''اب نہیں کروں گی اماں!''

''میں تجھے یہ بتا رہی ہوں کہ کیا کرنا چاہیے؟ بیوی شوہر کے آنے سے پہلے نہا دھو کر وہ کپڑے پہنے جو شوہر کو اچھے لگتے ہوں۔ چہرے پر سرخی پوڈر لگائے تاکہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو، تازہ دم ہو جائے اور ہر وہ کام کرے، جس سے شوہر کو خوشی ملتی ہو۔''

نور بانو نے سوچا، یہ نسخہ تو آسان ہے۔ دوپہر والے کام تو مشکل بھی تھے، اور اسے ضروری بھی نہیں لگ رہے تھے۔ رات کی رانی نسخہ تو اسے پہلے سے ہی آتا تھا۔ اب یہ شام کا گر بھی اس میں شامل کر لے۔

عبدالحق ارجمند کو پڑھانے بیٹھا تو نور بانو اپنی تیاریوں میں لگ گئی۔

عبدالحق کمرے میں آیا تو رات کی رانی مہک رہی تھی۔ شام کی تلخی کا دُور دُور تک نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ خود بھی بات دل میں رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔ اور بیوی اسے محبوب بھی بہت تھی۔ وہ خوش ہو گیا۔

لیکن اب وہ پہلے والی راتیں نہیں رہی تھیں۔ جب سے عبدالحق نے

ارجمند کو پڑھانے کے لئے جلدی اُٹھنا شروع کیا تھا، پہلے والی بات نہیں رہی تھی۔ مگر اب تو دن بھر کی تھکن تھی۔ عبدالحق کو نیند آ گئی۔ وہ سویا اور بے سدھ ہو کر سویا۔

نور بانو جاگتی رہی۔ اسے تو دیر تک جاگنے کی عادت تھی۔ وہ سوتے ہوئے عبدالحق کو دیکھ کر کڑھتی رہی۔ کیا اب وہ راتیں بھی پلٹ کر نہیں آئیں گی؟ بظاہر تو یہی لگتا ہے۔ لیکن تبادلہ ہو جائے تو یہ ایسا ناممکن بھی نہیں۔

بہت دیر تک وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے وہ سوچتی رہی، پھر اُٹھی اور کمرے سے نکل آئی۔ اس کا رخ اسٹڈی کی طرف تھا۔

اسٹڈی میں لائٹ آن کرنے کے بعد وہ کتابوں کے دیواری شیلف کی طرف بڑھی۔ یہ وہ شیلف تھا، جس میں اُردو ادب کی کتابیں رکھی تھیں۔ اس نے ایک کتاب نکالی اور پڑھنے کے لئے بیٹھ گئی۔

وہ پہلا موقع تھا کہ اسے مطالعے کا خیال آیا تھا۔

✿ ✿ ✿

اگلی صبح ارجمند نماز اور تلاوتِ قرآن کے بعد باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس کے ذہن میں حمیدہ کی باتیں تھیں۔ نور بانو ابھی سو کر نہیں اٹھی تھی۔ اس نے سوچا، وہ ہی عبدالحق کے ناشتے کا اہتمام کر لے۔

شاہانہ سے اس نے کھانے پکانے کی کئی ترکیبیں سیکھی تھیں۔ پکانے کا اسے شوق بہت تھا۔ نور بانو کھانا بہت اچھا پکاتی تھی، اور اس نے نور بانو سے سیکھا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو رات کا کھانا وہ پکاتی بھی تھی۔

اس وقت اس نے شاہانہ کی ترکیب سے فرنچ ٹوسٹ بنا لئے۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک جیسا ناشتہ بھی تو برا لگتا ہوگا۔ مختلف ناشتہ ملتا رہے تو یقیناً اچھا لگے گا۔ کسی دن پوریاں تل لیں، کسی دن پراٹھے اور رات کا سالن، کسی دن فرائی انڈوں کے ساتھ پراٹھے اور کسی دن مکھن ڈبل روٹی۔

اس نے حمیدہ کو بتا دیا تھا کہ آج سے اسے عبدالحق کے ساتھ ناشتہ کرنا

ہوگا۔

عبدالحق صبح حمیدہ کو سلام کرنے کے لئے آیا تو حمیدہ نے اسے روک لیا۔

''اب تو میرے ساتھ ناشتہ کیا کر پتر!''

''آپ نے ابھی ناشتہ نہیں کیا؟'' عبدالحق نے حیرت سے پوچھا۔ کیونکہ روز وہ پہلے ہی ناشتہ کر چکی ہوتی تھی۔

''نہیں! اب روز تیرے ساتھ ہی ناشتہ کیا کروں گی۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے اماں!'' عبدالحق شرمندہ ہونے لگا۔

''آپ کی تو عادت ہے بہت پہلے ناشتہ کرنے کی۔''

''اب اس وقت کی عادت ہو جائے گی۔ دوپہر کو تیرے ساتھ کھانا کھانے کی عادت بھی تو تھی۔ عادتیں تو بدلنی پڑتی ہیں آدمی کو۔''

اسی وقت نسیمہ ناشتے کی ٹرالی لے آئی۔

''آج تو کوئی نئی چیز نظر آ رہی ہے۔'' عبدالحق نے ٹوسٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بنایا ہے نسیمہ!''

''پتا نہیں صاحب!''

عبدالحق اس کے جواب پر حیران ہو رہا تھا کہ حمیدہ نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''یہ میری نکی نے بنایا ہے!''

عبدالحق کے لئے وہ ایک اور حیرت تھی۔

''ارے.....! اسے یہ سب کرنا بھی آتا ہے؟''

''ہر چیز سیکھنے کی کوشش کرتی ہے نکی!''

''تو اسے بھی تو بلائیں ناشتے پر۔ وہ بھی تو ہر روز آپ کے ساتھ ہی ناشتہ کرتی تھی۔''

حمیدہ نے نسیمہ سے کہا کہ وہ ارجمند کو بھیج دے۔

عبدالحق نے چائے کی پیالی حمیدہ کے سامنے رکھی اور پلیٹ پر ٹوسٹ رکھ دیا۔

''لیجئے اماں!'' اس نے کہا۔ خود وہ خوفزدہ تھا کہ نہ جانے ارجمند نے کیا تجربہ کیا ہوگا۔

حمیدہ نے ٹوسٹ کا ٹکڑا منہ میں رکھا اور بے ساختہ بولی۔

''واہ.....! بہت مزے کا ہے۔ سواد آ گیا۔''

عبدالحق کو حوصلہ ہوا۔ اس نے بھی ٹوسٹ لیا۔ وہ واقعی بہت مزے کا تھا۔ بالکل نئی چیز۔ وہ خوش ہوگیا۔

ارجمند پلیٹ میں ٹوسٹ لے کر آئی۔

''آ نکی! تو بھی بیٹھ جا۔'' حمیدہ نے کہا۔

ارجمند بیٹھ گئی۔ عبدالحق نے کہا۔

''تم نے تو کمال کر دیا ارجی! یہ سب کچھ بھی آتا ہے تمہیں؟''

''جی.....! سیکھ رہی ہوں۔'' ارجمند نے آہستہ سے کہا۔

''تو بتا، پڑھنے میں کیسی ہے میری نکی؟ سکول میں داخلہ ہو جائے گا نا اس کا؟'' حمیدہ نے عبدالحق سے کہا۔

''مجھے تو حیرت ہوتی ہے اماں! یہ اتنا جلدی سیکھتی ہے کہ کیا بتاؤں؟ اس کے داخلے میں کوئی دُشواری نہیں ہوگی۔''

حمیدہ نے محبت سے ارجمند کو دیکھا۔

''جس گھر میں بھی جائے گی میری نکی، وہ روشن ہو جائے گا۔''

''میں یہاں بہت خوش ہوں اماں!'' ارجمند نے اداسی سے کہا۔

''کیا آپ مجھے یہاں سے نکال دیں گی؟''

حمیدہ کو اس کی معصومیت پر اور پیار آیا۔

''لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں نکی! ہر ایک کو جانا ہوتا ہے ایک دن۔ قدرت کا قانون ہے نا! میرے بس میں ہو تو تجھے جانے ہی نہ دوں کبھی۔''

''تو سب سے بڑی آپ ہی ہیں دادی اماں! آپ روکیں گی تو مجھے

کوئی نہیں نکال سکے گا۔"

عبدالحق اس گفتگو سے کھسیا رہا تھا۔ ناشتہ کر کے وہ دفتر چلا گیا۔

ارجمند نے نسیمہ سے کہہ دیا کہ نور بانو کا ناشتہ بھی وہی بنائے گی۔ پھر وہ اپنی کتابیں اور کاپیاں لے کر اسٹڈی میں آ گئی۔ ذرا دیر میں وہ پڑھائی میں منہمک ہو گئی۔

پھر نور بانو کی آواز نے اسے چونکا دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے باورچی خانے کی طرف جاتے دیکھا تو نور بانو نے کہا۔

"کہاں چلی ارجی!"

"آج سے ناشتہ میری ذمہ داری ہے آپی!"

ارجمند کو اس خدمت کا صلہ بھی فوراً ہی مل گیا۔ نور بانو نے فرنچ ٹوسٹ کی تعریف کی۔

"یہ تم نے کہاں سے سیکھا ارجی!"

"شاہانہ باجی سے۔ اچھا ہے نا آپی!"

"ہاں! اچھا ہے۔ مگر اس سے ملتی جلتی ایک دیسی چیز مجھے بنانی آتی ہے۔ کھاؤ تو انگلیاں چاٹتی رہ جاؤ۔ یہ تو انگریزی ترکیب ہے نا! ہمارے دیسی کھانوں سے اچھے نہیں ہو سکتے ان کے کھانے۔"

"مجھے بتائیں نا آپی!" ارجمند نے اشتیاق سے کہا۔

"انہیں شاہی ٹکڑے کہتے ہیں۔ مگر وہ بہت جلدی نہیں بنتے۔ محنت بھی زیادہ کرنی ہوتی ہے۔ اور وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔"

ارجمند نے جھٹ ایک کاپی کھولی اور قلم سنبھال لیا۔

"آپ ترکیب تو بتائیں آپی!"

"لو......! تو لکھو گی کیا؟"

"جی آپی! میں تو ہر کھانے کی ترکیب لکھ لیتی ہوں۔ یہ کاپی میں نے مخصوص کر لی ہے اس کے لئے۔"

نور بانو بتاتی رہی اور ارجمند نوٹ کرتی رہی۔

"ٹھیک ہے آپی! کل تو نہیں، دو چار دن بعد میں آپ کو ناشتے میں کھلاؤں گی شاہی ٹکڑے۔" اس نے کہا۔

"دیکھیں گے!" نور بانو نے گویا چیلنج کیا۔

❁ ❁ ❁

دوسرا ہفتہ شروع ہونے کے بعد عبدالحق اس زندگی کا عادی ہو گیا۔ دفتر اس کے لئے ایک جز وقتی گھر بن گیا اور دفتر کے ساتھی گھر کے افراد جیسے لگنے لگے۔ مسعود صاحب تو ویسے ہی اس کے لئے گھر کے بزرگ تھے۔

اس کا پرسنل اسٹاف بہت اچھا تھا۔ ذوالفقار بہت کم گو اور بہت محنتی تھا۔ کام میز پر چھوڑ کر گھر جانا اسے گوارا ہی نہیں تھا۔ تین بار ایسا ہوا کہ عبدالحق عصر کی نماز پڑھ کر گھر جانے کے لئے دفتر سے نکلا تو ذوالفقار بیرونی کمرے میں ٹائپنگ میں مصروف تھا۔

"کیوں بھئی! گھر نہیں جانا؟" عبدالحق نے اس سے پوچھا۔

ذوالفقار جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"جی سر!" اس نے شاید اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

"سنو! ہر بار میری آمد پر تمہیں کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں۔" عبدلاحق نے زور دے کر کہا۔

"اور خاص طور پر کام کرتے وقت۔"

"یس سر!" ذوالفقار نے کہا اور بیٹھ گیا۔ مگر انداز ایسا تھا جیسے بھاگ کھڑا ہو گا۔

"آپ کچھ کہہ رہے تھے سر!"

عبدالحق نے اپنی بات دہرائی۔

"آج کا کام کل پر چھوڑنا اچھا نہیں لگتا جناب! کام مکمل کر کے ہی جاؤں گا۔"

"لیکن میں نے تو تمہیں کوئی لمبا کام دیا ہی نہیں۔ میرا کام تو تم ٹائپ کر کے میری میز پر رکھ چکے ہو۔" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

"وہ اجمل صاحب کے پی۔اے کے پاس کام زیادہ ہوتا ہے نا سر! تو وہ مجھے دے دیتے ہیں۔"

"اوہ......! ٹھیک ہے۔" عبدالحق باہر نکل آیا۔

باہر نکل کر وہ خاص طور پر اجمل صاحب کے دفتر کی طرف گیا۔ لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

ان دن دنوں میں عبدالحق نے بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ اگر تمام سرکاری دفاتر کا ماحول ایک سا ہوتا ہے تو پھر یہ خرابی ہر جگہ عام ہوگی۔ اس نے دیکھا تھا کہ یہاں جو شخص اپنے کام کے ساتھ مخلص ہو، اس سے دوسرے لوگ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب یہ ذوالفقار کی مثال سامنے تھی۔ وہ دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد جس شخص کا کام نمٹا رہا تھا، وہ خود بے فکری سے گھر جا چکا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ کل اس سلسلے میں کچھ کرے گا۔ اپنے ماتحتوں کو استحصال سے بچانا اس کی ذمہ داری تھی۔ ورنہ ایک دن ایسا ہوگا کہ ذوالفقار بھی یہی روش اختیار کرے گا۔ یہ تو اچھے لوگوں کو بگاڑنا ہوا۔

پلٹ کر وہ مسعود صاحب کے دفتر کی طرف آ رہا تھا کہ دوسری طرف سے شمریز آتا دکھائی دیا۔

"ارے! تم بھی نہیں گئے ابھی تک۔"

"بابو صاحب کو چھوڑ کے کیسے جاؤں صاحب!"

یہ دوسرا بھی ویسا ہی ہے، اللہ کا شکر ہے۔ عبدالحق نے دل میں سوچا۔

راستے میں اس نے مسعود صاحب سے اس سلسلے میں بات کی۔

"ہاں! وہ دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔" مسعود صاحب نے اس کی بات سن کر کہا۔

"میں نے خاص طور پر انہیں تمہارے لئے منتخب کیا تھا۔"

"یہ کیسی تربیت ہے چچا جان!" اس نے شکایت کی۔

"آپ پہلے مجھے نکمے لوگ دیتے، تاکہ میں ان سے نمٹنا سیکھتا۔"

مسعود صاحب ہنسے۔

"اچھوں کو دیکھنے کے بعد ہی تو بروں کی برائی کو پوری طرح سمجھ سکو گے۔ ویسے نکموں اور حرام خوروں کی تو بھرمار ہے یہاں۔ لوگ سرکاری ملازمت میں اس لئے آتے ہیں کہ عیش کریں۔ ابھی تم نے دیکھا کیا ہے؟ زیادہ تر لوگ دیر سے آتے ہیں اور وقت سے پہلے گھر چلے جاتے ہیں۔"

"تو ان کے خلاف کارروائی کرنی چاہئے۔"

"یاد رکھو، ماتحت اپنے افسروں کے ہی نقش قدم پر چلتے ہیں، انہی سے سب کچھ سیکھتے ہیں۔ ہاں کارروائی پر یاد آیا۔ کل میں تمہیں سروس رولز کی کاپی بھجوا دوں گا۔ اسے دیکھ لینا۔ کام آئے گا۔"

"لیکن چچا جان! میرے کلرک کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے۔"

"اسے روکنا تمہارا کام ہے، میرا نہیں!" مسعود صاحب نے بے رخی سے کہا۔

"اپنے ماتحتوں کو تو تمہیں ہی پروٹیکٹ کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے چچا جان!"

❁ ❁ ❁

ارجمند کو امید تھی کہ حمیدہ کے سمجھانے کے بعد نوربانو میں تبدیلی آئے گی۔ لیکن کئی دن گزر گئے اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہر روز وہ یہی سوچتی کہ نہ جانے آغا جی نے کیا کھایا ہوگا۔ کچھ کھایا بھی ہوگا یا نہیں۔

آخر اس نے نوربانو سے بات کر ہی لی۔

"آپی! میں سوچتی ہوں، دوپہر کا کھانا میں پکا لیا کروں۔"

"نسیمہ پکا تو لیتی ہے۔"

"میں نے ترکیبیں تو لکھ لی ہیں۔ لیکن پکائے بغیر تو کچھ نہیں آئے گا آپی!"

"تو ٹھیک ہے۔ اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ایک بات اور...... آپ اجازت دیں تو آغا جی کو بھی کھانا بھجوا دیا

کروں۔"

پہلی بار نور بانو کے کان کھڑے ہوئے۔

"یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

"وہاں کہیں باہر کا کھانا کھاتے ہوں گے۔ اچھا تو نہیں ہوتا ہوگا۔ گھر میں پک رہا ہے تو ان کے لئے بھی چلا جائے۔"

نور بانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"تو یوں کہو کہ تم میرے میاں پر ہاتھ صاف کرنا چاہتی ہو۔" اس نے کہا۔

"جی نہیں آپی!" ارجمند نے معصومیت سے کہا۔

"اب اتنا برا تو نہیں پکاؤں گی میں کہ کسی پر ہاتھ صاف کرنا کہلائے۔"

نور بانو کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اس کی کہی ہوئی رکیک بات کو ارجمند نے کس معصومیت سے ایک محاورے کے حوالے سے خوش گوار بنا دیا تھا۔ اسے خود پر شرم بھی آئی۔ یہ وہ لڑکی تھی، جسے وہ اپنی مرحوم بہن کا مقام دیتی تھی۔ اتنی مدت میں پہلی بار اس کا سفلہ پن ابھر کر آیا تھا، اور یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

"اب بھی تم جانو اور تمہارے آغا جی جانیں۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"میں کیوں بیچ میں پڑوں؟"

یوں ارجمند نے عبدالحق کے ساتھ گزارا جانے والا وہ وقت عبدالحق کے ہی نام کر دیا۔ اس نے سوچا۔ پڑھائی کے لئے سہ پہر کا وقت اچھا رہے گا۔ اسے کھانے پکانے کا شوق بھی بہت تھا۔ پھر کھانا، اور وہ بھی آغا جی کے لئے، یہ تو دہری خوشی تھی۔

پہلے دن اس نے کھانا پکایا تو اسے پھپھو یاد آ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کتنی محنت کرتی ہیں پھپھو۔ کپڑوں کی سلائی کڑھائی پھر دونوں وقت کھانا پکانا۔ اور اسے پڑھانے کے لئے بھی وقت نکالتی تھیں۔ آرام کرنے کے لئے وقت ہی کہاں ملتا تھا انہیں۔ اور ایک دن اس نے یہ بات کہی تو بولیں۔

"تمہیں نہیں معلوم ارجی! کہ ان کاموں میں کیسی راحت ملتی ہے؟ یہی تو عورت کی زندگی ہے۔"

وہ ان سے اصرار کرتی تھی کہ اسے بھی کھانا پکانا سکھائیں تو وہ کہتی تھیں، وقت آنے پر سکھاؤں گی۔ ابھی تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔ اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے۔ کون جانے کہ آنے والے وقت میں تم پر کتنی ذمہ داری ہو؟

پھر بھی وہ ان سے پوچھتی رہتی تھی، اور جو وہ بتاتیں، اسے کاپی میں لکھ لیتی۔ یہ ترکیبیں نوٹ کرنے کی عادت وہیں سے تو پڑی تھی اسے۔ اس کاپی میں پھپھو کی بتائی ہوئی کتنی ہی ترکیبیں لکھی تھیں۔

سو اب وہ پھپھو اور آپی، دونوں ہی کی ترکیبوں سے استفادہ کر سکتی تھی۔

اس روز کھانا پکاتے ہوئے وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ پھپھو کو یاد کرتی رہی۔ پھپھو ہمیشہ کہتی تھیں۔ بھئی! آدمی گیارہ بجے تک کھانا پکا کر فارغ ہو جائے تو پورا دن بچ جاتا ہے۔ اب رات کا کھانا تو ہلکا ہی ہوتا ہے نا! رات کو مرغن کھانے اچھے نہیں لگتے۔

آغا جی کے لئے کھانا بھجوانے کے خیال کو تحریک اسی بات سے ملی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ دن میں تو دفتر میں ہوتے ہیں۔ باہر کا کھانا کھاتے ہیں۔ اور رات کو کھانا ہلکا ہوتا ہے۔ یہ اسے آغا جی کے ساتھ زیادتی لگتی تھی۔

اس نے کھانا تیار کیا اور ٹفن میں رکھا۔ ٹفن لے کر وہ باہر آئی۔ گھڑی میں وقت دیکھا تو گیارہ بجنے والے تھے۔ اس نے نسیمہ کی بیٹی رضیہ سے کہا کہ جا کر یعقوب کو بلا لائے۔

نور بانو ابھی سو کر نہیں اٹھی تھی۔ رات کو مطالعے کے بعد اسے نیند اور گہری آئی تھی۔

ذرا دیر بعد رضیہ نے آ کر اسے بتایا کہ یعقوب آ گیا ہے، اور دروازے پر کھڑا ہے۔ وہ اندر کبھی نہیں آتا تھا۔

ارجمند دروازے کی طرف چلی گئی۔ اس نے یعقوب کو ٹفن دیتے ہوئے

کہا۔

"یہ کھانا صاحب کو دے کر آنا ہے۔"

"کہاں بے بی صاحب؟"

"صاحب کہاں جاتے ہیں ہر روز؟"

"اپنے آفس!"

"تو کھانا بھی وہیں دے کر آنا ہے مسٹر جیکب!"

مسٹر جیکب پکارے جانے پر یعقوب کے دانت نکل پڑے۔

"تھینک یو بے بی صاحب! یس بے بی صاحب!" یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔

کچھ خیال آیا تو ارجمند نے اسے پکارا۔

"سنو مسٹر جیکب!"

یعقوب پلٹ کر آیا۔

"جی بے بی صاحب!"

"صاحب کو بولنا کہ کھانا میم صاحب نے بھجوایا ہے۔"

"لیکن ہم جھوٹ......"

ارجمند نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

"مسٹر جیکب! کیا تم آرڈر کے خلاف کام کرتا ....." اس نے اسی کے انداز میں کہا۔

اور یہ یعقوب کی کمزوری تھی۔

"نہیں بے بی صاحب! جو آپ کا آرڈر! میں ہمبل سرونٹ۔"

"ٹھیک ہے، جاؤ!" ارجمند اندر چلی گئی۔

یہ وہ وقت تھا، جب نور بانو بیدار ہوئی۔

✿ ✿ ✿

عبدالحق نے ذوالفقار کو کمرے میں بلایا اور بیٹھنے کو کہا۔

"شمریز کو بھیج کر اجمل صاحب کے پی۔ اے کو بلاؤ۔ کیا نام ہے اس

کا؟"

"آفتاب، سر! لیکن آپ کیوں بلا رہے ہیں انہیں؟"

"تم خود ہی دیکھ لینا۔ اب تم کھڑے ہو جاؤ، اور اس کے رخصت ہونے تک کھڑے ہی رہنا۔" عبدالحق نے گھنٹی بجائی، شمریز اندر آیا تو اس نے کہا۔

"شمریز! اجمل صاحب کے پی۔ اے سے کہنا کہ میں بلا رہا ہوں۔"

"جی سر!"

شمریز کے جانے کے بعد ذوالفقار عبدالحق کی ہدایت کے مطابق کھڑا ہو گیا۔ دو منٹ بعد اجمل کا پی۔ اے شمریز کے ساتھ آ گیا۔ سلام کر کے وہ کرسی پر بیٹھنے لگا تو عبدالحق نے اسے ٹوک دیا۔

"میں نے آپ کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہا ہے آفتاب!"

آفتاب کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔

"سوری سر! آپ نے مجھے کیسے یاد کیا سر؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ کے آفس میں کام بہت زیادہ ہے۔ شاید ضرورت سے زیادہ بوجھ ہے آپ پر؟"

"جی سر! کچھ زیادہ تو ہے۔" آفتاب نے محتاط لہجے میں کہا۔

"تو میں اجمل صاحب سے اسٹاف میں اضافے کے سلسلے میں بات کروں؟"

آفتاب بوکھلا گیا۔

"اس کی ضرورت نہیں سر! میں کام چلا لیتا ہوں۔"

"لیکن جس انداز میں آپ کام چلاتے ہیں، وہ مجھے پسند نہیں۔"

عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں سر!"

"میں نے کل دیکھا کہ ذوالفقار آفس ٹائم کے بعد یہاں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اور وہ کام آپ کا تھا۔"

"اس کے پاس کام نہیں تھا، اور میرے پاس زیادہ کام تھا، اس لئے میں نے اسے دے دیا تھا۔"

"کیا آپ کا یہ حق ہے اس پر؟"

"میں اسٹینو ہوں سر! اور یہ ایل۔ ڈی۔ سی۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ میرا ماتحت ہے، تمہارا نہیں۔"

"میں نے تو اس سے ریکوسٹ کی تھی سر! اور یہ بھی نہیں کہا تھا کہ آفس ٹائم کے بعد بھی کام کرتا رہے۔" آفتاب کا انداز مدافعانہ ہوگیا۔

"اور میں تمہارے دفتر کی طرف گیا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ تم بھی نہیں تھے۔"

"چھٹی کے وقت میں چلا گیا تھا سر!"

"حالانکہ تمہارا کام باقی تھا، جو کہ ذوالفقار آفس ٹائم کے بعد کر رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تم خود آفس ٹائم کے بعد رک کر اپنا کام نمٹاتے یا پھر چھٹی کے وقت اپنا نامکمل کام ذوالفقار سے واپس لے جاتے۔ ان فائلوں کو میرے آفس میں تو نہیں ہونا چاہئے نا؟" عبدالحق نے سامنے رکھی اس کے دفتر کی فائلوں کو تھپ تھپایا۔

"یس...... یس سر!"

"میں نے اس بار تو ذوالفقار کو معاف کر دیا ہے۔ لیکن اگلی بار ایسا ہوا تو اسے شوکاز نوٹس دے دوں گا۔ اور رہی تمہاری بات، تو تم اپنی خود جانو۔ کام زیادہ ہے تو دیر تک بیٹھ کر کام کرو یا اجمل صاحب سے ایک اسسٹنٹ مانگو۔ کہو تو میں ان سے بات کروں۔"

"اس کی ضرورت نہیں سر!"

"آئندہ ایسا نہ ہو۔ ورنہ میں تم سے نہیں، اجمل صاحب سے بات کروں گا۔ اب یہ فائلیں لے جاؤ یہاں سے۔"

آفتاب کے جانے کے بعد عبدالحق نے ذوالفقار سے کہا۔

"ہاں! اب بیٹھ جاؤ، کچھ سمجھ میں آیا؟" ذ

"اس کی غلطی نہیں تھی سر! میں نے خود اس سے کہا تھا۔"

"یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آفس کا ڈسپلن بہت اہم ہوتا ہے۔ وہ اسٹینو ہے اور تم ایل۔ ڈی۔ سی۔ یہ درجے اور تنخواہ کا فرق ہے۔ تم اس کے ماتحت نہیں۔ تم اسے نہیں، مجھے جواب دہ ہو۔ یوں تم میری اجازت کے بغیر کسی اور کا کام نہیں کر سکتے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو آفتاب جیسے لوگ تمہیں بے دردی سے استعمال کریں گے۔ یوں تم ان کی حرام خوری میں اضافے کا سبب بنو گے۔ وہ عیش کریں گے اور اپنا کام تم پر ڈال دیں گے۔ اور زیادہ نکمے ہو جائیں گے۔ یہ تو قومی نقصان ہوا نا! اور اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔ اس کے علاوہ وہ موقع بہ موقع تم کو کم تر کہہ کر دبائیں گے۔ ڈسپلن خراب ہوگا، تم اعتماد سے محروم ہو جاؤ گے اور وہ ضرورت سے زیادہ پُراعتماد ہو جائیں گے۔ دفتری طور پر تمہیں اپنے اور دوسروں کے حقوق کا علم ہونا چاہئے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کون سے مقامات ہیں، جہاں تم میرا حکم ماننے سے بھی انکار کر سکتے ہو۔"

ذوالفقار ہونق ہوگیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا۔

"میرے پاس کام نہیں ہوتا سر! تو میں خود کو مجرم سمجھنے لگتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں حرام خوری کر رہا ہوں اور پھر مجھے نکمے پن کی عادت ہو جائے گی۔"

"اس انداز میں سوچنے والا آدمی کبھی حرام خور نہیں ہوسکتا۔ بہرحال کام نہ ہونے کی شکایت ہو تو مجھ سے بات کرو۔"

"جی سر......!"

"تعلیم کہاں تک ہے تمہاری؟"

"میٹرک کیا ہے سر!" ذوالفقار نے شرمندگی سے کہا۔

"تو آگے پڑھو، کتابیں ساتھ لاؤ۔ دفتر میں مصروفیت نہ ہو تو یہاں بیٹھ کر پڑھو۔ تم جیسے لوگوں کو تو آگے جانا چاہئے۔" عبدالحق نے مسعود صاحب کی بھیجی ہوئی آفس رولز کی کاپی اس کی طرف بڑھائی۔

"فی الحال یہ دفتری کام ہے۔ بہت اچھی طرح اسے پڑھو، اپنی حیثیت، حقوق اور فرائض کو سمجھو۔ پھر میں اسے پڑھوں گا اور بعد میں ہم اس پر ڈسکس کریں گے۔ اب جاؤ!"

ذوالفقار بیرونی کمرے میں چلا گیا۔ عبدالحق کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے ذوالفقار کو جو مشورہ دیا تھا، اس نے خود اسے بھی چونکا دیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال تھا، اس نے سوچا، شام کو وہ اس پر مسعود صاحب سے بات کرے گا۔

وہ ایک فائل میں الجھا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شمریز خان اندر آیا۔

"آپ کا ڈرائیور آیا ہے صاحب!"

عبدالحق پریشان ہوگیا۔ خیر تو ہے۔ یعقوب کی یہ بے وقت آمد۔ اس کے دل کی دھڑکن کچھ بے ربط ہوگئی۔

"بھیج دو اسے۔"

شمریز خان گیا اور اگلے ہی لمحے یعقوب اندر آ گیا۔

"خیریت تو ہے یعقوب!" عبدالحق نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"آل رائٹ سر! لنچ فور یو!" یعقوب نے ٹفن اس کے سامنے رکھ دیا۔

عبدالحق کو حیرت ہوئی۔ پریشانی میں اسے ٹفن نظر ہی نہیں آیا تھا، جو کہ یعقوب کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ حیرت دور ہوئی تو وہ اس بات پر حیران ہوا کہ اس کے لئے کھانا آیا ہے، گھر سے، مگر وہ خوش گوار حیرت تھی۔

"کس نے بھیجا ہے؟" اس نے یعقوب سے پوچھا۔

"میم صاحب نے سر!"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔"

عبدالحق کام میں مصروف ہوگیا۔ ایک بجنے میں پانچ منٹ پر اس نے مسعود صاحب سے انٹرکام پر رابطہ کیا۔

"آج میرے گھر سے بھی کھانا آ گیا ہے سر!"

"مبارک ہو۔ تو کیا اب کھانا اپنے آفس میں ہی کھاؤ گے؟"

"نہیں سر! میں تو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اب کھانا زیادہ ہو جائے گا۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے میں اپنے کھانے میں سے اپنے اسٹاف کو دیتا تھا۔ آج پھر ان کا بھلا ہو جائے گا۔ اور ایسے ہی تم اپنے اسٹاف کا بھلا کر دو۔"

"رائٹ سر!"

"بس تو میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" مسعود صاحب نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

عبدالحق نے شمریز کو بلا کر ٹفن اس کی طرف بڑھایا۔

"دو روٹیاں اور تھوڑا سا سالن میرے لئے نکال دو۔ باقی تمہارے اور ذوالفقار کے لئے ہے۔"

شمریز خان نے بڑی شکرگزاری سے اسے دیکھا۔

وہ عبدالحق کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ نوربانو نے اس کے لئے اہتمام کیا، کھانا پکایا اور بھیجا۔ اس نے کبھی کہا تو نہیں تھا۔ لیکن اسے یہ خیال ضرور ستاتا تھا کہ نوربانو کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔

اور جب مسعود صاحب نے کھانے کی تعریف کی تو اس کی خوشی دو چند ہوگئی۔

"یہ بات تو ماننے والی ہے بھئی! کہ نور بیٹی کے ہاتھ میں ذائقہ ہے۔" مسعود صاحب نے کہا۔

"اور سچ یہ ہے کہ آج تمہارے لئے گھر سے کھانا آیا ہے تو مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ جانتے ہو کیوں؟"

"اس لئے کہ اس سے آپ کے اور میرے اسٹاف کا بھلا ہوگا۔"

"نہیں! دراصل مجھے ملال ہوتا تھا کہ نور بیٹی نے تمہارے نئے معمولات کے ساتھ مطابقت نہیں پیدا کی۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ اپنے ہی معمولات میں گم ہے۔ جبکہ ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ میاں بیوی کو ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ خود کو ایک دوسرے کی ضروریات کے مطابق ڈھالنا ہوتا ہے۔ لیکن مجھے

یہ خیال نہیں آیا کہ بڑی تبدیلیوں میں وقت لگتا ہے۔ نور بیٹی نے میرا دل خوش کر دیا۔''

وہ عبدالحق کے لئے ایک اور خوشی تھی۔ اسے نور بانو پر فخر کا احساس ہوا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ دوسرے بھی ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرتے ہیں، اور ان سے نتائج بھی اخذ کرتے ہیں۔

نور بانو نے اس کی اور اپنی عزت رکھ لی تھی۔

❁ ❁ ❁

اس رات جب وہ سونے کے لئے لیٹے تو عبدالحق نے نور بانو کا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے کہا۔

''میں تمہارا شکرگزار ہوں نور بانو!''

''ارے! ایسا کیا کر دیا میں نے؟''

''بعض کام کرنے والوں کو چھوٹے اور غیر اہم لگتے ہیں۔ لیکن جن کے لئے کئے جائیں، ان کے نزدیک بڑے اور اہم ہوتے ہیں۔''

''کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہیں؟''

''تم نے جو آج کھانا بھجوایا، میں اس کی بات کر رہاں ہوں۔''

وہ خواب گاہ کا اندھیرا تھا، جس نے پردہ رکھ لیا۔ ورنہ نور بانو کی حیرت چھپنے والی نہیں تھی۔ تاہم اس نے بڑی تیزی سے خود پر قابو پا لیا۔

''اوہو! اس میں کیا خاص بات ہے؟'' اس نے اقرار نہ انکار والے انداز میں کہا۔

''میرے لئے اس کی اہمیت ہے۔ یہ تم نہیں سمجھ سکو گی۔''

نور بانو کے اندر اپنے لئے ملامت اُبھری۔ وہ واقعی اس بات کی اہمیت نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن جب شوہر کے لئے ایک بات کی اہمیت ہو تو پھر اسے اہم ہی سمجھنا چاہئے۔ یہ بات تو اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے سوچا، اس کوشش کرے گی کہ ہر روز عبدالحق کو کھانا دفتر بھجوائے۔

''یہ بتائیں، کیسا لگا آپ کو؟''

''بہت اچھا! جیسا تم ہمیشہ پکاتی ہو، اس سے بہت اچھا۔ یوں سمجھ لو، اتنا اچھا تم نے پہلے کبھی نہیں پکایا۔''

''واہ! کمال ہے۔'' نور بانو نے کہا۔

''اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی، آپ کا کیا خیال ہے؟''

''کھانا محبت سے پکایا جائے تو اس کا ذائقہ بہت بڑھ جاتا ہے۔''

ہاں، یہ تو ہے۔ نور بانو نے دل میں سوچا۔ بلاشبہ ارجی ہر کام بڑی محبت سے کرتی ہے۔ اور اس نے عبدالحق سے کہا۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ کو اس سے خوشی ملی۔''

عبدالحق نے ہاتھ بڑھا کر بڑی نرمی سے اسے چھوا۔ وہ محبت اور خوشی کو کئی گنا بڑھا کر واپس دینے والا آدمی تھا۔

پھر جب عبدالحق سو گیا تو نور بانو کو اس پر سوچنے کا موقع ملا۔ اس معاملے نے اس پر سوچوں کے کئی دروازے کھول دیئے تھے۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سو وہ اندھیرے میں لیٹ کر سکون سے سوچ سکتی تھی۔

حمیدہ نے یہ بات اسے سمجھائی تھی کہ محبت اور ازدواجی زندگی، دونوں میں خیال رکھنے کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔ اس نے اسی بات کی تلقین کی تھی لیکن اس نے اسے نظرانداز کر دیا تھا۔ مگر اب اس کی سچائی اور اہمیت اس پر روشن ہوگئی تھی۔

اب یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ ارجمند کو کھانا پکانے کا شوق ہوگیا۔ اور شاید اعتماد کی کمی کی وجہ سے اس نے رات کا کھانا پکانے کے بجائے دن کا انتخاب کیا۔ اور قدرتی بات ہے کہ اسے عبدالحق کو کھانا بھیجنے کا خیال آیا۔

اب سوال یہ تھا کہ عبدالحق نے یہ کیوں سمجھا کہ کھانا اس نے ہی بھیجا ہے۔ اس کے کئی ممکنہ جواب تھے۔ پہلا یہ کہ اس نے خود ہی یہ فرض کر لیا ہوگا۔ اسے تو یہ معلوم بھی نہیں ہوگا کہ ارجمند کو کھانا پکانا آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ عبدالحق نے یعقوب سے پوچھا ہوگا اور ارجمند نے یعقوب کو کھانا نسیمہ کے ہاتھ بھجوایا ہوگا۔ تو یعقوب نے اپنے طور پر یہ فرض کر لیا ہوگا کہ کھانا میم صاحب نے

بھجوایا ہے۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ بات نسیمہ نے اس سے کہی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود ارجمند نے ہی اس کا نام استعمال کیا ہو۔

اب اس وقت تو یہ معاملہ صاف نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ چھان بین تو کل ہی ہوسکتی تھی۔

اس نے کروٹ بدلی اور آخری بات پر غور کرنے لگی۔ ارجمند نے اس کا نام استعمال کیا تو کیوں؟

اس کا جواب بہت آسان تھا۔ ابھی ارجمند کو اپنی صلاحیت پر اعتماد نہیں تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اس کا نام استعمال کرے، تاکہ کھانے میں کوئی کمی یا خرابی ہو تو عبدالحق اس کی محبت کی وجہ سے خاموشی سے برداشت کرلے۔

ایک لمحے کو اسے برا لگا۔ یہ تو بہت بری بات ہے کہ ارجمند اسے اس طرح استعمال کرے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کی ناگواری دور ہوگئی۔ اس سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ ارجمند سے کیسی محبت کرتی ہے۔ ورنہ یہ حرکت تو وہ کسی کی بھی برداشت نہ کرتی۔

ارجمند بچی ہی تو ہے۔ اس نے سوچا۔ بچے ڈانٹ سے ڈریں تو اس بڑے ہی کو تو آگے کرتے ہیں، جو ان سے محبت کرتے ہوں اور جن سے وہ محبت کرتے ہوں۔

ایک لمحے کو اسے یہ خیال بھی آیا کہ یہ ارجمند کا ایثار بھی تو ہوسکتا ہے۔

لیکن اس نے اس خیال کو فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا۔

وہ سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ اس نے سوچا کہ صبح وہ جلدی اٹھے گی، اور وہ سب کچھ کرے گی، جس کی حمیدہ نے نصیحت کی تھی۔ لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہرگزرتے لمحے کے ساتھ وہ صبح اٹھنے کے خیال سے مایوس ہوتی جا رہی تھی۔

اور جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ صبح سویرے نہیں اٹھ سکے گی تو اس نے دل میں سوچا کہ عبدالحق کی محبت ان سب باتوں سے بلند اور بے غرض ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن سونے سے پہلے کی عبدالحق کی محبت اور اس کی گرم

جوشی اس بات کی تردید کر رہی تھی۔

بہرحال اس سے سویا نہیں گیا تو وہ اٹھی اور دبے پاؤں اسٹڈی کی طرف چل دی۔

❁ ❁ ❁

صبح وہ اپنے معمول سے بھی دیر سے اٹھی۔ اس لئے کہ وہ رات کو اور دیر سے سوئی تھی۔

غسل خانے میں نہاتے ہوئے وہ سوچتی رہی کہ کھانے والے معاملے کی تفتیش کس طرح کرے؟ پہلے نسیمہ سے پوچھے۔ لیکن ممکن ہے کہ نسیمہ کو اس بات کا علم یہ نہ ہو۔ یعقوب سے پوچھا جائے؟ لیکن پھر اس کی سمجھ میں بات آگئی۔ نوکروں کو اس معاملے میں ملوث کرنا ٹھیک نہیں۔ جب ارجمند سے حقیقت معلوم ہوسکتی ہے تو نوکروں کو منہ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟

اور جب اس نے ارجمند سے پوچھا تو اسے خوشی ہوئی کہ اس کا فیصلہ درست تھا۔

وہ ناشتہ کر رہی تھی اور ارجمند اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

''ارجی! تم نے اپنے آغا جی کو کھانا بھجوا دیا؟'' اس نے ارجمند سے پوچھا۔

''جی آپی!''

''نسیمہ کے ہاتھ بھجوایا ہوگا؟'' اس نے بے حد سرسری انداز میں استفسار کیا۔

ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''نہیں آپی! یہ کام تو یعقوب ہی کرسکتا ہے نا!''

''تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ میرا مطلب تھا کہ یعقوب کے پاس تم نے نسیمہ کو بھیجا ہوگا ٹفن دے کر؟''

''نہیں آپی! میں نے خود ٹفن دیا تھا اسے۔''

''اور تم نے کچھ کہا بھی تھا اس سے؟''

"جی! میں نے کہا تھا کہ صاحب پوچھیں تو کہنا کہ کھانا میم صاحب نے بھجوایا ہے۔"

نور بانو اب اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"یعنی میں نے......؟"

"جی آپی!"

"اور ایسا کیوں کیا تم نے؟ جبکہ کھانا تم ہی نے پکایا اور تم ہی نے بھیجا؟"

"آپ کا نام آئے گا تو آغا جی کو اتنی خوشی ہوگی کہ اور کسی طرح ہو ہی نہیں سکتی۔" ارجمند نے بلا جھجک جواب دیا۔

جواب بے ساختہ تھا، اور اس میں بناوٹ نہیں تھی۔ لیکن نور بانو کی تسلی نہیں ہوئی۔

"لیکن ارجی! انہیں کھانا اچھا نہیں لگا تو بری بھی تو میں ہی بنوں گی؟ یہ نہیں سوچا تم نے؟"

ارجمند کا چہرہ فق ہوگیا۔

"اللہ! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا آپی!" یہ کہہ کر وہ سوچنے لگی۔ پر کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ایک ترکیب ہے آپی! جب کبھی ایسا ہو تو آپ کہہ دیجئے گا کہ آج کھانا ارجمند نے پکایا تھا۔ بہت ضد کر رہی تھی۔ ٹھیک ہے نا آپی!"

"مگر تمہیں مجھے بتانا تو چاہئے تھا۔ اگر رات وہ پوچھ لیتے تو......؟"

"معاف کر دیں آپی! اس بات کا بھی مجھے خیال نہیں آیا تھا۔ خیر! اب ایسا ہی کریں گے۔"

نور بانو کے لئے وہ مقام حیرت تھا۔ کوئی کسی کے لئے بے غرضی سے ایسا بھی کر سکتا ہے۔ نہیں! کوئی نہ کوئی غرض تو ہوگی ہی۔ اس نے خود کو ارجمند کی جگہ رکھ کر سوچا۔ سچی بات یہ تھی کہ وہ کبھی ایسا نہیں کرتی۔ اپنی اچھی کارکردگی کون کسی دوسرے کے نام کرتا ہے۔

ہر شخص دوسروں کو خود پر قیاس کرتا ہے۔ نور بانو کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ بدقسمتی سے اس کی دونوں بہنیں بہت خوب صورت تھیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ خود کو کم از کم قبول صورت تو ضرور سمجھتی۔ لیکن بہنوں کی خوب صورتی ہر پل اسے یاد دلاتی رہتی تھی کہ وہ بدصورت ہے۔ اس کا بچپن احساسِ کم تری کے تکلیف دہ جھولے میں گزرا۔ نہ وہ کبھی اونچی پینگ لے سکی، نہ محبت کرنا سیکھ سکی۔ بلکہ وہ تو ان فطری محبتوں سے بھی محروم ہوگئی، جو اسے حاصل تھیں۔ بہنیں بھی اس کی حریف بن گئیں۔ اسے صرف اپنی بقا کی، خود کو منوانے کی فکر تھی۔ اس چیز نے اس کے وجود کو تلخی سے بھر دیا۔

یہی وجہ تھی کہ اب جبکہ محبت...... اور وہ عبدالحق جیسے مرد کی محبت سمیت اسے دنیا کی ہر نعمت حاصل تھی تو ارجمند کو دیکھ کر اسے اپنی گلنار کی محبت یاد آئی، جو تشنہ ہی رہ گئی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے ارجمند کے ذریعے ماضی کا وہ قرض ادا کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

اب اس وقت وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ ارجمند سے خالص اور سچی محبت کرتی ہے؟ بہت سوچنے پر اسے معلوم ہوگیا کہ اس کا جواب اثبات میں ہے۔ لیکن ابھی تک وہ اپنے اندر کے چھوٹے پن کو دور نہیں کر پائی ہے۔

اسے یاد تھا کہ رات عبدالحق نے بھجوائے ہوئے کھانے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اتنا اچھا کھانا اس نے پہلے کبھی نہیں پکایا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ ارجمند نے پکایا تھا۔ تو کیا ارجمند اس سے اچھا پکانے لگی ہے؟ یہ بات اس نے رات کو بھی سوچی تھی۔ مگر اس کا خیال تھا کہ خلافِ توقع دفتر کھانا بھیجے جانے پر جو عبدالحق کو خوشی ہوئی، اس کے زیرِ اثر اسے کھانا زیادہ ہی اچھا لگا ہوگا۔

مگر وہ کھانا خود اس نے بھی تو کھایا تھا۔ اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی رات کی تاویل خود پسندی کی وجہ سے تھی۔ ورنہ ارجمند نے سچ مچ اس سے بہتر پکایا تھا۔

پھر اسے خیال آیا کہ ارجمند نے پہلے اس سے اجازت لی تھی اور اس اجازت کے تحت وہ کھانا اپنے نام سے بھجوا سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

اور اس نے اس کی تاویل ارجمند میں خود اعتمادی کی کمی کی دی۔ اس نے یہ نہیں سمجھا کہ یہ ارجمند نے اس کی محبت کی وجہ سے کیا ہوگا۔ لیکن اب جو ارجمند نے یہ تجویز کیا کہ عبدالحق کو کھانا برا لگے تو وہ کہہ دے کہ ارجمند نے پکایا ہے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ ارجمند کا عمل صرف اور صرف خلوص اور محبت پر مبنی ہے۔

تو اس وقت جہاں ارجمند کے خلوص اور محبت کی سچائی واضح ہوگئی، ویسے ہی یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آ گئی کہ ارجمند سے اس کی محبت میں ابھی کھوٹ ہے۔ بلکہ یہ کہ ابھی وہ اپنے اندر کے زہر سے پوری طرح چھٹکارا نہیں پا سکی ہے۔ دوسروں کے محرکات کے بارے میں وہ اب بھی تنگ نظر اور بدگمانی سے کام لیتی ہے۔

مثبت بات یہ تھی کہ اسے ارجمند کا اتنا اچھا پکانا اچھا لگا تھا۔ عبدالحق نے کھانے کی جو تعریف کی، اسے تو نہیں معلوم تھا، لیکن وہ تو جانتی تھی کہ درحقیقت وہ ارجمند کی تعریف کر رہا تھا۔ ارجمند کی جگہ کسی اور کا معاملہ ہوتا تو وہ برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں تو اسے الٹا اچھا لگا۔ مطلب یہ کہ وہ ارجمند سے سچ مچ گلنار جیسی محبت کرتی ہے۔ لیکن ابھی اس میں وسیع النظری اور کشادہ دلی کی کمی ہے۔ اس بھی اس نے اپنی توجہ کا مرکز اپنی ذات کو بنا رکھا ہے۔ جبکہ اب یہ بات اس کی سمجھ میں آ چکی ہے کہ محبت لینے کا نہیں، دینے کا نام ہے۔ اس تعریف کی کسوٹی پر اگر وہ خود کو پرکھے تو اب تک اس نے کسی سے بھی محبت نہیں کی ہے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ خود کو بدلے گی۔ محبت کرنا سیکھے گی۔

وہ اٹھی اور اس نے ارجمند کو لپٹا لیا۔

''تم بہت اچھی ہو میری بہن! مجھے تم سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپی!'' ارجمند حیران تھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں ارجی!''

✿ ✿ ✿

ارجمند کے لئے وہ بہت کچھ سوچنے کا مقام تھا۔

وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی، نہ کوئی بہن نہ بھائی۔ اسے ان محبتوں کا تجربہ نہیں تھا۔ لیکن وہ محبت سے بے خبر بھی نہیں تھی۔ ماں، باپ، دادا، دادی اور چاچا، سب اسے محبوب تھے۔ آج بھی اسے ان کو کھونے کا غم تھا۔ اور ان سب کے جانے کے بعد اس کے پاس پھپھو کے سوا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ تمام کھوئی ہوئی محبتیں یک جا ہو کر پھپھو کے نام ہوگئی تھیں۔

پھر اس نے عبدالحق کو دیکھا اور اسے اس سے محبت ہوگئی۔ حالانکہ اس وقت وہ محبت کو سمجھتی بھی نہیں تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ محبت تو اللہ نے اس کے دل میں ڈالی ہے۔ وہ مختلف محبت تھی، یقین دینے والی محبت۔

اس کے بعد اس نے محبت کے اور روپ دیکھے۔ اچھو میاں، جنہیں وہ نانا کہتی تھی، اور عارف، جسے وہ چچا کہتی تھی۔ یوں کہو کہ اسے کم عمری میں ہی محبت کے تنوع سے متعارف کرا دیا گیا تھا۔

اب اس وقت نور بانو نے اسے گلے لگایا تو اسے احساس ہوا کہ بہن کی محبت کیسی ہوتی ہے۔ وہ جانتی تھی، دیکھ چکی تھی کہ نور بانو کتنی سخت ہے۔ لیکن اس کے لئے وہ پھولوں سے زیادہ نرم تھی۔ صرف اس لئے کہ اسے دیکھ کر اسے اپنی مرحوم بہن کا خیال آتا تھا۔ اس میں اس کی مرحوم بہن کی شباہت تھی۔ تو جس بہن سے مشابہ لڑکی کے لئے وہ ایسی نرم ہوگئی، اس بہن سے وہ کتنی محبت کرتی ہوگی۔

اور اس کے ساتھ ہی ارجمند کو خود پر شرمندگی ہونے لگی۔ نور بانو کی اتنی خالص محبت کے بعد وہ آغا جی سے محبت کیسے کر سکتی ہے۔ اگر آپی کو پتا چل جائے تو انہیں کیسا صدمہ ہوگا۔

لیکن جب اس نے آغا جی کو دیکھا تھا تو اسے تو آپی کے وجود تک کا علم نہیں تھا اور آغا جی سے اس نے ارادے سے محبت کب کی تھی۔ وہ تو ایسا تھا کہ جیسے اس کے وجود میں ان کی محبت کا بیج پہلے سے پڑا ہو، جسے ان کی دید نے نمو دے دی۔ وہ محبت تو اسے اللہ میاں نے دی تھی ورنہ وہ تو اس وقت محبت کا جانتی سمجھتی بھی نہیں تھی۔

یہ ارجمند کا واحد دفاع تھا۔

لیکن اب وہ جانتی تھی کہ وہ دفاع اس کے لئے ناکافی ہے۔ بے شک اللہ نے اسے محبت دی۔ لیکن اسے محترم سمجھنا، محترم بنانا تو اس کی ذمہ داری ہے۔ اس محبت کے آداب مختلف ہیں، اور وہ اسے سیکھنے ہوں گے۔ محبت کرنے والی آپی کے شوہر سے محبت کرنے کا اسے کوئی حق نہیں۔ مگر وہ محبت اسے اللہ نے دی ہے، اور وہی اسے یہاں لایا ہے اور اسے ان سب لوگوں سے ملایا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس کے لئے نعمت ہے۔ تو اس صورتِ حال میں اللہ اس سے کیا چاہے گا؟

وہ سوچتی رہی۔ اس سے جم کر سوچا نہیں جا رہا تھا۔ بہرحال یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ اسے آغا جی کی محبت سے لڑنا ہوگا۔ اللہ کی دی ہوئی آغا جی کی محبت سے، یعنی اب وہ کبھی ان کے بارے میں محبت سے نہیں سوچ سکتی۔ اسے ان کے بارے میں تصور کرنے کا بھی حق نہیں۔ وہ اس کے خیالوں میں بھی آئیں تو اسے ان کو جھٹکنا ہوگا۔ بلکہ اصولاً تو اسے ان کی محبت دل سے نکالنے کی مسلسل کوشش کرنا ہوگی۔

اور یہ کتنا مشکل ہے۔ ایک تو ہوتا ہے اپنی خواہش کو مارنا، مگر یہاں تو اس کے برعکس عمل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ وہ تو ہر وقت آغا جی کے بارے میں سوچنا چاہتی ہے، آنکھیں بند کر کے تصور میں انہیں دیکھنا چاہتی ہے۔ ایسے ہی بے اختیار سوچوں کو جھٹکنا، تصور میں ازخود سجنے والی محفل کو درہم برہم کرنا کتنا مشکل ہے۔

لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ چاہے وہ اس کوشش میں ہارے، لیکن یہ کوشش مسلسل کرتے رہنا اس پر لازم ہے۔ یہ اس کی آزمائش ہے اللہ کی طرف سے، اور وہی اس کی مدد بھی کرے گا۔ اور انشاء اللہ اس کوشش کا انعام بھی بڑا ہوگا۔

انعام کا خیال آتے ہی اس نے سوچا، آغا جی سے بڑا انعام اور کیا ہوگا۔ اور اس کے دل نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا، پھر وہی آغا جی کی بات۔ وہ تو

جو اللہ کی مرضی ہے، وہ ہوگا، اور جب وہ چاہے گا، تب ہوگا۔ لیکن مجھے تو اللہ کی دی ہوئی اس محبت سے لڑنا ہے۔

اس رات اس نے نماز کے بعد اللہ سے مدد کے لئے بہت دیر تک دُعا کی۔

✿ ✿ ✿

عبدالحق کی سمجھ میں مسعود صاحب کی بات پوری طرح آگئی تھی۔ اگرچہ اس نے مال و دولت کو ہمیشہ اللہ کی عطا سمجھا تھا۔ صرف عطا بھی نہیں، امانت بھی۔ اور وہ اسے ضرورت مندوں پر خرچ کر کے خوشی محسوس کرتا تھا۔ لیکن اب وہ سول سروس میں تھا۔ یہاں اسے اپنی ثروت کا مظاہرہ کرنا تھا، جتانا تھا۔ ورنہ یہ بات اس کے لئے بے حد تکلیف دہ ہوتی کہ لوگ اشارے کنائے میں بھی اور علانیہ بھی اس پر اللہ کے فضل کو مالِ حرام قرار دیتے۔ اللہ کی دی ہوئی عزت کی رسوائی تو دہرا ظلم ہے۔

اس نے مسعود صاحب کے کہنے کے مطابق اپنے لئے ایک کار خرید لی تھی۔ درحقیقت یہ اس کے پاس تیسری گاڑی تھی۔ پہلی گاڑی خریدنے کے بعد دوسری گاڑی اس نے زبیر کے لئے خریدی تھی۔ اب تو زبیر کو ڈرائیونگ بھی آگئی تھی۔

جس دن اس نے تیسری گاڑی خریدی، اسی دن اس نے مسعود صاحب سے وہ بات بھی کر لی، جو ملازمت کے پہلے دن سے اس کے دل میں تھی۔

''یہ خیال تمہیں کیوں آیا بیٹے!'' مسعود صاحب نے پوچھا۔

''اور پھر معاشیات ہی کیوں؟''

''جب پہلے دن آپ نے مجھے فائلیں دیکھنے کو کہا اور میں نے فائلوں کا سرسری جائزہ لیا، اسی لمحے میں نے اس کا ارادہ کر لیا تھا'' عبدالحق نے کہا۔

''خاص طور پر وہ فائل اس کی تحریک بنی، جسے میں ترجیح دینا چاہتا تھا۔ لیکن اپنی کم علمی کو محسوس کر کے میں نے اسے ڈراپ کر دیا۔ حالانکہ وہ سب سے اہم معاملہ تھا۔''

''کس فائل کی بات کر رہے ہو؟''

''وہ جو پاکستان کے معاشی اور اقتصادی مستقبل کی پالیسی لائن ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔ لیکن بیٹے! معاشیات تو تمہارا مضمون تھا بی۔ اے میں۔ اور تمہارے نمبر اسی مضمون میں تمہاری دلچسپی اور اہمیت کے گواہ ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ جہاں تک میں پہنچا ہوں، وہ تو اس مضمون کی ابتداء ہے۔ میں اس میں صرف ماسٹرز ہی نہیں، ڈاکٹریٹ بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

''خیر! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''میں صرف مطالعے کے ذریعے بھی استعداد بڑھا سکتا ہوں۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''لیکن میں نے ڈگری کی اہمیت بھی سمجھ لی ہے۔ آپ کتنا ہی جانتے ہوں، سند کے بغیر کچھ بھی مستند نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تو بسم اللہ کرو۔ یہ امتحان تو تم پرائیویٹ اُمیدوار کی حیثیت سے بھی دے سکتے ہو۔''

''جی چچا جان! اور میرے سامنے کوئی راستہ بھی نہیں۔''

''لیکن تمہاری مصروفیت بہت بڑھ جائے گی۔ گھر کے لوگوں کو شکایت بھی ہو سکتی ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے چچا جان! گھر میں شکایت کرنے والا کوئی بھی نہیں۔''

''اس کا قاعدہ یہ ہے کہ تم سرکاری طور پر تحریراً مجھ سے اس کی اجازت مانگو۔''

''جی...... بہتر ہے۔''

اس عرصے میں وہ اپنے معمولات میں جم چکا تھا، ان کا عادی ہو چکا تھا۔ دفتر میں اس نے ایک اصول بنا لیا تھا۔ ہر ماہ کے آخری سنیچر کو، جو ہاف ڈے ہوتا تھا، وہ اپنے اسٹاف کے ساتھ ایک غیر سرکاری میٹنگ کرتا تھا۔ اس میں وہ ایک دوسرے سے بے تکلفانہ گفتگو کرتے تھے۔ ذاتی معاملات اور مسائل پر بھی بات ہوتی تھی۔ عبدالحق ان کے ذاتی مسائل کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش

کرتا تھا۔

یہ سلسلہ شروع کرتے ہوئے عبدالحق نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے اتنے مثبت نتائج نکلیں گے۔ پہلی ہی میٹنگ میں اس نے اپنے دونوں ماتحتوں کے پس منظر کو سمجھ لیا۔ وہ دونوں بہت مختلف تھے۔

ذوالفقار لاہور کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی اور امکان تھا کہ اگلے سال اس کی شادی بھی ہو جاتی۔ اس کی ملازمت کو ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے تھے۔

شمریز کا تعلق مری سے تھا۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ اس لحاظ سے لاہور اس کے لئے پردیس تھا۔ اس کے گاؤں کا ایک دوست یہاں کسی بنگلے میں چوکیدار تھا۔ اس نے اپنے صاحب سے شمریز خان کے لئے اجازت لے لی تھی کہ وہ اس کے سرونٹ کوارٹر میں رہ سکتا ہے۔ یہ شمریز کے لئے بڑی سہولت تھی۔

دوسری میٹنگ میں شمریز نے ڈرتے ڈرتے عبدالحق سے کہا۔

''سر! میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔''

''تو جھجک کیوں رہے ہو؟'' عبدالحق نے کہا۔ شاید ابھی اس کے ماتحت اس میٹنگ کے بنیادی فلسفے کو نہیں سمجھ سکے تھے۔

''اس وقت تم لوگ مجھ سے کوئی بات بھی کر سکتے ہو۔ نہ میں افسر ہوں اور نہ تم ماتحت۔ اس وقت ہم دوست ہیں۔''

مگر شمریز اب بھی جھجک رہا تھا۔

''ڈرتا ہوں سر! کہ آپ ناراض نہ ہو جائیں۔''

''پھر وہی بات! اس میٹنگ میں تم مجھ سے آزادی سے بات کر سکتے ہو۔''

''وہ سر! آپ نے اپنے لئے گاڑی لی ہے نا......!''

''ہاں ہاں! آگے بولو!''

''افسر گاڑی چلاتا اچھا نہیں لگتا سر! اس کے پاس ڈرائیور ہونا چاہئے۔''

عبدالحق مسکرایا۔

''بات تو ٹھیک ہے تمہاری۔''

''جی سر جی......!'' اب شمریز پھر جھجک رہا تھا۔

''تو کوئی ڈرائیور ہے تمہاری نظر میں؟''

''جی سر! پر میں اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تو ایک اور بات ہے۔''

''وہ بھی بول دو!''

''ابھی جمعہ کو پچیس دسمبر کی چھٹی ہے سر جی! ہفتے کی چھٹی مل جائے تو میں بچوں کے پاس گھر جا سکتا ہوں۔''

''ذوالفقار! تمہاری درخواست لکھ دے گا۔ میں منظور کر دوں گا، اور کچھ؟''

''جی سر! میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی بچوں کے ساتھ میرے ساتھ چلیں۔''

بچوں کا سن کر عبدالحق کے دل میں ہوک سی اُٹھی۔ وہ تو اس نعمت سے محروم تھا۔ ویسے وہ جانتا تھا کہ بچوں سے شمریز کی مراد فیملی ہے۔ یہ لوگ بیوی کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ بچے ہوں یا نہ ہوں، کہا یہی جاتا ہے کہ بچوں سے ملنے جانا ہے۔

''تمہارا مطلب ہے کہ میں فیملی کے ساتھ مری چلوں؟''

''جی سر!''

''مگر شمریز خان! یہ مری تو پہاڑی علاقہ ہے نا! تو وہاں تو لوگ موسم گرما میں جاتے ہیں۔ اس وقت تو وہاں سردی ہوگی بہت۔''

''سردی تو ہوگی سر! لیکن ایک نظارہ بھی ہوگا۔''

''کیسا نظارہ......؟''

''برف باری کا سر! پچیس دسمبر کو ہر حال میں برف گرتی ہے سر!''

عبدالحق کا دل اشتیاق سے بھر گیا۔ اس نے برف باری کبھی نہیں دیکھی

تھی۔ گھر میں کسی نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ اماں دیکھیں گی تو کتنا خوش ہوں گی۔ اس نے سوچا۔

''لیکن شمریز! برف باری کے بعد تو راستے بند ہو جاتے ہوں گے۔ واپسی کیسے ہوگی؟''

''یہ برف باری کا موسم نہیں ہے سر جی! اللہ کی قدرت ہے کہ پچیس دسمبر کو برف ضرور گرتی ہے۔ بس ایک دن، برف کا سیزن تو آدھے جنوری کے بعد شروع ہوتا ہے سر جی! ہم جمعرات کو چلیں گے اور اتوار کو واپس آجائیں گے۔''

''اور ہم رہیں گے کہاں؟''

''کمال کرتے ہیں سر جی! اپنا گھر ہے نا وہاں!'' شمریز نے کہا۔ پھر اسے عبدالحق کی ہچکچاہٹ کا اندازہ ہوگیا۔

''ویسے سر! وہاں ہوٹل بھی بہت ہیں۔ پر آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کو وہاں بنگلہ مل جائے گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے! ہم چلیں گے۔''

اور شمریز خان خوش ہوگیا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے گرم کپڑوں کا خاص طور پر اہتمام کیا تھا۔ برف باری اس کے لئے محض ایک تصور تھی، جس کا دوسرا مطب نہایت درجہ کی سردی تھی۔ اس نے موزوں اور دستانوں کا بھی خیال رکھا تھا۔

ایک دن پہلے اس نے شمریز سے راستوں اور سڑکوں کے بارے میں استفسار کیا۔

''سڑک تو پکی ہے سر! لیکن راستے خطرناک ہیں۔'' شمریز نے کہا۔

''پہاڑی راستے تو ہوتے ہی خطرناک ہیں۔ ایک طرف پہاڑ ہوتا ہے تو دوسری طرف کھائی۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ میرے ڈرائیور کو ان سڑکوں کا تجربہ ہے یا نہیں؟''

عبدالحق کے لہجے میں تشویش تھی۔

''تو میں حاضر ہوں سر!''

''کیا مطلب؟''

''میں ڈرائیو کرلوں گا سر!''

''تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟''

''ہمارے ہاں بچے ہوش سنبھالتے ہی ڈرائیونگ سیکھ لیتے ہیں سر!'' شمریز نے فخریہ لہجے میں کہا۔

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ یعقوب کی نسبت شمریز ہی بہتر رہے گا۔ وہ راستے اس کے لئے جانے پہچانے ہوں گے۔

''ٹھیک ہے شمریز خان!'' اس نے کہا۔

اس شام عبدالحق نے خاص طور پر شاپنگ کی...... خصوصی شاپنگ۔ اس کے لئے اسے اپنے وجدان کا سہارا لینا پڑا۔ مگر وہ اعتماد سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے مناسب چیزیں خریدی ہیں۔ وہ بس دعا ہی کرسکتا تھا۔

اگلی شام کو وہ روانہ ہوئے۔ ابتداء میں ہی عبدالحق کو اندازہ ہوگیا کہ یعقوب کے مقابلے میں شمریز کہیں اچھا ڈرائیور ہے۔ جبکہ یعقوب بھی بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ مگر شمریز کی خوبی یہ تھی کہ تیز رفتاری کے باوجود وہ اتنے کنٹرول سے ڈرائیو کرتا تھا کہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ لطف آتا تھا۔

جی ٹی روڈ پر ٹریفک رات کو بھی ہیوی تھا۔ مال بردار ٹرکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہ کوئی انسان ڈرائیو نہیں تھی۔ لیکن شمریز خود کو بہت اچھا ڈرائیور ثابت کر رہا تھا۔

رات ڈھائی بجے وہ راولپنڈی پہنچے۔

''اب کیا حکم ہے سر!'' شمریز نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''سفر جاری رکھنا ہے یا یہاں رکنا ہے؟''

''مری تک کتنی دیر کی ڈرائیو ہے۔''

''اس وقت تو تین گھنٹے لگیں گے سر! رات ہے نا۔''

عبدالحق کو خیال آیا کہ راستے خطرناک ہیں۔ پھر اب تک کی ڈرائیو نے سب لوگوں کو تھکا ڈالا تھا۔ خاص طور پر حمیدہ تو بہت زیادہ تھک گئی تھی۔

''رکنا ہی بہتر ہے۔'' اس نے کہا۔

''کسی ہوٹل کا رخ کرو۔''

ہوٹل پہنچ کر عبدالحق نے دو ڈبل بیڈ والے اور ایک سنگل بیڈ والا روم طلب کیا۔ ہوٹل اچھا لگ رہا تھا۔

''سر! میرے لئے کمرے کی ضرورت نہیں۔'' شمریز نے عاجزی سے کہا۔

''کیوں بھئی!''

''تین چار گھنٹے تو باقی ہیں سر! میں یہیں صوفے پر کمر سیدھی کرلوں گا۔'' شمریز نے لابی میں پڑے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔''

ایک کمرے میں حمیدہ اور ارجمند اور دوسرے میں عبدالحق اور نوربانو چلے گئے۔ سب لوگ نڈھال ہو رہے تھے۔ فوراً ہی سو گئے۔ لیکن عبدالحق نے شمریز کے کمرے کا رخ کیا۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔ شمریز نے دروازہ کھولا۔

''آیئے سر!''

عبدالحق اندر چلا گیا۔

''سوری! میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔'' اس نے معذرت کی۔

''ارے نہیں سر!'' شمریز نے شرمندگی سے کہا۔

''کیا حکم ہے سر!''

''صبح کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ کس وقت نکلنا ہے؟''

''جب آپ کا حکم ہوگا سر!''

"میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ تمہیں ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔"

"آپ لوگ تھکے ہوئے ہیں۔ نیند پوری کرنا چاہیں گے، ورنہ......"

شمریز کی بات اُدھوری تھی۔

"تم بے فکر ہو کر بتاؤ کہ بہتر کیا ہے۔ ہماری تھکن اور نیند کو بھول جاؤ۔"

"تو سر! فجر کے بعد ناشتہ کر کے نکلنا چاہئے۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے برف گر گئی تو مجھے شرمندگی ہوگی۔"

"برف باری کس وقت ہوتی ہے؟"

"اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے سر!" شمریز نے بے بسی سے کہا۔

"بس بڑے دن پر ہوتی ضرور ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، فجر کے بعد ہم چل دیں گے۔ اور کوئی بات؟"

"جی سر! ناشتہ بہت ہلکا کرنا ہوگا۔ بس چائے یا کافی اور دو چار بسکٹ۔"

"اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"جی سر! پہاڑی سڑکیں چکر دار ہوتی ہیں۔ پیٹ بھرا ہو تو اُلٹیاں ہونے لگتی ہیں۔"

"اوہ......!" عبدالحق کو یاد آ گیا۔ ایک پہاڑی سفر تو وہ بھی کرتا رہا تھا۔ ماسٹر جی سے ملنے کے لئے۔ لیکن اسے تو چکر بھی نہیں آئے تھے۔ بہر حال عورتوں کا معاملہ مختلف تھا۔

"ٹھیک ہے شمریز! انشاء اللہ صبح ملاقات ہوگی۔" اس نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔

✿ ✿ ✿

صبح سات بجے مری کے لئے ان کے سفر کا آغاز ہوا۔

نیند تو کسی کی بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کیفیت سب کی الگ الگ تھی۔ شمریز خان اور عبدالحق دونوں تازہ دم تھے۔ عبدالحق کو اس روز یاد آیا کہ

ایک زمانے میں اس کے لئے محض دو گھنٹے کی نیند بھی کافی ہوتی تھی۔ وہ زمانہ تھا، جب وہ باقاعدگی سے تہجد پڑھا کرتا تھا۔ پھر فجر کی نماز اور اس کے بعد تلاوتِ قرآن پاک۔

اسے اتنی شدت سے احساسِ زیاں ہوا کہ آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ارے...... وہ کہاں سے چلا تھا، اور کہاں آ پہنچا۔ اتنے عرصے میں کتنی محرومیاں اس نے کما لیں۔ یہ سب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ اس وقت سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ اس وقت تو وہ بس اس کا دکھ ہی کر سکتا تھا۔

خواتین کا سب کا برا حال تھا۔ لیکن نور بانو تو تقریباً سو ہی رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے لئے رات کو دیر سے سونا تو معمول کے مطابق تھا۔ لیکن اتنی صبح اٹھنا تو اس کے لئے نئی بات تھی۔ کتنے برس ہو گئے تھے کہ وہ گیارہ بجے سے پہلے اٹھی ہی نہیں تھی۔

سو وہ اٹھ تو گئی تھی، لیکن درحقیقت سو ہی رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود سردی کا احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔

دوسری کھڑکی کے ساتھ حمیدہ بیٹھی تھی۔ نیند تو اس کی پوری نہیں ہوئی تھی، لیکن دن میں سونے کی اسے عادت نہیں تھی۔ اب تو وہ بس عشاء کے بعد یہ سو سکتی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہی لاہور جیسی سڑکیں، کوئی نئی بات نہیں۔ اسے اس سفر میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو بس عبدالحق کی خوشی کے لئے چلی آئی تھی۔ ہاں یہ تجسس ضرور تھا کہ برف کیسے گرتی ہوگی۔ اس نے تو عمر بھر آسمان سے ریت اور گرمی ہی برستے دیکھی تھی۔

اور ارجمند ان دونوں کے بیچ میں بیٹھی تھی۔ نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اسے کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔ سوائے اس کہ رہ رہ کر نیند کی ہوا کا ایک جھونکا آتا اور وہ ایک جھپکی لے لیتی۔ درحقیقت وہ جھپکی بھی اسے بری لگ رہی تھی۔ پاکستان آنے کا سفر اسے ہلکا ہلکا یاد تھا، اور وہ خوش گوار نہیں تھا۔ اور اس کا انجام تو برسوں ناخوش گوار رہا تھا۔ لیکن یہ سفر اسے خوشی دے رہا تھا۔ اس ناخوش گوار

سفر کے بعد یہ اس کا پہلا سفر تھا۔ لاہور سے راولپنڈی کا سفر اگرچہ رات میں ہوا تھا مگر اسے بہت اچھا لگا تھا اور یہ سفر اسے اور بھی اچھا لگ رہا تھا۔ ایک تو صبح کی اپنی خوب صورتی، پھر راستے بھی خوب صورت۔ وہ بہت خوش تھی۔ لیکن بیچ میں ہونے کی وجہ سے وہ بے چین تھی۔ کبھی وہ ایک طرف کی کھڑکی سے دیکھنے کی کوشش کرتی، کبھی دوسری کھڑکی سے۔

تھوڑی دیر بعد چڑھائی کا سفر شروع ہوگیا۔ ماسٹر جی کے حوالے سے عبدالحق کو وہ راستے اور وہ سفر جانا پہچانا لگ رہا تھا۔

''تو اب اصل سفر شروع ہو رہا ہے؟'' اس نے شمریز خان سے کہا۔

''جی سر! اب ہم اوپر ہی اوپر جائیں گے۔''

نور بانو سو رہی تھی۔ ارجمند نے اس کی طرف ہوتے ہوئے باہر دیکھا۔ چکردار سڑک اوپر ہی اوپر جا رہی تھی۔ اسے اپنا دل جھولے پر پینگیں لیتا محسوس ہوا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔

پھر ذرا ہی دیر میں وہ حیران ہوگی۔ کھائی کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ پتا بھی نہیں چلا تھا اور وہ اتنے اوپر آگئے تھے۔ کیا اور اوپر جائیں گے؟ اس نے خوشی سے سوچا۔

اسی وقت نور بانو ایک جھٹکے سے جاگ اٹھی۔ اس کا دل گھبرایا تھا، اور گھبراہٹ کی وجہ سے اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اسی لمحے اس نے کھڑکی سے دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اسے ایسا لگا کہ وہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہے، اور گرنے والی ہے۔ ساتھ ہی اس کا جی متلانے لگا۔

''میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔

عبدالحق نے پلٹ کر اسے دیکھا، اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

''تم ارجمند سے جگہ بدل لو۔'' اس نے تجویز پیش کی۔

یوں ارجمند کو بغیر کہے، بغیر مانگے وہ جگہ مل گئی۔ جو وہ چاہتی تھی۔

اب وہ مزے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اب اسے سب کچھ زیادہ بہتر طور پر نظر آ رہا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ دنیا بہت...... بہت بڑی ہے۔

کھڑکی سے نظر آنے والا وسیع منظر کا ایک چھوٹا سا حصہ اسے اتنا بڑا لگ رہا تھا تو وہ پورا منظر کتنا بڑا ہوگا۔ اور دنیا ایسے بہت بڑے بڑے اور بے شمار مناظر پر محیط ہے۔ اسے اپنا وجود بھی بڑا بڑا محسوس ہونے لگا۔

''سبحان اللہ! سبحان اللہ!'' حمیدہ کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔

''کیسی قدرت ہے میرے ربّ کی۔ اس نے پہاڑوں پر راستے بنائے ہمارے لئے۔ ورنہ پہاڑ کو دیکھ کر کون سوچ سکتا ہے کہ وہ اس پر چل سکتا ہے، رہ سکتا ہے۔''

''بے شک اماں! اللہ نے زمین پر، پہاڑوں پر، سمندر میں اور آسمان میں، ہر جگہ راستے بنائے ہیں۔ تاکہ انسان ان میں آزادانہ چل پھر سکے۔ یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کا احسان ہے۔''

شمریز کو اس بات پر بہت حیرت ہوئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بول پڑا۔

''آسمانوں میں اور سمندروں میں بھی راستے ہیں سر!'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''ہاں شمریز خان!''

''لیکن وہ نظر تو نہیں آتے سر!''

''آدمی غور سے دیکھے تو نظر آتے ہیں شمریز خان! دراصل راستے نشانیوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ غور کرنے پر وہ نشانیاں نظر آتی ہیں، اور راستوں کا تعین ہوتا ہے۔ سمندر میں جہاز چلانے والے ناخداؤں کو اور فضا میں جہاز اڑانے والوں کو وہ راستے نظر آرہے ہوتے ہیں۔ وہ اندھا دھند تو نہیں اڑتے۔ ورنہ آئے دن جہاز ٹکراتے۔ اب بھی کہیں کوئی جہاز ٹکرائے تو اس کا سبب کی ایک کا کسی وجہ سے راستہ سے بھٹکنا ہوتا ہے۔''

''تھوڑا تھوڑا تو میں سمجھ گیا سر!''

ارجمند نے یہ گفتگو سنی، پھر دوبارہ کھڑکی سے باہر کے منظر کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اتنے لمبے اور اونچے درخت اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اور وہ اس

ترتیب سے لگے ہوئے تھے کہ دیکھ کر لگتا تھا کہ پہاڑی چوٹی سے وہ کسی فوج کی طرح اترتے آرہے ہیں۔ لمبے تڑنگے سپاہی جو قطار در قطار منظم انداز میں اتر رہے ہوں۔ اس کے دل میں ہیبت بھر گئی۔

پھر اسے احساس ہوا کہ گاڑی کی آواز بدل گئی ہے اور رفتار بھی کم ہوگئی ہے۔ گاڑی کی آواز سن کر اسے ایسا لگ رہا تھا، جیسے کوئی شخص دوڑتے دوڑتے تھک کر ہانپنے لگا ہو، اور اب اسے چلنا مشکل ہو رہا ہو۔

اسی لمحے عبدالحق نے شمریز خان سے یہ بات پوچھ لی۔

''چڑھائی کا سفر ہے نا سر! تو انجن پر بوجھ پڑتا ہے۔ انجن گرم ہو جاتا ہے۔''

''تو یہ خطرناک ہوا نا!''

''اگلے موڑ پر ایک جگہ آئے گی سر! وہاں گاڑی روکیں گے دس پندرہ منٹ، اور پانی بھی ڈالیں گے۔''

اور دس منٹ بعد وہ مقام آگیا۔

❁ ❁ ❁

جہاں شمریز خان نے گاڑی روکی، وہاں سامنے ہی ایک بڑی سی جھونپڑی کی شکل میں ایک چائے خانہ تھا۔ شمریز نے وہاں بیٹھے ہوئے ایک کم عمر لڑکے سے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے کو کہا۔ عبدالحق بھی گاڑی سے اُتر آیا تھا۔

پانی ڈالتے ہی گاڑی سے جو دھویں کا بادل اٹھا تو عبدالحق گھبرا گیا۔

''یہ کیا؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اس سے اندازہ لگائیں صاحب کہ انجن پر کتنا بوجھ پڑا ہے۔'' شمریز نے کہا۔

''اوپر آنے والی تمام گاڑیاں یہاں رکتی ہیں سر! گرمیوں میں یہاں پانی بہت ہوتا ہے۔ وہ اوپر سے آتا ہے۔'' اس نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

عبدالحق نے اشارے کی سمت دیکھا۔ پانی اب بھی تھوڑا تھوڑا آرہا تھا۔ لیکن نشانات اور نمی سے پتا چلتا تھا کہ کبھی وہ خاصا بڑا جھرنا سا رہا ہوگا۔

''تو اب کیا ہوگیا؟'' اس نے پوچھا۔

''سردیوں میں پانی کم ہو جاتا ہے نا سر!'' شمریز نے جواب دیا۔ پھر پوچھا۔

''چائے پئیں گے سر!''

گرم کپڑوں کے باوجود سردی ہڈیوں تک میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ چائے تو اس وقت کی بہت بڑی ضرورت تھی۔ عبدالحق گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی میں نوربانو باقاعدہ سو رہی تھی۔ ارجمند نے کھڑکی کا شیشہ اُتار لیا تھا۔ اس نے ارجمند سے پوچھا۔

''چائے پیئو گی؟'' ارجمند نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔

''اماں سے بھی پوچھ لو۔''

چائے سے وہاں کون انکار کرسکتا تھا۔

''آغا جی! میں نیچے آسکتی ہوں۔'' ارجمند نے دبی دبی سی آواز میں پوچھا۔

عبدالحق کو ہنسی آگئی۔

''اگر تمہاری ٹانگیں سن نہیں ہوئی ہیں تو بالکل آسکتی ہو۔''

اور اگلے ہی لمحے ارجمند درواز کھول کر باہر آگئی۔ گہری سانس لے کر اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ کار میں بیٹھے ہوئے وہ منظر اسے حقیقی نہیں، بلکہ کسی مصور کی بنائی ہوئی خوب صورت تصویر لگ رہا تھا۔ مگر باہر آکر اسے احساس ہوا کہ وہ حقیقی ہے۔

شمریز چائے کے لئے کہنے چلا گیا تھا۔ ارجمند سامنے پہاڑ کو دیکھتی رہی۔ چوٹی تک وہی فوجیوں کی طرح درخت چلے گئے تھے۔ مگر ان میں زیادہ تر ٹنڈ منڈ درخت تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے، جن پر پتے موجود تھے۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اور وہ عجیب سے لگ رہے تھے۔

شمریز چائے کے ساتھ آگیا۔ چائے لانے والے لڑکے نے ایک پیالی گاڑی میں بیٹھی حمیدہ کو دے دی۔

"یہ سارے درخت سوکھے ہوئے کیوں ہیں آغا جی!" ارجمند نے عبدالحق سے پوچھا۔

"یہ خزاں کا موسم ہے نا! اس میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ اسی لئے اس موسم کو پت جھڑ بھی کہتے ہیں اور یہ سوکھے ہوئے درخت نہیں ہیں ارجی! یہ زندہ ہیں۔ بہار آئے گی تو نئے پتے نکلیں گے اور یہ پھر سے ہرے بھرے ہو جائیں گے۔"

"مگر یہ کچھ درخت ہرے بھرے بھی تو ہیں۔ ان کے پتے کیوں نہیں جھڑے؟"

عبدالحق چکرا گیا۔ یہ بات تو اسے بھی نہیں معلوم تھی۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم!"

"میں بتاؤں سر!" شمریز نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ضرور بتاؤ شمریز!"

"چوڑے پتے والے درختوں پر خزاں آتی ہے سر! پر نکیلے پتوں والے درخت سدا بہار ہوتے ہیں۔"

عبدالحق خوش ہوا کہ اسے ایک نئی بات معلوم ہوگئی۔

پھر چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے ارجمند سڑک کے اس طرف چل دی۔ وہاں پہاڑ نہیں تھا۔ وہ وہاں کا منظر دیکھنا چاہتی تھی۔

شمریز خان نے بے ساختہ اسے پکارا۔

"رک جائیں بی بی جی!"

ارجمند نے پلٹ کر دیکھا۔

شمریز اب اپنی اضطراری پکار پر شرمندہ ہو رہا تھا کہ اسے بی بی جی کو براہِ راست نہیں پکارنا چاہئے تھا۔ وہ عبدالحق سے مخاطب ہوگیا۔

"اس طرف کھائی ہے نا سر! اس کا دھیان کر کے ادھر جانا چاہئے۔"

عبدالحق اس کے انداز کو سمجھ گیا اور اسے یہ بات بہت اچھی لگی۔

"آؤ! تم بھی آ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ ارجمند کی طرف بڑھ گیا۔ جو وہیں

رکی ہوئی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

عبدالحق نے شمریز کی کہی ہوئی بات اسے سمجھائی۔ پھر بولا۔

"اب چلو!"

اور وہ واقعی کافی گہری کھائی تھی۔ خاصا پیچھے رکھ کر نیچے دیکھنے کے باوجود ایک لمحے کے لئے ارجمند کو چکر سا آیا۔ مگر پھر وہ سنبھل گئی اور نیچے دیکھنے لگی۔

وہ بڑا خوب صورت، لیکن پُراسرار سا منظر تھا۔ یہاں فوجی درخت نیچے کی جانب جاتے محسوس ہو رہے تھے۔ ارجمند کو ان میں باقاعدہ تحرک کا احساس ہو رہا تھا۔

"خوب صورت!" اس نے زیرلب کہا۔

اوپر کی طرف قدرے روشنی تھی۔ لیکن نیچے بتدریج اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ خاص طور پر جہاں پتوں والے درخت تھے، وہاں اندھیرا زیادہ تھا۔ حالانکہ درخت زیادہ گھنے نہیں تھے۔ اور اسی اندھیرے ہی کی وجہ سے وہ منظر پُراسرار لگ رہا تھا۔

اچانک بادلوں میں سے سورج نے ایک جھلک دکھائی، اور وہ پورا منظر جگمگا گیا۔ ہلکی ہلکی دُھوپ نکل آئی تھی، جو ٹھنڈک کو تم کم نہیں کر سکی تھی۔ مگر اس نے منظر کو جیسے سنہرے رنگ سے رنگ دیا تھا۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ اس منظر کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر لینا چاہتی تھی۔

عبدالحق اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"ڈر لگ رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی نہیں! اس منظر کو دیکھ کر تصویر بنانے کو جی چاہتا ہے۔" ارجمند نے بے ساختہ سچائی سے جواب دیا۔

"ارے ہاں! تم تو بہت اچھی تصویریں بناتی تھیں۔" عبدالحق نے کہا۔

"اب بھی بناتی ہو کیا؟"

''جی نہیں!''

عبدالحق نے پوچھا۔

''کیوں؟''

''ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔'' ارجمند نے سادگی سے کہا۔

''لیکن آج جی چاہا ہے۔''

عبدالحق کو اس پر بہت کچھ یاد آ گیا۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ ارجمند کیا کہہ رہے ہے۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم یہاں سے بہت کچھ لے کر جاؤ گی۔''

''جی ہاں!''

''صاحب! اب چلیں۔'' شمریز خان نے انہیں چونکا دیا۔

✿ ✿ ✿

ہوٹلوں کے سائن بورڈ دیکھ کر عبدالحق کو اندازہ ہوا کہ وہ منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ اس نے شمریز کی طرف دیکھا، جو اب بہت کم رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں عبدالحق کو لگا کہ شمریز کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن جھجک رہا ہے۔

''تمہیں کچھ کہنا ہے شمریز؟'' اس نے کہا۔

''جی سر!'' شمریز اب بھی جھجک رہا تھا۔

''آپ برا تو نہیں مانیں گے؟''

''ارے نہیں شمریز! جو دل میں ہے، بے فکری سے کہو۔''

''یہ بات تو میں خود تم سے کہنے والا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔ شمریز حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''بات یہ ہے شمریز کہ ناشتہ ہم تمہارے گھر ہی کریں گے۔''

شمریز نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ اب وہ پرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صاحب نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اب یہ ان کا بڑا پن ہے کہ انہوں نے اس کی اَن کہی اِلتجا کو اپنی فرمائش بنا دیا۔

لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عبدالحق اس کے گھر کے ہر ہر فرد کے

لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لایا ہے۔ صاحب لوگ ملازموں کی بات کہاں غور سے سنتے ہیں۔ لیکن یہ صاحب مختلف تھا۔ اس نے اس کو اپنے گھر کے لوگوں کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ اسے یاد تھا۔ اسے اس کے گھر کا ہر فرد یاد تھا۔

وہ ایک بڑے کمرے میں تھے، جو آرائش کے اعتبار سے بہت سادہ، لیکن بہت آرام دہ تھا۔ آتش دان کی وجہ سے کمرے میں بڑی خوش گوار تمازت تھی۔ وہاں بیٹھنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ باہر کتنی سردی ہے۔

شمریز نے عبدالحق کو اپنے باپ اور چھوٹے بھائی سے ملوایا۔ اس کے بھائی کا نام نوریز تھا۔ اس کی عمر کے بارے میں عبدالحق کا اندازہ تھا کہ وہ انیس بیس برس کا ہوگا۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قد تھا۔ چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔

''شمریز آپ کی بہت تعریف کرتا ہے صیب!'' شمریز باپ کا لہجہ شمریز سے بہت مختلف تھا۔

''شمریز خود بہت اچھا ہے نا جناب! اس لئے۔''

ذرا دیر میں ہی انہیں ناشتہ مل گیا۔ وہی عام سا ناشتہ تھا۔ فرائی انڈے اور پراٹھے۔ لیکن نہ جانے کیوں، بہت مختلف اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ان سبھی نے طبیعت سے ناشتہ کیا۔

ناشتہ کے بعد شمریز نے اپنے باپ کو کہا۔

''بابا! چابی مجھے دے دو۔''

''ہاں پتر! یہ لے۔'' باپ نے چابی اس کی طرف بڑھائی۔

''اور میں بھی پیچھے ہی آتا ہوں۔''

''نوریز کو بھی ساتھ لے آنا بابا!''

وہ لوگ باہر آ گئے۔ ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ احساس ہو رہا تھا کہ سردی بڑھ گئی ہے۔

نوربانو کی نیند تو پوری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ جاگ چکی تھی اور حیرت سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی، جیسے کسی نے بے ہوش کر کے اسے

اس اجنبی مقام پر پہنچا دیا ہو۔ پھر اس نے بڑے بے زار لہجے میں عبدالحق سے کہا۔

''لاہور میں سردی کچھ کم تھی آپ کے لئے کہ یہاں لے آئے۔''

''یہ خوب صورتی نہیں نظر آ رہی ہے تمہیں؟'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

''کیسی خوب صورتی؟ ٹنڈ منڈ درخت ہیں۔ مٹیالے پہاڑ ہیں۔ سبزے کا نام و نشان نہیں......''

''تو یہ تو پت جھڑ کا موسم ہے نا!''

''میں نے کب کہا تھا کہ پت جھڑ میں یہاں لائیں؟ بہار میں لے آتے۔''

عبدالحق کھسیا کر چپ ہو گیا۔

''آپ بھول گئیں آپی! کہ ہم یہاں برف باری دیکھنے آئے ہیں۔'' ارجمند نے کہا۔

''تو کہاں ہو رہی ہے برف باری؟'' نوربانو بری طرح چڑھی ہوئی تھی۔

''ہوگئی ہوتی تو مزہ خراب ہو جاتا۔ جب ہو تو دیکھئے گا۔''

گاڑی ایک بنگلے کے سامنے رُکی تو گفتگو کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ شمریز اترا اور اس نے لوہے کا گیٹ پر لگا ہوا تالا کھولا، اور پھر گیٹ پوری طرح کھول دیا۔ پھر وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اندر لے گیا۔

وہ لوگ گاڑی سے اُترے، شمریز نے کہا۔

''یہ بنگلہ ہے صاحب! یہاں آپ لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

وہ سبھی جائزہ لے رہے تھے۔ وہ ان کے لاہور کے بنگلے سے کچھ مختلف تھا۔ وہاں بنگلے سے داخل ہوتے ہی بہت بڑا لان تھا۔ جبکہ یہاں ایسا نہیں تھا۔ سامنے بہت تھوڑی جگہ تھی اور وہاں سیمنٹ کا فرش تھا۔ سامنے ہی صدر دروازہ تھا۔ اور بنگلے کے پہلو میں سرونٹ کوارٹرز تھے۔ مگر عبدالحق کو ایک چیز بہت اچھی

لگی۔ سامنے پہلی منزل پر بنگلے کی پوری چوڑائی میں ایک بہت بڑی گیلری تھی، جس میں تین دروازے نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ تین کمرے ہوں گے۔ گیلری کیا، وہ اچھا خاصا برآمدہ تھا۔ اس نے سوچا، یہاں کرسیاں ڈال کر بیٹھنے میں بہت لطف آئے گا۔

شمریز نے صدر دروازہ کھولا۔

''آپ لوگ چلیں، میں آپ کا سامان لے کر آتا ہوں۔''

اندر داخل ہو کر عبدالحق کو کچھ حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ اندر ہر چیز پر گرد ہوگی۔ نہ جانے بنگلہ کب سے بند ہوگا۔ مگر وہاں نہ تو گرد تھی نہ گھٹن۔

نچلی منزل پر دو کمرے سامنے کی طرف تھے اور تین عقبی سمت میں۔ سامنے کے دو کمروں میں ایک ڈرائنگ روم تھا اور دوسرا ایک بڑا کمرہ تھا۔ لاہور میں اس کی اسٹڈی جیسا۔ مخالف سمت میں تین بیڈ روم تھے۔

شمریز خان سامان لے آیا تھا۔ نوربانو تو نیند سے بوجھل اور بیزار تھی۔ ارجمند سامان رکھنے کی فکر میں لگ گئی۔

''ایک بات کہوں صاحب!'' شمریز نے کہا۔

''کیا بات ہے شمریز!''

''بی بی صاحب سے کہیں کہ سامان کو چھوڑ دیں۔ ابھی میری گھر والی اور بہن آ کر سب سنبھال لیں گی۔ آپ لوگ پہلے بنگلہ تو دیکھ لیں۔'' اس کے لہجے میں بچوں کی سی خوشی اور سنسنی تھی۔

''چلو ٹھیک ہے۔''

لیکن نوربانو نے جانے سے انکار کر دیا۔

''یہاں دیکھنے کو کیا رکھا ہے؟'' اس نے بے زاری سے کہا۔

عبدالحق کو بہت برا لگا۔ اسے شمریز خان کی دل آزاری کا احساس رہا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ تم یہیں بیٹھو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔''

شمریز انہیں زینے کی طرف لے گیا۔ حمیدہ بھی ان کے ساتھ تھی۔

نور بانو کو اکیلے میں ڈر لگنے کا احساس ہوا تو وہ بھی زینے کی طرف لپکی۔

وہ اوپری منزل پر پہنچے۔ عام طور پر اوپر کی منزل نیچے جیسی ہوتی ہے۔ عبدالحق کو حیرت ہوئی کہ وہاں اوپر کی منزل نیچے سے مختلف تھی۔ اوپر سامنے کے رخ پر تین کے بجائے دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ بہت بڑا تھا۔ اس میں دو دروازے تھے، جو گیلری میں کھلتے تھے۔ اور گیلری بہت کشادہ تھی۔ وہاں سے نظر آنے والا منظر بہت خوب صورت تھا۔ سڑک کے اس طرف ڈھلوان تھی، جہاں سر بلند درخت تھے۔

لیکن عقبی حصہ اور زیادہ مختلف تھا۔ کمرے تو وہاں بھی صرف تین تھے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ نیچے کے کمروں کے مقابلے میں کافی بڑے تھے۔ پھر نیچے کے کمروں میں عقبی سمت کھلنے والے دروازے تھے، جبکہ یہاں صرف کھڑکیاں تھیں۔ عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اوپر کے کمرے نیچے والے کمرے سے بڑے کیسے ہو سکتے ہیں۔

پھر شمریز نے ایک کھڑکی کھولی اور پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''اب یہاں سے دیکھئے سر!''

انہوں نے اس کھڑکی سے باہر دیکھا اور حیران رہ گئے۔ سامنے کافی بڑا قطعہ زمین تھا۔ وہ تین چار ایکڑ زمین تو ہوگی۔ اور آگے خاردار تاروں کی باڑھ نظر آ رہی تھی۔ وہ باڑھ تین اطراف میں تھی۔

''یہ زمین......؟''

''یہ اس بنگلے کے ساتھ ہی ہے سر! اور اس زمین پر ایک چشمہ بھی ہے پانی کا۔ گرمی کے موسم میں آپ یہاں آئیں گے تو جنت کا خیال آئے گا۔''

''بے شک! میں اندازہ کر سکتا ہوں۔''

''میں نیچے جاتا ہوں سر! بچے آنے والے ہوں گے۔''

اب عبدالحق کی سمجھ میں اوپر اور نیچے کا فرق پوری طرح آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ نچلی منزل کے کمروں کے دروازے اوپری منزل کے سامنے والے حصے کی طرح ایک گیلری میں کھلتے ہوں گے...... یا اسے برآمدہ کہہ لیں...... اور

اس برآمدے میں ایک دروازہ ہوگا، جو عقبی احاطے میں کھلتا ہوگا۔ اوپر والے کمروں میں وہ برآمدہ بھی شامل تھا۔ اس لئے وہ نچلے کمروں سے زیادہ بڑے تھے۔

نیچے جا کر اس نے چیک کیا تو اس کے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ پھر اس کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ سرونٹ کوارٹر سائیڈ میں اس لئے بنائے گئے تھے کہ عقبی حصے میں بدنما بھی لگتے اور جاگیر کا لک بھی خراب ہو جاتا۔

اس نے سوچا، ایک بار گرمی کے موسم میں یہاں آنا ہوگا۔

نیچے آتش دان دہکائے جا چکے تھے۔ شمریز کی بیوی اور بہن آ گئی تھیں اور نور بانو پھر سو گئی تھی۔

✿ ✿ ✿

نور بانو دوپہر کو سو کر اٹھی تو تازہ دم تھی اور اس کا چڑچڑا پن دور ہو چکا تھا۔ ارجمند کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ کھانے کے لئے سامان نوریز لے آیا تھا اور شمریز کی بیوی اور بہن اس کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

''تم سوئی نہیں؟'' نور بانو نے ارجمند سے پوچھا۔

''نہیں آپی! اب رات کو ہی سوؤں گی۔ آپ سنائیں، اب کیسا لگ رہا ہے؟''

''بہت اچھا! نیند پوری نہ ہو تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔'' نور بانو نے کہا۔

پھر وہ بڑی خوش اخلاقی سے فاطمہ اور جیناں سے باتیں کرنے لگی۔ فاطمہ شمریز کی بیوی تھی اور جیناں اس کی بہن۔

اس کو خوش دیکھ کر وہ دونوں بھی خوش نظر آنے لگیں۔

''یہ بتاؤ! یہ بنگلہ اتنے دنوں سے بند تھا تو یہاں گرد کیوں نہیں ہے؟'' نور بانو نے فاطمہ سے پوچھا۔

''کل ہی تو ہم دونوں نے صفائی کی ہے بنگلے کی۔'' فاطمہ نے کہا۔

''تو تمہیں پتا تھا کہ ہم لوگ آ رہے ہیں؟''

''جی بی بی......! انہوں نے کہلوایا دیا تھا۔''

نور بانو کو عبدالحق کا خیال آ گیا۔

”یہ تمہارے آغا جی کہاں ہیں؟“ اس نے ارجمند سے پوچھا۔

”باہر باتیں کر رہے ہیں۔“

نور بانو نے دروازے سے باہر دیکھا۔ اس کی گاڑی کے ساتھ ایک جیپ بھی کھڑی تھی۔ لیکن عبدالحق کہیں نظر نہیں آیا اور سردی کی وجہ سے باہر نکلنے کی نور بانو کو ہمت نہیں ہوئی۔ وہ دوبارہ اندر آ گئی۔

عبدالحق اس وقت عقبی احاطے میں شمریز کے ساتھ تھا۔ وہ اس جگہ کا ایک خاص نکتہ نظر سے جائزہ لے رہا تھا۔

”یہ زمین کتنی ہوگی شمریز؟“

”آٹھ ایکڑ سے کچھ کم ہے سر!“ شمریز نے جواب دیا۔

”آپ کو کیسے لگی سر!“

”بہت اچھی، ایسی کوئی اور جگہ نظر میں ہو تو مجھے بتانا۔“

”کوئی اور جگہ کیا سر! چاہیں تو یہی خرید لیں۔“

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے؟“

”جی سر! جن صاحب کی یہ زمین ہے، ان کی وفات ہو گئی ہے سر! ان کے بچے اسے بیچنا چاہتے ہیں۔“

”بس تو ٹھیک ہے۔ اپنے بابا سے کہو، بات کر کے مجھے بتا دیں۔ میں پے منٹ کر دوں گا۔“

”آپ خود ہی بات کر لیں نا سر!“ شمریز نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”مجھے ان معاملات کا تجربہ نہیں ہے۔“

”لیکن سر......“

عبدالحق اس کی جھجک کی وجہ سمجھ گیا۔

”دیکھو شمریز! آدمی کی بڑی پہچان ہے مجھے۔ تم سب لوگ بہت اچھے ہو۔ اور پھر مجھے یہاں کوئی رہنا تو نہیں ہے۔ کبھی کبھی آیا کریں گے ہم۔ تمہارے

بابا ہی کو دیکھ بھال کرنی ہوگی۔“

”جی سر!“

”اور ہاں! یہ تمہارا بھائی بہت اچھا ڈرائیور ہے۔ میں اس کے ساتھ بازار گیا تو مجھے اندازہ ہوا۔“

”جی سر!“

”یہ ہمارے ساتھ لاہور چل سکتا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں سر!“

”مجھے ایک ڈرائیور کی ضرورت ہے نا!“

”یہ تو میں آپ سے کہنے والا تھا سر!“

”بس تو ٹھیک ہے۔ تم اپنے گھر میں بات کر لو۔ اس سے بھی پوچھ لو۔“

”اس کی ضرورت نہیں سر! یہ تو آپ کا احسان ہوگا ہم سب پر۔“

اسی وقت نوریز دوڑتا ہوا ان کی طرف چلا آیا۔

”بی بی آپ کو بلا رہی ہیں سر جی!“

✿ ✿ ✿

ان کے اصرار کے باوجود شمریز کے ہاں سے کسی نے بھی کھانے پر ان کا ساتھ نہیں دیا۔ عبدالحق بھی یہ سوچ کر رہ گیا کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر وہ تکلف کرتے اور ٹھیک طرح سے کھانا نہیں کھاتے۔ ان لوگوں نے بعد میں کھانا کھایا اور وہ بھی سرونٹ کوارٹر میں۔

کھانے کے بعد عبدالحق نے شمریز سے کہا۔

”یہ بتاؤ کہ تم نے جیپ کیوں رکھی ہوئی ہے؟“

”یہاں جیپ زیادہ کارآمد ہے سر! یہ فور وہیل ڈرائیو ہے۔ بہت تنگ موڑ بھی کاٹ لیتی ہے۔“

”فور وہیل ڈرائیو کا مطلب؟“

”عام گاڑیوں کے دو وہیل چلتے ہیں، جیپ میں جب آپ چاہیں تو چاروں وہیل چلتے ہیں۔“

عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آیا۔ شمریز کو عملی مظاہرہ کر کے دکھانا پڑا۔

''ٹھیک ہے، لیکن اس کا فائدہ؟''

''بہت سیدھی چڑھائی میں کام آتا ہے سر!''

''میرا خیال ہے، تم مجھے ڈرائیو کر کے دکھاؤ۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور نوریز کو ساتھ لے لو۔''

اس کا واقعی فائدہ ہوا۔ عبدالحق کی سمجھ میں آ گیا۔ بعض مقامات پر موڑ ایسے تھے کہ عام گاڑی سے ان سے گزرنا آسان نہیں تھا۔ جبکہ جیپ ہر طرح کا موڑ کاٹ لیتی تھی۔

''تمہیں میرے لئے ایک جیپ بھی خریدنی ہوگی شمریز خان!''

''ہو جائے گا سر!''

عبدالحق نوریز سے ڈرائیونگ کے بارے میں سوالات کرنے لگا۔

اچانک شمریز نے کہا۔

''اب واپس چلنا ہے سر!''

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔

''خیریت؟''

''برف پڑنے والی ہے سر!''

عبدالحق کے وجود میں خوشی کی ایک لہر اُٹھی۔ یہاں آکر وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ برف باری دیکھنے کے لئے آئے ہیں۔ دراصل یہ بات اس کے حلق سے نہیں اتری تھی کہ ایک مخصوص دن برف باری ہوسکتی ہے۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے فضا میں غیر معمولی تبدیلی کا ادراک ہوا۔

''ٹھیک ہے! واپس چلو۔''

✿ ✿ ✿

نوربانو کو جنیاں بہت اچھی لگی تھی۔ وہ بہت تیزی سے اس سے گھل مل گئی تھی۔ جنیاں اور فاطمہ کے انداز میں بھی اب وہ جھجک نہیں تھی۔ وہ کچھ بے تکلف ہوگئی تھیں۔ لیکن ایک حد انہوں نے پھر بھی قائم رکھی تھی۔

انہیں کھانا کھائے ایک گھنٹہ ہوگیا تھا۔ جنیاں نے نوربانو سے کہا۔

''آپ باہر تو نکلیں بی بی صاحب!''

''نہیں بھئی! بہت سردی ہوگی۔''

''شروع شروع میں لگے گی۔ پھر جب چلیں گی تو سردی کم ہوتی جائے گی۔''

نوربانو نے سوالیہ نظروں سے ارجمند کو دیکھا۔ ارجمند نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نوربانو کو حیرت ہوئی کہ حمیدہ بھی باہر نکلنے کے موڈ میں ہے۔

''چلو...... چلتے ہیں۔''

وہ عقبی دروازے سے احاطے میں نکل آئے۔ سردی تو تھی۔ لیکن نوربانو کو وہاں سانس لینا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہاں کی ہوا بہت صاف اور پاکیزہ ہے۔

اور واقعی کچھ دیر بعد سردی کا احساس کم ہوگیا۔

بنگلے سے خاردار تاروں کی باڑھ تک وہ ایک ہلکی سی، لیکن مسلسل چڑھائی تھی۔ سامنے پہاڑی تھی۔ وہیں کہیں وہ جگہ ہوگی جہاں پانی کا چشمہ تھا۔ اس وقت تو اس کا سوتا خشک تھا۔ لیکن پانی بہنے کا واضح نشان موجود تھا۔ جو اس کے وجود کی گواہی دے رہا تھا۔ خاردار تاروں کی باڑھ کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درخت تھے مگر سب پتوں سے محروم تھے۔

''ان درختوں پر پتے بھی لگتے ہیں کبھی؟'' نوربانو نے پوچھا۔

''جی بیگم صاحب! بہار آئے گی تو سب درخت ہرے ہو جائیں گے۔'' جنیاں نے جواب دیا۔

لیکن نوربانو کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے تو لگ رہا تھا کہ سب درخت مر چکے ہیں۔

''اور بہار میں یہاں زمین نظر نہیں آئے گی۔ ہر طرف گھاس ہوگی۔''

ارجمند نے تصور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ تصور بھی محال ہی تھا۔

وہاں بہت ہلکی ہلکی دُھوپ تھی، جس میں تمازت نام کو بھی نہیں تھی۔

"برف باری کب ہوگی؟" ارجمند نے پوچھا۔

"یہ سو کسی کو بھی نہیں پتا بی بی صاحب!"

"کیا پتا؟ آج ہو گی بھی یا نہیں۔" ارجمند کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"نہیں بی بی صاحب! ہوگی ضرور، بڑے دن پر برف ضرور پڑتی ہے۔" فاطمہ نے اسے تسلی دی۔

اچانک دھوپ غائب ہوگئی۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سردی کا احساس کچھ اور کم ہوگیا تھا۔

وہ لوگ باڑھ اور درختوں تک پہنچ گئی تھیں۔ نور بانو اور ارجمند نے باڑھ کے دوسری طرف دیکھا۔ باڑھ سے آگے کچھ دور سے ڈھلوان بہت زیادہ نمایاں تھی۔ آگے یقیناً کوئی کھائی تھی۔ لیکن وہ یہاں اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

"آؤ اب واپس چلیں۔" نور بانو نے کہا۔

واپسی کا آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ سبھی کو فضا میں کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ اور کسی کی سمجھ میں اس تبدیلی کی نوعیت نہیں آ رہی تھی۔ بلا ارادہ وہ لوگ رُک گئے..... ٹھٹک گئے، جیسے اس تبدیلی پر غور کر رہے ہوں، اسے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

حمیدہ نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ مگر وہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ نور بانو اور ارجمند ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ تبدیلی کا احساس انہیں بھی ہوا تھا لیکن ابھی تک وہ اس کی نوعیت نہیں سمجھ سکی تھیں۔

وہ اس تبدیلی کو سمجھنے کی کوشش میں اتنی منہمک تھیں کہ انہوں نے فاطمہ اور جنیاں کے درمیان نگاہوں کے اس تبادلے کو بھی نہیں دیکھا اور ان کے لبوں پر مچلتی معنی خیز مسکراہٹ بھی نہیں دیکھ سکیں۔

پھر حمیدہ کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کا تاثر اُبھرا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

"لال آندھی!" لیکن اس کی بات کوئی نہیں سمجھا۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں دعا کرنے لگی۔

"اے اللہ! رحم فرما، اے اللہ مصیبت ٹال دے۔"

ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا دادی اماں!"

لیکن حمیدہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور زیرِ لب دعا کر رہی تھیں۔

پھر شاید نور بانو اور ارجمند دونوں کی سمجھ میں بات آ گئی۔ دنیا میں ہر منظر کے ساتھ قدرتی عناصر کی کچھ آوازیں ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات کہ آدمی ان کا عادی ہونے کی وجہ سے ان پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ قدموں کی چاپیں ہوں یا ٹریفک کی آوازیں، پرندوں کے چہچہے ہوں یا ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹیں۔ کچھ نہیں ہوتا تو ہوا کی سرسراتی سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ اور رات کو جب انسان اور تمام مخلوقات محوِ خواب ہوتی ہیں، لگتا ہے کہ شجر حجر، ہر چیز سو رہی ہے، تب سناٹا بھی ایک آواز کی طرح بولتا ہے، اور کبھی اس میں جھینگروں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کوئی بھی منظر خاموش کبھی نہیں ہوتا۔

ان دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہی تو غیر معمولی بات تھی، جس کا احساس انہیں خودبخود ہوگیا تھا۔ یہ منظر، یہ ماحول جس میں وہ موجود تھیں اور سانس لے رہی تھیں، بالکل خاموش تھا۔ یہاں تو ہوا کی نرمی سے بہنے کی آوازیں بھی نہیں تھی۔ انہیں ہوا کا لمس بھی اپنے چہروں پر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اگر وہ سانس نہ لے رہی ہوتیں تو کہہ دیتیں کہ اس وقت ہوا بھی موجود نہیں ہے۔

تب انہیں احساس ہوا کہ یہ تو ایسا سکوت ہے، جیسے پوری کائنات نے سانس روک لی ہے۔ کہیں معمولی سا بھی کوئی تحرک نہیں تھا۔ انہیں گھبراہٹ ہونے لگی۔

انہوں نے حمیدہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی آنکھیں بند کئے ہوئے تھی۔ ہونٹوں کی لرزتی ہوئی جنبش سے اندازا ہوتا تھا کہ وہ بھی گھبرائی ہوئی ہے۔ اور دعا کر رہی ہے۔

"کیا ہوا دادی اماں!" ارجمند نے حمیدہ سے پوچھا۔

حمیدہ نے آنکھیں کھولیں۔

"اللہ رحم کرے۔ لال آندھی آنے والی ہے۔" اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

ارجمند کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن نور بانو نے صحرا دیکھا تھا اور لال آندھی کے پس منظر سے بھی واقف تھی۔ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو اماں! یہ کوئی صحرا تھوڑی ہے۔ یہاں ریت کہاں اور لال آندھی کہاں؟"

"مگر اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا، جب لال آندھی آئی تھی۔"

"یہ کوئی اور بات ہے اماں!" نور بانو نے کہا اور فاطمہ اور جنیاں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔

"کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے جنیاں؟"

"نہیں بیگم صاب! آپ اندر چلیں...... جلدی جلدی۔"

اس کا لہجہ تو اطمینان دلانے والا تھا لیکن...... جلدی جلدی...... کی تاکید ڈرا رہی تھی۔ وہ سب تیز قدموں سے بنگلے کی طرف چل دیئے۔

"بات کیا ہے؟" نور بانو نے پوچھا۔

"برف پڑنے والی ہے بیگم صاب!"

"اوہ...... واہ......!" نور بانو کے دل میں خوشی جاگ اٹھی۔ وہاں آنے کے بعد وہ پہلی بار خوش ہوگئی تھی۔

"تو اندر چلنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہاں مزہ نہیں آئے گا، اندر سے دیکھیں گے تو بہت اچھا لگے گا۔" فاطمہ بولی۔

وہ لوگ عقبی دروازے سے بنگلے میں داخل ہوئے، اور اسی وقت عبدالحق سامنے والے دروازے سے اندر آیا۔ انہیں دیکھتے ہی اس نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

"برف باری ہونے والی ہے۔"

اور ماحول ایک دم بدل گیا۔ حمیدہ بھی خوش نظر آنے لگی۔

❀ ❀ ❀

وہ اندھیرا ایسا تھا، جیسے رات شروع ہو رہی ہو۔ سردی بالکل غائب ہوگئی تھی۔ عبدالحق کی فرمائش پر نور بانو اور ارجمند کافی بنانے کے لئے نیچے چلی گئی تھیں۔ شمریز اور اس کے گھر والے سرونٹ کوارٹر میں تھے۔ شمریز کے کہنے کے مطابق عبدالحق نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر لئے تھے۔ اس نے اس کی وجہ بھی بتا دی تھی۔

نور بانو اور ارجمند کافی لے کر اوپری منزل پر آئیں اور وہ لوگ بیٹھ کر کافی پینے لگے۔

"دروازے اور کھڑکیاں تو کھول دیں۔ گھٹن ہو رہی ہے۔" نور بانو نے عبدالحق سے کہا۔

"نہیں......! ابھی نہیں۔"

"کیوں بھئی!"

"سردی میں دروازے کھڑکیاں کون کھولتا ہے؟"

"مگر سردی تو ہے ہی نہیں۔"

"سردی ہے۔ بس محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ یہ بات بہت خطرناک ہوتی ہے۔" عبدالحق نے اسے سمجھایا۔

نور بانو نے بحث نہیں کی۔ خاموشی سے کافی کے گھونٹ لیتی رہی۔

"پتر عبدالحق! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" حمیدہ سے رہا نہیں گیا۔

"لال آندھی آنے کے وقت بھی ایسی ہی خاموشی تھی پتر! شاید تجھے یاد ہو۔"

"ڈرو مت اماں! وہ اللہ کا قہر تھا، اور یہ اس کی رحمت ہے۔"

عبدالق بھی اس سکوت پر غور کر رہا تھا۔ جاگتی راتوں کا اسے کافی تجربہ تھا۔ یہ سکوت اس سناٹے سے مختلف تھا۔ سناٹے کی اپنی خاموش آوازیں ہوتی ہیں، جو سنائی نہیں دیتیں، محسوس کر لی جاتی ہیں۔ شاید ان کا تعلق، حسات سے

نہیں، روح سے ہوتا ہے۔ مگر یہ تو مکمل سکوت تھا، جس میں سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ اور ہر سانس کا زیر و بم سنائی نہیں، جیسے دکھائی دے رہا تھا۔

پھر سکوت کا وہ شیشہ ایک آواز سے چٹخا ..... بھد بھد بھد ..... وہ عجیب سی آواز تھی، جیسے کوئی چھت پر دبے پاؤں چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن بھاری جثے کی وجہ سے وہ آواز پیدا ہو رہی ہو۔

نور بانو اور ارجمند ڈر گئیں۔ ارجمند نے کہا۔

''آغا جی! چھت پر کوئی چل رہا ہے۔''

''چاروں طرف سے ڈھلوان چھت ہے۔ اس پر کوئی کیسے چل سکتا ہے؟'' عبدالحق نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''کوئی بھوت ہو تو اور بات ہے۔''

''ڈرایئے نہیں!'' نور بانو نے گھبرا کر کہا۔

حمیدہ مطمئن تھی۔ بیٹا اس کے ساتھ تھا، اور مطمئن بھی نظر آ رہا تھا۔ تو پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔

''سنو! وہ جو چھت پر چل رہا ہے، وہ نیچے بھی چل رہا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

اور واقعی، وہ آواز نیچے سے بھی آ رہی تھی، بلکہ گیلری کی طرف سے بھی آ رہی تھی ..... بھد بھد بھد.....

عبدالحق اٹھا اور اس نے کھڑکیاں کھول دیں۔

''آؤ .....! اور دیکھو۔''

نور بانو اور ارجمند کھڑکی کی طرف لپکیں۔ ان کے پیچھے حمیدہ بھی تھی۔

وہ سب سحر زدہ سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ آسمان سے روئی کے بڑے بڑے گالے سے گر رہے تھے۔ ان کے گرنے کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ روئی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ روئی ہلکی ہوتی ہے۔ وہ فضا میں اُڑتی ہے۔ اس طرح گر نہیں سکتی۔ جبکہ یہ یقیناً بھاری تھے اور سیدھے زمین پر گر رہے تھے۔ اور زمین سے ٹکراتے تو بھد کی آواز سنائی دیتی۔

کچھ دیر تو وہ سب ساکت و صامت، سحر زدہ سے کھڑے رہے۔ پھر نور بانو اور ارجمند نے بچوں کی طرح کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالے۔ لیکن پھر وہ مایوس ہو گئیں۔ ان کے ہاتھ پر تو کچھ بھی نہیں گرا تھا۔

پھر ارجمند نے خوشی سے چیخ ماری۔ اس کے ہاتھ پر ایک گالا گرا تھا۔

''یہ دیکھیں میرے ہاتھ .....!'' اس نے ہاتھ اندر کھینچ کر نور بانو کو دکھایا۔ مگر خود بھی حیران رہ گئی۔ ایک ثانیے کو تو وہ سفید پر کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ مگر فوراً ہی وہ نمی میں تبدیل ہو گیا۔ شاید کچھ تو اس کے جسم کی گرمی سے، اور کچھ کمرے کے گرم ماحول سے، جو آتش دان کو سرد کرنے کے باوجود ابھی تک گرم تھا۔

''یہاں آیئے آپ لوگ!'' دوسری طرف سے عبدالحق کی آواز آئی۔ وہ سامنے کے رُخ والے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے لہجے میں بچوں کی سی خوشی اور سنسنی تھی۔

وہ تینوں اِدھر گئیں۔ عبدالحق نے گیلری کی طرف کھلنے والا دروازہ کھول دیا تھا۔

گیلری میں پہنچ کر وہ خوش ہو گئیں۔ کھڑکی سے جو افسانہ لگ رہا تھا، گیلری میں وہ حقیقت تھی۔ وہاں سے وہ برف باری کا پورا منظر دیکھ رہی تھیں۔ بلکہ گیلری کی ریلنگ پر تو برف جم رہی تھی۔

وہاں کھڑے ہو کر تو حمیدہ نے بھی بچوں کی طرح ہاتھ باہر نکالا اور اس کے ہاتھ پر برف کے گالے گرے تو اس نے جلدی سے ہاتھ واپس کھینچا، جیسے تتلی پکڑنے والا کوئی بچہ ڈرے کہ کہیں تتلی اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ وہ چند لمحے بڑی بے یقینی سے اپنی کلائی سے اوپر تک جمی ہوئی اس برف کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دوسرے ہاتھ کی اُنگلیوں سے بڑی نرمی اور نزاکت سے اس برف کو چھوا۔ جیسے وہ کوئی خواب ہو۔ اور برف کو چھو کر اس کی بوڑھی آنکھوں میں خوشی کی ایسی چمک ابھری، جیسے وہ پھر سے جوان ہو گئی ہو۔

ویسے تو جو پہلی بار برف گرتے دیکھ رہا ہو، وہ اس کے لئے بہت خوب

صورت ہوتا ہے۔ لیکن صحرا میں زندگی گزارنے والی حمیدہ کے لئے تو وہ خواب سے بھی بڑھ کر تھا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ آسمان سے یوں برف بھی گر سکتی ہے۔ وہ جہاں رہتی تھی، وہاں ہاتھوں اور چہرے پر صرف ریت ہی جمتی تھی۔ وہاں تو بارش بھی آدمی کو بہت بڑی خوشی دینے والا خواب تھی۔ کہاں یہ برف......

اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور دل میں عبدالحق کو دُعائیں دیں۔ وہ اس کے لئے ایک اور یادگار...... کبھی نہ بھولنے والا دن تھا۔

وہ دن سبھی کے لئے یادگار تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اس دن کو کبھی نہیں بھولا۔ نوربانو نے دہلی میں پالا ضرور دیکھا تھا، اور اس کے لئے وہی برف تھا۔ لیکن یہ سچ مچ کی برف باری، اس نے سامنے ٹنڈ منڈ درختوں کو دیکھا۔ اجڑی ہوئی شاخوں پر دیکھتے ہی دیکھتے برف نے بسیرا کر لیا تھا اور شاخیں یوں جھک گئی تھیں، جیسے ان پر بے شمار پرندے بیٹھ گئے ہوں۔

اس نے ایک شاخ کو غور سے دیکھا۔ شاید یہ اس کا وہم ہے۔ درحقیقت شاخ جھکی نہیں ہے۔ اس نے سوچا۔ وہ نظریں جما کر اس شاخ کو دیکھتی رہ گئی۔ مزید برف گرے گی تو یہ مزید جھکے گی، اور وہ اسے دیکھ سکے گی۔ زندگی میں پہلی بار وہ بڑے صبر وتحمل اور یکسوئی سے کسی چیز کا انتظار کر رہی تھی۔

شاخ پر برف کی تہہ دبیز تر ہوتی گئی۔ پھر اس نے شاخ میں ہلکی سی لچک محسوس کی۔ لیکن وہ ایسی واضح بھی نہیں تھی۔ اب بھی وہ اسے فریب نظر ہی لگا۔ اپنا کوئی وہم۔

اور ارجمند کے لئے تو وہ اس دنیا کا منظر ہی نہیں تھا۔ کہاں وہ ایک کوٹھے کے پنجرے میں قید ایک ننھی سی چڑیا، جو آسمان دیکھنے کو بھی ترستی تھی۔ اللہ نے کیسے دن پھیرے کہ اسے آزادی ملی۔ اس نے دیکھا اور جانا کہ دنیا محض ایک کوٹھا نہیں، وہ بہت بڑی ہے...... اتنی بڑی کہ آدمی ساری زندگی گھومتا رہے، پھر بھی دعویٰ نہ کر سکے کہ اس نے زمین کا چپہ چپہ دیکھ لیا ہے۔ اور آج اس نے منظر دیکھا، جو اس کے حافظے میں ہمیشہ زندہ اور متحرک رہے گا۔ کتنے احسان

ہیں اس پر آغا جی کے؟ یہ خیال اسے پہلی بار آیا اور ذہن میں ہمیشہ کے لئے جم کر بیٹھ گیا۔ یہ خوب صورتی بھی انہوں نے ہی اسے دکھائی ہے۔ کیا وہ کبھی ان کے احسانات کا صلہ دے سکے گی؟

اس کا دل عبدالحق کی محبت سے سرشار ہوگیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کتنا بے غرض ہے۔

پھر اس خوب صورت کیفیت میں اس کے دل میں پھانس سی چبھی۔ پھپھو زندہ ہوتیں، وہ بھی یہ منظر دیکھتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ کتنا خوش ہوتیں وہ۔ مگر فوراً ہی جوابی سوچ ابھری۔ وہ ہوتیں تو وہ خود یہاں نہ ہوتی۔ وہ تو کوٹھے پر ہوتیں اور وہ ان کے ساتھ ہوتی۔

ارے...... یہ تو اللہ کا کرم ہے۔ اس نے شرمندگی سے سوچا۔ اللہ نے ہی مجھے عزت اور آبرو کے ساتھ آزادی عطا فرمائی۔ اللہ نے ہی آغا جی کو...... نہیں، صرف آغا جی کو نہیں، آپی اور دادی اماں کو میرے لئے مہربان بنایا۔ ورنہ یہ سب لوگ تو اجنبی تھے۔ مجھے جانتے بھی نہیں تھے۔

اس نے سوچا، مغرب کے بعد وہ شکر کے دو نفل ضرور پڑھے گی۔

عبدالحق کی کیفیت ان سب سے مختلف تھی۔ وہ نہ صرف سحرزدہ سا اس منظر کو دیکھ رہا تھا، بلکہ سفر کے تمام مناظر بھی اس کی نگاہوں میں پھر رہے تھے، اور اسے قرآن کی آیتیں یاد آ رہی تھیں۔ زمین میں چلو پھرو...... سفر کرو...... گھومو...... اللہ کی نشانیاں دیکھو...... سمجھو...... ایمان لاؤ۔ اس کی مناعی کو داد دو۔ کیسے اس نے زمین کو تمہارے لئے بچھونا بنایا، ہموار کیا، اس میں راستے بنائے، تاکہ تم اس میں چل پھر سکو۔ اس نے زمین میں پہاڑوں کے لنگر ڈالے کہ کہیں وہ تمہیں لے کر لڑھک نہ جائے۔

یہ تو اس نے لڑکپن میں ہی سمجھ لیا تھا کہ ہر منظر میں، حتیٰ کہ ہر چھوٹی سی چیز میں اللہ کی نشانیاں ہیں۔ مگر اب بہت عرصے کے بعد وہ اس انداز میں گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا، غور کر رہا تھا۔

پھر اس پر غور کرتے ہوئے اسے اس پر شرمندگی ہونے لگی۔ یہ کیسی

غفلت ہے، جس میں وہ برسوں مبتلا رہا۔ اسے یاد تھا، ماسٹر جی کی علالت کے دوران وہ بارہا پہاڑی علاقے میں گیا، اور بڑی باقاعدگی کے ساتھ گیا۔ اس نے وہاں کے حسن کو بہرحال دیکھا اور سراہا۔ لیکن کبھی اس انداز میں اس پر غور نہیں کیا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟

اور اس کیوں کا جواب اسے فوراً ہی مل گیا۔ وہ جب بھی وہاں گیا تو اس کا ذہن ماسٹر جی اور ان کے مسائل میں الجھا رہا اور وہ صرف ماسٹر جی کی صحت کے مسائل نہیں تھے۔ وہ ان کے معاشرتی مسائل بھی تھے۔ وہ ان کے اندر کے دکھ تھے، جو ان کے لئے روگ بن گئے تھے، اور وہ انہیں محسوس کرتا تھا۔ وہ ان کے لئے دکھی تھا کہ کوشش کے باوجود وہ ان کے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکا تھا۔ وہ بوڑھا شخص، جس نے ساری زندگی اولاد کے لئے محنت کی تھی، ان کی ضرورتوں اور خوشیوں کا خیال رکھا تھا، جب اس پر وہ وقت آیا کہ اولاد اس کا خیال رکھے تو اولاد نے اسے اچھوت بنا کر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیا۔ چلو یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ لیکن اس سے سینی ٹوریم میں آکر ملنے کے لئے بھی اس کے بیٹوں میں سے کوئی وقت نہیں نکال سکا۔ سرتوڑ کوشش کے باوجود عبدالحق ان میں سے کسی کو قائل نہیں کر سکا، وہ ماسٹر جی کو یہ خوشی نہ دلا سکا۔

یوں وہ پہاڑی علاقے میں کئی بار جانے کے باوجود اس پر غور نہیں کر سکا، بلکہ صحیح معنوں میں اسے دیکھ بھی نہیں سکا۔ یہ زندگی کی الجھنیں تھیں، دنیا کے جھنجٹ تھے۔ ان میں الجھ کر آدمی کچھ بھی دیکھ اور سوچ نہیں سکتا۔

اور اس نے تو برسوں میں نہ کچھ دیکھا تھا، نہ سوچا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد وہ اپنی خاندانی حویلی کو، ریت میں دبے ہوئے گاؤں کو برآمد کرانے میں الجھا رہا۔ پھر نوربانو کے چچا کی تلاش میں لاہور آ گیا۔ اس کے بعد شادی، پھر لاہور منتقلی، اور اب یہ ملازمت۔ زندگی کے جھنجٹ تھے کہ پھیلتے ہی چلے جا رہے تھے۔ ہاں! ان برسوں میں اسے مشاہدات کا خزانہ ملا تھا۔ لیکن وہ دنیاوی تھا۔ اس نے بھانت بھانت کے لوگ دیکھے، انسانوں کی مجبوریاں، ان کی بے بسی، ان کی محرومیاں، ان کے دکھ اور ان کے عذاب، جہاں تک ہو سکا، اس نے

لوگوں کے دکھ بانٹے، ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بہرحال یہ مشاہدۂ حق تو نہیں تھا۔ چپے چپے پر، ہر شے میں بکھری ہوئی اللہ کی نشانیاں تو وہ نہیں دیکھ پایا تھا۔

اس نے جھنجلا کر سوچا۔ یہ وہ میں تو نہیں ہوں، جو کبھی تھا۔ میں نے تو آگہی کی راہ پر چلتے چلتے نہ جانے کب دنیا کے میلے میں کھو گیا، بھیڑ میں گم ہو گیا۔ یہ میرا راستہ تو نہیں۔ مجھے دنیا میں الجھنے کی ایسی کیا ضرورت ہے؟

اسی لمحے اسے اپنی ملازمت بری لگنے لگی۔ ملک و قوم کی کیا خدمت کر رہا ہوں میں؟ یہ کام تو کوئی اور بھی کر سکتا ہے۔ اس نے موازنہ کیا تو احساس ہوا کہ وہ پہلے زیادہ خوش تھا۔

اسے مولوی مہر علی بڑی شدت سے یاد آئے۔ اس نے سوچا۔ پہلی فرصت میں وہ حق نگر جا کر ان سے بات کرے گا۔

''دیکھیں تو، سڑک پر کتنی برف جم گئی ہے۔'' نوربانو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس نے دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ واقعی اتنی دیر میں کافی برف گر چکی تھی۔ گرد و پیش بالکل سفید ہو گیا تھا۔ کہیں بھی زمین نظر نہیں آ رہی تھی۔

''اب باہر چلیں نا!'' نوربانو نے کہا۔

''ابھی نہیں.....! مغرب پڑھ کر چلیں گے۔ ٹوپیاں ضرور پہن لیجئے گا آپ لوگ۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور برف باری رک گئی تو؟''

''انشاء اللہ نہیں رکے گی۔''

❁ ❁ ❁

اور مغرب کے بعد وہ لوگ عقبی دروازے سے نکلے تو برف باری کا سلسلہ جاری تھا۔ ہر طرف برف ہی برف نظر آ رہی تھی۔ رات ہو گئی تھی۔ لیکن برف کی وجہ سے اندھیرا نہیں لگ رہا تھا۔

"ایسا لگتا ہے کہ آسمان سے پھول برس رہے ہیں۔" ارجمند نے خوشی سے کہا۔

"ہاں ارجی! اللہ میاں تم پر پھول برسا رہے ہیں۔" نور بانو نے محبت سے کہا۔

وہ لوگ خاردار تاروں کی باڑھ تک گئے۔ اس کے پار، ڈھلان پر برف چمک رہی تھی۔

"ہم اس طرف نہیں جا سکتے کیا؟" ارجمند ت چھوٹی سی بچی بن گئی تھی۔

"رات کے وقت یہ مناسب نہیں۔" عبدالحق نے اسے سمجھایا۔

"اور پھر ادھر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم سڑک کی طرف سے چلیں گے۔ ڈھلانوں پر برف خطرناک بھی ہوسکتی ہے۔"

"تو پھر باہر چلیں۔" ارجمند نے بے صبرے پن سے کہا۔

"کل صبح چلیں گے۔"

"سورج نکل آیا اور برف پگھل گئی تو؟"

"ارے نہیں! انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔"

وہ بنگلے کی طرف واپس چل دیے۔ عبدالحق اور نور بانو آگے تھے۔ اور ارجمند حمیدہ کا ساتھ دینے کے لئے پیچھے چل رہی تھی۔ پھر اچانک حمیدہ رکی اور برف پر اکڑوں بیٹھ گئی۔

ارجمند بھی رک گئی۔

"کیا ہوا دادی اماں! تھک گئیں؟"

"نہیں نکی! بس تو دیکھتی جا۔" حمیدہ کے لہجے میں بچوں کی سی سنسنی تھی۔

ارجمند بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

حمیدہ نے چمڑے کے لمبے بوٹ میں چھپے پاؤں کو سیدھا کر کے رکھا اور اس کے اوپر برف جمانے لگی۔

"اوہو......! آپ گھروندہ بنا رہی ہیں دادی اماں!" ارجمند نے چہک

کر کہا۔

"ہاں نکی!"

ارجمند بھی اسی کوشش میں مصروف ہوگئی۔

عبدالحق کو خاصا آگے جا کر احساس ہوا کہ اماں اور ارجمند ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کچھ دور برف پر بیٹھی وہ دونوں سائے کی طرح نظر آ رہی تھیں، اور دونوں کے ہاتھ مسلسل حرکت میں تھے۔

"کیا ہوا اماں؟" عبدالحق نے پکارا۔

"کچھ نہیں پتر! ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔" حمیدہ نے جواب دیا۔

"پتا نہیں! کیا کر رہی ہیں۔" عبدالحق پُرتشویش لہجے میں بڑبڑایا۔

لیکن نور بانو سمجھ گئی تھی۔

"اماں بھی بچہ بن گئی ہیں۔ گھروندا بنا رہی ہیں۔"

"تو بڑھا اور بچہ برابر ہی ہوتے ہیں۔" عبدالحق نے مسکرا کر کہا۔

"کاش میرے پاس کیمرہ ہوتا اور میں ان دونوں کی تصویر بنا سکتا۔ اس کا عنوان ہوتا...... دو بچے...... کیسی یادگار تصویر ہوتی۔"

اسی وقت سرونٹ کوارٹر کی طرف سے جنیاں دوڑتی ہوئی ان کی طرف آئی۔ اس کے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔

"صاحب جی! یہ بھائی نے بھجوایا ہے۔ وہ بولتے ہیں، اس میں فلم بھی ہے۔"

عبدالحق نے سوچا، اس وقت میں کچھ بھی مانگتا، مل جاتا۔ اور اسے شمریز پر شک آیا۔ وہ جس بات کا خیال نہیں رکھ سکا تھا، شمریز نے اس کا خیال رکھا تھا۔ اس نے جنیاں سے کیمرہ لیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ!"

"آ پتر! تو بھی آ جا! دیکھ، بچپن لوٹ آیا ہے۔" حمیدہ نے ایک لمحے کو سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پکارا۔ اور پھر فوراً ہی اپنے گھروندے پر جھک گئی۔

عبدالحق نور بانو کے ساتھ آگے بڑھا۔ مناسب فاصلے سے اس نے ان دونوں کی تصویر کھینچی، جو اپنے اپنے گھروندے میں الجھی ہوئی تھیں۔ انہیں اس کا علم بھی نہیں تھا کہ کیمرے کی آنکھ اس لمحے کو دیکھ کر محفوظ کر رہی ہے۔

دوسری تصویر عبدالحق نے جس لمحے کھینچی، وہ جادوئی لمحہ تھا۔ حمیدہ نے اپنا پاؤں باہر نکالا، اور فوراً ہی اس کا گھروندا ڈھے گیا۔ اس نے سر اُٹھایا اور مایوسی سے بولی۔

''ہائے ربا..... ! ٹوٹ گیا۔'' اور کیمرے نے اس کے تاثرات، ٹوٹے ہوئے گھروندے کو اور گھروندا بناتی ہوئی ارجمند کو محفوظ کر لیا۔

ذرا دیر بعد یہی کچھ ارجمند کے گھروندے کے ساتھ ہوا۔ عبدالحق نے وہ تصویر بھی کھینچ لی۔

''اب چلیں!'' عبدالحق نے کہا۔

''ناپتر! میں نے تو گھروندا بنانا ہے۔'' حمیدہ نے بچوں کے سے ضدی لہجے میں کہا۔ اور اٹھتی ہوئی ارجمند بھی دوبارہ بیٹھ گئی۔ وہ دونوں، گرد و پیش سے بے خبر ہو کر پھر گھروندا بنانے میں مصروف ہو گئیں۔

کئی کوششوں کی ناکامی کے بعد حمیدہ نے سر اٹھا کر بے بسی سے عبدالحق کو دیکھا۔

''یہ کیوں نہیں بنتا پتر!''

عبدالحق سوچ میں پڑ گیا۔ جواب اسے معلوم نہیں تھا، لیکن آس کا کوئی جواب تو ہوگا۔

''اس برف سے تو میری ریت اچھی۔'' حمیدہ نے جھنجلا کر کہا۔

''نہیں اماں! ایسا نہ کہو۔''

''تو پھر گھروندا کیوں نہیں بنتا میرا۔''

''آج چھوڑ دو۔ انشاء اللہ کل بن جائے گا۔'' عبدالحق نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

''آج کیوں نہیں بنتا؟ اور کل کیسے بن جائے گا؟'' حمیدہ چڑ کر بولی۔

عبدالحق اس بات کا جواب نہ ہونے کی وجہ سے شرمندہ ہونے لگا۔ لیکن اسی لمحے اس کے اندر ایک خیال ابھرا۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''دیکھو اماں! ریت تو زمین کی ہی چیز ہے نا!'' اس دوران وہ ازخود ابھرنے والا خیال اس کے ذہن میں اپنے خدوخال اجاگر کر رہا تھا۔

''اور برف!''

''یہ تو آسمان سے آئی ہے نا اماں!'' وہ ایسے سمجھانا چاہتا تھا کہ بات حمیدہ کی سمجھ میں آجائے۔

''تو پھر؟'' حمیدہ نے جرح کی۔

''یہ جہان سے آئی ہے، وہاں اتنی سردی ہے کہ بارش کے قطرے جم کر برف بن گئے ہیں۔''

''تو یہاں بھی تو سردی ہے۔'' حمیدہ نے اعتراض کیا۔

ارجمند اب ٹکٹکی باندھے عبدالحق کے چہرے کو تک رہی تھی، جس پر گہرے انہماک کا ایسا تاثر تھا، جیسے وہ کسی ایسی بات پر غور کر رہا ہو، جسے سمجھنا اس کے لئے بھی آسان نہیں، جبکہ وہ تو دوسروں کو سمجھانے کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔

''یہ برف اس زمین کی چیز نہیں، یہ یہاں اجنبی ہے اماں!'' عبدالحق پُرخیال انداز میں کہا۔

''اور زمین کتنی ہی ٹھنڈی ہو؟ اس برف کے لحاظ سے تو گرم ہی ہے۔''

''تو کل گھروندا کیسے بن جائے گا؟'' حمیدہ کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''زمین پر برف کی تہہ اتنی ہو جائے گی اماں! کہ بعد میں گرنے والی برف جم جائے گی، سخت ہو جائے گی۔ تب گھروندا بن جائے گا۔'' یہ کہتے کہتے عبدالحق کو ایک خیال نے چونکا دیا۔

''اور اماں! ریت کا گھروندا بھی گرمی میں کب بنتا تھا؟''

حمیدہ نے چند لمحے سوچا، پھر بولی۔

''سچ کہتا ہے پتر! گھروندا تو گیلی ریت سے بنتا تھا۔ بارش کے دنوں

میں، یا پھر ندی کے کنارے بنتا تھا۔''

''ہاں اماں! زمین پر پڑی ہوئی برف جس جگہ تک زمین کے اندر کی گرمی کو جذب کرے گی تو اس سے اوپر کی برف ویسی ہی ٹھنڈی رہے گی، جیسی آسمان سے آئی ہے۔ پھر وہ جم کر سخت ہوگی۔ تب تم گھروندا بنا سکو گی۔''

''میں سمجھ گئی پتر!'' حمیدہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''آپ کتنے عقل مند ہیں آغا جی!'' ارجمند نے بے ساختہ ستائشی لہجے میں کہا۔

''ہاں نکی! عقل مند تو ہے میرا پتر!'' حمیدہ کے لہجے میں فخر تھا۔

''نہیں اماں! یہ بات میں نے عقل سے نہیں، دل سے سمجھی ہے۔ اور سمجھانے والا اللہ ہے۔''

''اب چلیں پتر!'' حمیدہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

ارجمند بھی اللہ اللہ کر کے کھڑی ہوئی۔ وہ بنگلے کی طرف چل دیئے۔

حمیدہ نے تو عبدالحق کی بات کو اس کی فطری عاجزی سمجھا تھا۔ لیکن ارجمند اس کی بات پر بہت سنجیدگی سے غور کر رہی تھی۔ وہ اس بات کو سمجھ سکتی تھی۔ اسے دل کی سچی راہنمائی کا تجربہ تھا۔ عقل اور دماغ جہاں نہیں پہنچ سکتے، دل آدمی کو وہاں پہنچا دیتا ہے۔ دل میں جو خیال آتا ہے، دماغ اس پر ہمیشہ شک کرتا ہے، اسے گمان سمجھ کر اپناتا ہے۔ لیکن دل اس پر یقین کرتے ہوئے اسے ایمان کے درجے پر پہنچا دیتا ہے۔

اچانک اسے حمیدہ کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ حمیدہ نے کہا تھا کہ جب تک بندہ اللہ سے ڈرتا ہے، اس کا کہنا مانتا ہے، سچ بولتا ہے اور پاک صاف رہتا ہے تو اس کا دل اللہ کا گھر رہتا ہے۔ اللہ اس سے باتیں کرتا ہے، اسے راستہ دکھاتا ہے۔ اور دل سیاہ ہو جائے تو شیطان آدمی کو بہکاتا بھٹکاتا رہتا ہے اور آدمی سمجھتا ہے کہ اللہ اس کی راہنمائی کر رہا ہے۔

اس وقت کی طرح وہ اس وقت بھی خوف سے جھرجھری لے کر رہ گئی۔

دل کو پاک صاف رکھنا چاہئے۔ اسی لمحے اسے خیال آیا کہ آغا جی کا دل کیسا

روشن اور پاک صاف ہے۔ اسے رشک آنے لگا۔

❁ ❁ ❁

صبح وہ سو کر اٹھے، تب بھی برف باری ہو رہی تھی۔ باہر اب برف کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہر چیز برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ سب کی کیفیت بچوں کی سی تھی۔ وہ باہر نکلنے کو تڑپ رہے تھے۔ کسی سے ٹھیک سے ناشتہ بھی نہیں کیا گیا۔

جنیاں اور فاطمہ آ گئی تھیں۔ عبدالحق باہر شمریز اور نوریز کے پاس چلا گیا۔

''کیا ساری رات برف باری ہوئی ہے؟'' نوربانو نے جنیاں سے پوچھا۔

''جی بی بی صاحبہ!'' جنیاں نے فخر اور خوشی سے کہا۔

''ابھی تک نہیں رکی ہے۔ بڑے دن پر اتنی برف پڑتی کبھی نہیں دیکھی۔''

''لگتا ہے، اللہ میاں آپ کی مہمان نوازی کر رہے ہیں۔'' فاطمہ نے ہنس کر کہا۔

''مگر سردی تو بالکل نہیں ہے۔''

''برف رکے گی تو اتنی ٹھنڈی ہوا چلے گی کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔'' فاطمہ نے کہا۔

''برف باری کے بعد اصل سردی ہوتی ہے۔''

''اچھا!'' نوربانو کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

نوربانو تو فوراً ہی بنگلے سے نکل کر باہر کی سیر کرنا چاہتی تھی۔ لیکن حمیدہ کے سر پر گھروندا سوار تھا۔ عبدالحق نے کہا۔

''پہلے عقبی حصے میں چلتے ہیں۔ برف باری کسی بھی وقت رک سکتی ہے۔ اس کے بعد خطرناک سردی ہوگی۔ میں بغیر تیاری کے باہر نہیں نکلنا چاہتا۔ مجھے اماں کی فکر ہے۔'' اور نوربانو برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

وہ باہر نکلے۔ حمیدہ ارجمند کو لے کر اس طرف گئی، جہاں رات وہ

گھروندا بنانے کے ناکام کوشش کرتی رہی تھی۔ اس نے بڑے خشوع وخضوع سے بسم اللہ پڑھی اور بیٹھ گئی۔ اس نے برف کو چھوا لیکن اس کے انداز میں بڑی بے یقینی تھی۔

عبدالحق نے کیمرہ سنبھال لیا تھا۔

اس بار گھروندا گرا نہیں، قائم رہا۔ حمیدہ کی بوڑھی آنکھوں میں ایسی چمک ابھری، جو عبدالحق نے برسوں سے نہیں دیکھی تھی۔

''میرا گھروندا بن گیا۔ تیرا شکر ہے ربا!'' حمیدہ نے آسمان کی طرف سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

ارجمند بھی بچوں کی طرح تالیاں بجا رہی تھی۔ نور بانو بھی مسکرا رہی تھی۔ پھر وہ بھی گھروندا بنانے بیٹھ گئی۔ حمیدہ دوسرا گھروندا بنانے لگی۔ لگتا تھا کہ اس کا دل ابھی نہیں بھرا ہے۔

پھر اچانک ہی حمیدہ کو شدید سردی کا احساس ہوا۔ اس کا جسم کپکپانے لگا۔ نور بانو اور ارجمند پہلے کی سی بے فکری کے ساتھ اپنے اپنے گھروندے میں لگی ہوئی تھیں۔

''پتر! مجھے تو بڑی ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' حمیدہ نے کپکپاتی آواز میں عبدالحق سے کہا۔

عبدالحق نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔

''یہ ایک دم سے کیا ہوا اماں!'' اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ برف باری رک گئی ہے۔ برف باری کب رکی، اس کا اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ان لوگوں کو دیکھنے اور تصویریں بنانے میں منہمک تھا۔

''برف باری رک گئی ہے۔ آپ لوگ جلدی سے اندر آ جائیں۔ میں اماں کو لے کر جا رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور تیزی سے حمیدہ کو گود میں لے کر گھر کی طرف دوڑنے لگا۔

نور بانو اور ارجمند نے چونک کر دیکھا تو وہ احتجاج کرتی ہوئی حمیدہ کو

گود میں لئے بنگلے کی طرف دوڑتا نظر آیا۔

''یہ انہیں کیا ہو گیا اچانک؟'' نور بانو بڑبڑائی۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ برف باری رک گئی ہے۔'' ارجمند نے کہا۔ لیکن ابھی وہ محض لفظ تھے۔ ان کی معنویت اس کے دماغ تک نہیں پہنچی تھی۔ پھر اسے یاد آیا تو اس نے اضافہ کیا۔

''اور آپی! اس سے پہلے دادی اماں نے کہا تھا کہ انہیں سردی لگ رہی ہے۔''

نور بانو نے ادھر ادھر دیکھا اور بولی۔

''ارے واقعی! یہ برف باری کب رکی؟''

اس بار ارجمند کو احساس ہو گیا کہ برف باری رک گئی ہے۔

''معلوم نہیں آپی! مجھے تو پتا بھی نہیں چلا۔ اور اب مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

''لگ تو مجھے بھی رہی ہے۔ لیکن اماں نے اتنا شور کیوں مچا دیا؟''

''اماں بوڑھی اور کمزور ہیں نا آپی!'' ارجمند نے اسے سمجھایا۔ ''اب اندر چلیں آپی! آغا جی کہہ کر گئے ہیں۔''

''یہ گھروندا مکمل کر لیں، پھر چلتے ہیں۔''

لیکن گھروندا مکمل ہوتے ہوتے ان دونوں کو بھی باقاعدہ سردی لگنے لگی۔

وہ اندر پہنچیں تو حمیدہ کمبل میں لپٹی بیٹھی تھی اور عبدالحق اسے کافی کی پیالی دے رہا تھا، جو اس نے خود بنائی تھی۔

''اسے گرم گرم پی لو اماں!''

حمیدہ نے پہلا گھونٹ لیا اور برا سا منہ بنا کر بولی۔

''یہ تو کڑوی زہر ہے۔''

''اسے سردی بھگانے والی دوا سمجھ کر پی لو اماں!''

اور واقعی، کافی پیتے ہی حمیدہ نے کمبل اتار پھینکا۔

''یہ تو بڑے کام کی چیز ہے پتر!''
عبدالحق مسکرا دیا۔
''اب باہر چلیں نا!'' نور بانو نے عبدالحق سے کہا۔
''اب یہ خطرناک سردی ہے۔'' عبدالحق بولا۔
''پوری تیاری سے نکلنا ہوگا۔ گرم کپڑوں اور تمام لوازمات کے ساتھ، تیار ہو جاؤ۔''
وہ سب تیار ہونے لگے، سویٹر، جیکٹ اور جیکٹ پر چیسٹر، کانوں پر اونی مفلر لپیٹے گئے اور سروں پر اونی ٹوپیاں، ہاتھوں میں چمڑے کے دستانے۔ یہ سب کچھ شمریز کی ہدایات کے مطابق تھا۔
''پہلی بار مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں بہت موٹی ہوں۔'' نور بانو نے ہنستے ہوئے کہا۔
لیکن حمیدہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
''پتر! میں بیل تو نہیں ہوں کہ یہ بوجھ اٹھا سکوں۔''
عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''کیا کہہ رہی ہو اماں!''
''میں تو اس حال میں دو قدم بھی نہیں چل سکتی پتر! تم لوگ جاؤ۔ میں یہیں رکوں گی۔''
''تو یہ لوگ چلی جائیں گی۔ میں تمہارے ساتھ رکوں گا اماں!'' عبدالحق نے کہا۔
''تو کیا ہم اکیلی جائیں گی۔'' نور بانو نے اس پر آنکھیں نکالیں۔
''اکیلی کیوں؟ نوریز اور جنیاں جائیں گے تمہارے ساتھ۔''
''نا پتر! تو ان لوگوں کے ساتھ جا۔'' حمیدہ نے جلدی سے کہا۔
''تمہیں اکیلا چھوڑ کر؟''
''میرے ساتھ یہ جنیاں اور فاطمہ ہیں نا، تو میری فکر نہ کر۔''
عبدالحق کا دل نہیں مان رہا تھا۔ لیکن انکار ممکن نہیں تھا۔

''آؤ چلیں۔'' اس نے نور بانو اور ارجمند سے کہا۔

❁ ❁ ❁

شمریز نے نوریز کو ان کے ساتھ کر دیا تھا۔
پہلے تو انہوں نے مال روڈ کا رخ کیا۔ وہاں خاصی رونق تھی۔ انہوں نے ایک دکان سے چوڑیاں خریدیں۔ پھر وہ ادھر ادھر گھومتے پھرے۔ ایک دکان سے عبدالحق نے ڈرائی فروٹ خریدے۔
''گھر میں بیٹھ کر کھائیں گے۔'' اس نے کہا۔
ارجمند کو کوئی چیز رہ رہ کر ستا رہی تھی۔ اندر جیسے کوئی تکلیف میں تھی، اور اس کا تعلق کسی ایسی چیز سے تھا، جو وہ دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ ذہن پر زور دیتی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔
مگر پر بات سمجھ میں آ گئی۔ اسے دکھ ہونے لگا۔
''ہائے..... یہ برف کتنی میلی ہوگئی ہے لوگوں کے چلنے سے۔'' اس نے کہا۔
نور بانو نے چونک کر اسے دیکھا۔
''واقعی! مجھے بھی برا لگ رہا تھا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیا ہے؟''
''کتنی پاک صاف، کتنی سفید برف تھی۔'' ارجمند نے آزردگی سے کہا۔
''اب دیکھ کر لگتا ہے کہ اس کی خوبصورتی کو داغ لگ گیا ہے۔''
عبدالحق اداسی سے مسکرایا۔
''اللہ انسان کو ایسی ہی پاک صاف، شفاف اور بے داغ روح دے کر بھیجتے ہیں دنیا میں۔ اور وہ یہاں اسے میلا اور داغ دار کر لیتا ہے۔ اسی کا تو جواب دینا پڑے گا قیامت کے دن۔''
''آپ بھی بس فلسفہ شروع کر دیتے ہیں۔'' نور بانو نے لاڈ سے کہا۔
''ان دونوں باتوں کا کیا تعلق آپس میں؟''
''محسوس کرنے کی بات ہے۔'' عبدالحق نے برا مانے بغیر کہا۔

ارجمند نے اسے محسوس بھی کیا تھا، اور اس نکتے پر غور بھی کر رہی تھی۔ نور بانو کی مداخلت اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔

''یہ کیسے محسوس کیا آپ نے؟'' نور بانو نے عبدالحق سے پوچھا۔

''دیکھو نا، آدمی تو خاک کا پتلا ہے۔ سو اس کا جسم زمین پر پھلتا پھولتا ہے، بڑھتا ہے، لیکن روح تو آسمانوں کی چیز ہے۔''

''کیسے......؟''

''غور کیا کرو، سوچا کرو۔ آدمی مرتا ہے تو اس کا جسم تو مٹی میں دبا دیا جاتا ہے۔ لیکن روح آسمان پر پرواز کر جاتی ہے۔ اب سوچو، زندگی کیا ہے؟ اور روح کیا ہے؟ زندگی روح کے دَم سے ہے۔ روح کرنٹ ہے، بیٹری ہے، جسے ہم زندگی کہتے ہیں۔ موت اللہ کے حکم سے، اس کے مقرر کردہ وقت پر روح قبض کر لینے کا نام ہے۔ روح نکل جاتی ہے تو جسم بے جان ہو جاتا ہے۔ کبھی بیٹری سے چلنے والی موٹر نہیں دیکھی۔ بیٹری نکال لو تو موٹر رک جاتی ہے۔ روح توانائی ہے۔ وہ اس دنیا کی زمین کی چیز نہیں۔ وہ تو اللہ کی امانت ہے۔ زندگی کی کامیابی یہ ہے کہ اللہ روح واپس لے تو وہ ویسی ہی پاک صاف ہو، جیسی اللہ نے دی تھی۔''

''لیکن یہ تو ممکن نہیں۔'' ارجمند نے کہا۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ یہ میلی برف ہمیں یہی بتاتی ہے۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''لیکن اللہ غفور الرحیم ہے۔ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ ہماری فطرت سے واقف ہے، اور یہ دنیا بھی اسی کی بنائی ہوئی آزمائش ہے۔ روح جیسی اللہ نے دی، ویسی تو شاید صرف پیغمبر ہی واپس کرتے ہوں گے۔ عام بندے تو آلودہ ہوتے ہی ہیں۔ تو اللہ نے ان کے لئے نرمی بھی یقیناً رکھی ہے۔ وہ تو بہت بخشنے والا ہے۔ سمندر کے جھاگ جتنے گناہ بھی بخش دے۔ لیکن جنہوں نے شرک کی، اور اس سے بغاوت کی، انہیں وہ نہیں بخشے گا۔ شاید یہی دو چیزیں روح کو سب سے زیادہ آلودہ کرتی ہوں گی؟''

ارجمند سوچ رہی تھی۔ یہ آغا جی کیسے آدمی ہیں؟ کیسے مختلف انداز میں سوچتے ہیں، اور کتنا اچھا سوچتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا عمل بھی اچھا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی سمجھ میں ایک بات آئی، جو اسے بہت اہم لگی۔ انسان کی سوچ بہت اہم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اس کے عمل کی بنیاد ہوتی ہے۔ جس شخص کی سوچیں اور خیالات برے ہوں گے، وہ اچھا عمل کیسے کرے گا۔ بے شک اچھا سوچنے والا بھی اپنی سوچ کے برابر عمل نہیں کر سکتا۔ لیکن کم از کم برے عمل سے تو بچا رہتا ہے، اور کسی حد تک اچھا عمل بھی کرتا ہے۔ اس نے سمجھ لیا کہ آدمی کو اپنی سوچوں پر نظر رکھنی چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ اس کی سوچیں درست ہوں۔

''لیکن آغا جی! اس برف میں اور آدمی میں کچھ فرق بھی تو ہے۔'' اس نے عبدالحق سے کہا۔

عبدالحق چند لمحے غور کرتا رہا۔ پھر اس نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' اس نے کہا۔

''فرق تو بڑا ہے۔ برف تو مجبور ہے۔ اپنی مرضی سے میلی نہیں ہو رہی ہے۔ انسان بے شک برف کی طرح دوسرے لوگوں سے، اپنے گرد و پیش اور اپنے ماحول سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ بڑا نقصان اسے اپنی نفسانی خواہشوں سے ہوتا ہے۔ جبکہ اسے مزاحمت کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔ اسی لئے تو اسے جواب دہی کرنی ہے۔ اسی لئے تو جزا اور سزا ہے۔''

سنتے سنتے ارجمند کی نظر اچانک ایک چیز پر پڑی، اور وہ خوشی سے چلائی۔

''وہ دیکھیں تو...... ارے واہ......!''

عبدالحق اور نور بانو نے اشارے کی سمت دیکھا۔ ایک ٹیلے پر چار پانچ بچے برف سے مجسمے بنا رہے تھے۔ مجسمہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ عبدالحق سحر زدہ سا اسے تکنے لگا۔

نور بانو نے سکون کی سانس لی۔ اس خشک موضوع سے چھٹکارا مل رہا

تھا۔ جو اس کے لئے محض کوفت کا سبب تھا۔ اسے ارجمند پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اس میں کیسے دلچسپی لے رہی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بات اسی کی وجہ سے بڑھی تھی۔

وہ تینوں، بچوں کی طرف بڑھ گئے، جو اپنے مجسمے میں منہمک تھے۔ وہ دیکھتے رہے۔

"کل تو گھروندا بھی نہیں بن رہا تھا اور آج یہ اتنا بڑا مجسمہ......" وہ بڑبڑائی۔

"اب برف سخت ہوگئی ہے نا!" عبدالحق نے کہا۔

"مجھے یاد ہے، آپ نے کل کہی تھی یہ بات۔" ارجمند بولی۔

بچوں کو ان کی موجودگی کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی نگاہوں میں فخر تھا۔

"یہ کیا بنا رہے ہو؟" نوربانو نے ان سے پوچھا۔

"یہ...... سنو مین ہے۔" ایک بچے نے جواب دیا۔

نوربانو کی سمجھ میں نہیں آیا۔ عبدالحق نے اس کے کان میں کہا۔

"یہ انگریزی میں کہہ رہے ہیں، برفادی۔"

"یہ برفادی کیا ہوتا ہے؟"

"میں نے تو ترجمہ کیا ہے۔" عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، برف کا آدمی۔"

ارجمند ان کی باتوں سے بے خبر، بچوں کے ساتھ شامل ہوگئی تھی۔

مجسمہ مکمل ہوگیا تو ایک بچے نے انگلی سے اس کے سینے پر Snow man لکھ دیا۔ پھر وہ سب تالیاں بجانے لگے۔

وہ چاروں بھی آگے بڑھ گئے۔ کچھ دیر وہ ایک گہری کھائی کے کنارے پر کھڑے نیچے دیکھنے لگے۔ وہاں کوئی چلنے والا نہیں تھا، اس لئے وہاں برف ویسی ہی سفید اور پاکیزہ تھی۔ جیسی آسمان سے برسی تھی۔

"اللہ جسے چاہے، محفوظ کر دے، جسے چاہے بچا لے۔" عبدالحق نے خود

کلامی کے انداز میں کہا۔

نوربانو کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آئی۔ لیکن بات بڑھ جانے کے ڈر سے اس نے وضاحت نہیں چاہی۔ اور ارجمند اس بات کو پوری طرح سمجھ گئی تھی۔ اسے کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

ذرا دیر بعد ارجمند نے کہا۔

"آغا جی! اب گھر چلیں۔"

"کیوں؟ بھوک لگ رہی ہے؟" عبدالحق نے پوچھا۔

"واقعی! بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" نوربانو نے جلدی سے کہا۔

"دادی اماں نہیں آئیں نا! تو ہم انہیں وہاں باہر لے کر چلیں گے، اور ان کے لئے سنو مین بنائیں گے۔" ارجمند نے جواب دیا۔

"پتا بھی ہے کہ سنو مین کیا ہوتا ہے؟" نوربانو نے جیسے اسے چیلنج کیا۔

"جی آپی! آغا جی نے مجھے انگریزی پڑھائی ہے نا، اس لئے مجھے معلوم ہے۔" ارجمند نے سادگی سے کہا۔

✿ ✿ ✿

انہوں نے کھانا کھایا، نماز پڑھی، کچھ دیر آرام کیا اور پھر بنگلے کے عقبی حصے میں نکل گئے۔ حمیدہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ارجمند کی ضد کے سامنے اسے ہار ماننا پڑی۔

"پر اس کی ضرورت کیا ہے نکی!" حمیدہ نے نکلتے نکلتے بھی احتجاج کیا۔ بہت زیادہ گرم کپڑوں کے بوجھ کی وجہ سے اسے قدم اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

"ضرورت ہے دادی اماں!" ارجمند نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"آپ بھی کہہ سکیں گی کہ برف باری کے بعد بھی آپ باہر گھومی تھیں۔ یہاں ہم وہی سب کریں گے، جو ہم نے باہر کیا تھا...... آپ کے لئے۔"

"اور باہر کیا کیا تھا تم لوگوں نے؟"

"خود ہی دیکھ لیجئے گا۔"

ارجمند نے عبدالحق سے اس کا ایک کوٹ اور ہیٹ مانگ لیا تھا۔

چھڑیاں تو سب کے ہاتھ میں تھیں، حمیدہ کے لئے وہ چھڑی سب سے زیادہ کام کی ثابت ہو رہی تھی۔

باہر نکلتے ہی حمیدہ کو سب سے پہلے اپنے گھروندے کا خیال آیا۔

''مجھے میرا گھروندا دکھاؤ پہلے۔''

وہ وہاں پہنچے تو حیران رہ گئے۔ رات بھر ہونے والی برف باری کے نتیجے میں ان کے گھروندے تقریباً غائب ہو گئے تھے۔ تاہم وہ جگہ اتنی ابھری ہوئی ضرور تھی کہ انہیں بغیر کسی دشواری کے مل گئی۔

''ہائے ربا! میرا گھروندا؟'' حمیدہ نے تاسف سے کہا۔

''اس کا تو دروازہ ہی بند ہو گیا۔''

''شکر کریں اماں! اندر کوئی نہیں تھا۔ ورنہ دم گھٹ جاتا اس کا۔'' نور بانو نے شوخ لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں دادی اماں! اب آپ پہلے سے بھی بڑا گھروندا بنا سکتی ہیں۔'' ارجمند نے حمیدہ کو دلاسہ دیا۔

''اتنی مشکل سے تو وہ بنا تھا۔''

''اب اتنی مشکل نہیں ہوگی۔ برف سخت ہو گئی ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

حمیدہ گھروندا بنانے میں مگن ہو گئی۔ ارجمند اور نور بانو سنومین کے لئے جُت گئیں۔ لیکن چند ہی منٹ میں نور بانو بے زار ہو گئی۔ اسے ویسے بھی اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور نہ ہی اس کی سمجھ میں کچھ آ رہا تھا۔

ارجمند کچھ دیر تو اکیلی کام کرتی رہی۔ پھر اس نے عبدالحق کو پکارا۔

''آغا جی! میری مدد کیجئے نا!''

''مجھے تو یہ سب کچھ آتا ہی نہیں!'' عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

''آپ آئیں تو! میں سکھا دوں گی۔''

یوں عبدالحق ارجمند کے ساتھ شامل ہو گیا۔

''آپ اس کی ایک ٹانگ بنائیں آغا جی۔''

سنومین کی وہ نامکمل ٹانگ نور بانو کی بنائی ہوئی تھی، اور جس ٹانگ پر ارجمند کام کر رہی تھی، اس کے مقابلے میں بہت بے ڈھنگی تھی۔ ارجمند کی بنائی ہوئی ٹانگ میں صفائی بھی تھی اور حسن تناسب بھی۔ عبدالحق کو خیال آیا کہ مصوری کی خداداد صلاحیت کی وجہ سے ارجمند کو جسمانی اعضاء کا مکمل شعور حاصل ہے۔

اس نے بھی اسی انداز میں کام شروع کر دیا۔

اچانک حمیدہ نے پکارا۔

''مجھے اٹھا پتر! میں خود سے نہیں اُٹھ سکتی۔''

عبدالحق نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ وہ گھروندا بنا چکی تھی۔ اور ہاتھوں کے زور پر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تو ابھی بیٹھی رہو اماں! کھڑی ہو گی تو تھک جاؤ گی۔'' عبدالحق نے کہا۔

حمیدہ نے ان کی مصروفیت کو دیکھا۔

''یہ تم دونوں کیا بنا رہے ہو؟ ڈنڈے؟''

ارجمند ہنسنے لگی۔

''دیکھتی رہیں دادی اماں!''

لیکن حمیدہ دوسرا گھروندا بنانے میں مصروف ہو گئی تھی پھر نور بانو بھی تھک کر بیٹھ گئی، اور بیکار مباش کچھ کر کے مصداق اس نے بھی گھروندا بنانا شروع کر دیا۔

سنومین کی ٹانگیں مکمل ہو گئی تھیں۔ مگر وہ ایک دوسرے سے مختلف لگ رہی تھیں۔ عبدالحق نے یہ بات ارجمند سے کہی تو اس نے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں آغا جی! میں ابھی ٹھیک کر دیتی ہوں۔''

اور واقعی ذرا دیر میں دونوں ٹانگیں ایک سی لگنے لگیں۔

''اب میں آگے تمہاری مدد نہیں کر سکوں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''ایک مدد تو کر سکتے ہیں۔ میرے لئے برف اکٹھی کر دیں یہاں۔''

عبدالحق ادھر ادھر سے برف لا کر وہاں ڈھیر کرنے لگا۔ پھر اسے ایک

اور خیال آیا۔

''لیکن تمہارا ہاتھ اوپر کیسے جائے گا؟'' اس نے کہا۔

''ہاں آغا جی! یہ تو ہے۔''

''چلو! یہ مسئلہ بھی حل کرتے ہیں۔'' عبدالحق نے کہا اور بنگلے کی طرف چل دیا۔

وہ بنگلے میں داخل ہوا۔ اسی وقت شمریز اور نوریز بھی وہاں آ گئے۔

''کیا بات ہے سر!'' شمریز نے پوچھا۔

''کرسی لے جانے کے لئے آیا ہوں۔''

''ہم نے غلطی ہوگئی سر! ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم پہنچا دیں گے۔''

عبدالحق نے سوچا، باہر کافی کی ضرورت ہے۔ وہ کافی بنانے میں مصروف ہوگیا۔

تھرماس میں کافی بھر کر وہ باہر نکلا تو شمریز واپس آتا نظر آیا۔

''اور کوئی حکم سر جی!''

''پیالیاں لے آؤ اندر سے۔''

باہر نقشہ بدلا ہوا تھا۔ شمریز اور نوریز نے چھ کرسیاں وہاں پہنچا دی تھیں، اور فاطمہ اور جنیاں نے دور دور سے لا کر برف کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ یہی نہیں، سنومین کا اوپری دھڑ مکمل ہو چکا تھا۔ ارجمند کرسی پر کھڑی ہو کر اب اس کے چہرے پر کام کر رہی تھی۔ حمیدہ اور نوربانو کرسی پر بیٹھی تماشہ دیکھ رہی تھیں۔

عبدالحق کے آتے ہی جنیاں بنگلے کی طرف دوڑ گئی۔ فاطمہ، شمریز اور نوریز سرونٹ کوارٹر کی طرف چلے گئے۔ شمریز نے پیالیاں لا کر ایک خالی کرسی پر رکھ دی تھیں۔

سنومین کو دیکھ کر عبدالحق کافی کو بھول گیا۔ ارجمند کا تناسب اعضاء کا شعور واقعی غیر معمولی تھا۔ اوپری دھڑ اور ٹانگوں کے درمیان کا تناسب کمال کا تھا اور ارجمند نے اس کے کندھوں پر چیسٹر ڈال کر تمام بٹن بند کر دیئے تھے اور اب

وہ گردن پر کام کر رہی تھی۔

عبدالحق نے سوچا، اچھا ہوا کہ میں نے کوٹ کے بجائے چیسٹر دیا۔ اس قد و قامت کے ساتھ اس کا کوٹ تو سنومین کے لئے محض ایک تنگ سی واسکٹ ہی ثابت ہوتا۔

ارجمند سنومین کی گردن بنا چکی تھی اور اس کے چہرے پر کام کر رہی تھی۔ اب مشکل مرحلہ ہے۔ عبدالحق نے سوچا۔ چہرے کے خدوخال کے تناسب کا خیال رکھنا آسان نہیں ہے۔

جنیاں آئی اور ایک ٹرے دوسری خالی کرسی پر رکھ کر واپس چلی گئی۔ ٹرے میں بڑی پلیٹ پر اُبلے ہوئے انڈے تھے۔ لیکن کس کو پتا نہیں چلا۔ وہ سب سحر زدہ سے ارجمند کے متحرک ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔

پھر چہرہ بھی مکمل ہو گیا۔ ارجمند نے سنومین کے سر پر ہیٹ ترچھا کر کے لگا دیا۔

عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیسے اس کی تعریف کرے۔ وہ چہرہ اور سر سنومین کے جسم کے عین مطابق تھا۔ حسن تناسب کا شاہکار، اور پھر چہرے کی خوب صورتی، ناک، بھویں، ہونٹ، جبڑا...... سب تناسب کے ساتھ تھے۔ بس ایک کمی تھی......

''ذرا ایک طرف ہٹ نگی! میں دیکھوں تو......'' حمیدہ نے کہا۔

ارجمند ایک طرف کو ہٹی۔

''واہ......! بہت خوب صورت ہے۔'' نوربانو نے کہا۔

''تو نے تو کمال کر دیا نگی!'' حمیدہ بولی۔

''لیکن ایک کمی ہے۔'' نوربانو نے عبدالحق کے دل کی بات کہی۔

ارجمند پھر ان کے اور سنومین کے درمیان آئی۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور سنومین کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ پلٹ کر بولی۔

''مجھے تو کوئی کمی نظر نہیں آتی آپی!''

''اس کی آنکھیں.....'' نور بانو جملہ مکمل نہ کر سکی۔ ارجمند ایک دم سے کرسی سے اُتر آئی تھی، اور سنومین کا چہرے سامنے آ گیا تھا۔ ہیٹ کے سائے میں اس کی نیلی آنکھیں تقریباً سیاہ لگ رہی تھیں۔ اور وہ گول آنکھیں نہیں تھیں۔ بڑی اور بیضوی آنکھیں تھیں۔

وہ سب حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ آنکھیں تو سچ مچ کی لگ رہی تھیں۔

''یہ آنکھیں تو کہاں لائی نکی!'' حمیدہ نے پوچھا۔

نور بانو بھی اسے تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''وہ بندے مجھے آپی نے دلائے تھے نا.....!''

نور بانو کو یاد آ گیا۔

''وہ نیلے نگ والے.....؟''

''جی آپی! ابھی میں آتے ہوئے وہ نگ نکال لائی تھی۔ ان کی ساخت آنکھوں جیسی ہے نا.....!''

''ہاں.....!''

عبدالحق کو کافی اور انڈوں کا خیال آ گیا تھا۔ اس نے پیالیوں میں کافی انڈیلی۔

''یہ لیں! سردی دور کریں۔ پھر میں اس سنومین کے ساتھ آپ سب کی تصویریں بناؤں گا۔''

❁ ❁ ❁

لاہور واپسی کے بعد زندگی ویسے ہی جاری ہو گئی تھی۔ وہی معمولات، وہی روز و شب۔ ارجمند کو مری میں گزارے ہوئے وہ تین دن بالکل الگ سے لگتے تھے، جیسے کسی طویل کہانی میں غلطی سے کسی اور کہانی کا ایک ورق شامل ہو گیا ہو۔

لیکن ایک بہت بڑا فرق پڑا تھا۔ مصوری کا شوق پھر سے زندہ ہو گیا تھا۔ پھپھا کی دی ہوئی اسکیچ بک نکالنے کی تو اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس نے

عبدالحق سے کہا تو اسے نئی اسکیچ بک مل گئی۔

مری کے وہ منظر اس کے لئے خواب جیسے تھے۔ وہ آنکھیں بند کرتی تو کوئی منظر جزئیات سمیت اس کے تصور میں تازہ ہو جاتا۔ اور وہ سنو مین...... اسے یاد تھا، بنگلے کی کھڑکی سے اس نے دیکھا تو ایسا لگا، جیسے وہ سچ مچ کا کوئی آدمی ہے، جو تنہا برف باری میں گھر گیا ہے۔ دور دور تک کوئی ایسی جگہ نہیں، جہاں اسے پناہ مل سکے۔ بلکہ اسے تو اس کے چہرے پر بے چارگی کا تاثر بھی نظر آ رہا تھا۔

واپس نکلنے تک وہ بار بار اس سنومین کو دیکھتی رہی۔ اس میں کوئی جادو تھا۔ دور سے دیکھنے پر وہ بہت لمبا اونچا نہیں، بلکہ ایک عام آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اور جیسے وہ کوئی آئینہ تھا۔ وہ جس باطنی کیفیت میں اسے دیکھتی، اس کا عکس اسے اس کے چہرے پر نظر آتا۔ وہ خوش ہوتی تو وہ مسکرا رہا ہوتا۔ وہ خود کو تنہا محسوس کرتی تو وہ اسے خوفزدہ دکھائی دیتا۔ اس کے دل میں دبی ہوئی محبت سر اٹھانے کی کوشش کرتی تو وہ عبدالحق بن جاتا۔ وہ بے روح تھا، لیکن شاید دیکھنے والے کی روح کا ایک حصہ وقتی طور پر مستعار لے لیتا تھا۔ اس میں شاید انسانی باطن کے تمام رنگ تھے۔

ارجمند حیران تھی۔ وہ لاہور میں رہتی تھی، جو شہر تھا۔ وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی عمارتیں تھیں، بہت قدیم بھی اور جدید بھی۔ وہاں تاریخی عمارتیں بھی تھیں، جو یادگار کی حیثیت رکھتی تھیں، بنگلے بھی تھے، اور غریبوں کی جھونپڑیاں اور کچے مکان بھی۔ انہیں دیکھ کر اللہ کا خیال نہیں آتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ یہ سب انسانوں نے بنایا ہے۔

لیکن پھر اس نے دو انتہائیں دیکھیں۔ پہلے وہ حق نگر گئی تھی۔ سفر کے دوران صحرا دیکھ کر وہ بہت حیران، بہت مرعوب ہوئی تھی۔ وہ تو لا انتہا ہی تھا۔ جہاں وہ نظر کی حد سے باہر نکلتا تو آسمان سے مل کر بے کراں ہو جاتا اور پھر ریت کے ڈیزائن، جیسے ایک خوب صورت اور مرتب نمونے کی دری اللہ میاں نے بچھا دی تھی۔ کہیں کوئی شکن نہیں تھی اور کہیں ڈیزائن میں کوئی فرق نہیں تھا۔

ارجمند مصوری کرتی تھی، سو جانتی تھی کہ تصویر چھوٹی ہو تو غلطیوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسے بڑا کرو تو چھوٹی چھوٹی غلطیاں بھی نمایاں ہو کر نظر آنے لگتی ہیں۔ لیکن صحرا تو جیسے آسمان کی اونچائی تک کے میلوں چوڑے کینوس پر بنی بہت...... بہت بڑی تصویر تھا۔ اور باریک بینی سے دیکھنے پر بھی اس میں کہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ اسے دیکھ کر دل پر اللہ کی ہیبت طاری ہوتی تھی۔

پھر اس نے پہاڑ دیکھا۔ سفر کے دوران اس نے سوچا، پہاڑ پر بہت سے لوگ کیسے رہتے ہوں گے؟ اتنی تو جگہ بھی نظر نہیں آتی۔ بلکہ پہاڑی چوٹی کے بارے میں تو وہ سوچتی تھی کہ وہاں تو مشکل سے ایک آدمی کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ لیکن اوپر جا کر اس نے دیکھا کہ وہاں بھی زمین میدان کی طرح ہموار اور وسیع ہے۔ مکان اور بنگلے ہیں، سڑکیں اور راستے ہیں۔ لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ وہ لڑھکتے بھی نہیں۔ ایک طرف جھکتے بھی نہیں۔ جیسا کہ سفر کے دوران وہ سوچتی رہی تھی۔ بلکہ اگر اسے یقینی طور پر معلوم نہ ہوتا کہ وہ پہاڑ پر ہے تو شاید وہ کبھی یہ بات تسلیم بھی نہ کر پاتی۔

تو ان دونوں مقامات نے اسے اللہ کی بے پناہ قدرت کا احساس دلایا، اور اس بے بسی کا بھی کہ اللہ کی قدرت کو کوئی سمجھ بھی نہیں سکتا۔ قرآن سے اس کا تعلق اور گہرا ہو گیا۔ اور مصوری کا شوق بھی جاگ اُٹھا۔ اب اس شوق کا مرکز قدرتی مناظر تھے۔

✿ ✿ ✿

عبدالحق حق نگر خاص طور پر مولوی صاحب سے ملنے کے لئے گیا تھا۔ ان کے ساتھ طویل نشست کے آغاز میں اس نے ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔

''میں سمجھا نہیں پتر!'' مولوی صاحب نے کہا۔

''تم چاہتے کیا ہو؟''

''میں ملازمت چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔''

''کیوں......؟''

''اس میں الجھ کر میں اللہ سے دور ہو گیا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اللہ نے معاش اور روزگار کو میرے لئے مسئلہ نہیں بنایا۔ تو پھر مجھے چاہئے کہ میں قرآن پر توجہ دوں اور اللہ کو سمجھنے کی کوشش کروں۔''

مولوی مہر علی چند لمحے سوچتے رہے، پھر بولے۔

''پتر! آزمائش تو سب کے لئے ہے۔ انداز الگ الگ ہیں۔ اللہ کسی کو فراخی اور کشادگی دے کر آزماتا ہے اور کسی تنگی اور عسرت دے کر۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں مولوی صاحب!'' عبدالحق نے جوش سے کہا۔

''تو پھر تم نے ملازمت قبول ہی کیوں کی تھی؟''

عبدالحق نے انہیں مسعود صاحب کے نظریے کے بارے میں بتایا، جس کے زور پر انہوں نے اسے قائل کیا تھا۔

''بات ان کی سولہ آنے سچی ہے۔'' مولوی صاحب بولے۔

''انسانوں کی خدمت سے بڑی کوئی عبادت نہیں۔''

''لیکن یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔''

''یہ بات تو اس کام کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے، جو تم اس کام کو چھوڑ کر کرنا چاہتے ہو۔'' مولوی صاحب نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''دنیا میں عابدوں کی، اللہ کے کلام پر غور کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ آدمی کو بدلتے وقت سے ڈرنا چاہئے کہ کہیں غرور اور خود پسندی میں تو مبتلا نہیں ہو رہا ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔

''میں تو آخرت کی جواب دہی سے ڈر رہا ہوں۔''

مولوی صاحب پھر سوچنے لگے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''دیکھو پتر عبدالحق! اللہ نے ہر آدمی کو ایک مقام، ایک مرتبہ اور ایک کام دے کر پیدا فرمایا ہے۔ آدمی تو بڑی چیز ہے، گھاس کی ایک پتی اور ریت کا ایک ذرہ بھی بے مصرف نہیں۔ جہاں جو کچھ بھی ہے، اپنی جگہ اہم ہے، اور اس

بہت بڑے نظام کا حصہ ہے، جسے قیامت تک کوئی سمجھ نہیں سکے گا۔ اب آدمی یہ سوچ کر اپنے بچے کو تعلیم دلاتا ہے کہ وہ اسے ڈاکٹر بنائے گا۔ لیکن ضروری نہیں کہ ایسا ہو۔ اللہ نے اس کے لئے جو فیصلہ کیا ہے، وہ وہی بنے گا۔"

"تو کوشش کی کوئی اہمیت نہیں؟"

"کوشش ایک کھلونا ہے، انسان کو بہلانے کا، اس کو اعتماد عطا کرنے کا اور اس پر ایک بہت بڑا بھید کھولنے کا۔"

"اور وہ بھید کیا ہے؟"

"مشیت .... اللہ کی مرضی، جس کے بغیر ریت کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ دیکھو حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے کتنا سہل کر کے ہمیں بتا دیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ارادوں کو ٹوٹنے سے اللہ کو پہچانا۔"

عبدالحق نے چند لمحے اس بات کی گہرائی پر غور کیا۔ اس کے دل نے کہا۔

"سبحان اللہ!" پھر وہ بولا۔

"آپ نے فرمایا، کوشش کے ذریعے اللہ نے آدمی کو اعتماد عطا فرمایا۔ لیکن مولوی صاحب! کوشش ناکام ہو تو آدمی خود اعتمادی سے محروم ہو جاتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک! لیکن ایک بہت بڑی نعمت پا لیتا ہے ..... ایمان ... مشیت پر ایمان، اور یہ بات سمجھ لے تو مایوسی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتا ہے۔"

"یعنی بندہ اپنی کوشش کرتا رہے، اور صلے کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دے۔"

"لیکن سعی ناکام سے اللہ کی پناہ مانگتا رہے۔ کوشش کی درست سمت کے لئے اللہ سے راہنمائی طلب کرتا رہے۔" مولوی صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد وہ گویا ہوئے۔

"تم نے بہت چھوٹی عمر میں یہ بات سمجھ لی تھی کہ اللہ نے ایک زبردست نظام قائم فرمایا ہے ..... مکمل نظام۔ لیکن تم نے بہت سرسری طور پر یہ بات سمجھی تھی۔ بچے تھے نا! لیکن پوری طرح تو اس نظام کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔

دیکھو اللہ نے ہر چیز کا، ہر آدمی کا ایک مقام متعین فرمایا ہے، اور اس کے لئے ایک مہلت مقرر کرتے ہوئے اس کو ایک راستہ بنا کر دیا ہے۔ یہ تقدیر ہے، جس سے مفر نہیں۔"

"تو پھر کوشش اور تدبیر ....؟"

"وہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں پتر!" مولوی صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دیکھو، آدمی قرآن کو پڑھے اور سمجھے بغیر غور کرے تو اسے گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔ تمہارا کیا خیال ہے پتر! کہ کوئی بادشاہ خود بنا ہے؟"

عبدالحق کوئی جواب نہ دے سکا، مستفسرانہ نگاہوں سے مولوی مہر علی کو دیکھتا رہا۔

"نہیں پتر! بادشاہ بنتا نہیں، پیدا ہوتا ہے، چاہے بادشاہ کے گھر پیدا ہو، چاہے فقیر کے گھر۔ اس کے اقتدار کی مہلت بھی اللہ کی متعین کی ہوئی ہوتی ہے۔"

"یعنی موروثی؟"

"نہیں! ہرگز نہیں! ایسا ہوتا تو ہمایوں برسوں در در کی خاک کیوں چھانتا؟ اور شیر شاہ جیسے معمولی سپاہی کو دیکھ کر بادشاہ یہ کیسے سمجھتا کہ وہ بادشاہت کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اور پھر اسی شیر شاہ سوری کا پانچ سالہ دور تاریخ میں بڑے بڑے بادشاہوں کے بڑے بڑے ادوار پر بھاری کیوں ہوتا؟ اور اسی برصغیر میں خاندانِ غلامان کا عہد شاہی کیسے ممکن ہوتا؟"

"آپ یہ سب کچھ قرآن کی روشنی میں سمجھ کر کہہ رہے ہیں؟"

"بالکل!" مولوی صاحب نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"سورۃ الزخرف کے تیسرے رکوع میں آیت مبارکہ ہے، جس کا مفہوم ہے کہ اللہ نے ہی انسانوں کے درمیان دنیاوی زندگی میں روزی تقسیم کی ہے اور بعض کو مرتبے کے لحاظ سے بعض پر فوقیت عطا کی ہے، تاکہ ان میں سے بعض بعضوں کے خدمت گار ہوں۔ اس آیت کا یہ چھوٹا سا حصہ ایک بہت بڑے اور

مرتب نظام کی نشان دہی کرتا ہے، جسے ہم بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ سوچو، غور کرو پتر! اگر تمام انسان ہدایت پر ہوتے، قرآن کو پڑھتے، سمجھتے اور اللہ کی عبادت کے سوا کچھ بھی نہ کرتے تو اس دنیا کا نظام کیسے چلتا؟ خدمت گار نہ ہوتے تو بادشاہ کی بادشاہت کی کیا حیثیت ہوتی؟ اسے تو پانی پینے کے لئے بھی خود صراحی کے پاس جانا پڑتا۔''

عبدالحق کی آنکھوں کے سامنے جیسے مفاہیم کا ایک بہت بڑا اور روشن دریچہ کھل گیا۔ بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی، لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

مولوی صاحب کی بات جاری تھی۔

''کسان کی مثال لو۔ وہ ہل جوتتا ہے، زمین میں بیج ڈالتا ہے، پانی دیتا ہے، فصل تیار کرتا اور کاٹتا ہے۔ یہ اس کی روزی روٹی ہے۔ وہ تو صرف اپنے لئے محنت کرتا ہے نا! لیکن اس کی محنت کتنے لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ روٹی کھانے والا تو ایک پل کے لئے بھی نہیں سوچتا کہ یہ کس کس کی محنت کے نتیجے میں اس تک پہنچی ہے۔ کسان نے فصل کاٹی، گندم بازار میں پہنچی، چکی والے نے اس سے آٹا بنایا اور دکان والے کو دیا۔ دکان دار نے آٹا فروخت کیا۔ تم گھر لے کر گئے۔ بیوی نے آٹا گوندھ کر روٹی بنائی، تب تمہارے پیٹ بھرنے کا سامان ہوا۔ یہ نظام ہے نا! ایسے لاکھوں کروڑوں چھوٹے چھوٹے نظام اللہ نے قائم فرمائے، جو ایک بہت بڑے مرکزی نظام کا حصہ ہیں۔''

عبدالحق کو یاد آیا، وہ بہت چھوٹا سا تھا، جب حمیدہ نے یہ بات اس سمجھائی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ مناسب وقت پر بارش اور دھوپ اللہ فراہم کرتا ہے۔ ورنہ فصلیں تباہ ہو جاتیں۔ اور فصلیں تباہ ہوتی ہیں تو قحط پڑتا ہے، اور لوگ بھوکے مرنے لگتے ہیں، چاہے غریب ہوں، چاہے دولت مند۔ قحط سب کے لئے ایک جیسا ہوتا ہے۔

''اور پتر! سورہ کہف میں اللہ فرماتا ہے کہ اس نے زمین کو خوب صورت بنایا کہ دیکھے اس کے بندوں میں سے کون نیک اعمال کرتے ہیں۔ تو پتر! میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ اللہ نے اس دنیا کو آدمی کے لئے پرکشش بنایا۔

تاکہ وہ اس کی رنگینیوں میں کھو جائے۔ تو یہ امتحان ہے، جیسا امتحان تم نے پچھلے سال دیا تھا نا! تین گھنٹے کا پرچا تھا نا؟ تو سمجھ لو، یہ زندگی بھی تین گھنٹے کا ایک پرچا ہے۔ کئی جگہ قرآن میں اللہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن انسان دنیا کی زندگی کو یاد کرے گا تو اسے لگے گا کہ وہ عرصہ یا تو صبح کا ایک حصہ تھا یا شام کا۔ تو تین گھنٹے ہی سمجھ لو نا! اب تم نے امتحان میں پاس ہونے کے لئے کتنی محنت کی تھی۔ دن رات ایک کر دیئے تھے۔ پاس ہو گئے تو کیا ملا؟ بی۔ اے کی ڈگری! فیل ہو جاتے تو کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ دوبارہ موقع مل جاتا امتحان دینے کا۔ لیکن یہ زندگی کا جو امتحان ہے نا پتر! اس میں دوسرا موقع نہیں ملتا۔ اور اس میں پاس اور فیل ہونے کی بڑی اہمیت ہے۔ پاس ہوئے تو جنت اور فیل ہوئے تو جہنم اور دونوں میں ہی ابدی زندگی۔

تو پتر عبدالحق! یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ قرآن اس کا کورس ہے۔ اور امتحان تحریری یا زبانی نہیں، عملی ہے۔ اللہ نے دنیا کو ہمارے لئے پرکشش بنا کر ہمیں یہاں بھیجا۔ یہاں ہمارے لئے بڑی بڑی ترغیبات رکھیں۔ پھر پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعے اپنی وحدانیت اور مطلق قدرت ہم پر روشن کی اور احکام نازل فرمائے۔ کیا کام کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا، ہمیں بتایا۔ پھر آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آخری کتاب قرآن حکیم بھیج کر پرچا فائنل کر دیا۔''

''تو مولوی صاحب! کورس کی کتاب پڑھنا تو لازمی ہے نا؟''

''ہاں پتر! لیکن یہ کبھی نہ بھولو کہ امتحان عملی ہے۔ کتاب پڑھے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن پڑھنے کے ساتھ ساتھ ہی عمل بھی ہے۔ پڑھتے جاؤ اور اس پر عمل بھی کرتے جاؤ۔ یہ نہیں کہ کتاب پڑھنے میں ہی عمر گزار دو۔ دیکھو پتر! قرآن کے چار حقوق ہیں بندے پر۔ اور اسے چاروں ادا کرنے ہیں، ایک یا دو سے کام نہیں چلتا۔ پہلا حق ہے پڑھنا، دوسرا سمجھنا، تیسرا اس پر عمل کرنا اور چوتھا اسے دوسروں تک پہنچانا۔

اب اس امتحانی پرچے کا پہلا بنیادی سوال ہے ایمان۔ بغیر دیکھے اللہ پر ایمان لانا، اس کے فرشتوں، اس کے صحیفوں اور اس کے تمام پیغمبروں پر ایمان

لانا اور آخرت پر ایمان لانا۔ زبان سے بھی اور دل سے بھی۔ اب کہنے کو یہ زبانی اور نظریاتی سوال ہے۔ لیکن میں نے کہا نا کہ یہ پورا پرچا عملی ہے۔ اس ایمان کو تمہارے اقوال و افعال میں عملاً نظر آنا چاہئے۔ اور قرآن میں جہاں بھی ایمان کا ذکر ہوا ہے تو عمل صالحات کا ذکر بھی ہوا ہے۔ ایسے جیسے وہ شرط ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ شرط ہی ہے۔ ایمان اور صالح اعمال لازم اور ملزوم ہیں۔ نہ ایمان کے بغیر صالح اعمال کی کوئی حیثیت ہے اور نہ صالح اعمال کے بغیر ایمان کی۔''

''ٹھیک کہتے ہیں آپ!'' عبدالحق نے تائید کی۔

''قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ جو ایمان سے محروم ہوں گے، ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے لیکن مولوی صاحب! ایمان تو زبانی چیز ہے۔ یہ عملی کیسے ہوگا؟''

''دیکھو پتر عبدالحق! سائنس کی مثال لو۔ کوئی سائنس دان غور و فکر کے بعد ایک نظریہ ہی لاتا ہے نا، مگر نظریے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک تجربے کی عملی کسوٹی پر پرکھا نہ جائے، اسے کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ پھر وہ درست ثابت ہوتا ہے تو بات آگے بڑھتی ہے اور ایجاد تک پہنچتی ہے۔ ہے نا؟ تو اب ایمان کو لو۔ میں اللہ کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں۔ اب اللہ کی کتاب سود لینے سے منع کرتی ہے۔ اگر میں سود لوں تو ایمان کہاں رہا۔ کتاب شراب پینے کو منع کرتی ہے۔ میں اس پر ایمان رکھتا ہوں تو شراب تو نہیں پیوں گا نا، اور میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں کہ وہ حاضر و ناظر ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا، سنتا اور جانتا ہے۔ اگر مجھے کوئی ممنوعہ کام کرتے ہوئے یہ خیال نہیں آتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے تو ایمان کیا رہا۔ میرا ایمان ہے کہ اللہ سینوں کے تمام بھید جانتا ہے، میری سوچوں تک سے واقف ہے تو میں کسی برائی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ سوچوں تو ایمان کہاں رہا؟ سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی مولوی صاحب!''

''سب سے مشکل آخرت ہے۔'' مولوی مہر علی نے اپنی بات جاری رکھی۔

''قیامت کا تصور، جنت اور دوزخ اور ابدی زندگی، قرآن میں بہت تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ آدمی جہنم پر یقین رکھتا ہو، اس کا تصور کرتا ہو تو ڈر کے مارے گناہ سے بچ نکلے، لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اصل میں آدمی صرف حواس پر انحصار کرتا ہے۔ جو چیز دیکھے گا نہیں، اس پر یقین کرنا مشکل ہے۔ یہی تو ایمان بالغیب ہے۔ ایک بادشاہ اعلان کرتا ہے کہ میرے سامنے پیش ہونے والے ہر شخص پر لازم ہے کہ مجھے سجدہ کرے۔ جو سجدہ نہیں کرے گا، اس کی گردن مار دی جائے گی۔ تو موت کے خوف سے ہر شخص اسے سجدہ کرے گا اور اللہ کہتا ہے کہ پانچ وقت خالص میری عبادت کی نیت سے نماز پڑھو، ورنہ ابد تک کے لئے جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے۔ مگر لاکھوں کروڑوں لوگ ایسے ہیں، جو کبھی ایک وقت کی نماز بھی نہیں پڑھتے۔ انہیں نہ اللہ کا ڈر ہے نہ جہنم کا۔ البتہ کلمہ شہادت وہ ضرور پڑھتے ہیں۔ تو سوچو کہ انہیں کتنے نمبر ملیں گے؟''

عبدالحق کو لگا کہ جیسے وہ اپنے بچپن، لڑکپن کے دور میں پہنچ گیا ہے۔

''مجھے لگتا ہے مولوی صاحب! کہ آدمی اللہ پر تو یقین رکھتا ہے لیکن قیامت کے دن کی پیشی اور جہنم کو نہیں سمجھ پاتا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس نے اللہ کو بھی نہیں دیکھا اور جہنم کو بھی نہیں دیکھا۔''

''پتر عبدالحق! نادیدہ قوت کا خوف تو انسان کی فطرت میں ہے۔ ان دیکھے اللہ پر یقین نہیں کرتا تو وہ عبادت کے لئے کوئی بت تراش لیتا ہے۔''

''مگر مولوی صاحب! دنیا میں ملحدوں کی بھی تو کمی نہیں۔''

''ہاں! لیکن وہ تو ہر طاقتور سے ڈرتے ہیں۔ وہ اقبال صاحب نے کہا ہے نا......

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اور پتر! اس پر مجھے سورۃ الزمر کے تیسرے رکوع کی ایک آیت یاد آتی ہے۔ دیکھو، اللہ اپنے بندوں کو کیسے آسان کر کے سمجھاتا ہے۔ اللہ مثال پیش کرتا ہے ایک شخص کی، جس کے بے شمار آقا ہوں، اور کج خلق، اور ایک دوسرے شخص

کی، جس کا ایک ہی آقا ہو، پھر وہ پوچھتا ہے، کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے۔ اب تم خود غور کرو۔''

''سبحان اللہ!'' عبدالحق نے بے ساختہ کہا۔

''پتر! اگر اللہ آدمی کو ایک بار جہنم کا نظارہ کرا دے تو کوئی مسئلہ ہی نہ رہے۔ بلکہ وہ اپنے بندوں کو اپنی ہی ایک جھلک دکھا دے تو کفر اور ایمان کا جھگڑا ختم ہو جائے۔''

''میں سمجھا نہیں مولوی صاحب!''

''بھئی! یہ تو ممکن نہیں کہ اللہ کو دیکھنے کے بعد بھی کوئی ایمان نہ لائے۔ بات وہی ہے کہ یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔''

''تو پھر مولوی صاحب! بہتر یہی ہے نا کہ بندہ اللہ کا ہو جائے، سمجھ لے کہ یہ دنیا فریب ہے، یہ زندگی کی مہلت امتحان کا عرصہ ہے اور اصل زندگی آخرت ہے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے پتر! کہ آپ نے حقیقت جان لی۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

''لیکن دنیا ترک کرنے کا مطلب امتحان سے فرار ہوگا۔ آپ امتحان میں بیٹھے ہی نہیں تو کیا پاس ہونا اور کیا فیل ہونا؟ تو پھر جزا کس بات کی؟''

عبدالحق کا ذہن الجھنے لگا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''بات توازن کی ہے پتر! نمبر تو صالح اعمال کے ملیں گے نا!''

''تو اگر میں قرآن کے چاروں حقوق ادا کرنے میں زندگی گزار دوں، دل سے عبادت کروں تو یہ صالح اعمال ہی ہیں نا!''

''دیکھو پتر! یہ جو پرچا ہے نا زندگی کا، اس کے دو حصے ہیں اور دونوں لازمی ہیں۔ اور میں نے کہا نا کہ نصاب قرآن ہے۔ تو ایک حصہ آخرت کا ہے اور دوسرا دنیا کا۔ ایک اللہ کے حقوق کا ہے تو دوسرا بندوں کے حقوق کا۔ اللہ کے حقوق ادا کرتے رہو اور بندوں کے چھوڑ دو تو جواب آدھی ہوگی۔ نمبر کٹیں گے۔

امتحان پاس نہیں کر سکو گے۔ پر یہ پتا تو جب چلے گا کہ قرآن پڑھو اور سمجھو۔ والدین کے حقوق ہیں پھر بیوی بچوں کے حقوق ہیں، پھر آدمی گھر سے نکل کر پھیلتا جاتا ہے۔ رشتہ داروں، پڑوسیوں کے حقوق، عام لوگوں کے حقوق، سارے سوال لازمی ہیں۔ سب کا جواب دینا ہے۔ اکل حلال کو عبادت کیوں کہا گیا؟ لوگو کے ساتھ حسن سلوک کی، ضرورت مندوں کی مدد کی تلقین کیوں کی گئی؟ اس لئے کہ یہ نصاب میں شامل ہے۔ دن کو اللہ نے معاش کے لئے بنایا، رات کو آرام کے لئے۔ سورہ مزمل میں فرمایا کہ قرآن پڑھنے کے لئے رات کا وقت بہت موزوں ہے جب تم دنیا کی فکروں سے آزاد ہو۔ یعنی دنیا کی فکر کو منع نہیں فرمایا۔ دوسرے تمہیں تمہارے آرام کے وقت میں سے قرآن کے، عبادت کے لئے وقت نکالنے کے لئے کہا۔ یہی تو یکسو ہو کر عبادت کرنا ہے۔ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے پتر عبدالحق! اللہ کے احکام کے مطابق فطری زندگی گزارنا ضروری ہے۔ تم پر تمہارے اپنے بھی حقوق ہیں۔ بشری تقاضے ہیں۔ وہ اللہ نے ہی عطا کئے ہیں تمہیں۔ لیکن ان کے لئے جائز و ناجائز کی وضاحت کر دی ہے۔ شادی کرو گے تو بیوی بچوں سے خوشی اور راحت ملے گی۔ وہ تم پر تمہارا حق ہے۔ غلط طریقے سے فطری تقاضے پورے کرو گے تو گناہ ہے۔ یہی تو امتحان ہے۔ دنیا کو بھی وقت دو، بیوی بچوں کو بھی وقت دو اور اللہ کو بھی وقت دو۔ خاص اور یکسو ہو کر اسے پکارو، اس کی عبادت کرو۔ اس توازن میں ہی خوب صورتی ہے زندگی کی۔ یوں دنیا میں بھی انعام ہے اور آخرت میں بھی۔''

''آدمی شادی ہی نہ کرے تو ذمہ داریاں بھی نہیں ہوں گی۔ پھر وہ یکسوئی کے ساتھ اللہ کا ہو سکتا ہے۔''

''یہ کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل ہے پتر! کیونکہ ایسی زندگی غیر فطری ہوگی نا! رہبانیت کو اسی لئے تو منع کیا گیا ہے۔ اسلام میں ترک لذت نہیں۔ اللہ کی نعمتوں سے منہ موڑنا ناشکرا پن ہے۔ جو اللہ نے حلال کیا، اس سے جائز طریقے سے استفادہ کرو، اور پھر اس پر اللہ کا شکر ادا کرو تو یہ عبادت ہے۔ لذت کی لذت اور منافع میں اضافی نمبر۔ اب سوچو، رہبانیت ناکام کیوں ہوئی؟ غیر

فطری زندگی پادریوں کو راہباؤں کو گناہ کی طرف لے گئی۔ ایک لمحے میں برسوں کی تپسیا غارت ہوگئی۔ ایسے لوگ تو شیطان کا آسان ہدف ہوتے ہیں۔ پادریوں کے ان اعمال ہی کی وجہ سے عیسائی مذہب سے عملاً دور بلکہ بے زار ہوگئے۔ ذرا آگے جا کر سوچو کہ اللہ کے قائم کردہ نظام میں شادی کی کتنی اہمیت ہے۔ اگر سب لوگ محض اللہ اللہ کرتے تو نسل انسانی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔

تو پتر! اللہ نے انسان کو بڑی نعمت گھر عطا فرمایا۔ انسانی معاشرے میں بنیادی اہمیت گھر کی ہے۔ یہ پردہ بھی ہے اور دارالسکون بھی۔ ہر برائی کے خاتمے کا آغاز بھی گھر سے کرنا ہوتا ہے اور ہر نیکی کا آغاز بھی۔ ہر گھر ٹھیک ہو جائے تو معاشرہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بیوی کے اور بچوں کے حقوق ادا کرنا بھی عبادت ہے۔ ان کے لئے ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا، انہیں تحفظ کا احساس دلانا، بچوں کی پرورش اور تربیت، شوہر اور بیوی مل کر کرتے ہیں۔ بچوں کو دونوں سے محبت اور شفقت بھی چاہئے ہوتی ہے، کیونکہ اس سے ان کی شخصیت بنتی ہے۔ ان فرائض سے منہ موڑ کر آدمی کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔ آپ ان سے دور جائیں گے تو خرابیاں پیدا ہوں گی۔ بیوی سے دور جاؤ گے تو اسے آزمائش میں ڈالو گے نا...... بہت بڑی آزمائش میں، کیونکہ اس کی بھی نفسانی ضروریات ہیں، جنہیں پورا کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ وہ بہک گئی تو آپ بھی ذمہ دار ہوں گے۔ ایک عمر تک بچوں کے بھی آپ ہی ذمہ دار ہیں۔ وہ غلط راستے پر نکل گئے تو آپ کو جواب دہی کرنا ہوگی۔ نہیں پتر! اللہ نے بندے کو آخرت کمانے کے لئے دنیا میں ہی بھیجا ہے...... دنیا کے لوازمات کے ساتھ۔ اسلام چلّوں کا، تپسیاؤں کا مذہب نہیں ہے۔ توازن قائم کرنا بہت ضروری ہے پتر!''

''لیکن مولوی صاحب! یہ نوکری کرنا تو ضروری نہیں ہے میرے لئے۔''

''فرض تو نہیں ہے پتر! فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔ اگر اس سے بہت سارے لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے، اور یہ قومی خدمت ہے تو دیانت کے ساتھ یہ بھی عبادت ہے۔ سوچو، تمہاری جگہ کوئی بے ایمان آجائے تو کتنے لوگوں کو، بلکہ قوم کو بھی نقصان ہوگا۔''

''تو میں ملازمت کرتا رہوں؟''

''میری رائے تو یہی ہے پتر! جب اللہ چاہے گا، تمہیں وہاں سے ہٹا دے گا۔ اور پتر! اللہ کے لئے اپنے آرام کے وقت میں سے وقت نکالو۔ اس میں بڑی برکت ہوتی ہے اللہ کی طرف سے۔ اللہ بھی پوری طرح متوجہ ہوتا ہے بندے کی طرف۔ وہ سورۂ ذاریات میں اللہ نے خوش نصیبوں کے بارے میں فرمایا ہے نا..... کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَہْجَعُوْنَo وَبِالْاَسْحَارِ ھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَo''

''جزاک اللہ مولوی صاحب!'' عبدالحق کے لہجے میں طمانیت تھی۔

''ایسی گفتگو میں اختصار کی وجہ سے ربط کی کمی ہوجاتی ہے پتر! تم خود قرآن پڑھ کر غور کیا کرو۔''

''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا مولوی صاحب!''

❁ ❁ ❁

ایک سرونٹ کوارٹر اور آباد ہوگیا تھا۔ مری سے نوریز خان آگیا تھا۔ عبدالحق نے شمریز کو بھی اصرار کر کے وہاں بلا لیا تھا۔ بلکہ اس کا تو کہنا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو بھی بلا لے۔ لیکن شمریز کا کہنا تھا کہ اس کی وہاں گھر میں موجودگی بہت ضروری ہے۔ وہ اماں اور ابا کی خدمت بھی کرتی ہے، اور اس سے جنیاں کو بھی دوسراہٹ رہتی ہے۔ عبدالحق نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔

نوریز اب عبدالحق کی ذاتی کار چلاتا تھا۔ لیکن شمریز کبھی اس کے ساتھ دفتر نہیں گیا اور نہ ہی اس کے ساتھ گھر واپس آیا۔ یہ ایک اور بات تھی، جو اس نے عبدالحق کے اصرار کے باوجود نہیں مانی تھی۔

''یہ آپ کی شان کے خلاف ہے سر!'' اس نے کہا تھا۔ سو وہ عبدالحق کے دفتر جانے سے پہلے دفتر کے لئے نکلتا تھا۔ اور چھٹی عبدالحق کے گھر جانے کے بعد کرتا تھا۔

فروری میں عبدالحق نے مری والا بنگلہ خرید لیا۔ لیکن جیپ نہیں خریدی گئی۔ شمریز کا کہنا تھا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں، جیپ تو جب ضرورت ہو، خریدی جا

سکتی ہے۔ ابھی خرید لی تو استعمال نہ ہونے کی وجہ سے اس میں خرابیاں پیدا ہوں گی۔

ارجمند کے اسکول میں داخلے کے دن قریب آ رہے تھے۔ لیکن عبدالحق کو کوئی فکر نہیں تھی۔ ارجمند میں اس وقت بھی اتنی قابلیت تھی کہ وہ بغیر کسی دشواری کے میٹرک کا امتحان بھی پاس کر سکتی تھی۔ داخلے کا امتحان تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

مولوی صاحب سے ملاقات کے بعد عبدالحق نے ایک نیا معمول شروع کیا تھا۔ رات کو وہ ایک گھنٹہ قرآن پڑھتا تھا اور پڑھنے سے زیادہ وہ غور کرتا تھا، چاہے کچھ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ ایک بات تو تھی، احکام تو بالکل واضح تھے۔ باقی اللہ کی حکمتیں تو اسی وقت سمجھ میں آتی ہیں، جب اللہ کرم فرمائے۔

اس نے کئی بار نوربانو کو بھی اس طرف راغب کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ وہ پڑھتی بھی تو بے دلی سے۔ اور دو دن بعد وہ پڑھنا چھوڑ دیتی۔ عبدالحق افسوس کے سوا کیا کر سکتا تھا؟ بات صرف اتنی نہیں تھی۔ نوربانو اس کے ارتکاز میں بھی خلل ڈالتی رہتی تھی۔ ایسا نادانستگی میں ہی ہوتا ہوگا۔ یہ تو عبدالحق سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دانستہ ایسا کرتی ہوگی۔

اس مسئلے کا عبدالحق کو ایک ہی حل سجھائی دیا۔ اس نے رات کے معمول کو ترک کیا اور صبح ایک گھنٹہ پہلے کا الارم لگانے لگا۔ اس کا ایک اضافی فائدہ بھی ہوا۔ اسے تہجد بھی میسر آنے لگی۔

ارجمند ہر صبح نماز کے بعد تلاوت کرتی تھی۔ عبدالحق فجر کی نماز کے بعد ہر روز باقاعدگی سے اس کی تلاوت سننے لگا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ ارجمند کی تلاوت نوربانو کی اس تلاوت سے بہت زیادہ خوب صورت ہے، جو اس نے دہلی میں سنی تھی۔ ارجمند کی قرأت میں عجیب سا گداز تھا۔ اسے سنتے ہوئے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

ارجمند کی تلاوت اس نے پہلے بھی سنی تھی۔ مگر جب میں اور اس میں زمین میں آسمان کا فرق تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اب جو وہ پڑھتی تھی، اسے

سمجھتی بھی تھی۔ عربی کے استعداد میں وہ اس سے آگے نکل گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ کوئی تنبیہی آیت پڑھتی تو اس کی آواز میں جاہ و جلال ہوتا۔ سننے والے پر لرزہ طاری ہونے لگتا۔ اور کوئی آیت مبشرہ پڑھتے ہوئے اس کی آواز میں نرمی اور مٹھاس ہوتی۔ سننے والے کا دل امید سے بھر جاتا۔ اس کی قرأت میں جہنم کا نقشہ کھینچنے والی آیت سن کر عبدالحق پر ہیبت طاری ہو جاتی، او جہاں جنت کی نعمتوں کا بیان ہوتا، وہاں جی چاہتا کہ اللہ کی رضا اور تائید و خوشنودی میسر ہو تو اس لمحے مر جائیے۔

عبدالحق کو ان لمحوں میں ایسا لگتا کہ اس کی کوئی کھوئی ہوئی چیز واپس مل گئی ہے۔ نوربانو سے شادی سے پہلے وہ سوچا کرتا تھا کہ اس کا سونا بھی اس خوب صورت معمول کے ساتھ ہوگا اور اس کی بیداری بھی۔ لیکن اسے محرومی کے سوا کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ کبھی کبھی وہ جھنجلاتا کہ نوربانو ارجمند کی جگہ کیوں نہیں ہے۔ اسے افسوس ہوتا۔ لیکن اس بات کی خوشی بھی ہوتی کہ اس کی محرومی دور ہوگئی ہے۔ یہ خیال اس کے دل میں پختہ ہوگیا تھا کہ ارجمند اس کے لئے بہت بڑی نعمت ہے، اللہ کا دیا ہوا تحفہ ہے۔

ایک اور بات کی اسے خوشی ہوتی۔ جس بچی نے اس سے شادی کی فرمائش کی تھی، اب اس کے کسی انداز میں وہ بات نہیں تھی۔ سو اس کا وہ ڈر بھی نکل گیا تھا کہ اس بچی کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے گی، جو اس کے لئے، پورے گھر کے لئے مسئلہ بن جائے گی، اس کی اپنی عزت کم کر دے گی۔ وہ بےفکری کے ساتھ اس سے بے تکلف ہوگیا تھا۔

ارجمند نے قرأت ختم کی، قرآن کو چوما، آنکھوں سے اور پھر دل سے لگایا اور اٹھ گئی۔ اب اسے ناشتہ بنانا تھا۔

ناشتہ بناتے ہوئے وہ بڑی محبت سے قرآن کے بارے میں سوچتی رہی۔ یہ کیسی نعمت ہے، یہ اسی کی برکت ہے کہ آغا جی میرے سامنے بیٹھتے ہیں۔ میں دل سے پڑھتی ہوں اور وہ دل سے سنتے ہیں۔ یہ دل سے دل کا کیا پاکیزہ اور خوب صورت تعلق ہے۔ یہ نہ ہوتا تو میں آغا جی کے پاس بیٹھ بھی نہیں سکتی

تھی۔

اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور زیر لب بولی۔

''اے میرے رب کے سچے کلام! میں عمر بھر تجھ سے بڑھ کر کسی سے محبت نہیں کروں گی۔ تو ہی میرا ساتھی، میرا دم ساز، میرا راز دار اور میرا مددگار ہے۔ مجھے بھٹکنے اور بہکنے سے بچاتے رہنا، مجھے سیدھا راستہ دکھاتے رہنا۔''

❁ ❁ ❁

اس شام عبدالحق دفتر سے ایک اہم فائل اسٹڈی کے لئے گھر لے آیا تھا۔ رات کو اس نے وہ فائل نوربانو کو دی۔

''یہ احتیاط سے الماری میں رکھ دو۔ صبح دفتر لے کر جانی ہے۔''

صبح دفتر کے لئے تیار ہونے کے بعد اس نے اس فائل کی تلاش میں پوری الماری چھان ماری۔ لیکن فائل اسے نہیں ملی۔ نوربانو بے سدھ سو رہی تھی۔ وہ ہچکچاتا رہا۔ کسی کو سوتے سے اٹھانا اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس وقت بھی اس کا جی نہیں چاہا کہ نوربانو کو جگائے، وہ جانتا تھا کہ وہ بہت دیر سے سوتی ہے۔

آخر اس کی سمجھ میں ایک بات آ گئی۔ دفتر جانے سے پہلے اس نے یعقوب کو بلایا۔

''یعقوب! آج ایک بہت اہم کام کرنا ہے تمہیں؟'' اس نے کہا۔

''حکم کریں سر!''

''آج جب میم صاحب تم کو کھانا دیں تو ان سے کہنا کہ جو فائل رات کو میں نے انہیں دی تھی، وہ بھی دفتر لے کر جانی ہے، وہ بھی تمہیں دے دیں۔''

''یس سر......!''

لیکن عبدالحق مطمئن نہیں ہوا۔

''مجھے بتاؤ! تم کیا کہو گے میم صاحب سے......؟''

''میں کہوں گا کہ صاحب نے آپ کو جو فائل دی تھی، وہ نکال دیں۔ صاحب نے منگوائی ہے۔''

''ویری گڈ...... ! اور یہ بہت اہم ہے۔ بھول نہ جانا۔''

''یس سر...... ! آئی نو فور گیٹ امپورٹنٹ۔'' یعقوب نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''ویری گڈ! مسٹر جینیئس!''

''تھینک یو سر......!''

عبدالحق آفس چلا گیا۔

لیکن دوپہر کو یعقوب لنچ لے کر آیا تو فائل اس کے پاس نہیں تھی۔ عبدالحق کو عام طور پر غصہ نہیں آتا تھا، لیکن اس وقت اسے غصہ آ گیا۔ بہرحال اس نے اپنے غصے پر قابو رکھنے کی کوشش کی۔

''تم فائل نہیں لائے یعقوب!''

''سوری سر!''

''اتنی اہم بات، میری اتنی تاکید کے باوجود بھول گئے؟''

''نو سر! آئی نو فور گیٹ امپورٹنٹ۔''

''تو پھر فائل کیوں نہیں لائے؟''

''ہیلپ لیس سر! میم صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔'' یعقوب نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔

''میں نے بی بی صاحب سے بولا تھا کہ مجھے میم صاحب سے ضروری کام ہے۔ وہ بولیں کہ وہ سو رہی ہیں۔ اب میں کیا کرتا سر!''

عبدالحق کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔

''تو کھانا تمہیں کس نے دیا؟''

''وہ تو ہمیشہ بی بی صاحب ہی دیتی ہیں سر!''

''ہمیشہ......؟''

''یس سر......!''

''تو میم صاحب کھانا کیوں نہیں دیتیں؟''

''وہ تو سو رہی ہوتی ہیں نا سر!'' یعقوب کو احساس بھی نہیں تھا کہ وہ

جال میں پھنس رہا ہے۔ بات اتنی پرانی تھی کہ وہ بھول گیا تھا۔ پہلی بار کے بعد عبدالحق نے کبھی اس سے پوچھا بھی نہیں تھا۔

''پہلے دن تم نے کہا تھا کہ کھانا میم صاحب نے بھجوایا ہے۔''

یعقوب اب بھی صورتِ حال کو نہیں سمجھا تھا۔

''وہ تو بی بی صاب نے کہا تھا کہ صاب پوچھیں تو کہنا کہ کھانا میم صاحب نے بھجوایا ہے۔''

''اچھا، ٹھیک ہے۔ اب یہ بات کسی کو نہیں بتانا کہ میں نے تم سے یہ پوچھا تھا۔''

''کوئی پوچھے گا ہی نہیں۔''

''پوچھے تو بھی نہیں بتانا۔ اٹس این آرڈر! سمجھ گئے؟''

''یس سر...!''

''اب تم جاؤ۔''

یعقوب جاتے جاتے پلٹا۔

''اب میم صاب اٹھ گئی ہوں گی، فائل لے کر آؤں سر؟''

''نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔ بس اب تم اپنا منہ بند رکھنا۔''

خوش قسمتی سے اس روز مسعود صاحب دفتر نہیں آئے تھے، اس لئے فائل کی فوری طور پر ضرورت نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ اگلے روز میں خود لے آؤں گا۔

اس روز کھانا اس نے اکیلے ہی کھایا۔ کھانے کے دوران وہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ جب پہلی بار گھر سے کھانا آیا تو اسے حیرت ہوئی تھی، اور اس کے پوچھنے پر یعقوب نے بتایا تھا کہ کھانا نور بانو نے بھیجا ہے۔ اور اس نے رات کو نور بانو سے پوچھا اور کھانے کی تعریف کی تو نور بانو نے اس تعریف کو ایسے قبول کیا، جیسے وہ اس کا حق تھا۔ اور اس دن کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کھانا گھر سے نہ آیا ہو۔ اب یعقوب کا کہنا یہ ہے کہ اسے دفتر لے جانے کے لئے کھانا ہر روز ارجمند دیتی ہے۔

قرائن سے تو یہی ثابت ہوتا تھا کہ ارجمند ہی کھانا پکاتی اور بھیجتی ہے۔

لیکن عبدالحق کا ذہن اسے تسلیم نہیں کر پا رہا تھا۔ اس میں کچھ معقولیت بھی تھی۔ لیکن کچھ نور بانو کی محبت کی وجہ سے بھی تھا۔

ارجمند اس کے نزدیک چھوٹی سی بچی تھی۔ ہر صبح ناشتہ تو وہی بناتی تھی۔ لیکن اس میں کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ کھانا پکانا مختلف تھا۔ اس کے خیال میں ارجمند ابھی اس قابل نہیں تھی۔ پھر اسے پڑھائی بھی کرنی ہوتی تھی۔ اور گھر میں کبھی کسی نے نہیں کہا تھا کہ آج کھانا ارجمند نے پکایا ہے۔ اور صبح کے علاوہ اس نے بھی کبھی اسے باورچی خانے میں نہیں دیکھا تھا۔ چلو یہ عذر بھی مان لیں کہ وہ دن بھر گھر سے باہر رہتا ہے، اس لئے اسے پتا نہیں چلتا۔ لیکن چھٹی کے دن تو وہ گھر میں ہوتا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ نور بانو کو ہی کھانا پکاتے دیکھا تھا۔

اس پر اسے خیال آیا کہ چھٹی کے دن تو کھانا دیر سے ہی کھایا جاتا تھا۔ وہ خود بھی فجر پڑھ کر سو جاتا تھا اور دیر سے اٹھتا تھا۔ نور بانو بھی دیر سے ہی اٹھتی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ نور بانو بہت دیر سے سونے اور بہت دیر تک سونے کی عادی ہے۔ اسی لئے تو گھر سے کھانا آنے پر اسے اور زیادہ خوشی ہوئی تھی کہ اس کی محبت میں نور بانو اپنی نیند پوری کئے بغیر اٹھتی ہے اور کھانا پکا کر اسے بھیجا ہے۔ لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ نور بانو کو تو اس کے ناشتے کا خیال بھی کبھی نہیں آیا تھا۔ بلکہ اس نے تو کبھی اس سے یہ ہی نہیں پوچھا تھا کہ وہ دفتر ناشتہ کر کے بھی جاتا ہے یا نہیں۔ جیسے اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ تو پھر یہ کھانے کی اہمیت کیسے اتنی ہوگئی کہ وہ اپنی نیند قربان کرنے لگی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ مری میں بھی نور بانو نے کبھی اپنا معمول ترک نہیں کیا تھا۔ وہ سوتے ہوئے ہی مری پہنچی تھی۔ ناشتہ بھی اسے اچھا نہیں لگا تھا اور وہ بنگلے میں پہنچتے ہی سو گئی تھی۔ اور وہاں قیام کے دوران بھی وہ ہمیشہ گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ہی سو کر اٹھتی تھی۔

اشارے کچھ بھی کہہ رہے ہو، عبدالحق کی محبت نور بانو کے خلاف کوئی

دلیل ماننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سوچا، ناشتے کے وقت تو اٹھنا نوربانو کے لئے ممکن ہی نہیں۔ البتہ اس کے کھانے کے لئے وہ ایثار کرسکتی ہے، اور کرتی ہے۔ اور پھر ارجمند اتنا اچھا کھانا کہاں پکا سکتی ہے۔

لیکن یعقوب نے بتایا تھا کہ اسے ہر روز کھانا ارجمند ہی دیتی ہے۔

اس میں کیا خاص بات ہے، اس نے سوچا۔ اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ کھانا ارجمند ہی پکاتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ ٹفن تیار کر کے ارجمند کو دیتی ہو کہ وہ یعقوب کے ہاتھ دفتر بھجوا دے۔

یہ سب سوچتے سوچتے عبدالحق جھنجلا گیا۔ اس بات کی اہمیت کیا ہے کہ میں اتنا سوچ رہا ہوں اس پر۔ جب گھر سے کھانا نہیں آتا تھا تو مجھے کسی محرومی کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

لیکن پھر اسے مسعود صاحب کا ردعمل یاد آیا...... وہ اس کے گھر سے کھانا آنے پر بہت خوش ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کا اظہار کیا تھا کہ کھانا نہ بھیجنے کی وجہ سے نوربانو کے بارے میں ان کا تاثر منفی ہوگیا تھا...... اور انہوں نے میاں بیوی کے تعلقات کے بارے میں تبصرہ بھی کیا تھا کہ اچھے میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت پیدا کرتے ہیں، ایک دوسرے کے لئے ایثار کرتے ہیں۔

اس کا مطلب تھا کہ اسے پرواہ ہو یا نہ ہو، معاشرتی اعتبار سے اس بات کی بڑی اہمیت ہے۔ اس نے تو کبھی کسی بات کے لئے بھی نوربانو پر دباؤ نہیں ڈالا تھا، زور نہیں دیا تھا۔ اور شاید اسی لئے نوربانو کو بہت سی باتوں کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔

لیکن نہیں! ایک بات ایسی تھی، وہ پیچھے پڑ جانے والا، اپنی بات پر اصرار کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ لیکن قرآن پڑھنے کے معاملے میں اس نے نوربانو سے اصرار تک کیا تھا۔ نوربانو نے اسے قرآن سنایا بھی، لیکن بے دلی سے۔ اور اس کی تنقید اور شکایت کے باوجود وہ پہلے کی طرح نہیں سنا سکی۔ پھر اس نے اس سے کہنا بھی چھوڑ دیا۔

اس پر پہلی بار عبدالحق کے دل میں ایک خیال نے سر اٹھایا...... یہ کہ نوربانو احسان شناس نہیں ہے۔ قرآن پڑھنے ہی کے نتیجے میں تو اسے وہ ملا تھا۔ اور وہ قرآن سے ہی دور ہوگئی۔ اس کا یہ مطلب بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے نزدیک اس کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ وقعت ہوتی تو وہ اللہ کا، قرآن کا احسان مانتی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ خود ہی خوش رہا۔ نوربانو نے اسے خوش کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اور یہ تو سچ ہے کہ جو اللہ کا احسان نہیں مانتا، وہ بندے کا احسان کیا مانے گا۔ یہ الگ بات کہ اس نے نوربانو کے لئے جو کچھ کیا، درحقیقت اپنی غرض سے، اپنی محبت کی وجہ سے کیا۔ وہ بے اماں تھی، اکیلی تھی، وہ اسے پاکستان لایا، عزت سے رکھا، شادی کی، نوربانو کے نکتۂ نظر سے تو یہ احسان ہونا چاہئے۔ مگر وہ تو زندگی کے بے سمت گھپ اندھیرے میں روشن راہ دکھانے والے اللہ سے منہ موڑے بیٹھی تھی۔ تو ایسے میں وہ کس شمار میں تھا۔

وہ سب سوچتے سوچتے عبدالحق چونکا۔ اسے پہلے بار احساس ہوا کہ وہ نوربانو کا شاکی ہو رہا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ شکایت حادثاتی نہیں۔ کوئی شکایت بھی حادثاتی نہیں ہوتی۔ وہ مدتوں، برسوں لاشعور میں پلتی ہے، تب کہیں شعور تک پہنچتی ہے۔ اسے خود پر شرم آنے لگی۔ وہ شکایت دل میں رکھنے والا کب سے ہوگیا! شکایت، اور وہ بھی نوربانو سے۔

اس نے سر جھٹکا، بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ وہ تو صرف اس پر غور کر رہا تھا کہ اسے کھانا کون بھیجتا ہے...... نوربانو یا ارجمند...... اور یہ جاننا کچھ مشکل نہیں تھا۔ وہ باتوں باتوں میں نسیمہ سے پوچھ لے تو حقیقت سامنے آجائے گی۔

لیکن نہیں! یہ تو گھر کے ملازموں کو گھر کے معاملات میں دخیل کرنا ہوا۔ گھر کے کسی فرد کو ملازم کے سامنے شرمندہ کرنا تو مناسب بات نہیں۔ یعقوب والا معاملہ تو غیر ارادی تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ یعقوب تو گھر پہنچتے پہنچتے بات بھول بھی چکا ہوگا۔ لیکن نسیمہ سے تفتیش بری بات ہوگی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نوربانو اور ارجمند سے ہی حقیقت معلوم کرے

گا۔

* * *

رات کو ارجمند کو پڑھاتے ہوئے اس نے تفتیش کا آغاز کیا۔ ایک بات کا اسے یقین تھا کہ وہ جھوٹ کبھی نہیں بولتی۔

''ارجمند! تمہیں کھانا پکانا آتا ہے؟'' اس نے بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔

''کچھ کچھ آتا ہے آغا جی!''

''کچھ کچھ کا مطلب؟''

''سیکھ رہی ہوں۔ سیکھتی رہتی ہوں۔''

''یہ کوئی پڑھائی تو نہیں ہے، عملی معاملہ ہے۔ پکائے بغیر کیسے سیکھ سکتی ہو۔'' اس نے اسے اُکسایا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا جی!''

''اس کا مطلب ہے، تم پکاتی بھی ہوگی۔''

''جی کبھی کبھی پکاتی بھی ہوں۔''

''مگر میں نے تمہیں کبھی پکاتے نہیں دیکھا۔''

''آپ گھر میں ہوتے ہی کب ہیں، اور رات کا کھانا تو آپی پکاتی ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم دوپہر میں پکاتی ہوگی۔''

یہ وہ لمحہ تھا، جب ارجمند خود بخود چوکنا ہوگئی۔

''میری مشق تو بس ناشتے تک ہے آغا جی!'' اس نے سادگی سے کہا۔

''ناشتے اور کھانے میں تو بہت فرق ہوتا ہے ارجی!''

نہ جانے کیوں ارجمند کا چہرہ تمتا اٹھا۔

''جی...... ! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

عبدالحق نے اُردو کی کتاب کے اس سبق میں سے جو وہ اسے پڑھا رہا تھا، جملے پڑھے۔

''جھوٹ بولنا بہت عام سی بات ہے۔ لیکن اللہ جھوٹ کو بہت ناپسند کرتا ہے۔ اسی لئے جھوٹ گناہِ کبیرہ ہے۔ اب یہ بتاؤ ارجمند کو جھوٹ کا سب سے بڑا نقصان کیا ہے۔''

''جھوٹ دل کو سیاہ کرتا ہے اور آدمی کے اللہ سے تعلق کو کمزور کرتا ہے۔'' ارجمند نے بے جھجک جواب دیا۔

''کتاب میں تو یہ نہیں لکھا ہے۔'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''کتابوں میں سب کچھ تو نہیں لکھا ہوتا۔ کتابیں تو آدمی کو سوچنا اور سمجھنا سکھاتی ہیں۔''

''واہ...... ! بڑی عقل مند ہو تم، اچھا یہ بتاؤ، کبھی دوپہر کو بھی کھانا پکاتی ہو تم؟''

''جی...... ! کبھی کبھی۔'' ارجمند نے جواب دیا۔ اور عبدالحق کو بولنے کا موقع دیئے بغیر بولنے لگی۔

''ایک بات بتاؤں آغا جی! میرے داخلے کے ٹیسٹ میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے، اور مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

عبدالحق اپنی بات بھول گیا۔

''ڈر لگنے کا کیا سوال ہے؟ کیسا ڈر؟''

''مجھے لگتا ہے، میں فیل ہو جاؤں گی۔''

''یہ کیسے ممکن ہے، تمہاری تیاری تو ایسی ہے کہ تم میٹرک کے امتحان میں بھی نہیں ہو سکتی۔''

''میں جانتی ہوں، لیکن امتحان کا خوف ڈراتا ہے آغا جی! کتنا ہی کچھ آتا ہو، لیکن آزمائش تو امتحان میں ہی ہوتی ہے۔ میں سوچتی ہوں، امتحان کے وقت سب کچھ بھول گئی تو کیا ہوگا۔''

''ارے نہیں! ڈرو نہیں، انشاء اللہ تم کچھ نہیں بھولو گی۔''

''آپ نے یہ بات کہی اور انشاء اللہ کے ساتھ کہی تو کچھ اعتماد آیا مجھ میں۔''

"اللہ سے دعا بھی کیا کرو۔"

"کرتی ہوں آغا جی! بہت کرتی ہوں۔" ارجمند نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہر چیز کے لئے اللہ سے دعا کرتی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر دعا قبول نہیں ہوسکتی۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا؟" عبدالحق نے چونک کر پوچھا۔

"اللہ میاں نے۔" ارجمند نے بے ساختہ کہا۔ پھر جلدی سے وضاحت کی۔

"سورہ نجم میں آیت ہے آغا جی! اَمْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی o کیا ضروری ہے کہ انسان کی ہر تمنا پوری ہو جائے۔"

عبدالحق کو بہت حیرت ہوئی۔ اتنی سی بچی قرآن کے حوالے سے بات کر رہی ہے۔ اس نے جانچنے کی خاطر بات آگے بڑھائی۔

"اور قرآن میں جگہ جگہ اللہ نے بندوں کو دعا کی تلقین کی ہے کہ اپنے ربّ سے سب کچھ مانگو۔"

"جی ہاں! سوائے خلافِ فطرت دعا کے۔"

"یہ خلافِ فطرت دعا کیا ہوتی ہے؟"

"سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی دعا۔ ایسی دعا، جس کی قبولیت سے اللہ کے قائم کئے ہوئے نظام میں خلل پڑتا ہو۔"

اب تو عبدالحق کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ اور وہ مرعوب بھی تھا۔

"تم تو عالم بن گئیں ارجی!"

"جی نہیں آغا جی! مجھے تو پڑھنا بھی نہیں آتا۔ اللہ کچھ سمجھا دے تو الگ بات ہے۔"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"تو پھر تم ہر چیز کے لئے اللہ سے دعا کیوں کرتی ہو؟ جب کہ جانتی ہو کہ ہر دعا قبول نہیں ہوسکتی۔"

"آپ ہی نے تو بتایا ہے کہ اللہ نے بندوں کو دعا کی تلقین کی ہے۔ اور اسی نے بتایا ہے کہ ہر دعا قبول ہونے والی نہیں۔"

"تو پھر.....؟"

ارجمند سوچتی رہی، پھر بولی۔

"اب مجھے تو نہیں معلوم کہ جو دعا میں کر رہی ہوں، وہ قبول ہوگی یا نہیں، لیکن اللہ کے حکم کے مطابق مجھے تو دعا کرنی ہے نا!"

"تو دعا کا فائدہ؟" عبدالحق نے دل ہی دل میں توبہ کرتے ہوئے سوال اٹھایا۔ اسے لگتا تھا کہ کوئی گہرا بھید کھلنے والا ہے۔ ورنہ وہ یہ جرأت نہ کر پاتا۔

"اللہ کا حکم ماننے میں تو فائدے ہی فائدے ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے آغا جی کہ ان فائدوں کا ہمیں علم ہے یا نہیں۔"

وہ روک دینے والا جواب تھا، لیکن عبدالحق رکنا نہیں چاہتا تھا۔

"پھر بھی آدمی کو جاننے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تم مجھے دعا کا فائدہ بتاؤ۔"

"اس پر میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ میں تو بس مان لیتی ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اب اس پر غور کرو، پھر جواب دو۔"

ارجمند کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ خود عبدالحق بھی اس بات پر غور کر رہا تھا۔

بالآخر ارجمند سر اٹھایا۔

"میں نے سب سے پہلے اس بات پر غور کیا ہے آغا جی کہ اللہ نے بندوں کو دعا کی تلقین کی۔ پھر انہیں یہ بھی بتایا کہ ضروری نہیں، ان کی ہر دعا قبول بھی ہو۔ تو یہ دوسری بات اس نے بندوں کو کیوں بتائی؟ ظاہر ہے، ضروری تھا تو بتائی۔ تو ضرورت کیا تھی بتانے کی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں، کوئی جواب ملا تمہیں؟"

"جی......! ملا۔ اگر اللہ یہ نہ بتاتا تو دعائیں قبول نہ ہونے پر بندے

مایوس ہو جاتے اور دعا کرنی چھوڑ دیتے۔ یوں ان کا نقصان ہوتا، اور اللہ کو اپنے بندوں کا نقصان پسند نہیں۔''

عبدالحق کا دماغ جیسے روشن ہو گیا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

''سبحان اللہ!'' پھر اس نے بے یقینی سے آنکھیں ملیں، جیسے آنکھیں ملنے سے منظر تبدیل ہو جائے گا، اور وہ خود کو اپنے اسٹڈی کے بجائے مولوی صاحب کے حجرے میں ان کے رو بہ رو پائے گا۔

لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں۔ اس کے سامنے مولوی مہر علی نہیں، چودہ سالہ ارجمند ہی بیٹھی تھی۔

''بے شک!'' اس نے تائید میں کہا۔

''اور نقصان بھی بہت بڑا ہوتا، کیونکہ اللہ نے مایوسی کو کفر قرار دیا ہے۔''

''یہ میں نہیں سمجھ پائی تھی۔'' ارجمند نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''آپ مجھ سے بہت زیادہ جانتے ہیں آغا جی!''

''لیکن تم مجھ سے بہت زیادہ سمجھتی ہو۔ اور سمجھنا جاننے سے بہت زیادہ اہم ہے۔ سمجھے ہی نہیں تو جاننے کا کیا حاصل؟ اب آگے چلو۔''

ارجمند پھر سوچنے لگی۔

''اللہ نے دعا کی تلقین کی، پھر بتایا کہ ہر دعا کی قبولیت ضروری نہیں، تاکہ بندے اس پر مایوس نہ ہوں تو آغا جی! دُعا بہت ہی اہم اور ضروری ہوئی نا!''

عبدالحق نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

''یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ لیکن وہ اہمیت ہے کیا، اس پر غور کرنا ہے۔''

''دماغ میں بہت ساری سوچیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں، جیسے بری طرح الجھا ہوا دھاگا سلجھانے کی کوشش میں اور الجھ جاتا ہے۔ لیکن میرے دل میں صاف خیال آتا ہے۔ صحیح ہے یا غلط اس پر ڈر لگتا ہے۔''

''مجھے بتاؤ!''

''میرا دل کہتا ہے، دعا عبادت سے بھی بہت بڑی چیز ہے۔ اس لئے تو اس سے محرومی بہت بڑا نقصان ہے۔''

''کیسے؟'' اب عبدالحق خود بھی اس پر غور کر رہا تھا، اور اس کی نظر میں ارجمند کے چہرے پر جمی تھی۔

''یہ تو مجھے نہیں معلوم، سب کچھ گڈمڈ ہو رہا ہے۔'' ارجمند نے بے بسی سے کہا۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور الجھن تھی اور آنکھوں میں وحشت، جیسے وہ کسی بھول بھلیاں میں راستہ تلاش کر رہی ہو، اور کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہو۔

''یہ بتائیں، میری یہ بات کہ دعا عبادت سے بھی بہت بڑی چیز ہے، آپ کو ڈراؤنی تو نہیں لگی۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''ڈراؤنی تو نہیں لگی، لیکن میرا دماغ اسے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ عبادت بندگی ہے، اور بندوں کے لئے بندگی سے بڑی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ لیکن میرا دل تمہاری بات کو سچ مانتا ہے۔ کیسے، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔''

اچانک ارجمند کے چہرے پر طمانیت پھیل گئی۔

''آپ کا دل بھی یہی کہتا ہے۔ اب میرا ڈر دور ہو گیا۔''

''مگر اس پر سوچنا تو ہے۔''

وہ دونوں سوچتے رہے۔ پھر ارجمند نے کہا۔

''آغا جی! بندگی سے بھی بڑی ایک چیز ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ایمان...... ایمان کے بغیر زندگی ممکن نہیں، تو ایمان بندگی سے بڑا ہوا نا......!''

عبدالحق کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ ایمان کے بغیر تو کچھ بھی نہیں۔ نہ بندگی، نہ اعمال۔ ایمان کے بغیر صالح اعمال بھی آخرت میں رائیگاں ہیں۔ بس دنیا میں اجر مل جاتا ہے ان کا۔ ٹھیک کہتی ہو ارجی! لیکن دعا سے ایمان کا تعلق؟''

''ایمان نہ ہو تو دُعا کیسی؟''

"نہیں ارجمند! وقت پڑنے پر تو کافر بھی دعا کرتا ہے۔"

"یقین ہوتا ہے، تبھی تو دعا کرتا ہے۔" ارجمند نے کہا۔

اب تک کی گفتگو کے دوران عبدالحق کو ایسا لگتا رہا تھا جیسے ارجمند اس سے بڑی ہے۔ اس کی راہنمائی کر رہی ہے۔ اب پہلی بار اسے وہ چھوٹی لگی۔ اس نے کہا۔

"یقین اور ایمان میں بہت فرق ہے ارجمند! صرف یقین سے آدمی مومن نہیں ہو جاتا ہے، بلکہ مومن کیا، مسلم بھی نہیں ہوتا۔ قرآن میں ہے کہ وقت پڑتا ہے تو وہ رب کو پکارتے ہیں اور جب وہ انہیں پریشانی سے نکال لیتا ہے تو وہ سب سے پہلے اسی سے منہ پھیرتے ہیں، یعنی وہ کافر ہی رہتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا جی! اس پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔" ارجمند کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"تو بات یہ ہے کہ دعا عبادت سے بھی بڑی ہے، اور عبادت بندگی ہے۔ تو دعا بندگی کا اعلیٰ ترین اظہار ہے۔ اور ایمان کے بغیر نہ اعمال ہیں، نہ دعا ہے اور نہ بندگی۔ تو دعا اور ایمان میں تعلق تو ہے نا!"

"جی ہاں! ضرور ہوگا۔"

"تو بتاؤ!"

"سمجھ میں نہیں آتا۔" ارجمند نے بے بسی سے کہا۔

"بہت کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تو اس پر سوچنا چاہئے، سوچو!"

ارجمند کہنا چاہتی تھی کہ آپ بڑے ہیں، زیادہ جانتے ہیں، آپ سوچیں، لیکن یہ بدتمیزی ہوتی۔ اس نے سوچا، مجھے تو حکم کی تعمیل کرنی ہے، اس نے آنکھیں بند کیں اور بڑے ارتکاز کے ساتھ، بڑی عاجزی کے ساتھ اللہ سے دعا کی...... اللہ میاں! میری مدد کیجئے۔ مجھے سمجھا دیجئے۔

عبدالحق اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ ارجمند کا چہرہ کتنا حسین، دل کش اور دل نشیں ہے۔ وہ سچائی کے ساتھ کہہ سکتا تھا

کہ اتنا خوب صورت چہرہ اس نے پہلے کہیں نہیں دیکھا۔ اسے حیرت بھی ہوئی کہ اتنے دنوں کے ساتھ کے باوجود اس نے پہلے کبھی یہ بات محسوس نہیں کی۔

خوب صورتی سے بڑھ کر اس کی پاکیزگی تھی۔ بند آنکھوں کے ساتھ اس کے چہرے پر محویت کے تاثر کو دیکھ کر نہ جانے کیوں عبدالحق کو ایسا لگا کہ ارجمند اس وقت اللہ سے رابطہ میں ہے۔ اور اس بات کے یقینی ہونے پر اس کا دل گواہی دے رہا تھا۔

عبدالحق نے اس سے پہلے نوربانو کے سوا کسی کو اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی اس نے نظریں جھکا لیں۔

اسی لمحے ارجمند سر اٹھایا۔

"جی آغا جی! کچھ کچھ تو میری سمجھ میں آتا ہے۔ میں خود پر غور کر رہی تھی۔ جب میں نماز پڑھتی ہوں تو مجھے اللہ کی موجودگی کا اتنا قوی احساس نہیں ہوتا، جتنا دعا مانگتے وقت ہوتا ہے۔ دعا مانگتے ہوئے مجھے خیال آتا ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے تو میں اور جھک جاتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے پیروں پر گر پڑوں۔ اور مجھے یقین ہوتا ہے کہ وہ میری بات سن رہا ہے، میرے دل کا حال جان رہا ہے، اور سورۂ نجم کی اس آیت کے حوالے سے میں جانتی ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں جانتی اور اللہ سب جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میری دعا میرے حق میں بہتر ہے یا نہیں، اور دوسرے تمام لوگوں کے لئے، ساری دنیا کے لئے نقصان دہ تو نہیں ہے۔ میں نہیں جانتی اور اللہ سب جانتا ہے۔ اسی لئے اس نے بتا دیا کہ میری ہر دعا قبول نہیں کی جا سکتی۔ تو میں نے اس سے یقین کے ساتھ یہ سیکھا کہ اللہ میاں میری اور سب کی بہتری چاہتے ہیں۔ تو پھر وہ میرے اور سب کے دوست ہوئے نا، اور میں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ وہ ایسے قادرِ مطلق ہیں کہ جو چاہیں، کر سکتے ہیں، وہ کُن کہتے ہیں تو زمین آسمان وجود میں آجاتے ہیں۔ تو ہماری دعا کی قبولیت میں ہماری بہتری ہی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ ورنہ اللہ میاں کے لئے کچھ بھی کرنا ناممکن نہیں۔"

"لیکن دعا کی اہمیت......؟"

"میں سمجھ رہی ہوں، سمجھا نہیں پا رہی۔" ارجمند نے بے بسی سے کہا۔

"میں قرآن میں پڑھتی ہوں، جگہ جگہ اللہ نے اپنی صفات بیان فرمائی ہیں۔ میں اس پر سوچتی تھی کہ کیوں بیان فرمائیں۔ پھر میری سمجھ میں آیا کہ ہماری آسانی کے لئے۔ ہمیں اللہ پر بغیر دیکھے زبان اور دل سے ایمان لانا ہے۔ یہ تو بہت مشکل ہوتا ہمارے لئے۔ تو اللہ نے ہمارے لئے آسانی فرما دی۔"

"مشکل کیسے ہوتا؟"

"میں تو اپنے ہی حوالے سے بات کروں گی آغا جی! دوسروں کا تو مجھے نہیں پتا۔ میں جانتی ہوں کہ میرے اللہ میاں سب کچھ سنتے، سب کچھ دیکھتے، اور سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ میرے دل کا بھید بھی جانتے ہیں۔ میں یہ جانتی بھی ہوں، اور اس پر ایمان بھی رکھتی ہوں۔ لیکن کئی کئی دن مجھے اس کا خیال نہیں آتا۔ میں بری بات بھی کرتی ہوں اور مجھے یہ خیال نہیں آتا کہ اللہ میاں سن رہے ہیں، خفا ہوں گے۔ میں غلط کام بھی کرتی ہوں اور نہیں سوچتی کہ اللہ میاں دیکھ رہے ہیں۔ اور دل میں برائی سے تو میں ڈرتی ہی نہیں۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ اللہ میاں سب کچھ جانتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ میرا ایمان کمزور ہے نا! میں اللہ میاں کو اور ان کی صفات کو اس طرح یاد نہیں رکھ پاتی، جیسے یاد رکھنا چاہئے..... ہر ہر پل، ہر ہر لمحہ، یاد رکھوں تو نڈر نہ رہوں۔"

عبدالحق کا ذہن اب بھی الجھ رہا تھا۔

"تو دعا سے اللہ کی صفات کا شعور پختہ ہو جاتا ہے؟"

"جی.....! مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

"کیسے.....؟"

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی، جیسے الجھے ہوئے دھاگے کو سلجھا رہی ہو۔ پھر پُرخیال لہجے میں بولی۔

"مجھے کاپی کی ضرورت ہوتی ہے تو میں آپی سے کہتی ہوں، وہ منگا دیتی ہیں۔ لیکن کوئی ایسی ضرورت ہو، جسے کوئی پورا نہ کر سکے تو بے بسی محسوس ہوتی ہے اور میں اللہ سے دعا کرتی ہوں۔"

"مثلاً.....؟"

ارجمند گڑبڑا گئی۔ ضرورتوں کے حوالے تو اس کے پاس زیادہ تھے ہی نہیں۔

"میں آپ کے لئے دعا کرتی ہوں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"میرے لئے کیا دعا کرتی ہو تم.....؟" عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ آپ کو بیٹا دے۔" ارجمند نے بے ساختہ کہا۔

"اب دیکھیں نا آغا جی! یہ کام تو اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ وہی تو پیدا کرنے والا ہے۔" اب وہ شرمندہ ہو رہی تھی کہ یہ اس کے منہ سے کیسے نکل گیا؟ آغا جی کیا سوچیں گے۔

"اس دعا کے لئے مجھ سے دادی اماں نے کہا تھا۔" اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

عبدالحق سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"آپ کو برا لگا ہے آغا جی!" ارجمند نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں بھئی! کوئی کسی کے لئے دعا کرے تو اسے برا کیسے لگ سکتا ہے؟" عبدالحق نے خود کو سنبھالا۔

"میں تو تمہارا شکرگزار ہوں۔ تم میرے لئے دعا کرنا کبھی نہ چھوڑنا۔ اور بھی کوئی دعا کرتی ہو میرے لئے؟"

"جی.....! میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ آپ کو اپنے خاص پسندیدہ بندوں میں شامل فرمائے۔"

"جزاک اللہ!" عبدالحق نے کہا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ بات سے بات نکلی اور رُخ ہی بدل گیا۔ ایسے ہی تو اصل بات کہیں پیچھے رہ جاتی ہے۔

"ہاں تو ہم بات کر رہے تھے دعا کی۔ دعا سے اللہ کی صفات کا شعور پختہ ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں ایمان مستحکم ہوتا ہے۔ اور ایمان کے استحکام

سے عبادت میں بہتری اور سچائی آتی ہے۔ اور عبادت بندگی ہے، تو دعا بندگی کا عبادت سے بڑا روپ ہے۔ تم نے مجھے بہت بڑی بات سمجھا دی۔ دعا اپنی مکمل محتاجی اور اللہ کے قادرِ مطلق ہونے کا عملی اعتراف ہے۔ یہی تو بندگی ہے۔ لیکن اللہ نے عقل دے کر بندے کو گمان میں مبتلا کر دیا۔ یہ اس کی آزمائش ہے۔ وہ اپنی طاقتوں اور وسائل پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور خود بے بس ہو جائے تو دوسروں کی طاقتوں اور وسائل سے امید لگاتا ہے۔ اللہ کو نہیں پکارتا۔ نہیں سمجھتا کہ یہ راستہ شرک کی طرف لے جاتا ہے۔ مگر اس سے بچنا بہت مشکل ہے۔'' وہ اب ایک کیفیت میں بول رہا تھا۔ مدتوں کے بعد وہ اس طرح غور کر رہا تھا، اور سوچ رہا تھا۔

''نہیں آغا جی! اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ تو رحمت والا ہے۔''

ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

''اس نے اپنے بندوں کی ایسی راہنمائی کی ہے کہ وہ کبھی بھٹک ہی نہیں سکتے۔ قرآن بہت بڑی رحمت ہے اللہ کی۔ اب بندہ اس سے ہی منہ موڑ لے تو پھر اللہ سے دور تو ہوگا نا! یہ تو بدنصیبی ہے کہ روشنی میسر ہو اور بندہ سوئچ دبانا بھول کر اندھیرے میں بھٹکتا پھرے۔''

عبدالحق یوں تڑپا، جیسے جسم پر کسی نے کوڑا مارا ہو۔ اسے ایسا لگا کہ ارجمند خصوصیت سے اس کے بارے میں بات کر رہی ہے۔ واقعی وہ برسوں سے منہ موڑے ہی تو بیٹھا ہے۔

''کبھی کبھی اللہ کی رحمت سے صرف ایک آیت آدمی کی زندگی بدل دیتی ہے۔'' ارجمند اس کی حالت سے بے خبر اپنی کہے جا رہی تھی۔

''آدمی بس قرآن سے جڑ کر رہے۔ روز پڑھے اور سمجھنے کی کوشش کرے تو اللہ اسے اندھیرے میں رہنے ہی نہیں دے گا۔ ہر آیت میں بے شمار حکمتیں ہیں۔ اللہ خوش ہو تو اس پر بھید کھول دے۔ زندگی آسان ہو جائے۔''

''تمہارے ساتھ کبھی ایسا ہوا؟'' عبدالحق نے اس سے پوچھا۔

''جی......! ابھی دس پندرہ دن پہلے ہی ہوا۔'' ارجمند جیسے کھو سی گئی۔

''میں سورۃ الحج کی تلاوت کر رہی تھی کہ ایک آیت پر جیسے کسی نے مجھے روک دیا۔ میں نے ٹھہر ٹھہر کر اس آیت کو کئی بار پڑھا اور حیران ہوتی رہی۔ کچھ نہیں تو سو بار میں اس آیت کو پڑھ چکی ہوں۔ مگر نہ کبھی اس پر رکی اور نہ ہی غور کیا۔ پھر مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ اس میں کوئی پیچیدگی ہے ہی نہیں۔ وہ تو بالکل کھلی، واضح اور روشن آیت ہے۔ پہلے کیوں نہیں سمجھ سکی میں؟ بہرحال اسے پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔''

''کون سی آیت ہے وہ...؟'' عبدالحق نے تجسس سے پوچھا۔

''۷۳ ویں آیت ہے سورۃ الحج کی۔ مفہوم کچھ یوں ہے... اے لوگو! بیان کی جاتی ہے ایک مثال تو غور سے سنو اسے۔ یقیناً وہ جن کو تم پکارتے ہو اللہ کو چھوڑ کر، ہرگز نہیں پیدا کر سکتے وہ ایک مکھی بھی، اگرچہ جمع ہو جائیں وہ سب اس کام کے لئے۔''

''بے شک...! سبحان اللہ...!''

''آگے تو سنیے۔ اللہ فرماتا ہے... اور اگر چھین لے جائے مکھی ان سے کوئی چیز تو نہیں چھڑا سکتے اس کو اس سے۔ کمزور ہیں مدد مانگنے والے بھی اور وہ بھی جن سے مدد مانگی جاتی ہے۔''

ہیبت سے عبدالحق کا جسم شل ہو گیا۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ اس وقت مداخلت نامناسب ہوگی۔

''میں نے سوچا، یہ کیسی کھلی، واضح اور دوٹوک بات ہے۔'' ارجمند کہتی رہی۔

''اور پہلے کبھی میں نے اس پر غور نہیں کیا۔ اس روز میں آگے بڑھ ہی نہیں سکی، اس پر سوچتی اور غور کرتی رہی۔ جس نے یہ آیت پڑھی یا سنی، وہ تو اللہ کا انکار کر ہی نہیں سکتا آغا جی!''

''پھر کیا ہوا ارجی......؟''

''اس پر غور کرتے کرتے اچانک میرے اندر روشنی ہو گئی۔ اس میں چھپے ہوئے معنی بھی میری سمجھ میں آنے لگے۔ میری حالت خراب ہو گئی۔ لگتا تھا،

دماغ کو کچھ ہو جائے گا۔ دماغ کے اندر اتنے بہت سے معنی مچل رہے تھے، کہ دماغ انہیں گرفت میں نہیں لے پا رہا تھا۔ جیسے بند کمرے میں بہت سی تتلیاں اُڑ رہی ہوں اور سب کی سب پکڑی جا سکتی ہوں اور میں کبھی ایک کے پیچھے بھاگوں اور کبھی دوسری کے، اور بس چھو کر رہ جاؤں۔ کوئی تتلی ہاتھ ہی نہ آئے۔''

عبدالحق اس کیفیت سے گزر چکا تھا، اسے سمجھ سکتا تھا۔ اسے محرومی کا، زیاں کا احساس ہونے لگا اور اسے ارجمند پر رشک بھی آ رہا تھا۔ اتنی سی بچی اور یہ باتیں، یہ سب کیا ہے؟

''پھر کچھ ہاتھ بھی آیا؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت تھوڑا۔ جیسے بہت تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا جاتی ہیں نا آغا جی! میرے دماغ کی آنکھیں بھی ویسے ہی چندھیا گئی تھیں۔''

''جو سمجھ میں آیا، وہ تو بتاؤ!''

''سب سے کھلی اور واضح بات تو یہ ہے کہ اللہ قادرِ مطلق ہے، اور وہی تمام عالموں کا واحد پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی کچھ پیدا کرنے والا نہیں۔ اور یہاں اللہ نے مکھی کی مثال دی، جو بہت چھوٹی، بہت حقیر مخلوق ہے۔ اللہ نے جتایا کہ بڑی چیز تو کجا، تم مکھی جیسی حقیر چیز بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ دوسری بات یہ کہ جیسے اللہ کی قدرت لامحدود ہے، ویسے یہ بندوں کی کمزوری اور بے بسی بھی لامحدود ہے۔ اللہ نے انسان کو اپنا نائب بنایا، اشرف المخلوقات بنایا تو یہ عزت محض اللہ کے کرم سے ہے۔ اس پر انسان کو غرور نہیں کرنا چاہئے، پھولنا نہیں چاہئے، اسے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہئے۔ یہاں اللہ نے انسان کے غرور کو پاش پاش کر دیا۔ اس کے لئے کسی گمان کی گنجائش بھی نہیں چھوڑی۔ حوالہ وہی حقیر سی مکھی کا ہے کہ انسان اس پر بھی قدرت نہیں رکھتا۔ مکھی ان سے کچھ چھین لے تو وہ اسے واپس بھی نہیں لے سکتا، چاہے وہ اپنے جیسے اور لوگوں کو بھی جمع کر لے۔ تو وہ اپنے سے طاقتور سے کیسے نمٹ سکتا ہے۔''

عبدالحق کو بھی اپنا دماغ روشن روشن محسوس ہو رہا تھا۔ ارجمند کی باتوں سے اس کا ذہن کھل گیا تھا۔ وہ دور تک دیکھ اور سمجھ سکتا تھا۔

''اللہ نے تم پر کریمی کی ارجمند کہ تمہیں سمجھایا۔ اور مجھ پر کریمی کی کہ تمہارے ذریعے مجھ تک یہ بات پہنچی اور میرا ذہن کھلا۔ الحمد للہ! میں اور آگے دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہوا۔''

''تو جو آپ کی سمجھ میں آیا، مجھے بھی سمجھایئے!'' ارجمند کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''اللہ نے بہت سختی کے ساتھ دوٹوک انداز میں انسان کو اس کی اوقات بتا دی۔ اسے جتا دیا کہ اس کے لئے غرور نہیں، عاجزی ہے۔ اللہ کی محتاجی میں اس کے لئے عزت ہے۔ اسی میں اس کے لئے افتخار ہے۔ میں نے اس بے بسی کا تصور کیا اور لرز کر رہ گیا۔ میرے سامنے کی لذیذ چیز کی کوئی تاب رکھی ہے۔ مکھی اس پر آ کر بیٹھتی ہے، اور اگلے ہی پل اُڑ جاتی ہے۔ جو کچھ وہ لے کر اُڑی، اس کی کیا اہمیت ہے۔ وہ تو ذرّے سے بھی چھوٹا ایک ذرہ ہوگا، جو اگر مکھی میرے دامن پر بھی گرا دے تو شاید مجھے نظر نہ آئے۔ اس میں تو میرا کچھ نقصان نہیں۔ نقصان تو یہ ہے کہ تاب میں موجود وہ پوری کی پوری چیز میرے نزدیک خراب ہوگئی۔ اب میں اسے کھا نہیں سکتا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ!'' ارجمند نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''ہمیں یہ سوچ کر گھن آئے گی کہ مکھی نہ جانے کیسی کیسی غلاظتوں پر بیٹھ کر، گندگی سمیٹ کر آئی ہوگی اور اس چیز پر چھوڑ گئی ہوگی۔ اس بات کو میں نے نہیں سوچا تھا۔ آغا جی! آپ بہت عقل مند ہیں۔''

''نہیں ارجمند! یہ اللہ کا فضل ہے۔ اور یہ بات تو تمہاری بات سننے کے بعد میں سمجھا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب اس میں بھی اللہ کی مطلق قدرت اور ہماری بے بسی ہے، فرض کر لو، وہ چیز میں نے بہت شوق سے پکائی تھی، وہ میری دست رس میں تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اسے لے لینا۔ لیکن اللہ کی مرضی نہیں تھی، تو طاقت اور اختیار کے باوجود میں محروم رہ گیا۔''

''لیکن اس کے باوجود آپ اسے کھا سکتے ہیں۔'' ارجمند بولی۔

”اوّل تو گھن آئے گی۔ دوسرے یہ احساس ستائے گا کہ مکھی کی چھوڑی ہوئی غلاظت اور جراثیم کی وجہ سے وہ ضرر رساں بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اسے کھا کر میں بیمار بھی ہو سکتا ہوں۔ اور اسے کھاؤں تو شاید بیمار ہو بھی جاؤں۔“ عبدالحق نے کہا۔

”اور بھی کچھ سمجھ میں آیا آپ کی؟“ ارجمند نے پوچھا۔

”ہاں..... ! اپنی بے بسی کا احساس اور شدید ہو گیا۔ سمجھ میں آ گیا کہ جس چیز کو ہم اپنی دسترس میں سمجھتے ہیں، وہ بھی ہماری ناسمجھی ہے۔ وہ دسترس ظاہری ہے اصل میں وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اللہ چاہے تو مجھے اس سے روک دے۔ میں کچھ اٹھا کر پھینکنا چاہوں تو پھینک سکتا ہوں۔ لیکن اللہ نہ چاہے تو میرا ہاتھ ہی شل ہو جائے۔ میں اپنے اختیار پر اصرار کروں تو مجھے کوئی بڑا نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔“

ارجمند جھرجھری لے کر رہ گئی۔

”میں نے سمجھ لیا کہ جو کچھ مجھے میسر ہے اور جس پر بظاہر میرا اختیار ہے، اس سے استفادے کے لئے بھی مجھے اللہ سے اجازت لینی چاہئے۔“

”تب تو ہر لمحہ اجازت لینا ہوگی، اور ذرا دیر بعد یہ خود ہمیں بھی دکھاوا معلوم ہوگا۔“

عبدالحق مسکرایا۔

”اللہ بڑا مہربان ہے۔ وہ آسانیاں فراہم کرتا ہے۔ اس کے لئے اس نے ہمیں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم عطا فرمایا ہے۔ کچھ بھی کرو، بسم اللہ پڑھ کر اللہ کی قدرت اور بے بسی کا اعلان کر دو۔“

”جی..... ! میں سمجھ گئی۔“ ارجمند نے کہا۔ پھر بولی۔

”ایک بات بتاؤں آغا جی! مجھے اللہ کی قدرت اور اپنی بے بسی کا خیال اس آیت کو سمجھ کر ہی آیا؟“

”کیسے.....؟“

”میں نے سوچا، سب لوگوں کے گھروں میں قرآن موجود ہوتا ہے۔

لیکن وہ کبھی پڑھتے نہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ وہ مجھے پڑھنا نصیب کرتا ہے۔ پھر یہ آیت میں نے بارہا پڑھی اور گزر گئی۔ کھلی اور روشن آیت، لیکن کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس روز اللہ نے مجھے اس آیت پر روک دیا۔ تبھی تو میں سمجھ سکی۔ اللہ نے مجھے سمجھایا۔ یہ تو نشانی ہے کہ اس کی مدد کے بغیر میں کچھ نہیں کچھ سکتی۔“

عبدالحق مسکرایا۔

”یہ تو اللہ نے قرآن میں خود بھی فرمایا ہے قرآن کے لئے، سورۂ مدثر یاد ہے؟“

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔

”اللہ سورۃ المدثر کی آخری آیات میں فرماتا ہے ..... خبردار! یہ تو ایک نصیحت ہے۔ سو جس کا جی چاہے، سبق حاصل کر لے۔ اور نہیں سبق حاصل کریں گے یہ لوگ اس سے، الا یہ کہ چاہے اللہ، وہ لائق ہے ڈرنے کے اور وہ مالک ہے بخشش کا۔“ عبدالحق نے کہا۔

”اب دیکھو، قرآن کی دعوت بھی عطا فرمائی، اور یہ بھی جتا دیا کہ روشنی تو اللہ کی مرضی سے ہی ملے گی۔“

”بے شک! لیکن آغا جی.....“

”مطلب یہ کہ اللہ سے لو لگا کر قرآن نصیحت حاصل کرنے کے لئے پڑھتے رہو، سمجھنے کی کوشش کرتے رہو، چاہے سمجھ میں نہ آئے۔“ عبدالحق کی طبیعت میں روانی آ گئی تھی۔

”پھر آخر میں اپنے بارے میں وضاحت بھی فرما دی اور راہنمائی بھی فرما دی کہ صرف اسی سے ڈرتے رہو اور اسی سے بخشش طلب کرتے رہو۔ اس کے نتیجے میں سمجھ سکو گے اور روشنی حاصل کر سکو گے۔“ عبدالحق نے ایک لمحہ توقف کیا، پھر بولا۔

”اب تم دیکھ لو، تم نے خود کہا کہ نہ جانے کتنی بار تم سورۃ الحج کی اس آیت کو پڑھ کر گزر گئیں۔ لیکن پھر ایک دن اللہ نے تمہیں اس پر روکا اور روشنی عطا فرما دی۔ تو قرآن سے جڑا رہنا، رابطہ رکھنا، اللہ سے ڈرنا اور بخشش طلب کرنا

ضروری ہے۔''

''آپ نے کتنی اچھی طرح سمجھا دیا آغا جی!'' ارجمند نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔

''اللہ نے سمجھایا ہے، تمہیں بھی اور مجھے بھی۔ اور ہاں! سورۃ الدھر میں بھی اسی طرح کا مضمون ہے۔ ۲۹ ویں اور ۳۰ ویں آیت میں اللہ فرماتا ہے ... یقیناً یہ ایک نصیحت ہے، پس جو شخص چاہے بنا لے اپنے ربّ کی طرف جانے کا راستہ۔ اور تم چاہ بھی نہیں سکتے مگر یہ کہ چاہے اللہ یقیناً اللہ ہے سب کچھ جاننے والا، بڑی حکمت والا۔ اب دیکھو، تقریباً وہی مضمون ہے۔ سورۃ المدثر میں بات ہے سب حاصل کرنے کی۔ سبق کیسا؟ پچھلی اُمتوں، اللہ کی نافرمانی، اس کا انکار کرنے والوں، خودسروں، سرکشوں اور مغروروں کے انجام سے سبق۔ سبق حاصل کرو گے تو ڈرو گے اپنے اعمال پر بخشش طلب کرو گے۔ یوں اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔ اور سورۃ الدھر کی آیت مبارکہ کے مطابق تم اپنے ربّ کی طرف جانے والا راستہ پالو گے۔ یہاں بھی فیصلہ اللہ کی مرضی سے ہوگا۔ اور یہاں اللہ نے اپنی دو صفات کا ذکر فرمایا ہے۔ فرماتا ہے کہ وہ ہے سب کچھ جاننے والا اور بڑی حکمت والا۔ یعنی ہم نے اللہ سے ڈرنے اور بخشش طلب کرنے کی شرط پوری کر دی۔ اب اللہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ ہمارے باطن کے ان گوشوں سے بھی واقف ہے جو خود ہم سے بھی پوشیدہ ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ہمارا اس سے ڈرنا محض زبانی ہے یا واقعتاً ہم اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ہم یوں ہی بخشش طلب کر رہے ہیں اس سے یا اس کے ساتھ ہم نے اصلاحِ اعمال کا ارادہ بھی کیا ہے۔ جب اس نے جان لیا اور ہمیں اپنی رحمت کا حق دار قرار دے دیا تو وہ ہمارے لئے اپنی طرف آنے کا راستہ بنائے گا۔ یہاں اس نے ہمیں بتایا کہ وہ بڑی حکمت والا ہے۔''

''راستہ بنانے کا کیا مطلب آغا جی! راستہ تو موجود ہے پہلے سے۔''

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

''مولوی صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ دنیا میں جتنے انسان ہیں، اللہ

تک پہنچنے کے اتنے ہی راستے ہیں۔''

''راستہ تو ایک ہی ہے آغا جی..... ! صراطِ مستقیم!'' ارجمند نے عاجزی سے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آگے، بہت آگے جا کر وہ راستے آپس میں جا ملتے ہیں۔''

''لیکن ہر شخص کا اللہ تک پہنچنے کا راستہ الگ ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور اس وقت میں نے مولوی صاحب سے پوچھا نہیں، جب اس طرح کی گفتگو ہو رہی ہوتی ہے تو بات سے بات نکلتی ہے، اور باتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں، اور وقت کم۔ یوں ذہن منتشر بھی ہو جاتا ہے۔''

''تو اب اس پر سوچیں۔''

عبدالحق کچھ دیر سوچتا رہا، پھر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''شاید میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔'' اس کے لہجے میں یقین کی کمی تھی۔

''مولوی صاحب نے سورۂ زخرف کی ایک آیت کا حوالہ دیا تھا، جس کے مطابق اللہ نے دنیا میں روزی تقسیم کی ہے، اور بعض لوگوں کو بعض لوگوں پر فوقیت عطا فرمائی ہے۔ کوئی کسان ہے، کوئی بادشاہ، ہر شخص کو اپنا کام کرنا ہے۔ یہ اللہ کا نظام ہے..... ارے..... ہاں، بات سمجھ میں آ رہی ہے۔'' اس کے لہجے سے ہیجان جھلکنے لگا۔

''ٹھیک تو ہے، روزی کیا ہے..... متاعِ حیات، دنیا کی زندگی کا زادِ راہ۔ ہر آدمی کو اپنی زندگی بھی گزارنی ہے، اور نیک اعمال بھی کمانے ہیں، اللہ نے سب انسانوں کو ایک جیسا نہیں بنایا۔ ہر طرح کی تفریق موجود ہے انسانوں میں۔ امیر غریب، گورا کالا، خادم اور آقا، آجر اور اجیر، اور اللہ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ اس کی کم سے کم رحمت انصاف ہے۔''

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔''

"میں تو خود سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری سنو، شاید تمہاری سمجھ میں مجھ سے زیادہ آ جائے۔ روشنی تو بس اللہ دیتا ہے۔" عبدالحق نے عاجزی سے کہا۔

"قیامت کے دن کوئی بندہ اللہ سے یہ شکایت نہیں کر سکے گا کہ اے اللہ! مجھے نیکی کرنے کے اتنے مواقع نہیں ملے، جو دوسروں کو ملے تھے۔ ہر نیکی کا کوئی طے شدہ وزن نہیں ہے۔ وہ نیکی کرنے والے کی حیثیت کے مطابق اللہ طے کرتا ہے، جو سب کچھ جاننے والا ہے، ذرا سوچو تو کوئی غریب صرف چونّی سے اپنے سے زیادہ کسی غریب کی مدد کرے تو ہمیں تو وہ حقیر ہی لگے گی۔ ہمیں امیر کے دیئے ہوئے سو روپے بہت بڑے لگیں گے نا! لیکن اللہ کے ہاں وہ چونّی سو روپے سے بہت بھاری ہوگی کہ اس غریب کے پاس وہی ایک چونّی تھی، جو اس نے اپنے سے زیادہ ضرورت مند کو دے دی۔ امیر کے پاس لاکھوں روپے تھے، جس میں سے اس نے سو روپے دیئے۔"

"جی...... ! میں سمجھ گئی۔"

"اور جس کے پاس دینے کے لئے کچھ بھی نہیں، اس نے اپنے پریشان حال بھائی کو ایک حوصلہ افزاء مسکراہٹ سے، دلاسے اور تسلی سے نوازا، اس کی غم گساری کی، اس کے لئے دعا کی تو وہ بھی بہت بڑی نیکی ہوگی اللہ کے ہاں۔"

"بات رب کی طرف جانے والے راستوں کی ہو رہی ہے آغا جی!" ارجمند نے یاد دلایا۔

عبدالحق کھسیا گیا۔

"دیکھ لو، بات سے بات نکلتی ہے تو اصل بات پیچھے رہ جاتی ہے۔ بات رب کی طرف جانے والے راستوں کی ہو رہی تھی۔ مولوی صاحب نے کہا تھا، جتنے انسان اتنے ہی راستے۔ میں نے سنا اور توجہ نہیں دی۔ غور ہی نہیں کیا۔ اب سوچا تو اللہ کی رحمت سے کچھ کچھ سمجھ میں آیا ہے۔ تمام راستوں کا آغاز تو ایمان سے ہے۔ اس کے بعد زندگی میں جس شخص کا جو مقام، حیثیت اور مرتبہ ہے، اسی کے اعتبار سے اس کا راستہ ہوگا، جو آگے جا کر دوسرے تمام راستوں سے مل جائے گا۔ ہمارا تمام تاثر یہ ہے کہ صرف علم دین ہی آدمی کو اللہ تک پہنچاتا ہے۔

لیکن اللہ نے خود بتایا کہ اس نے ہر شخص کو الگ طرح کی متاع حیات عطا فرمائی...... یعنی روزی۔ اور حیثیت اور مرتبے بھی مختلف بنائے۔ اس لئے ہر شخص کا اللہ تک پہنچنے کا ایک اپنا ہی راستہ ہے۔ اسے اس راستے کو کھوجنا ہے اور اس پر آگے بڑھنا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے رب تک پہنچ جائے۔

اب اللہ نے یہ بھی بتا دیا کہ تم وہ راستہ نہیں کھوج سکتے۔ بغیر اس کی مرضی اور خوش نودی کے۔ اور اپنی خوش نودی حاصل کرنے کا راستہ اس نے دکھا دیا۔ قرآن پڑھو کہ وہ نصیحت ہے۔ پڑھو گے تو سبق حاصل کرو گے۔ اللہ کو، خود کو اور زندگی کو سمجھو گے۔ سمجھو گے تو ڈرو گے اور اللہ سے بخشش طلب کرو گے۔ وہ خوش ہوگا تو تمہیں نہ صرف راستہ دکھائے گا، بلکہ راستے کو تمہارے لئے آسان بھی فرما دے گا۔"

"مگر جتنے انسان اتنے راستے......؟"

"میں اب اسی طرف آ رہا تھا۔" عبدالحق نے کہا۔

"اللہ نے لوگوں کے درمیان معیشت تقسیم کی۔ ایک مکمل اور مربوط نظام قائم فرمایا۔ اسی کی وجہ سے ہر شخص کا راستہ الگ ہے۔ کوئی عالم ہے، کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر، کوئی افسر، کوئی خدمتگار، کوئی زمین دار، کوئی کسان، کوئی مزدور، کوئی صنعت کار۔ کسی کو ظاہری طور پر زیادہ آسانیاں میسر ہیں، اور کسی کو کم۔ اب ایمان لانے کے بعد اللہ کے کچھ حقوق تو سب پر مشترک ہیں، اور ان کو ادا کرنے میں کسی کی حیثیت مانع نہیں۔ پانچ وقت کی نماز پڑھنی ہے، صاحب حیثیت ہو تو زکوۃ ادا کرنی ہے، اور ماہِ رمضان کے روزے رکھنے ہیں۔ اس کا ہر ایک کو اپنے عمل کے خلوص کے لحاظ سے اجر ملے گا۔ جس غریب کو سحری میسر نہیں تھی، اور اس نے صرف پانی پی کر روزہ رکھا، اور پھر افطار کے وقت بھی صرف دو کھجوریں میسر آئیں۔ اس نے افطار کیا، اللہ کا شکر ادا کیا اور سحری کے آسرے کے بغیر اگلے روز کا قصد کیا، تو اس کے روزے کا اجر تو میرے روزے سے کہیں زیادہ ہوگا نا! پھر اللہ نے اکل حلال کو عبادت کا درجہ دیا۔ یعنی جو کام بھی آدمی کرے، خلوص اور دیانت کے ساتھ احسن ترین طریقے سے کرنے کی کوشش

کرے۔ پھر حقوق العباد اور حسن اخلاق کے بارے میں بتایا۔ لوگوں کی خدمت کو عین عبادت قرار دیا۔

"تو اب راستے تو الگ الگ ہو گئے نا! دولت مند کا اپنا راستہ ہے۔ وہ اللہ سے ڈرے اور بخشش طلب کرے تو اللہ اسے راستہ دکھائے گا۔ وہ سمجھ لے گا کہ دولت اس کی ملکیت نہیں، اللہ کی عطا ہے، اور اسے اس دولت سے اللہ کو خوش کرنا ہے، وہ صدقہ خیرات کرے گا، لوگوں کی مدد کرے گا، ضرورت مندوں کے کام آئے گا، یتیموں پر مہربانی کرنے گا، بھوکوں کو کھانا کھلائے گا، مال دے کر لوگوں کی گردنیں چھڑائے گا، اور دکھاوے کے لئے نہیں، بلکہ خالصتاً اللہ کو خوش کرنے کے لئے۔ پھر اس کا راستہ ربّ سے ملانے والی شاہراہ یعنی صراطِ مستقیم سے جا ملے گا۔ غریب اپنے راستے کو صبر، شکر، قناعت اور ایثار جیسے اوصاف سے سجائے گا، ڈاکٹر اپنے فرض سے بھی آگے جا کر بیماروں کی خدمت اور دل جوئی کرے گا۔ تو ہر شخص کا راستہ الگ ہے نا، اور وہ خود سے اس راستے کو نہیں پا سکتا۔ وہ اللہ سے ڈرے گا اور بخشش طلب کرے گا تو اللہ اس کے لئے راستہ بنائے گا۔ اور جب تک وہ اللہ کو، اس کی صفات اور قدرتِ کاملہ کو نہیں سمجھے گا تو نہ اللہ سے ڈرے گا اور نہ بخشش طلب کرے گا۔ اور اللہ کو، اس کی صفات اور قدرتِ کاملہ کو وہ اس وقت تک نہیں سمجھ سکے گا، جب تک وہ اللہ سے روشنی اور راہنمائی طلب کرتے ہوئے قرآن نہیں پڑھے گا، اس پر غور نہیں کرے گا۔"

"میں سمجھ گئی آغا جی!" ارجمند نے خوش ہو کر کہا۔

"اللہ کا شکر ہے، اس نے ہمیں روشنی عطا فرمائی۔" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔ بہت دیر سے وہ خود کو بہت بوجھل بوجھل محسوس کر رہا تھا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا۔

"بات سورۂ نجم کی آیت مبارکہ سے شروع ہوئی تھی۔ اس کے حوالے سے اللہ نے اپنی رحمت سے ہمیں سمجھایا کہ قرآن ہمیں اللہ کی صفات اور قدرتِ کاملہ کا شعور عطا کرتا ہے، جس سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔"

"یعنی اتنا کافی نہیں کہ ایمان لائے اور مطمئن ہو گئے۔ ایمان کو تازہ

اور مستحکم کرتے رہنا بھی ضروری ہے۔"

"بالکل ..... اور اللہ نے ہمیں یہ بھی سمجھایا کہ دُعا بندگی کا اعلیٰ تر درجہ ہے۔ وہ اللہ کی صفات اور قدرتِ کاملہ کے اس شعور کو جو قرآن نے ہمیں عطا کیا، پختہ اور مستحکم کرتی ہے، اور ایمان بڑھاتی ہے۔"

"اور یہ کہ دعا قبوت نہ ہونے پر ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔" ارجمند نے کہا۔

"اور اللہ نے ہمیں یہ بھی سمجھایا کہ ہم جو کچھ چاہتے اور مانگتے ہیں، وہ سب کچھ دیا نہیں جا سکتا۔ اور جب قادرِ مطلق یہ فرمائے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم بہت کچھ ایسا مانگتے ہیں..... اپنی بے علمی اور بے خبری کی وجہ سے..... جو ہمارے حق میں، یا دوسروں کے حق میں یا دنیا کے نظام کے لئے بہتر نہیں۔ مختصراً یہ کہ وہ مشیت کے خلاف ہے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ ہمیں نہیں دیا جا سکتا۔"

"مشیت کا کیا مطلب ہے آغا جی.....؟"

"اللہ کی مرضی، جو حرفِ آخر ہے۔"

"اس کے بعد تو مجھے دعا سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔" ارجمند سہم گئی تھی، جیسے اندر ہی اندر لرز رہی ہو۔

"لیکن دعا تو بہت ضروری ہے۔ وہ بندگی ہے۔ ایمان کو مستحکم کرتی ہے۔ بس یہ ہے کہ لفظوں میں دعا ذمہ داری کے ساتھ کی جائے۔ ورنہ ہمیں نقصان بھی ہو سکتا ہے۔"

"کیسے.....؟"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ کوئی مثال ہی نہیں سوجھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"تم میرے لئے اولاد کی دعا کرتی ہو نا! اب اگر اللہ قبول کر لے اور خدانخواستہ مجھے ایسا بیٹا دے، جو نابینا ہو، یا اس کے ساتھ کوئی اور محرومی ہو، یا یہ کہ وہ صالح نہ ہو تو میرا نقصان ہوگا نا!"

"آپ تو مجھے اور ڈرا رہے ہیں دعا سے۔" ارجمند کی آواز لرزنے لگی۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں، مجھے مولوی صاحب نے اس مسئلے کا حل بتایا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہر دعا کے ساتھ ''بالخیر'' کا اضافہ کر لیا کروں۔ اگر اس میں شر ہوگا تو اللہ یا تو اس کا شر دور فرما دے گا یا پھر وہ دعا قبول ہی نہیں کرے گا۔ تو ظاہر ہے کہ اس دعا کے قبول نہ ہونے میں بہتری ہی ہوگی۔ دعا جیسی نعمت سے کیوں محروم ہو آدمی۔''

ارجمند خوش ہوگئی۔

''واہ......! یہ بات تو دل کو لگتی ہے۔ اور کتنی آسان ہے۔''

''مولوی صاحب اللہ والے ہیں، اور قرآن سے محبت کرتے ہیں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''تو یہ تو ہوئی دعا کی بات۔ ایک بات میں یہ سمجھا کہ اللہ کے سوا کوئی دینے والا نہیں۔ سو اللہ کے سوا کسی سے کچھ نہیں مانگنا چاہئے۔''

''لیکن آغا جی! یہ دنیا تو اسباب کا نظام ہے۔ اب اللہ میاں مجھے کاپی تو نہیں دیں گے۔'' ارجمند نے معصومیت سے کہا۔ پھر خود ہی ڈر گئی اور رخسار پیٹتے ہوئے توبہ توبہ کرنے لگی۔

''نہیں سمجھیں تم!'' عبدالحق نے کہا۔

''فرض کرو، تمہیں کوئی ضرورت ہے۔ تم نے اپنی آپی سے کہا، انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر مجھ سے کہا، میں نے بھی انکار کر دیا۔ اب وہ چیز بہت ضروری ہے تمہارے لئے، تو تم کیا کرو گی؟''

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی۔

''میں دادی اماں سے کہوں گی۔''

عبدالحق مسکرایا۔

''بالکل ٹھیک! اس لئے کہ اماں کے پاس اس گھر کا اقتدار ہے۔ ان کا حکم نہیں ٹلے گا۔ میں اور نور بانو چاہیں یا نہ چاہیں، ہمیں تمہاری ضرورت پوری کرنی پڑے گی۔ تب تم یہ نہیں سوچو گی کہ اس سے تو اچھا تھا، تم پہلے ہی اماں سے کہہ دیتیں۔''

''لازمی بات ہے، میں یہی سوچوں گی۔''

''تو اللہ کے پاس تو بلا شرکت پوری کائنات کا اقتدار ہے، تو آدمی کو ہر ضرورت کے لئے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانا چاہئے۔ تم نے میرے اور نور بانو کے انکار کے بعد اماں سے کہا تو اماں نے خود تو تمہاری ضرورت پوری نہیں کی نا! ہمیں حکم دیا اور تمہارا کام ہوگیا۔ تو اللہ تو قدرت والا ہے۔ وہ تمہارے دل میں ڈالے گا کہ میرے بجائے تم اماں سے بات کرو، بلکہ وہ چاہے گا تو میرے دل میں ڈالے گا، اور میں خود ہی وہ چیز تمہیں لا کر دے دوں گا۔ تمہیں کسی سے مانگنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔''

''جی آغا جی! میں سمجھ گئی۔'' نور بانو نے خوش ہو کر کہا۔

''اور مکھی والی آیت سے بھی میں نے ایک بات سیکھ لی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''کوئی ہم سے زیادہ طاقت ور ہمیں ستاتا ہے تو ہم کسی ایسے کو تلاش کرتے ہیں جو اس سے بھی زیادہ طاقت ور ہو، یا کم از کم اس کا ہم پلّہ تو ہو۔ تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ سب سے زبردست اور طاقت ور ہے۔ ہم کتنے ہی طاقت ور لوگوں کو جمع کر لیں تو مکھی کا اٹھایا ہوا ایک ذرّہ بھی اس سے نہیں چھڑا سکتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ظاہری طور پر طاقت ور نظر آنے والے بھی درحقیقت کمزور ہیں۔ حقیقی طاقت تو بس اللہ کی ہے۔ تو وہ دعا والی سہولت یہاں بھی کام آئے گی۔ انفرادی طور پر ہو یا قومی سطح پر، ہمیں اللہ سے مدد مانگنی ہوگی۔ وہی بچانے والا اور حفاظت فرمانے والا ہے۔ اس نے صاف اور واضح طور پر ہمیں بتا دیا کہ مدد مانگنے والے بھی کمزور ہیں اور وہ بھی جن سے مدد مانگی جاتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہر چیز کے لئے اور ہر مسئلے کے لئے صرف اللہ سے رجوع کرنا چاہئے۔ جو کچھ ہماری دسترس میں، ہمارے قبضے میں ہے، وہ بھی اللہ کی مرضی اور حکم کے بغیر ہمارے تصرف میں نہیں آتا۔''

''لیکن آغا جی! بات تو پھر ایمان پر آ رکی۔'' ارجمند نے کہا۔

''اللہ کی صفات پر تو راسخ یقین ہو۔''

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ صرف زبانی ایمان سے کام نہیں چلتا۔ اب مجھے لگتا ہے کہ ایمان تو ایک طویل اور مشکل سفر کا آغاز ہے، جو اللہ کی تائید کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اتنا کافی نہیں کہ زبان سے، دل سے ایمان لے آئے۔ زندگی پر، تمام معاملات پر، وہ چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں، ہمارے ہر فعل اور ہر عمل پر ایمان کی حکومت ہونی چاہئے۔ زندگی کا اصل مقصد یہی ہے۔ جبکہ ہم دنیا میں الجھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

"میں یہ بات یاد رکھوں گی، اللہ سے مدد کی دعا کروں گی۔ اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔"

"مجھے بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔"

"آپ مجھے ہمیشہ یاد رہتے ہیں آغا جی!" ارجمند نے بے ساختہ کہا۔ پھر جلدی سے اضافہ کیا۔

"سب سے زیادہ تو میں آپ کے لئے دعا کرتی ہوں۔"

"جزاک اللہ!" عبدالحق نے کہا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔

"ارے......! اتنی دیر ہوگئی۔ اور پڑھائی تو ہوئی ہی نہیں۔"

"جو کچھ آج حاصل ہوا ہے، وہ پڑھائی سے بہت بڑھ کر ہے۔"

"اچھا......! اب جا کر سو جاؤ۔"

✿ ✿ ✿

عبدالحق بستر پر لیٹا تو نیند سے بے حال تھا۔ لیکن کھانے والی بات دل میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس نے بے حد سرسری انداز میں نور بانو سے پوچھا۔

"آج کھانا تم نے پکایا تھا؟"

"روز میں ہی پکاتی ہوں۔"

"میں دوپہر کے کھانے کی بات کر رہا ہوں۔"

نور بانو چوکنا ہوگئی۔ یہ بات وہ بلاوجہ تو نہیں پوچھ رہا ہوگا۔ لیکن وہ یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ سوچ رہی ہے۔ سوچنے کی مہلت حاصل کرنے کے لئے اس نے بات آگے بڑھائی۔

"دوپہر کے کھانے کو کیا ہوگیا؟"

"میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ آج جو کھانا مجھے دفتر بھیجا گیا، کیا وہ تم نے پکایا تھا؟"

"کیوں پوچھ رہے ہیں آپ!"

"تمہارا پکایا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔"

نور بانو نے سمجھ لیا کہ حکمت سے کام لینا ہوگا۔ کوئی بات ضرور ہے۔ ارجمند سے کوئی گڑبڑ ہوگئی ہوگی۔

"واہ بھئی ......! آپ تو خوب پہچانتے ہیں۔" اس نے خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"کمال کر دیا آپ نے۔"

"کیا مطلب......؟"

"خوب پہچانا آپ نے۔ آج میں اٹھ نہیں سکی تھی۔ کھانا ارجی نے پکایا تھا۔" نور بانو نے کہا۔

"کیا بہت فرق تھا ذائقے میں؟"

"نہیں ......!" عبدالحق نے بے پرواہی سے کہا۔ پھر بولا۔

"ایسا کم ہی ہوتا ہوگا؟"

نور بانو نے محتاط لہجے میں کہا۔

"کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ پھر آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ارجی کو کھانا پکانے کا کتنا شوق ہے۔"

"ہاں ......! میں جانتا ہوں۔ اور وہ پکاتی بھی اچھا ہے۔"

"کبھی میں نہ اٹھ پاؤں تو وہ کھانا پکا کے آپ کو بھجواتی ہے۔ بہت ذمہ دار ہے۔"

نور بانو کی بات معقول لگ رہی تھی۔ لیکن یعقوب کا کہنا تھا کہ اسے کھانا ہمیشہ ارجمند ہی دیتی ہے، اور پہلی بار بھی کھانا اس نے ہی دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ پوچھے تو بتائے کہ کھانا نور بانو نے بھجوایا ہے۔ یہی نہیں، یعقوب نے تو یہ

بھی کہا تھا کہ جب وہ کھانا لے کر آتا ہے تو نور بانو سو رہی ہوتی ہے۔

وہ اتنی اہم بات نہیں تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں عبدالحق کو بہت اہم لگ رہی تھی۔ اسے خیال آیا کہ ارجمند نے کہا تھا کہ اس کی پکانے کی مشق ناشتے تک محدود ہے۔ وہ مزید کریدتا، لیکن بات کہیں کی کہیں نکل گئی تھی۔

تو نور بانو کی بات معقول تھی۔ لیکن اس کے دل کو نہیں لگ رہی تھی۔

نور بانو بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟''

عبدالحق نیند سے بے حال ہو رہا تھا۔ لیکن اچانک اسے خیال آ گیا۔

''ارے ہاں......! وہ فائل نکال کر باہر رکھ دینا۔ آج میں لے جانا بھول گیا تھا۔ کل لے جانا بہت ضروری ہے۔''

''تو جاتے ہوئے لے لیجئے گا۔''

''تم سو رہی ہوتی ہو۔'' عبدالحق نے سادگی سے کہا۔

''صبح میں نے تلاش کی، مگر مجھے نہیں ملی۔ تم ابھی نکال کر رکھ دو۔''

نور بانو اٹھی۔ اس نے الماری کے سیف سے فائل نکال کر مسہری کے سرہانے رکھ دی۔

عبدالحق سو گیا۔ مگر نور بانو عادت کے مطابق جاگ رہی تھی۔ وہ اسی مسئلے پر سوچ رہی تھی۔ بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ سب کچھ فائل ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ عبدالحق صبح فائل نہیں لے جا سکا ہوگا۔ اس نے یعقوب سے کہا ہوگا کہ کھانے کے ساتھ فائل بھی لے آئے۔ اب سوال یہ تھا کہ یعقوب نے کیا کچھ کہا ہوگا؟ کیا یہ کہ کھانا ہر روز ارجمند دیتی ہے؟ یہ بھی کہ وہ دوپہر تک سوتی رہتی ہے؟

وہ پریشان ہوگئی۔ لیکن یہ اطمینان ہوگیا کہ یعقوب نے اس کے سونے کے متعلق نہیں بتایا ہوگا۔ اسے کیا معلوم! وہ گھر کے اندر تو آتا نہیں ہے۔ مگر یہ تو ضرور بتایا ہوگا کہ کھانا ہر روز ارجمند ہی دیتی ہے۔

اور اس نے کس کس طرح بات بنائی۔ اب اگر اس کا جھوٹ کھل جائے

تو......؟ یہ پریشانی بہت بڑی تھی۔

اس پر سوچتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ایسا ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ نوکروں سے عبدالحق کبھی گھر کی بات نہیں کرتا ہے اور ارجمند بتانے والی نہیں ہے۔

وہ کچھ مطمئن ہوگئی۔ اس نے سوچا، کل یعقوب سے ضرور پوچھنا ہوگا۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ کل وہ جلدی اٹھے، کھانا پکائے اور خود یعقوب کو دے، اور اس سے تفتیش بھی کر لے۔ لیکن نہیں، کھانا تو وہ ارجمند سے ہی بھجوائے۔ معمول میں فرق نہیں آنا چاہئے۔ یوں وہ کہہ سکتی ہے کہ کھانا وہ پکاتی ہے، اور یعقوب کو ارجمند ٹفن پہنچاتی ہے۔

وہ پوری طرح مطمئن ہوگئی۔ لیکن نیند اسے پھر بھی نہیں آئی۔ بری عادتیں آسانی سے پیچھا کہاں چھوڑتی ہیں۔

✿ ✿ ✿

اس رات ارجمند کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

وہ بہت خوش تھی۔ ویسے تو یہاں آنے کے بعد وہ خوش ہی رہی تھی۔ لیکن اتنی خوشی اسے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ آج عبدالحق کے ساتھ جو وقت اس نے گزارا تھا، وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ اس نے عبدالحق سے کتنا کچھ سیکھا اور سمجھا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ پہلی بار عبدالحق نے اسے اہمیت دی تھی۔ بلکہ اس کے انداز میں ایسا احترام تھا، جیسے وہ بڑی...... بہت بڑی ہوگئی ہو۔

اب سے کافی پہلے اس نے عبدالحق کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا...... نہیں، سوچنا تو وہ نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ لیکن اس کے بارے میں پہلے والے انداز میں اب وہ نہیں سوچتی تھی۔ اور اس کے لئے اس نے بہت کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں کامیاب ہونا آسان نہیں تھا۔ لیکن دو بہت بڑے جواز اسے میسر آ گئے تھے، جنہوں نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ ان میں ایک تو نور بانو تھی، جس کے روپ میں اسے بہت شفیق اور محبت کرنے والی بہن مل گئی تھی۔

بے شک وہ عبدالحق سے بہت پہلے سے محبت کرتی تھی، اس وقت جب

شاید اس نے صحیح معنوں میں ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا اور اس کا ایمان تھا کہ وہ محبت اللہ نے اس کے دل میں ڈالی ہے۔ نشانیاں بھی یہی بتاتی تھیں۔ اللہ میاں کہتے تھے کہ وہ اسے ضرور ملے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اور جس طرح وہ اسے ملا، وہ معجزہ ہی تھا۔ اللہ ہی نے تو اسے اس کے گھر پہنچایا۔ ورنہ تو یہ ممکن ہی نظر نہیں آتا تھا۔

وہ محبت اس کے لئے کبھی باعث شرم نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو محترم تھی۔ اللہ کی دی ہوئی ہر چیز محترم ہی ہوتی ہے۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ عطا کے ساتھ آزمائش بھی ہوتی ہے۔ اگر نوربانو اس پر مہربان نہ ہوتی، اس سے محبت نہ کرتی تو وہ پہلے ہی کی طرح عبدالحق سے محبت کرتی رہتی۔ لیکن نوربانو نے صورتِ حال بدل دی۔ اور غیر معمولی بات یہ تھی کہ سوائے اس کے نوربانو ہر ایک کے لئے سخت اور تنگ دل تھی۔ لیکن اس کی خاطر نوربانو کچھ بھی کر سکتی تھی۔ تو پھر اس کی بھی تو کچھ ذمہ داری تھی۔

تو اب وہ محبت کرنے والی بہن کے شوہر سے کیسے محبت کر سکتی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ محبت پر مجبور تھی۔ تو اسے محبت کے آداب سیکھنے پڑے، محبت کو دبانا، خود سے بھی چھپانا سیکھنا پڑا۔ اس نے عبدالحق کے بارے میں اس طرح سے سوچنا چھوڑ دیا۔ اللہ میاں کہتے تھے، وقت آنے پر وہ اسے ملے گا ..... ضرور ملے گا۔ مگر اب وہ اس کے ملنے سے ڈرنے لگی تھی۔ وہ سوچتی، کیا خدانخواستہ.....؟ اور اس سے آگے اس نے سوچا بھی نہیں جاتا۔ وہ باقاعدگی سے نوربانو کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کرتی۔ نوربانو سے محرومی، دائمی جدائی کے نتیجے میں ملنے والی محبت اسے گوارا نہیں تھی۔ یہ بات اس نے اللہ میاں سے بھی کہہ دی تھی۔ مگر جواب نہیں ملا تھا۔ اور ملنے کی کوئی اور صورت اسے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس محبت کو ترک کر دیتی۔

اب اسے پتا چل رہا تھا کہ محبت کتنی طاقت ور ہوتی ہے۔ وہ عبدالحق کی قربت سے بچنا چاہتی تھی۔ اب اسے عبدالحق سے پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ تھکے ہارے عبدالحق کو اس غیر ضروری زحمت

سے بچا لے۔ لیکن دل مانتا نہیں تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ اپنی محبت کی تہذیب کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ سرسری انداز میں دیکھ لینا اور بات، وہ ارادے سے کبھی اسے نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں تھی۔ محبت سے دیکھنا تو بہت دور کی بات ہے۔

اور آج اسی قربت کی وجہ سے اسے کتنا کچھ ملا تھا۔ کتنی نئی باتیں اس کی سمجھ میں آئی تھیں۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ عبدالحق غیر معمولی آدمی ہے، اس پر اللہ کی عنایت ہے۔ اس احساس نے اس کی محبت اور بڑھا دی۔

جب سے عبدالحق کے تبادلے کا امکان سامنے آیا تھا، وہ یہ سوچتی تھی کہ اس کا تبادلہ ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ یہ آزمائش اسے بہت کڑی اور بڑی لگتی تھی کہ وہ سامنے ہو اور وہ خواہش کے باوجود اسے نہ دیکھ سکے۔ نظر اٹھنے کو بے تاب ہو، اور وہ اسے روکے بیٹھی رہے۔ وہ اس کے بارے میں سوچے بھی نہیں کہ سوچے گی تو اس میں محبت ضرور شامل ہوگی۔ وہ سوچتی تھی، اس سے تو اچھا ہے کہ وہ دور چلا جائے۔ نہ وہ ہوگا، نہ وہ نظروں پر قابو رکھنے کی جدوجہد ہوگی، جو اسے اندر ہی اندر گھلاتی ہے، کمزور کرتی ہے۔ وہ سامنے نہیں ہوگا تو اس کے بارے میں سوچنا بھی آزمائش نہیں بنے گا۔ وہ اسے بھول جائے گی اور اپنی پڑھائی میں گم ہو جائے گی۔

اسے اپنی عمر کا کبھی خیال نہیں آتا تھا۔ اس محبت نے پہلے اسے بڑا بنا دیا تھا۔ رازدار اس کا کوئی تھا نہیں، جو اسے یہ احساس دلاتا کہ اتنی کم عمری میں اس پر وہ بوجھ ڈال دیا گیا ہے، جو بڑے پختہ کار اور عالی ظرف لوگوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ یقیناً خود ترسی کا شکار ہو جاتی۔ وہ تو عالم بے خبری میں یہ بوجھ اٹھائے بیٹھی تھی۔

مگر اس رات عبدالحق سے اس تبادلہ خیال نے اس کی سوچ بدل دی۔ عبدالحق کی قربت اس کے لئے اہمیت اختیار کر گئی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ قرآن کے بارے میں عبدالحق سے بات کرنا اور اس کی باتیں سننا بہت بڑی نعمت ہے۔ زندگی کا مفہوم اور مقصد سمجھ میں آنے لگا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ

کہ اس گفتگو کے دوران نگاہوں اور سوچوں پر قابو رکھنا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ پہلی بار اس کے روبہ رو اس نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔

ہاں، ایک بات وہ اسے نہیں بتا سکی تھی، بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ سورۂ نجم کی اس آیت مبارکہ...... اَمْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی...... کو اس نے اس کی محبت کے حوالے سے سمجھا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کے لئے وہ چاند ہے، جس کو دیکھا جا سکتا ہے، جس کی آرزو کی جا سکتی ہے، لیکن اس کے حصول کی دعا نہیں کی جا سکتی۔

بستر پر لیٹ کر اس نے سوچا، اب میں بالکل نہیں چاہتی کہ آغا جی کا کسی دوسرے شہر میں تبادلہ ہو۔

✿ ✿ ✿

کھانے کے بارے میں الجھن عبدالحق کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اس نے اسے غیر اہم قرار دے کر ذہن سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ مشکل یہ تھی کہ اس الجھن کے سلجھنے کی کوئی تدبیر بھی نہیں سوجھ رہی تھی۔

ناشتے سے پہلے وہ حمیدہ کے ساتھ بیٹھا تھا، اور اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ نوکروں کو وہ گھریلو معاملات میں بھی ملوث کرنے کا قائل نہیں تھا، جبکہ یہ تو ذاتی معاملہ تھا۔ وہ تو اس پر بھی خود سے شرمندہ تھا کہ نادانستگی میں اس نے یعقوب کو اس معاملے میں ملوث کر دیا ہے۔ اگرچہ اس میں نہ اس کے ارادے کا کوئی دخل تھا، نہ ہی اس کا کوئی قصور تھا۔

اس کے جی میں آئی کہ حمیدہ سے یہ بات پوچھ لے۔ لیکن یہ بھی اسے اچھا نہیں لگا۔ اصل میں تو اسے اپنا تجسس بھی برا لگ رہا تھا۔ لیکن وہ اس کے لئے بے چین کر دینے والی خلش بن گیا تھا۔

پھر اسے ایک خیال سوجھ گیا۔ اس نے حمیدہ سے کہا۔

''ارجمند کی بھی کچھ فکر کیا کرو اماں!''

حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیسی فکر پتر!''

''لڑکیوں کو بڑے ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اچانک ہی کوئی رشتہ آجائے تو پتا چلتا ہے کہ بچی تو بڑی ہوگئی۔''

''تو فکر کی کیا بات ہے؟ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے تیرے پاس۔'' حمیدہ نے کہا۔

''اب زرینہ کی بھی تو شادی کی تھی نا تو نے۔''

''میرا مطلب یہ نہیں اماں! سینا پرونا، کڑھائی، کھانا پکانا...... یہ سب اسے سکھانا ہوگا۔''

حمیدہ بری طرح بھڑکی۔

''یہ سب کچھ وہ نور بانو سے سیکھتی رہتی ہے۔ اور کھانا تو وہ ایسا پکاتی ہے کہ نور بانو بھی کیا پکائے گی۔''

عبدالحق نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے، مجھے تو پتا بھی نہیں۔''

''تجھ سے زیادہ کسے پتا ہوگا پتر! پر تو تو ہے ہی سدا کا بے خبر۔'' حمیدہ نے جل کر کہا۔

''میں سمجھا نہیں اماں!''

''ہر روز دفتر میں اس کا پکایا ہوا کھانا کھاتا ہے، اور کہتا ہے، مجھے تو پتا ہی نہیں۔''

''تو دفتر ہر روز کھانا ارجمند بھیجتی ہے؟''

''اور کون بھیجے گا؟ تیری بیوی تو پڑی سوتی رہتی ہے دوپہر تک۔ کتنی بار کہا کہ نحوست ہوتی ہے۔''

عبدالحق کو کام کی بات معلوم ہوگئی تھی۔ اس نے جلدی سے موضوع بدلا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو اماں! دیر تک سونا بہت برا ہوتا ہے۔''

''تیری یہ نوکری مجھے بہت بری لگتی ہے۔ پر اس کا ایک فائدہ تو ہوا۔ تو پہلے کی طرح سویرے اٹھنے لگا۔ ورنہ تو تو خود دوپہر تک سوتا رہتا تھا۔''

عبدالحق شرمندگی کے احساس سے شل ہوگیا۔ اس سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔

اس کی شرمندگی محسوس کر کے حمیدہ نے اس اس کی دل جوئی کی۔

"جو ہوا سو ہوا پتر! اب تو تو پہلے جیسا ہوگیا ہے۔"

پہلے جیسا کہاں ہوا ہوں اماں! عبدالحق نے دل میں کہا۔ پھر حمیدہ سے بولا۔

"تم نور بانو کو سمجھاتی رہا کرو اماں!"

"سمجھاتی ہوں، سر پھوڑتی ہوں اپنا۔ وہ کہاں مانتی ہے؟"

اتنی دیر میں ارجمند ناشتہ لے آئی۔ حمیدہ خاموش ہوگئی۔ وہ ناشتہ کرنے لگے۔

الجھن سلجھ گئی تھی۔ عبدالحق ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو کی آنکھ کھلی تو گھڑی دیکھ کر وہ دہل گئی۔ اس نے ارادہ کیا تھا کہ جلدی اٹھے گی اور کھانا پکا کر عبدالحق کو بھجوائے گی۔ لیکن لگتا تھا کہ بری عادتیں آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

وہ اس قدر جھنجلائی ہوئی تھی کہ اس سے ناشتہ بھی نہیں کیا گیا۔ صرف چائے پی کر اٹھ گئی۔ اسے یاد تھا کہ اسے یعقوب سے بہت ضروری پوچھ گچھ کرنی ہے۔

وہ انتظار کرتی رہی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ یعقوب واپس آچکا ہوگا تو وہ باہر آئی اور اس کے کوارٹر کی طرف چل دی۔ وہ یعقوب سے علیحدگی میں گفتگو کرنا چاہتی تھی۔

پورچ میں کھڑی گاڑی گواہی دے رہی تھی کہ یعقوب واپس آچکا ہے۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔

یعقوب نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر دہل گیا۔

"میم صاحب آپ؟ کیا حکم ہے میم صاحب؟"

"تم ڈر کیوں گئے مجھے دیکھ کر؟" نور بانو نے بگڑ کر کہا۔

"نہیں...... ڈرا نہیں میم صاحب! آپ آتی نہیں ہیں نا ایسے، کہیں جانا ہے؟"

"نہیں! کچھ پوچھنا ہے تم سے۔"

"حکم میم صاحب!"

"کل صبح دفتر جاتے ہوئے صاحب نے تم سے کچھ کہا تھا؟"

یعقوب اتنی دیر میں خود کو سنبھال چکا تھا۔ اسے صاحب کی صبح کی بات بھی یاد تھی اور دوپہر کی بھی۔ اسے صاحب کا آرڈر بھی یاد تھا، اور آرڈر کے خلاف وہ کبھی کچھ نہیں کرتا تھا۔ یہ تو انگریزوں نے اسے سکھایا تھا۔

"صاحب اب دفتر میرے ساتھ تو نہیں جاتے ہیں۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ وہ حتی الامکان جھوٹ بولنے سے بچتا تھا۔ یہ بھی اسے انگریزوں نے ہی سکھایا تھا۔

"وہ مجھے بھی معلوم ہے۔" نور بانو نے بھنا کر کہا۔

"میں پوچھ رہی ہوں، صبح دفتر جاتے ہوئے صاحب نے تم سے کچھ کہا تھا؟"

"وہ ملے ہی نہیں تو کہتے کیا؟"

"جتنا پوچھوں، اتنا جواب دو۔"

یعقوب کو اتنی سخت تفتیش کی امید نہیں تھی۔ اس نے تو یقین سے کہا تھا کہ کوئی کچھ پوچھے گا ہی نہیں۔ وہ اور محتاط ہوگیا۔ صاحب نے سختی سے کہا تھا...... کوئی پوچھے تو بھی نہیں بتانا۔ اٹس این آرڈر!...... نو میم صاحب! صاحب نو سے......" اس نے انگریزی جھاڑی۔

نور بانو اس کی انگریزی سے بہت چڑتی تھی۔ لیکن اس وقت بات اتنی اہم تھی کہ اس طرف دھیان ہی نہیں دے سکی۔

"اچھا! جب تم کھانا لے کر گئے تو صاحب نے کچھ پوچھا تم سے؟"

"نو میم صاحب!"

''کسی فائل کے بارے میں کچھ نہیں کہا تم سے؟''

''نو میم صاحب!''

''تم نے صاحب کو کبھی بتایا کہ کھانا تمہیں کون دیتا ہے دفتر لے جانے کے لئے؟''

''ایک بار بتایا تھا میم صاحب!'' یعقوب نے بے ضرر سچ بولا۔

''کب......؟''

''جب پہلی بار کھانا لے کر گیا تھا۔''

لیکن نور بانو کی تسلی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''بعد میں کبھی نہیں بتایا...... کل بھی نہیں بتایا؟''

''نو میم صاحب......!''

''کیوں نہیں بتایا؟''

عجیب مصیبت ہے، یعقوب نے سوچا، لگتا ہے، پولیس نے پکڑ لیا ہے مجھے۔

''نو کوئچسن نو آنسر میم صاحب!''

اس بار نور بانو کو جلال آ گیا۔

''ہزار بار کہا، یہ انگریزی میں گٹ پٹ نہ کیا کر مجھ سے۔''

''میرا مطلب ہے میم صاحب کہ جب کوئی پوچھے گا ہی نہیں تو میں بتاؤں گا کیوں؟''

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! اب کسی کو یہ نہیں بتانا کہ میں نے یہ سب پوچھا تھا تم سے۔''

''نو کوئیس...... میرا مطلب ہے میم صاحب! کوئی پوچھے گا ہی نہیں تو......''

'''کوئی پوچھے تو بھی نہیں بتانا۔'' نور بانو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ پھر مٹھی میں دبا دس کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ رکھ لو۔''

یعقوب نے سوچا، یہی بات صاحب نے بھی کہی تھی۔

''تھینکس یو میم صاحب!''

''پھر وہی انگریزی؟''

''سوری میم مس!'' یعقوب نے جلدی سے اپنے منہ کو دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا۔

نور بانو اب پوری طرح مطمئن ہوگئی تھی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق پہلے تو بظاہر ہلکا ہوا۔ مگر پھر اسے احساس ہوا کہ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ بوجھل ہوگیا ہے۔ جاننے کے مقابلے میں بے خبری کتنی بہتر ہوتی ہے، یہ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

جو صورتِ حال سامنے تھی، اس میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ نور بانو اور ارجمند کے درمیان موازنہ نہ کرتا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ دونوں ایک دوسرے کے برعکس روپ میں سامنے آئی تھیں۔

جو کچھ اس نے سمجھا تھا، اس میں ایک زاویے سے اس کے لئے تاسف تھا اور دوسرے زاویے سے خوشی۔ لیکن افسوس بہت زیادہ بھاری تھا، کیونکہ وہ نور بانو کی وجہ سے تھا، جو اس کی شریک حیات تھی، اس کی اپنی متاع تھی۔ جبکہ خوشی ارجمند سے ملی تھی، جو کسی اور کی متاع ہوگی۔ اسے یاد آیا، اماں ہمیشہ کہتی تھیں، نکی جس گھر میں جائے گی، اسے روشن کر دے گی۔ وہ خوش نصیب ہوگا، جس سے نکی کی شادی ہوگی۔

ایک اور بات تھی۔ نور بانو ایک عورت تھی، اور بیوی بھی۔ اسے ذمہ دار ہونا چاہئے تھا۔ جبکہ ارجمند ابھی بچی ہی تھی۔ ابھی تو اس کے کھیل کود کے، پڑھنے لکھنے کے دن تھے۔ لیکن وہ ذمہ دار ثابت ہوئی تھی۔ بلکہ وہ کہہ سکتا تھا کہ اس میں ایک بڑا پن ہے۔ اور نور بانو کے رویے سے لگتا تھا کہ اس میں بچپنا ہے، بلکہ چھوٹا پن ہے۔

وہ جانتا تھا کہ ان دونوں میں باہم بڑی محبت ہے، اگرچہ شخصیت اور

اپنے روّیوں کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ارجمند کو تو لگتا تھا کہ اللہ نے محبت کی مٹی سے بنایا ہے۔ وہ تو سبھی سے محبت کرتی تھی۔ لیکن نور بانو کا کسی سے یوں محبت کرنا غیر معمولی بات تھی۔

عبدالحق کی نور بانو سے محبت غیر اختیاری تھی۔ وہ تو بغیر دیکھے ہی اس کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ اور محبت اس کے لئے بہت بڑی چیز تھی، اس لئے اس نے آنکھیں بند کر کے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ اس نے بارہا اس پر شک کیا تھا، لیکن ہر بار اس پر یہی ثابت ہوا تھا کہ وہ محبت سچی ہے اور اللہ کی دی ہوئی ہے۔ اور اس نے کبھی خود کو نور بانو کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے مقابلے میں احساسِ کم تری میں مبتلا رہا۔ شاید اس بنیاد پر کہ وہ ایمان والوں میں پیدا ہوئی تھی، اور وہ مشرکوں میں، قرآن سے تو وہ واقف ہی اس کے ذریعے ہوا تھا۔ بلکہ وہ تو ایمان تک بھی اسی سیڑھی کے ذریعے پہنچا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اس کے لئے بہت محترم تھی۔

عبدالحق محبت کی عظمت کا قائل تھا، اس لئے وہ اندھی محبت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خامیاں اور کمزوریاں ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ اس نے نور بانو کی کمزوریوں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی، اور شعوری طور پر اس نے اسے اس کی کمزوریوں سمیت قبول کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ حاسد ہے، تنگ دل اور تنگ نظر ہے۔ محبت کے معاملے میں بہت شکی بھی ہے۔ قابضانہ فطرت کی مالک بھی ہے۔ یہ سب کچھ شادی سے پہلے حمیدہ نے اسے بتایا اور سمجھایا بھی تھا۔ لیکن وہ پوری سچائی کے ساتھ سمجھتا تھا کہ وہ نور بانو کی تمام خامیوں سے صرفِ نظر کر سکتا ہے۔ اس کی محبت بہت گہری ہے۔

لیکن پھر اس نے نور بانو کی خوبیوں کو ختم ہوتے دیکھا اور وہ بھی وہ خوبیاں جو اسے بہت عزیز تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نہایت خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ علم دین حاصل کرتی رہی ہے۔ مگر شادی کے ساتھ ہی سب کچھ بدل گیا۔ قرآن پڑھنا موقوف ہوا۔ صبح سویرے اٹھنا بھی موقوف ہوا۔ بلکہ وہ اپنے ساتھ اسے بھی لے بیٹھی۔ اماں نے آج سچ ہی تو کہا

تھا۔ ملازمت نہ ہوتی تو وہ بھی نور بانو کے ساتھ دوپہر تک سویا کرتا۔

عبدالحق کے مزاج میں عاجزی اور انکسار تھا۔ اس نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ نور بانو کو اس کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے۔ لیکن اپنے اندر گہرائی میں وہ جانتا تھا کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ اس نے تو شادی کی رات بھی نور بانو سے سورۂ ملک کی فرمائش کی تھی۔ لیکن نور بانو نے ٹال دیا تھا۔ وہ تو شادی کی رات شکر کے دو نفل پڑھنا چاہتا تھا۔ مگر نور بانو کی وجہ سے وہ نوافل تو کیا صبح کی فرض نماز سے بھی محروم ہو گیا تھا۔

اپنی خرابی دوسرے پر کیوں رکھتے ہو۔ اس نے خود کو ٹوکا۔ یہی اس مزاج تھا۔ وہ دل میں توبہ کرنے لگا۔

لیکن یہ سچ تھا کہ نور بانو نے ازدواجی زندگی کا عنوان جسمانی تعلق رکھا تھا، اور وہ اس طوفان میں بہہ گیا تھا۔ اب سمجھ میں آتا تھا کہ اس نے کتنا کچھ کھو دیا، وہ کتنا پیچھے چلا گیا۔ شاید اس پر اس نے کبھی سوچنا ہی نہیں چاہا۔ وہ خود سے نظریں چراتا رہا۔ صرف اس لئے کہ وہ نور بانو کو الزام سے بچانا چاہتا تھا۔ اللہ نے اسے وہ محبت دی تھی، جو اسے اس کے دین کی طرف لے آئی تھی۔ وہ اس محبت میں ذرا سی بھی کمی نہیں چاہتا تھا۔

مگر اب وہ نور بانو اور ارجمند کا موازنہ کرنے پر مجبور تھا...... ایک عورت اور ایک کم عمر بچی کا موازنہ۔

اسے سب سے زیادہ دکھ اس بات پر ہوا تھا کہ نور بانو جھوٹی ہے۔ جب پہلی بار دفتر کھانا آیا تو اس رات اس نے نور بانو کی تعریف کی۔ اس کا شکریہ ادا کیا، اور نور بانو نے اسے قبول کر لیا۔ وہ محض ایک جھوٹ تھا، نہ ہی اتفاقی جھوٹ۔ رات کو اس نے اس جھوٹ کو نبھانے کے لئے کتنے جھوٹ بولے۔ کس شان سے کہا کہ کبھی کبھی ارجمند دوپہر کا کھانا پکاتی ہے۔ جبکہ یعقوب نے بتایا تھا کہ وہ تو اس وقت سو رہی ہوتی ہے۔ اور اماں نے بھی تائید کی کہ اس نے کبھی کھانا نہیں پکایا۔ وہ تو دوپہر تک سوتی ہے۔ رات نور بانو کو جھوٹ بولتے ہوئے یہ ڈر بھی نہیں لگا کہ اس کا جھوٹ کھل بھی سکتا ہے۔ اتنا نڈر تو عادی جھوٹا ہی ہو سکتا

ہے۔

اور عبدالحق کو جھوٹ بہت ناپسند تھا۔

اسے یاد تھا کہ کھانے کے سلسلے میں اس کی تفتیش پر ارجمند نے کتنے محتاط جواب دیئے تھے۔ کئی سوالوں کے جواب میں اس نے بڑی مشکل سے اعتراف کیا تھا کہ وہ کبھی کبھی کھانا پکاتی ہے۔ پھر اس نے جھوٹ کے گناہِ کبیرہ ہونے کے بارے میں بات چھیڑی اور اس کے بعد اپنا سوال دہرایا تو اس نے کھلا جھوٹ بولنے کے بجائے موضوع بدل دیا۔ اور جھوٹ کے بارے میں اس نے غیر نصابی، لیکن کتنی بڑی بات کہی کہ جھوٹ دل کو سیاہ کرتا ہے اور آدمی کے اللہ سے تعلق کو کمزور کرتا ہے۔ یہ اس کے اندر کی بات تھی، اسی لئے تو وہ جھوٹ بولنے سے بچنے کی کوشش کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اسے موضوع ہی بدلنا پڑا۔

لیکن جھوٹ تو اس نے بہرحال بولا۔ عبدالحق کے اندر اعتراض ابھرا۔ سچ تو یہ ہوتا کہ وہ کہتی، ہاں، دوپہر کو روز کھانا میں ہی پکاتی ہوں۔

ایسا ایک جھوٹ عبدالحق نے بولا تھا۔ نوربانو کو بڑے دکھ سے بچانے کے لئے، یہ کہ اس کے چچا کو وہ تلاش نہیں کر سکا اور اسے اس جھوٹ پر شرمندگی بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے نزدیک مجبوری تھی، وہ سچ سے بہتر تھا۔ یہ بات اس نے اماں سے بھی کہی تھی۔

اسے ارجمند پر پیار آ گیا۔ اس کا جھوٹ اور خوب صورت، اور ضروری تھا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ اس نے بھی نوربانو کی خاطر جھوٹ بولا تھا۔ کسی دکھ سے بچانے کے لئے نہیں، بہت بڑی شرمندگی سے بچانے کے لئے، اسے اس کی نظروں میں جھوٹا ثابت ہونے سے بچانے کے لئے، اس کی نظروں میں گرنے سے بچانے کے لئے.....

تو کیا ایسا ہے کہ نوربانو سے جو بھی محبت کرے گا، اسے نہ چاہتے ہوئے بھی جھوٹ بولنا پڑے گا؟

دوسرا موازنہ محبت کا تھا۔ جب اس نے پہلی بار کھانا بھیجنے پر نوربانو کا شکریہ ادا کیا، یہ بتایا کہ اس سے اسے بہت خوشی ملی تو نوربانو کو یہ خیال نہیں آیا

کہ یہ خوشی تو وہ اسے ہر روز دے سکتی ہے۔ کیا وہ اس کی محبت کی خاطر یہ ایثار نہیں کر سکتی تھی کہ اپنی نیند قربان کر کے اس کے لئے وہ زحمت کرتی۔ جبکہ یہ تو اس کی ذمہ داری تھی، اس کا فرض تھا۔ مسعود صاحب نے یہی بات تو کہی تھی۔ بلکہ ارجمند کے ایثار نے بھی اسے نہیں جھنجوڑا۔ ارجمند کی تو کوئی ذمہ داری نہیں تھی اس سلسلے میں۔ مگر نوربانو اسے استعمال کرتی رہی۔ اس کی کارکردگی پر بے حسی سے داد سمیٹتی رہی۔ وہ کبھی اسے ناشتہ دینے کے لئے بھی نہیں اٹھی۔

اسے یاد تھا، مسعود صاحب نے کہا تھا کہ انہیں ملال ہوتا تھا کہ نوربانو نے اس کے نئے معمولات کے ساتھ مطابقت نہیں پیدا کی۔ وہ اپنے ہی معمولات میں گم ہے۔ جبکہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ انہیں خود کو ایک دوسرے کے معمولات اور ضرورتوں کے مطابق ڈھالنا ہوتا ہے۔

یہ گویا اچھی بیوی اور اچھے شوہر کی تعریف تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ نوربانو کبھی اس تعریف پر پوری نہیں اتری۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس کی بیوی کبھی نہیں بنی، ہمیشہ محبوبہ ہی رہی۔ اب وہ پلٹ کر گزری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتا تھا تو سمجھ میں آتا تھا کہ نوربانو نے جسمانی آسائش کے سوا اسے کبھی کچھ نہیں دیا، اور وہ بھی ایسے، جیسے پنجرے میں بند پرندے کو قید میں خوش رہنے کا عادی بنانے کے لئے اس کے دال پانی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کی روحانی ضرورتوں کا اس نے کبھی خیال نہیں رکھا۔ اس کے نتیجے میں وہ خود بھی خسارے سے دوچار ہوئی، اور اسے بھی دوچار کیا۔ اب وہ نقصان اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ نوربانو نے خود کو بہت ..... بہت چھوٹا کر لیا تھا۔ وہ اللہ کے دیئے ہوئے مقام سے بہت نیچے آ گئی تھی، بلکہ اسے بھی نیچے لے آئی تھی۔

یہاں موازنے کی ایک اور شاخ نکل آئی۔ ایک نوربانو تھی، جسے گھر پر باقاعدہ دینی تعلیم دلائی گئی تھی۔ جو قرآن پڑھنے کی عادی تھی، پنج وقتہ نمازی تھی۔ دین کا مطالعہ کرتی تھی۔ یہ سب کچھ شادی سے پہلے اس نے خود دیکھا تھا، ورنہ اب اسے وہ افسانہ ہی لگتا۔ مگر شادی کے بعد، سکون، تحفظ اور آسودگی ملتے ہی وہ سب کچھ بھول بیٹھی۔ مدت ہوئی کہ اس نے کبھی اسے نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔

دوسری طرف کم عمر ارجمند تھی، جس نے کوٹھے کے ماحول میں ہوش سنبھالا۔ وہیں اس کی پھپھو نے اسے قرآن پڑھایا، نماز سکھائی، اللہ نے اسے گھر کا تحفظ عطا فرمایا تو وہ اس راہ پر آگے بڑھی۔ اس نے عربی پڑھنے کو اوّلیت دی، صرف اس لئے کہ وہ قرآن کو سمجھ بھی سکے۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتی۔ شکر گزاری اور احسان مندی کا یہ عالم ہے کہ نور بانو کی عزت اور خوشی کے لئے ہر روز اسے کھانا بھیجتی ہے، اور نام نور بانو کا کرتی ہے۔ اسے اللہ نے کیسی بڑائی دی کہ قرآن کے حوالے سے اس کی گفتگو سن کر وہ خود اس کے سامنے چھوٹا ہو گیا تھا۔

وہ پھر محبت پر پہنچ گیا۔ اسے یاد تھا کہ ارجمند کو گھر لاتے ہوئے وہ کتنا خوفزدہ تھا۔ نادرہ نے اسے بتایا تھا کہ ارجمند بہت چھوٹی تھی، جب اس نے اسے دیکھا تھا اور اس کی تصویر بنائی تھی۔ وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ وہ اس کا شہزادہ ہے، اور وہ اسی سے شادی کرے گی۔ لیکن نادرہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ ارجمند کو بہت اچھی طرح سمجھا چکی ہے۔ اور وہ اس کے لئے مسئلہ نہیں بنے گی۔ پھر اسے یاد تھا، جب ارجمند پہلی بار روئی تھی تو اس نے اس سے کہا تھا کہ اس کے آنسو روکنے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے تو ارجمند نے بچوں کی طرح اس سے کہا تھا...... مجھ سے شادی کریں گے...... اور وہ ہنس دیا تھا۔ اس نے کہا تھا، ابھی تو تم بہت چھوٹی ہو۔ اور وہ سر جھکا کر بولی تھی...... جی ٹھیک ہے...... جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ اپنے بڑے ہونے کا انتظار کرے گی۔ پھر عارف صاحب نے بھی اسے اس حوالے سے ڈرایا تھا۔ لیکن بعد میں سب بے بنیاد ثابت ہوا تھا۔ ارجمند نے کبھی اسے شرمندہ نہیں کروایا تھا۔ شاید وہ اس کا بچپنا تھا، جسے وہ بھول گئی تھی۔

اسے یاد تھا، شادی سے پہلے اماں نے اسے سمجھایا تھا۔ انہوں نے محبت کے بارے میں کہا تھا کہ محبت میں آدمی کا دل تنگ نہیں ہوتا، بلکہ بڑا ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا...... محبت کا مطلب کسی پر قبضہ کرنا تھوڑا ہی ہے۔

اس حوالے سے ثابت ہوتا تھا کہ ارجمند کو محبت کرنا آتا ہے۔ وہ صرف دینا جانتی تھی، لینا نہیں۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ اسے ایثار کرنا آتا ہے۔ اور کسی پر قابض ہونا کجا، وہ تو اپنے وجود کا ایک ایک حصہ سب کو سونپ دیتی تھی۔

اس کا تو شاید خمیر ہی محبت کی مٹی سے اٹھا تھا۔

کیا وہ اب بھی مجھ سے اسی طرح محبت کرتی ہے؟ یہ خیال عبدالحق کے دل میں خود بخود ابھرا۔

وہ اس خیال کو جھٹک بھی سکتا تھا، اس سے نظریں بھی چرا سکتا تھا، اور یہ سوچ کر ٹال بھی سکتا تھا کہ وہ ارجمند کا بچپنا تھا، جبکہ اب وہ بڑی ہو چکی ہے لیکن اس وقت وہ پرانا والا عبدالحق تھا، جو کبھی کسی سوال سے نظریں نہیں چراتا تھا، بلکہ تجزیے کے ذریعے اس کا جواب کھوجتا تھا۔

اس نے ارجمند کے اپنے ساتھ رویے کو ذہن میں تازہ کیا۔ اسے کوئی ایسی بات یاد نہیں آئی، جس سے اس خیال کی تائید ہوتی۔ ارجمند صرف پڑھائی کے وقت اس کے قریب ہوتی تھی، پڑھائی کے دوران بلا ضرورت وہ کبھی نہیں بولتی تھی۔ اور وہ کبھی اسے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ بلکہ ایک بار تو وہ جھنجلایا بھی تھا۔ اس کے اصرار پر بھی ارجمند نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔

اور پڑھائی کے وقت کے علاوہ تو ان کا سامنا بھی کم ہی ہوتا تھا۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ ارجمند بلاضرورت اس کے سامنے نہیں آتی تھی۔ یعنی وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ اسے بلاوجہ ارجمند سے ڈرایا گیا تھا۔

اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ بچے تو محبت سے بھرے ہوتے ہیں۔ انہیں کسی سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ اور محبت کی مختلف قسموں اور درجوں سے وہ واقف نہیں ہوتے۔ بڑے ہوتے ہیں تو انہیں اپنی ہر محبت کو الگ الگ خانے میں رکھنا آ جاتا ہے۔ اور پھر ایسے بچے، جو عدم تحفظ کے شدید احساس کا شکار ہوں، وہ تو امید کی بنیاد پر بھی محبت کرتے ہوں گے۔ شاید ارجمند کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اور جب عدم تحفظ سے چھٹکارا ملا تو محبت ختم ہو گئی۔

یہ بات اس کے لئے باعث طمانیت تھی کہ ارجمند اب اس سے محبت نہیں کرتی۔ ہاں، وہ نور بانو سے بہت محبت کرتی ہے۔ یہ پورا معاملہ اس محبت کا ثبوت ہے۔ نور بانو کی خاطر اس نے جھوٹ تک تو بول لیا۔

اطمینان اپنی جگہ، لیکن عبدالحق کو ایک لمحے کے لئے افسوس ہوا کہ وہ

اس محبت سے محروم ہوگیا۔ وہ محبت سے خائف نہیں تھا، کبھی ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے نزدیک محبت اللہ کی بہت بڑی نعمتوں میں سے تھی۔ ہاں وہ محبت کے اس روپ سے خائف تھا، جو ایک بچی سے کسی بڑی عمر کے مرد کے لئے یہ کہلوا دے کہ میں تو انہی سے شادی کروں گی۔

مگر وہ افسوس بس ایک لمحے کا تھا۔ اگلے ہی لمحے عبدالحق نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ تو ایک بڑی پیچیدگی تھی جو اللہ نے اپنی رحمت سے دور کر دی۔

گزشتہ رات ارجمند سے ہونے والے تبادلہ خیال نے جہاں اسے فائدہ پہنچایا تھا، اور خوشی دی تھی، وہیں ایک بہت بڑی محرومی کے احساس کو اجاگر کر دیا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ محرومی برسوں سے اس کے اندر موجود تھی، لیکن شعور کی سطح پر نہیں آسکی تھی۔

دراصل وہ اس کا خواب تھا، اور اس نے نور بانو کو اس کی تعبیر سمجھا تھا۔ لیکن وہ تعبیر ثابت نہیں ہوئی۔ یہ اس کا خواب تھا کہ وہ تنہائی میں نور بانو کی قرأت سنے گا، وہ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر قرآن کی آیات کو سمجھنے کے لئے باتیں کریں گے۔ وہ باہم اپنی زندگی کے لئے راہِ عمل کے ہر ہر قدم کا تعین کریں گے کہ ہر بڑھتا ہوا قدم انہیں اللہ سے قریب تر کر دے گا۔

لیکن تعبیر تو کجا، نور بانو نے تو اسے خواب سے ہی محروم کر دیا۔ اس کے تو اپنے معمولات، اپنے روز و شب ہی بگڑ گئے۔ آگے بڑھنا تو دور کی بات، وہ جو تھا، وہی نہیں رہا۔ وہ اس پر سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن سوچیں تو خودبخود ابھرتی ہیں۔ ایسا کوئی خیال دل میں آتا تو وہ اس سے فرار اختیار کرتا۔ سوچتا تو نور بانو سے شکایت دل میں پیدا ہوتی، اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس محبت کی ناقدری کیسے کرتا، جس نے اس کی راہنمائی کی تھی، جو اسے دین اسلام کی چوکھٹ تک لانے کا سبب بنی تھی۔

مگر گزشتہ رات ارجمند سے بات کر کے جہاں محرومی کا ادراک پوری طرح شعوری سطح تک آیا تھا، وہاں اس محرومی سے نجات کا راستہ بھی اسے مل گیا

تھا۔ ارجمند بچی ضرور تھی لیکن اس پر اللہ کی خاص عنایت تھی۔ شاید ویسی ہی، جیسی خود اس پر تھی۔ اللہ ارجمند کی بھی راہنمائی کرتا تھا۔ اس راہنمائی کے بغیر کوئی اللہ کی کسی آیت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ بہرحال بات یہ تھی کہ وہ قرآن پڑھ کر ارجمند سے تبادلہ خیال کر سکتا تھا، اور اس میں دونوں کا ہی فائدہ تھا۔

اس خیال پر وہ ٹھٹکا۔ ارجمند سے وہ ڈرتا بھی تو تھا۔ لیکن نہیں، یہ اس کی زیادتی ہے۔ ارجمند نے پہلی ملاقات کے بعد اس سے کبھی ویسی کوئی بات نہیں کی۔ بلکہ اس نے تو کبھی نظر بھی نہیں اٹھائی۔ نہیں، وہ بے فکری سے اس کے ساتھ بیٹھ کر بات کر سکتا تھا۔ یہ اس کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ اس نے سوچا، وہ ارجمند کے ساتھ ہر روز ایسا ہی وقت گزارے گا۔

لیکن اس کے اس دکھ کا کوئی ازالہ نہیں تھا کہ نور بانو جھوٹ بولتی ہے، اور دھڑلے سے جھوٹ بولتی ہے۔

❁ ❁ ❁

ارجمند ٹیسٹ میں کامیاب ہوگئی تھی اور اسکول میں اس کا داخلہ بھی ہوگیا تھا۔ نور بانو اسے ساتھ لے کر گئی اور اسے کورس کی کتابیں، کاپیاں، یونیفارم اور دوسری چیزیں دلا کر لائی۔ ارجمند بہت خوش تھی۔ اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو رہا تھا۔

اسکول شروع ہونے سے ایک دن پہلے ناشتے کے دوران حمیدہ نے فکرمندی سے کہا۔

”بچی کا اسکول گھر سے کتنی دور ہے؟“

”زیادہ دور نہیں ہے اماں! پانچ منٹ کا راستہ ہے۔“

”پیدل کا......؟“

”نہیں اماں! یہ تو گاڑی میں جائے گی۔“

”کون لے کر جائے گا......؟“

”میں چھوڑ آؤں گا اماں!“

حمیدہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

’’نا پتر! بڑی باتوں میں بہت سوچنا سمجھنا چاہئے بندے کو۔ کام وہ شروع کرے کہ آگ تک دشواری نہ ہو۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں اماں!‘‘

’’کسی دن تو نہیں جا سکا تو کیا ہوگا؟‘‘

’’عبدالحق ہنس دیا۔

’’تو اماں! گاڑیاں تو دو ہیں ہمارے پاس۔ ایک تو ہر وقت گھر پر ہی رہتی ہے آپ لوگوں کے لئے۔‘‘

حمیدہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

’’اور تو لے بھی جائے تو اسکول سے واپس کون لائے گا؟‘‘

’’میں نے کہا نا اماں! ایک گاڑی تو گھر پر ہی رہتی ہے۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے پتر! پر یہ جائے آئے گی کس کے ساتھ؟‘‘

’’خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو اماں! یعقوب ہے نا! آپ کبھی مزاروں پر جاتی تھیں تو میرے ساتھ تو نہیں جاتی تھیں۔ یعقوب ہی لے کر جاتا تھا آپ کو۔‘‘ کہتے کہتے عبدالحق کو احساس ہوگیا کہ وہ مزاروں کا حوالہ غلط دے گیا ہے۔

لیکن حمیدہ نے جیسے اس کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

’’وہ اور بات تھی پتر! نکی کی بات اور ہے۔ دیکھو نا! اب یہ بڑی ہو رہی ہے۔ اکیلے ڈرائیور کے ساتھ تو میں نہیں بھیج سکتی اسے۔‘‘

اپنے بڑے ہونے کی بات پر ارجمند کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ کیا واقعی وہ بڑی ہوگئی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو جائے، اور خود کو دیکھے۔

’’تو بھی کیا مسئلہ ہے اماں!‘‘ عبدالحق نے بے پروائی سے کہا۔

’’گاڑی تو ہے، آپ ہی اسے چھوڑ بھی آیئے گا اور اسکول سے واپس بھی لے آیئے گا۔‘‘

’’ہاں! یہ ٹھیک ہے۔‘‘ حمیدہ نے سکون کی سانس لی۔ پھر بولی۔

’’بڑی ہوتی ہوئی بچیوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے پتر!‘‘

عبدالحق کے خیال میں ارجمند محض بچی تھی، بڑے ہونے کے مرحلے سے بہت دور۔ تاہم اس نے حمیدہ کا دل رکھنے کے لئے کہا۔

’’میں سمجھ گیا اماں!‘‘

عبدالحق کے جانے کے بعد ارجمند سے رہا نہیں گیا۔ حمیدہ کے سامنے تو اسے شرم آ رہی تھی۔ اسے عبدالحق کے کمرے کا خیال آ گیا۔ لیکن پھر اس نے سوچا، بری بات ہے۔ آپی سو رہی ہوں گی وہاں۔

تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اکیلی ہی تو ہوں گی۔ دل نے کہا۔

لیکن کسی کے کمرے میں یوں بغیر اجازت داخل ہونا کوئی اچھی بات نہیں۔ اس نے دل کو سمجھایا۔

مگر وہ زیادہ دیر خود کو روک نہیں سکی۔ اشتیاق اتنا زیادہ تھا کہ اس نے اخلاقیات کی مضبوط دیوار میں درز بنا دی۔

وہ عبدالحق کے کمرے کی طرف چل دی۔

اس نے دروازے کو بڑی آہستگی سے دھکیلا کہ کہیں نوربانو کی آنکھ نہ کھل جائے۔ دروازہ بے آواز کھلا۔ اندر نوربانو بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے دروازے کو بڑی احتیاط سے بند کر دیا۔

اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا، جیسے وہ کچھ چرانے آئی ہو۔ وہ بار بار نوربانو کو دیکھتی۔ اسے ڈر تھا کہ کسی بھی لمحے وہ جاگ جائے گی، اور پھر اس کی چوری پکڑی جائے گی۔

کچھ دیر وہ سانس روکے، دروازے پر کھڑی نوربانو کو دیکھتی رہی۔ آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن اتنی دیر میں نوربانو کسمسائی تک نہیں تھی۔

بالآخر اسے اطمینان ہوگیا۔ پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کے جسم میں لرزش تھی۔

اس نے ایک بار پھر سوتی ہوئی نوربانو کو دیکھا اور پھر آئینے میں اپنے

عکس پر بھرپور نگاہ ڈالی۔

اس کی مایوسی کی کوئی حد نہیں رہی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو ویسی ہی تھی...... بالکل ویسی...... وہی پرانی والی ارجمند۔ وہی ہونٹ، وہی ناک، وہی آنکھیں اور وہی بھویں۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔

پھر بھی وہ دیکھتی رہی۔ اپنے چہرے کو، چہرے کے نقوش کو متجسس نگاہوں سے ٹٹولتی رہی۔ لیکن اسے کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ وہ تو بالکل پہلے ہی جیسی تھی۔

اس کی مایوسی جھنجلاہٹ میں تبدیل ہوگئی۔ دادی اماں نے اسے بڑی ہوتی ہوئی بچی کیوں کہا تھا؟ غلط تو نہیں کہا ہوگا۔ تو پھر وہ بڑا پن اسے نظر کیوں نہیں آ رہا ہے؟

اچانک اسے خیال آیا کہ شاید اس کا قد بڑھا ہوگا۔ ضرور یہی بات ہے۔ دل نے اس کی تائید کی۔

اس بار اس نے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ ایک لمحے کو اسے ایسا لگا کہ اس کا قد بڑھا ہے۔ مگر فوراً ہی اس نے سمجھ لیا کہ دراصل یہ اس کی خواہش ہے۔ وہ خود کو جانبداری سے نہیں دیکھ رہی ہے۔ وہ یہ تسلیم کرنا چاہتی ہے کہ وہ بڑی ہو رہی ہے۔ اس لئے اسے اپنا قد بڑھا ہوا لگا ہے۔ ورنہ درحقیقت وہ ویسی ہی ہے، جیسی کل تھی، جیسی پرسوں تھی۔

جھنجلاہٹ اور مایوسی ایسی تھی کہ وہ دبے پاؤں چلنا بھی بھول گئی۔ بے احتیاطی سے دھڑ دھڑ چلتی وہ دروازے تک پہنچی۔ مگر وہاں پہنچ کر اسے یاد آ گیا کہ وہ اس کمرے میں ہے، جہاں اس وقت موجود ہونے کا اسے کوئی حق نہیں، اور وہ یہاں چوری چھپے آئی ہے۔ اس نے پلٹ کر نور بانو کو دیکھا جو اب بھی بے خبر سو رہی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکلنے کے بعد بڑی احتیاط سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ اسٹڈی کی طرف چلی گئی۔

وہاں بیٹھ کر وہ یہی سوچتی رہی کہ حمیدہ نے یہ بات کیوں کی تھی؟ اس پر وہ کتنا سوچتی، اس کی مایوسی اور جھنجلاہٹ بڑھ جاتی۔ اب وہ یوں ہی بیٹھی

رہتی۔ لیکن اچانک ہی ایک اور پریشان کن خیال نے اس کے ذہن میں سر اٹھایا۔ وہ بری طرح چونکی...... ارے...... کل..... تو مجھے اسکول جانا ہے۔ اس نے سوچا۔

حالانکہ وہ اس کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ لیکن ایک پریشانی کا پہلو تو اس میں بھی تھا۔ میں اسکول چلی جاؤں گی تو آغا جی کے دوپہر کے کھانے کا کیا ہوگا؟ اس نے سوچا۔ کھانا نہیں جائے گا تو پول کھل جائے گی۔ اور آغا جی کتنے ناراض ہوں گے اور آپی کے لئے تو یہ بہت ہی بری بات ہوگی۔

وہ سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ اس مسئلے کو حل کرنا بہت ضروری تھا۔ اور ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو ہوتا ہے۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق اس روز بہت خوش تھا۔ وہ ارجمند کے اسکول جانے کا پہلا دن تھا۔ وہ خود ہی اسے اور حمیدہ کو لے جانے کے لئے تیار تھا۔ لیکن حمیدہ نے منع کر دیا۔

''میں نے کہا نا پتر! وہ کام نہیں شروع کرنا چاہئے جو آدمی نبھا نہیں سکے۔ ہمیں یعقوب ہی چھوڑ کر آئے گا۔''

''لیکن اماں! آج پہلا دن ہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔

''آج تو مجھے ہی لے چلئے۔''

حمیدہ کو اس پر پیار آ گیا۔ جانتی تھی کہ وہ کتنا ذمہ دار ہے۔ اسی لئے تو وہ اس کی ذمہ داری میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ بھی وہ سمجھ رہی تھی کہ عبدالحق کے لئے یہ ایک جذباتی معاملہ ہے۔

''اچھا! چل یوں ہی سہی۔''

عبدالحق نے گاڑی اسکول کے سامنے روکی۔ حمیدہ بھی ارجمند کے ساتھ اترنے لگی تو اس نے کہا۔

''تم کہاں چلیں اماں!''

''بچی کو اندر تک چھوڑ کر آؤں گی۔''

"اس کی ضرورت نہیں ہے اماں!"

"اس میں میری خوشی ہے۔" حمیدہ نے کہا۔

"پھر یہ ہے کہ مجھے اطمینان بھی ہو جائے گا۔"

وہ ارجمند کے لئے بہت بڑا لمحہ تھا۔ یہ لوگ مجھ سے کیسی محبت کرتے ہیں، وہ سوچ رہی تھی۔ میں کیسے اس محبت کا صلہ دے سکوں گی۔ یہ بے لوث، بے غرض محبت۔ آغا جی کو کیا ضرورت تھی زحمت کرنے کی۔ لیکن نہیں، یہ ان کے لئے خوشی تھی۔ اور دادی اماں اپنی خوشی پوری کر رہی ہیں۔

اس لمحے اسے اپنے کھوئے ہوئے لوگ یاد آ گئے۔ آج وہ زندہ ہوتے تو بابا اور امی اسے اسکول لے کر آتے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تو رو رہی ہے نکی!" حمیدہ نے تڑپ کر کہا۔

"خوشی کے آنسو ہیں دادی اماں!"

"مجھے سب پتا ہے۔ کچھ خوشی کے ہیں تو کچھ دکھ کے ہیں۔" حمیدہ نے کہا۔

"پر نکی! سب سے اچھے آنسو شکر کے ہوتے ہیں۔ سوچ تو سہی، اللہ کچھ لیتا ہے تو اس سے زیادہ دیتا بھی تو ہے۔ چل! آ جا .....!"

عبدالحق کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ پھر حمیدہ ارجمند کو اسکول میں چھوڑ کر واپس آئی تو اس نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔ حمیدہ اس کے برابر ہی بیٹھ گئی۔

"چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی بھی ہوتی ہیں پتر!" حمیدہ نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں اماں!"

"میں اسے چھوڑنے گئی، تاکہ نکی کو خود پر اعتماد ہو، وہ خود کو اکیلا نہ سمجھے۔ سکول میں بھی تو سر اٹھا کر رہنا ضروری ہوگا پتر!"

"ہاں اماں! اب میں سمجھ گیا۔"

"بندہ جس سے محبت کرے تو اس کی ضرورتوں کو بھی سمجھے۔"

"ایک بات بتاؤ اماں! ارجمند دکھ سے رو رہی تھی کیا؟"

"خوشی بھی تھی اسے پتر! اور دکھ بھی تھا۔"

عبدالحق نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"دکھ کس بات کا اماں!"

"خوشی تو اسے ہونا ہی تھا پتر! بات ہی خوشی کی تھی۔" حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

"پر خوشی کے موقع پر ہی تو دکھ یاد آتے ہیں۔ اسے اپنے ماں باپ، دادا دادی اور اپنی پھپھو یاد نہیں آئی ہوگی؟ اس نے نہیں سوچا ہوگا کہ کاش وہ اسے چھوڑنے کے لئے آئے ہوتے؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہو اماں! پر تم نے اسے شکر کے بارے میں خوب سمجھایا۔"

"میں نے سمجھایا نہیں پتر! بس اسے یاد دلایا تھا۔ وہ ایسی باتوں کو خوب سمجھتی ہے۔ بس بندہ کبھی دکھ میں بھول ہی جاتا ہے۔ تو ایسے میں محبت کرنے والے اسے یاد دلا دیتے ہیں، تو نہیں جانتا پتر! وہ بچی ہے، پر بہت بڑی ہے۔"

عبدالحق خاموش رہا۔ کیسے کہتا کہ یہ بات وہ بھی سمجھ چکا ہے۔

خوش تو وہ تھا۔ لیکن دفتر میں ایک خیال نے اسے پریشان کر دیا۔ اب اس کے دوپہر کے کھانے کا کیا ہوگا۔ اسے یہ فکر نہیں تھی کہ اب اس کے لئے گھر سے کھانا نہیں آئے گا۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ یہ معمول رکنے کے سلسلے میں وہ مسعود صاحب کو کیا بتائے گا؟ اب وہ انہیں حقیقت تو نہیں بتا سکتا تھا۔

وہ سوچتا رہا، اور اس کی سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہیں آیا کہ اسے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ اس کے سوا اس کے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے۔ پہلی بار جھوٹ کی برائی اتنی گہرائی کے ساتھ اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے تو مسعود صاحب سے جھوٹ بولا بھی نہیں تھا۔ جھوٹ تو اس سے بولا گیا تھا۔ مگر اب گھر سے کھانا نہ آنے کی وجہ تو مسعود صاحب پوچھیں گے۔ اور وہ کیا بتائے گا؟ یہ کہ نور بانو کی طبیعت بہت خراب ہے۔ لیکن کب تک؟ پھر اس جھوٹ کی خاطر اور نہ جانے

کتنے جھوٹ بولنے پڑیں گے۔

نہیں! اس نے جھنجلا کر سوچا۔ میں چچا جان کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔ میں جھوٹ کیوں بولوں۔ جبکہ اللہ نے سختی سے جھوٹ بولنے کو منع کیا ہے۔ میں کیوں اللہ کی نافرمانی کروں۔

مگر اسے خیال آیا کہ یہ سب کچھ سن کر مسعود صاحب نوربانو کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ اور وہ اسے برا سمجھیں، یہ وہ گوارا نہیں کر سکتا۔ تو اسے نہ چاہتے ہوئے جھوٹ بولنا پڑے گا۔

وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔ اللہ کا حکم اور نوربانو کا بھرم! ان میں کوئی مقابلہ تھا ہی نہیں۔ بھرم اور جھوٹے بھرم کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے..... اور پھر اللہ کے حکم کے سامنے تو کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں۔

یہ دل کا فیصلہ تھا۔ پہلی بار عبدالحق کی سمجھ میں آیا کہ عقل تو بس گمراہ کرتی ہے۔ کیونکہ عقل نے ایک دلیل پیش کر دی تھی۔ وہ اس جھوٹ کو جائز قرار دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اللہ ستار ہے، اپنے بندوں کا پردہ رکھنے والا ہے، اور وہ دوسروں کا پردہ رکھنے والوں کو پسند فرماتا ہے، اور قیامت کے دن وہ ان کا پردہ رکھے گا۔ تو اسے نوربانو کا پردہ رکھنا چاہئے چاہے اس کے لئے اسے جھوٹ بولنا پڑے۔

وہ جھنجلا گیا۔ ارے.....! اتنی آسان اور خوب صورت نظر آنے والی زندگی، جسے چھوڑنے کو آدمی کا دل نہیں چاہتا، درحقیقت اتنی مشکل ہے۔

مشکل ہے، جبھی تو اس میں کامیابی کا انعام جنت اور اس کی نعمتیں ہیں۔ دل نے کہا۔ سیدھا چلنا آسان تو نہیں۔

اس لمحے عبدالحق نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جھوٹ ہرگز نہیں بولے گا۔ عزت اور ذلت تو اللہ کے ہاتھ ہے۔ وہ نہ کسی کو عزت دے سکتا ہے نہ کسی کی عزت بچا سکتا ہے۔ نہ وہ کسی کو ذلیل کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور نہ ہی کسی کو ذلت سے بچا سکتا ہے۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ پُرسکون ہو گیا۔

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد یہ بھی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ جو بندہ نڈر ہو کر اللہ کا حکم مانے، اللہ اس کی کیسی مدد کرتا ہے۔

شمریز نے کھانے کا ٹفن میز پر لا کر رکھا تو وہ حیران رہ گیا۔

''یہ..... یہ کہاں سے آیا؟''

''گھر سے صاحب!'' شمریز کو اس کی حیرت پر حیرت ہو رہی تھی۔

''کون لایا؟''

شمریز کو لگا کہ صاحب کا دماغ چل گیا ہے۔

''یعقوب لایا ہے سر!''

''اسے بلاؤ۔'' عبدالحق نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یعقوب تو جا رہا ہوگا۔

''اگر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا ہو تو نوریز کو گاڑی میں اس کے پیچھے بھیجو۔ اس سے کہو کہ گھر پہنچنے سے پہلے یعقوب کو یہاں واپس لانا ہے۔''

شمریز بات کی اہمیت کو تو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن وہ یہ بہرحال سمجھ گیا کہ بات اہم ہے۔ وہ عبدالحق کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کمرے سے نکل گیا اور باہر کی طرف لپکا۔ اس کا اندازہ تھا کہ اب تک یعقوب گاڑی میں بیٹھ کر نکل چکا ہوگا اور نوریز کو اس کے پیچھے بھیجنا پڑے گا۔

یہ دیکھ کر اسے سکون ہوا کہ گاڑی پارکنگ میں موجود ہے۔ لیکن یعقوب اس میں موجود نہیں تھا۔ یہ ایک اور مشکل آ گئی۔ اب وہ یعقوب کو کہاں ڈھونڈے۔ اور وہ ڈھونڈ رہا ہو اور ادھر یعقوب آ کر گاڑی میں بیٹھ کر نکل جائے تو.....''

اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ سامنے چھوٹے سے باغیچے میں اسے یعقوب نظر آ گیا۔ وہ گھاس پر پاؤں پھیلائے بیٹھا نوریز سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ان کی طرف بڑھ گیا۔

''اے یعقوب! صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔''

یعقوب ہمیشہ کی طرح بگڑ گیا۔

"کیا یاقوب یاقوب کرتا ہے۔ مائی نیم جیکب!" اس نے سینے کو انگلی سے ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"تم سالا کالا انڈین، تم کو بات کرنا نہیں آتا۔"

"اندھا ہوگیا ہے کیا۔ نہ میں کالا ہوں نہ انڈین۔ تو آئینہ دیکھا کر ہر روز۔ گوروں کے چھوڑے ہوئے کالے سائے، اور مجھ کو غور سے دیکھ۔ میں تیرے انگریزوں سے بھی گورا ہوں۔ مجھے سلوٹ کیا کر صبح شام۔"

"یو بلڈی ہمبل سرونٹ۔ تجھ کو انگریزی آتی ہے؟"

اب وہ ساتھ رہتے تھے تو یہ نوک جھونک ان کا روز کا معمول تھی۔ لیکن نوریز چھوٹا ہونے کی وجہ سے یعقوب کا احترام کرتا تھا۔

"میں نے کہا، صاحب تجھے بلا رہے ہیں۔"

یعقوب کو تشویش ہونے لگی۔

"کیا بات ہے؟"

"جیسے بلایا ہے، اس سے تو ایمرجنسی ہی لگتی ہے۔"

یعقوب جلدی سے اٹھا اور دفتر کی طرف تیز قدموں سے چل دیا۔ شمریز اس کے پیچھے تھا۔

یعقوب نے دروازہ پر دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شمریز کو اندازہ تھا کہ وہ کوئی ذاتی نوعیت کا معاملہ ہے۔ اس لئے اس کا کمرے میں جانا مناسب نہیں ہوگا۔

"یو کال می سر!" یعقوب نے اندر داخل ہوتے ہی گڑبڑا کر کہا۔

"دروازہ بند کرو۔"

یعقوب اور ڈر گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ پلٹا۔

"سم مسٹیک فرام می سر!"

"یہ ہر وقت اپنی انگریزی نہ جھاڑا کرو۔" عبدالحق نے اسے جھاڑا۔

"یس سر! میرا مطلب ہے حاضر جناب!"

"یہ کھانا تمہیں کس نے دیا؟"

پھر وہی کھانے کا کیس۔ یعقوب نے گھبرا کر سوچا۔ پھر اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"یور میڈ سر! سٹی گیو می دِس ٹفن۔"

"میں کہتا ہوں، سیدھی طرح بات کرو مجھ سے۔"

"وہ میں نروس ہو رہا ہوں سر! یہ ٹفن مجھے آپ کے اس نوکرانی نے دیا ہے۔ کیا نام ہے اس کا...... ہاں، نسیمہ نے۔"

"اور نسیمہ کو کس نے دیا؟"

"میم صاحب نے۔"

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے اس میڈ نے ہی بتایا سر! میرا مطلب ہے، نوکرانی نسیمہ نے۔"

عبدالحق چند کے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ، یہ سمجھ لو کہ میں نے تم سے کچھ نہیں پوچھا ہے۔"

"سمجھ گیا جناب!"

اس کے جانے کے بعد بھی عبدالحق اس پر سوچتا رہا۔ ارجمند کو تو وہ خود ہی اسکول چھوڑ کر آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کھانا یا تو نسیمہ نے پکایا ہے یا نور بانو نے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ رات کا کھانا ہو۔ خیر...... کھائیں گے تو پتا چل جائے گا۔

لیکن کھانے کے بعد وہ اور الجھ گیا۔

بیشتر کھانے ایک ہی ترکیب سے پکائے جاتے ہیں۔ لیکن شاید ان میں پکانے والے کے ہاتھ کا ذائقہ اور شاید محبت بھی شامل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہر کسی کے پکائے ہوئے قورمے کا ذائقہ ایک سا ہونے کے باوجود کچھ منفرد بھی ہوتا ہے۔ آپ کس کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا روز کھائیں تو آپ اس انفرادی ذائقے کی عادی ہو جاتے ہیں۔ کبھی اس میں فرق ہو تو آپ کو فوراً ہی محسوس ہو جاتا ہے۔ آپ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کھانا کسی اور نے پکایا ہے۔

یہ اندازہ تو اسے ٹفن کھولتے ہی ہوگیا کہ کھانا رات کا نہیں ہے۔ مگر

کھاتے ہوئے اسے حیرت ہوئی۔ کیونکہ وہ ویسا ہی تھا، جیسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ اسے الجھن ہونے لگی۔ ارجمند نے کھانا پکانا نور بانو سے سیکھا تھا۔ مگر وہ ان دونوں کے کھانے میں فرق کرنے لگا تھا۔ شاید اس لئے کہ دوپہر کا کھانا ارجمند کا اور رات کا نور بانو کا ہوتا تھا۔

اگر وہ کھانا نسیمہ کا پکایا ہوا ہوتا تو وہ فوراً ہی سمجھ لیتا۔ لیکن اسکا دل تو یہ ماننے کو بھی تیار نہیں تھا کہ یہ کھانا نور بانو نے پکایا ہوگا۔ اس میں وہی ذائقہ تھا، جو دفتر بھیجے جانے والے کھانے کا ہوتا تھا، اور وہ جانتا تھا کہ وہ ارجمند کا پکایا ہوا ہوتا ہے۔

لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ارجمند اسکول گئی ہوئی ہے۔ تو پھر یہ نور بانو ہی کا ہوگا۔ لیکن اس کا دل یہ نہیں مان رہا تھا۔

بغیر مسعود صاحب کو کچھ بتائے، اپنی الجھن دور کرنے کے لئے اس نے ان کا سہارا لیا۔

''آج آپ کو کھانے کے ذائقے میں کچھ فرق محسوس نہیں ہو چچا جان!''

اس نے بڑی معصومیت سے ان سے پوچھا۔

مسعود صاحب نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔

''نہیں بھئی! نور بیٹی کے ہاتھ کا ذائقہ میں خوب پہچانتا ہوں۔''

''یہ تو آپ بغیر سوچے سمجھے کہہ رہے ہیں۔ اب ذرا کھاتے ہوئے محسوس کرنے کی کوشش کریں۔''

مسعود صاحب نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا، مگر اس کی فرمائش پر عمل کیا۔ نوالہ حلق سے اترنے کے بعد وہ بولے۔

''وہی ذائقہ ہے روز والا اور میاں! کسی کے ہاتھ کا ذائقہ پہچاننے کے لئے غور نہیں کرنا پڑتا۔ وہ تو منہ سے بولتا ہے اور آدمی خود بخود پہچان جاتا ہے۔''

مسعود صاحب نے اس کے اندازے کی تائید کر دی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ گھر سے جو کھانا آتا ہے، وہ نور بانو نہیں، ارجمند پکا کر بھیجتی ہے۔ اور وہ یہ بات جانتا تھا۔

تو یہ کھانا ارجمند کا پکایا ہوا ہے۔ اس نے سوچا، مگر وہ یہ بات پورے یقین سے صرف اس لئے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خود ارجمند کو اسکول چھوڑ کر آیا تھا۔ تو ممکن ہے، یہ نور بانو کا کام ہو۔

اس نے سوچا، رات کو نور بانو سے کسی ترکیب سے یہ بات پوچھ لے گا۔ لیکن فوراً ہی اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کی تفتیش کے نتیجے میں نور بانو پھر جھوٹ بولے گی۔ کیوں کسی سے جھوٹ بلوایا جائے۔

❁ ❁ ❁

زرینہ کے ہاں دوسرا بیٹا ہوا تھا۔ حمیدہ اسے دیکھنے کے لئے حق نگر گئی۔ وہ بہت خوب صورت بچہ تھا۔ بات خوشی کی تھی۔ حمیدہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ لیکن محرومی کے جس احساس کو اس نے مدت سے دبا رکھا تھا، اچھل کر سطح پر آ گیا۔ اللہ میرے عبدالحق کو بیٹا کیوں نہیں دیتا۔ اس کے دل میں شکایت سی ابھری۔

ارجمند بھی بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے بچے دیکھے ہی کہاں تھے۔

حمیدہ رخصت ہونے لگی تو زرینہ نے کہا۔

''ابھی تو آپ کچھ دن حویلی میں رکیں گی نا اماں!''

''نا دھیے! بس تھوڑی دیر بعد لہور واپس جاؤں گی۔''

''کیوں اماں! رکو نا کچھ دن!''

''بلکہ اس بار تو ہمارے گھر میں ہی رہیں۔'' اکبر نے کہا۔

''نا پتر! اب تو میں رک ہی نہیں سکی۔ نکی کا اسکول میں داخلہ ہو گیا ہے نا، اب تو تم لوگ آ کر رہو ہمارے ہاں۔''

''میں تو آ جاؤں گی اماں! لیکن یہ نہیں آ سکتے۔ اسٹور کو کس پر چھوڑیں گے۔'' زرینہ نے اکبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسکول کی چھٹیوں میں ہم آئیں گے باجی!'' ارجمند نے بڑے خلوص سے کہا۔

’’انشاء اللہ......! اور تمہارے ساتھ رہیں گے بھی۔‘‘

لاہور واپس آتے آتے حمیدہ پر محرومی کا بخار پوری طرح چڑھ چکا تھا۔

اگلے روز وہ ارجمند کو اسکول چھوڑ کر آئی تو نسیمہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

’’آ...... بیٹھ ادھر!‘‘

’’کیا بات ہے اماں جی......؟‘‘

’’مجھے اپنے پتر کی محرومی کا دکھ کھا رہا ہے نسیمہ!‘‘ حمیدہ نے کہا۔ وہ رات بھر اپنی اور عبدالحق کی محرومی پر سوچتی اور کڑھتی رہی تھی۔ اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس کی محرومی بڑی ہے یا عبدالحق کی۔ وہ جانتی تھی کہ عبدالحق بے نیاز بنا رہتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر ترستا ہے اولاد کو۔ پھر بھی اللہ نے اسے صبر دیا تھا۔ مگر خود اسے تو قرار نہیں تھا۔ اس لحاظ سے شاید اس کی محرومی بڑی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ عبدالحق کے ہاں بیٹا ہوگا تو شاید وہ اس کے وصال دن جیسا ہوگا۔

’’میں پوتے کی صورت دیکھے بغیر، اسے گود میں لئے بغیر مرنا نہیں چاہتی نسیمہ!‘‘

’’ایسی باتیں کیوں کرتی ہو اماں جی! اللہ تمہیں بہت عمر دے گا، اور انشاء اللہ پوتا بھی دے گا۔‘‘ نسیمہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ حمیدہ سے وہ ماں جیسی محبت کرتی تھی۔

’’پر کب دے گا، میں تو بوڑھی ہو چکی۔ ہر دن موت کی طرف قدم بڑھتا ہے میرا۔‘‘ حمیدہ کے لہجے میں مایوسی اور دل گرفتگی تھی۔

’’ایسا کچھ نہیں ہے اماں جی! لوگ تو سو سو سال جیتے ہیں۔ تمہیں سب کچھ ملے گا اماں جی!‘‘

’’پر اللہ کے کسی نیک بندے کی دعا تو ملے، تو کچھ کرنا نسیمہ!‘‘

’’تم ہی پیچھے ہٹ گئی تھیں اماں جی!‘‘ نسیمہ نے کہا۔ پھر رازدارانہ لہجے میں بولی۔

’’یہ تیسرے بنگلے میں ایک نوکرانی ہے اماں جی! پندرہ سال سے خالی

گود لئے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ بانجھ ہے، کبھی ماں نہیں بنے گی۔ پر اماں! کل ہی چھلا نہا کر بیٹھی ہے۔‘‘

’’کیسے......؟‘‘ حمیدہ کے لہجے میں ہیجان ابھر آیا۔

’’ایک اللہ والے نے دعا دی تھی۔‘‘

’’کہاں ہیں وہ؟ مجھے بھی لے چل ان کے پاس۔‘‘

’’ٹھیک ہے اماں جی! میں آج ہی پتا معلوم کر لوں گی اس سے مل کر۔ پھر کسی دن چلیں گے۔‘‘

’’کسی دن کیوں؟ کل ہی چلیں گے۔‘‘ حمیدہ نے تڑپ کر کہا۔

’’مجھ سے تو اب صبر نہیں ہوتا۔‘‘

’’ٹھیک ہے اماں جی! پر بڑی بیگم کو نہ بتانا۔ وہ مجھ سے چڑنے لگی ہیں۔‘‘

’’اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔ کل نکی کو اسکول چھوڑ کر ادھر ہی نکل چلیں گے۔‘‘

❁ ❁ ❁

عبدالحق کی الجھن اپنی جگہ تھی۔ کھانے کا ذائقہ ہر روز وہی پرانا والا تھا۔ اور ارجمند ہر روز اسکول جاتی تھی۔ اس کے لئے تو کھانا بھیجنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اور نسیمہ ایسا کھانا نہیں پکا سکتی تھی۔ ایسے میں ایک ہی امکان رہ جاتا تھا، اور وہ بڑا خوش آئند تھا۔ یہ کہ نور بانو کو ہی خیال آ گیا تھا، اور اب ہر روز وہی کھانا پکا کر اسے بھیجتی تھی۔ وہ اس پر یقین کر لینا چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں؟ دل نہیں مانتا تھا۔

ایک رات اس سے رہا نہیں گیا۔

’’آج کھانا تم نے بھیجا تھا؟‘‘

نور بانو بری طرح چونکی۔

’’کیوں؟ اچھا نہیں تھا؟‘‘

’’نہیں! بہت اچھا تھا۔‘‘

"تو پھر پوچھا کیوں آپ نے؟"

"ایسے ہی ....!" عبدالحق نے ٹالنے کے لئے کہا۔ اب وہ یہ قصہ چھیڑ کر پچھتا رہا تھا۔ نوربانو کے انداز سے اس نے بروقت سمجھ لیا تھا کہ اس بار بھی ہ کہے گی کہ وہ اٹھ نہیں پائی تھی، ارجمند نے اپنا شوق پورا کیا تھا۔ اس کی چھٹی س بتا رہی تھی کہ نوربانو کو یہ بھی یاد نہیں ہے کہ ارجمند اب اسکول جانے لگی ہے۔ اب اس نے بات آگے بڑھائی تو کسی نہ کسی مرحلے پر اسے یاد آئے گا کہ رجمند تو اسکول جاتی ہے۔ پھر وہ نسیمہ سے پوچھ گچھ کرے گی، اور وہ نوکروں کو ن معاملات میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ تو نوربانو سے جھوٹ بھی نہیں انا چاہتا تھا۔ یہ کیسی غلطی کر بیٹھا ہے وہ۔

"کوئی بات تو ہوگی؟" نوربانو نے اسے کریدا۔

وہ جانتا تھا کہ اب وہ پیچھے پڑ جائے گی۔ اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔

"آج کھانا معمول سے زیادہ اچھا تھا۔" اس نے سچائی سے کہا۔

نوربانو نے سکون کی سانس لی۔

"آپ نے بہت محبت سے کھایا ہوگا، اس لئے اچھا لگا۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔

"یہ تو تمہارا انکسار ہے۔ اور محبت تو میں تم سے ہر پل کرتا ہوں۔"

بات ادھر ادھر ہوگئی۔ لیکن عبدالحق کی الجھن اس صبح ہی دور ہوگئی۔

وہ معمول کے مطابق تہجد کے لئے اٹھا۔ لیکن طبیعت میں کچھ بھاری پن سا تھا۔ نماز پڑھ کر وہ لان میں چلا گیا۔ ننگے پاؤں گھاس پر چلتا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ذرا سی چہل قدمی کے بعد وہ بھاری پن دور ہو جائے گا۔

وہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھا تو اسے ایک غیر معمولی بات نظر آئی۔ کچن کی کھڑکی روشن تھی۔ اس نے سوچا، ممکن ہے کوئی لائٹ آف کرنا بھول گیا ہو۔ اور کھڑکی بند تھی۔ اس نے سوچا کہ اندر جائے گا تو لائٹ آف کر دے گا۔

ذرا دیر بعد طبیعت ہلکی ہوئی تو وہ اندر گیا۔ کچن کی لائٹ اب بھی اس

کے دماغ میں چبھ رہی تھی۔ چنانچہ وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اسے حیرت ہوئی۔ کچن میں کوئی کام میں مصروف تھا۔

وہ حیرت در حیرت تھی۔ کچن میں اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ملازم ابھی جاگے بھی نہیں ہوں گے۔ اگر نوربانو کو وہ بیڈروم میں سوتا چھوڑ کر نہ آیا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ وہ نوربانو ہوگی۔ رات کو اکثر اس کی نیند اڑ جاتی تھی تبھی تو وہ دن چڑھے تک سوتی تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ وقت نوربانو کے جاگنے کا ہے ہی نہیں۔

متجسسانہ انداز میں وہ دبے پاؤں آگے بڑھا، اور اندر جھانکا۔ وہ ارجمند تھی۔ اور یقیناً وہ کھانا پکا رہی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے بروقت خود کو روک لیا۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کے دفتر کے لئے کھانا اب بھی ارجمند ہی پکاتی تھی۔ اسے حیرت نہیں ہوئی۔ شاید اس کے لاشعور نے یہ حقیقت پہلے ہی سمجھ لی تھی۔

پھر بھی استفسار کو اس کا جی چاہا، وہ اس کی زبانی حقیقت سننا چاہتا تھا۔ لیکن اسے یاد آیا کہ رات اس نے جھوٹ کی عادی نوربانو کو جھوٹ سے بچانے کے لئے بات ختم کر دی تھی۔ تو یہ تو ہمیشہ سچ بولنے والی ارجمند کا معاملہ تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ اس کے پوچھنے پر ارجمند کو نہ چاہتے ہوئے بھی جھوٹ بولنا پڑے گا۔ اور یہی نہیں، ارجمند شرمندہ بھی ہوگی۔ اور جب وہ حقیقت جان گیا ہے تو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

وہ جیسے دبے پاؤں آیا تھا، ویسے ہی واپس پلٹ گیا۔ اس روز اسے ارجمند پر بہت پیار آیا۔ اسے پہلے بار احساس ہوا کہ اس بچی میں کوئی غیر معمولی بات ہے..... ایسی بات جو اللہ کے ان بندوں میں ہوتی ہے جنہیں اس نے بڑائی دی ہو۔ وہ چھوٹی سی تھی لیکن سچ بولتی تھی۔ اللہ سے ڈرتی تھی۔ عالی ظرف تھی۔ اس کے ایثار کی شان ہی اور تھی۔ صرف اتنا نہیں تھا کہ وہ کسی اور کو کریڈٹ دلوانے کے لئے خود محنت کرتی تھی بلکہ اسے شرمندگی سے بچانے کے لئے وہ

جھوٹ بھی بولتی تھی، جو اسے سخت ناپسند تھا۔ ایسا ایثار محبت کے بغیر کوئی نہیں کر سکتا۔ اور عبدالحق نے یہ بات بھی سمجھ لی تھی کہ ارجمند کا خمیر ہی محبت کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔

وہ اسٹڈی میں گیا اور قرآن کی تلاوت میں مصروف ہوگیا۔

✿ ✿ ✿

کمرہ عورتوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ کمرے میں آتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ برابر والے کمرے میں مرد ہی مرد تھے۔ حمیدہ اور نسیمہ کو دروازے کے قریب ہی بیٹھنے کی جگہ ملی، وہ بھی مشکل سے۔ جیسے تیسے وہ وہاں سمٹ کر بیٹھ گئیں۔

حمیدہ نے کمرے کا جائزہ لیا۔ جس دروازے سے وہ آئی تھی، اس کے عین سامنے والی دیوار میں ایک اور دروازہ تھا۔ دروازے پر بھاری چِق تھی۔ یہ یقیناً بابا جی کا کمرہ ہے۔ اس نے سوچا۔

اب حمیدہ کو احساس ہو رہا تھا کہ یہاں آکر اس نے غلطی کی ہے۔ کم از کم اس وقت اسے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ ادھر عورتوں کے ہجوم کو دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ کئی گھنٹوں تک اس کی باری نہیں آئے گی۔ جبکہ دوسری طرف مرد بھی کم نہیں تھے۔ جلد بازی اور بے صبرا پن بہت بری چیزیں ہیں۔

لیکن غلطی اس کی بھی نہیں تھی۔ وہ تو صبح سویرے یہی سوچ کر چلی آئی تھی کہ اس وقت زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔ اور اس کا کام آسانی سے ہو جائے گا۔ لیکن یہاں تو لگتا تھا کہ لوگ فجر سے آئے بیٹھے ہیں۔

اور کہنے کو وہ کمرہ تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر حمیدہ کو ٹھاکر جی کی حویلی کی بیٹھک یاد آگئی۔ وہاں سو آدمی بھی ہوتے تھے تو پتا نہیں چلتا تھا۔ یہاں بھی اس کے اندازے کے مطابق عورتیں سو سے زیادہ ہی تھیں۔

حمیدہ کو ارجمند کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ اب یہاں سے وہ بابا سے ملے بغیر تو نہیں جا سکتی تھی اور اس دوران یقیناً اسکول کی چھٹی ہو جاتی۔ ارجمند بے چاری کو تو گھر کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔

وہ سب کچھ بھول کر اس مسئلے کا حل سوچتی رہی۔ پھر اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے سوچا، وہ نسیمہ کو چھٹی کے وقت یعقوب کے ساتھ سکول بھیج دے گی۔ بچی کو گھر پہنچا کر وہ دونوں پھر واپس آجائیں گے۔

اس فیصلے پر پہنچ کر وہ پُرسکون ہوگئی۔ اس نے چِق پڑے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک عورت کھڑی تھی۔ وہاں موجود عورتوں کی طرح وہ دیکھنے میں ضرورت مند نہیں لگ رہی تھی۔ البتہ اس کا انداز دربانوں جیسا تھا۔

حمیدہ عورتوں کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ وہ سب دبی آواز میں ایک دوسرے کو اپنے اپنے دکھڑے سنا رہی تھیں۔ کسی کی ساس ظالم تھی تو کسی کو اپنے شوہر سے شکایت تھی۔ لیکن وہاں زیادہ معاملات بیماریوں کے تھے۔

''بڑی تائید ہے بابا کی دعا میں۔'' ایک عورت کہہ رہی تھی۔

''پڑھا ہوا پانی دیتے ہیں۔''

''اور بندہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' دوسری نے ٹکڑا لگایا۔

''دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

''اللہ لوگ ہیں۔'' تیسری بولی۔

حمیدہ کو ان باتوں سے ڈھارس ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کی نظریں چِق والے دروازے کی طرف اٹھیں۔ دروازے پر کھڑی عورت چِق اٹھا کر اندر جا رہی تھی۔ اب تک نہ اس نے کسی کو کمرے میں جاتے دیکھا تھا اور نہ باہر آتے۔

وہ سحر زدہ سی چِق کو تکتی رہی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔

پھر وہی عورت باہر آئی اور عورتوں کے درمیان جگہ بناتی آگے بڑھنے لگی۔ بیٹھی ہوئی عورتیں بڑے احترام سے اس کے لئے جگہ بنا رہی تھیں۔ حمیدہ دربان عورت کو دیکھ رہی تھی۔ اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ بھی اس کو دیکھ رہی ہے۔ لیکن شاید یہ اس کا وہم تھا۔

لیکن چند لمحوں میں وہ عورت عین اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"چلو...... ! بابا تمہیں بلا رہے ہیں۔"

حمیدہ نے بے یقینی سے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید وہ کسی اور سے مخاطب ہوگی۔ کیونکہ وہ تو سب سے آخر میں یہاں آئی ہے۔

"میں تم سے کہہ رہی ہوں۔" عورت نے حمیدہ سے کہا۔

"مجھ سے؟ مجھے بلا رہے ہیں بابا؟" حمیدہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے خیال میں عورت کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔

"ہاں تمہیں، تمہارا نام حمیدہ ہے نا؟"

اب حمیدہ کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ لیکن شک کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی۔ دل نے کہا۔ یہ بابا یقیناً اللہ کا کوئی ولی ہے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن اس کا خدشہ بے بنیاد تھا۔ کسی عورت نے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔

نسیمہ بھی اٹھی لیکن عورت نے اسے منع کر دیا۔

"تیرا کوئی کام نہیں ہے، تو بیٹھی رہ۔"

حمیدہ دربان عورت کے ساتھ آگے بڑھی۔ بیٹھی ہوئی عورتیں اب ان دونوں کے لئے احترام کے ساتھ راستہ بنا رہی تھیں۔

دروازے پر پہنچ کر دربان عورت رک گئی۔

"تم اندر جاؤ۔"

حمیدہ ایک لمحے کو جھجکی، پھر اس نے چق اٹھائی اور اندر والے کمرے میں داخل ہوگئی۔

وہ ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ اور بہت سادہ۔ ایک دری بچھی تھی، جس پر وہ بابا بیٹھا تھا۔ وہاں نہ کوئی تکیہ تھا نہ گاؤ تکیہ، نہ کوئی میز۔ دیوار کے ساتھ بس ایک مصلّی تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ ایک مٹکا تھا، جس پر پانی نکالنے کا مگ اور ایک کٹورا رکھا تھا۔

اس نے ایک چھوٹے سے پل کو، بس ایک نظر بابا کو دیکھا، پھر اس کی نظریں خودبخود جھک گئیں۔ اس چہرے پر ایسا ہی جلال تھا کہ اسے نظر بھر کر نہیں

دیکھا جا سکتا تھا۔ حمیدہ کا جسم کانپنے لگا۔

"بیٹھ جا!" بابا نے کہا اور خود اٹھ کر مٹکے کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے وہ کٹورے میں اس کے لئے پانی لے کر آیا۔

"لے یہ پی لے۔ پرائے معاملے میں خود کو تھکاتی ہے۔ ماری ماری پھرتی ہے۔"

"پرایا معاملہ کیسا بابا؟ وہ میرا بیٹا ہے۔" حمیدہ نے تڑپ کر کہا۔

"بے شک وہ تیرا بیٹا ہے۔" بابا نے اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اور بچہ پیدا ہو جائے تو سب کا ہوتا ہے۔ پر اس سے پہلے تو وہ کسی کا معاملہ نہیں ہوتا، تیرا کیا بیچ اس میں۔"

"میں کچھ نہیں لگتی اس......"

"میں نے کہا نا! بچے کا معاملہ شوہر اور بیوی کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ اس میں کسی کا بیچ نہیں۔"

"میں اس کے بچے کی آس میں تو جی رہی ہوں۔"

"بری بات!" بابا نے نرم لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

"نہ کوئی اپنی مرضی سے جیتا ہے، نہ کوئی اپنی مرضی سے مرتا ہے۔ اوپر والے نے جتنی دی ہے اتنی ہی جیئے گی تو۔ اور جب اس کا حکم ہوگا، مر جائے گی۔"

"پر بابا......!"

"پھر وہی بات، مدعی سست خواہ چست۔" بابا نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"تو مدعی تو نہیں ہے۔"

"پر ضرورت مند تو ہوں۔" حمیدہ نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"مدعی تو تو ہے نہیں۔ اور خود کہتی ہے کہ ضرورت مند ہے۔ تو ضرورت مند کی تو گواہی بھی سچی نہیں ہوتی۔"

حمیدہ کو لگا کہ وہ صحیح جگہ پہنچ گئی ہے۔

''کچھ بھی ہو بابا! میں یہاں نامراد نہیں جاؤں گی۔''

''جو تیری مراد ہے ہی نہیں، اس کے لئے کوئی کیا کرے؟''

''تم میری سفارش کرو اللہ سے۔''

''اس کے ہاں سفارش بھی اس کے اذن سے ہے۔ ورنہ کسی کی کیا مجال؟'' یہ کہتے کہتے بابا پر تھرتھری چڑھ گئی۔

''تو لے تو نا اجازت!''

''نہیں ملے گی۔ کیسے مل سکتی ہے۔ اگر وہ پہلے ہی کسی سے وعدہ کر چکا ہو۔'' بابا نے چھت کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''وہ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔ میں اس سے وعدہ شکنی کو کہوں تو وہ مجھ سے ناراض ہوگا، مجھے چھوڑ دے گا۔''

''میرے لئے دعا کرو بابا!'' حمیدہ گڑگڑائی۔

''تیرے لئے تو دعا کر سکتا ہوں، اور کروں گا۔ لیکن جو تو چاہتی ہے، اس کے لئے دعا نہیں کر سکتا۔ تو مدعی کو لے کر آ، تبھی کچھ ہو سکتا ہے۔''

حمیدہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

''دعا تو آدمی کچھ کر سکتا ہے۔'' اس نے دلیل دی۔

بابا کو جلال آ گیا۔

''تو کیا تجھے خوش کرنے کے لئے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی دعا کروں میں۔ تباہ ہو جاؤں تیری خاطر۔''

''یہ ایسی دعا تو نہیں ہے بابا!''

''تجھے کیا معلوم، تو سمجھ بھی نہیں سکتی۔''

حمیدہ نے لپک کر بابا کے پاؤں پکڑ لئے۔

''کچھ کرو بابا!''

''یہ کیا کرتی ہے، چھوڑ میرے پاؤں۔'' بابا نے اسے جھٹکنے کی کوشش کی۔

لیکن حمیدہ مضبوطی سے اس کے پاؤں پکڑے ہوئے تھی۔

''اچھا! پاؤں چھوڑ میرے، میں کچھ سوچتا ہوں۔''

حمیدہ نے پاؤں چھوڑ دیئے۔ بابا نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے چہرے پر گہرا استغراق تھا۔ ان لمحوں میں حمیدہ اسے دیکھ سکتی تھی، اور دیکھتی رہی لیکن جب ہی بابا نے آنکھیں کھولیں۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

چند لمحے خاموش رہی۔ حمیدہ میں کچھ بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ بالآخر بابا نے کہا۔

''بس ایک ہی صورت ہے۔ پہلے کسی اور سے اجازت لینی ہوگی۔ اس کے بعد شاید اللہ سے بھی اجازت مل جائے۔''

''تو اجازت لے لو نا بابا!''

''اس لئے تو کہتا ہوں کہ مدعی کو ساتھ لے کر آ۔''

حمیدہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''کسے ساتھ لاؤں؟''

''اسے جس کے ہاں اولاد کی آرزو ہے تجھے۔ اپنی بہو کو لے کر آ۔''

حمیدہ حیران رہ گئی۔

''تم اس سے اجازت لو گے بابا؟''

''ہاں! اس کے بغیر بات نہیں بن سکتی۔''

''پر کیوں بابا؟''

''یہ تو سمجھ نہیں سکتی۔ اور میں تجھے سمجھاؤں گا نہیں۔''

''لیکن بابا......!''

''بس اب تو جا...... چلی جا...... تجھ سے بن پڑے تو اسے لے کر آ۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔''

حمیدہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن سمجھتی تھی کہ اب رکنا نقصان دہ ہوگا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں اسے لے کر آؤں گی بابا!''

''کوشش کر لے۔ آگے ربّ جانے۔'' بابا نے کہا۔ پھر دوسری طرف

والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"ادھر سے جانا۔"

حمیدہ اس دروازے سے نکلی تو سامنے ایک احاطہ تھا۔ نسیمہ وہاں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

* * *

حمیدہ کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بھید کیا ہے۔ عبدالحق کے لئے اولاد کی دعا سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی دعا کے برابر کیسے ہوگئی۔ سورج تو مغرب سے کبھی نہیں نکلتا۔ لیکن یہ تو عام بات ہے کہ لوگوں کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ وہ خود بھی دعا کرتے ہیں اور جگہ جگہ دعا کے لئے جھولی پھیلائے پھرتے ہیں۔ اور اللہ والے بابے ان کے لئے دعا بھی کرتے ہیں، اور وہ قبول بھی ہوتی ہے۔ پھر محروموں کے ہاں اولاد بھی ہوتی ہے۔ تو پھر اس کے عبدالحق کے ساتھ ایسا کیسے ہوگیا۔

اس پر اسے سوچتے ہوئے ایسا لگا کہ یہ معاملہ عبدالحق کا نہیں، نور بانو کا ہے۔ وہ محض ایک خیال تھا، جس کی کوئی وجہ اسے معلوم نہیں تھی۔ لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بات یہی ہے۔ اس نے بابا سے ہونے والی بات چیت کو یاد کیا۔ بالآخر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ بابا نے بار بار کہا تھا کہ مدعی کو لے کر آ۔ مدعی سست گواہ چست۔ تو تو بس گواہ ہے، مدعی نہیں۔ پھر بابا نے ایک عجیب بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اللہ سے دعا کرنے سے پہلے کسی اور سے اجازت لینی ہوگی۔ اور اس کے پوچھنے پر اس نے کہا تھا کہ اپنی بہو کو لے کر آ۔

تو یہ تو طے تھا کہ اس معاملے میں عبدالحق مدعی نہیں ہے، صرف نور بانو ہے۔ مگر الجھن کی بات تو یہ بھی تھی۔ بچہ تو ماں اور باپ دونوں کا ہوتا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو وہ باپ کا زیادہ ہوتا ہے۔ وہ باپ کا خون کہلاتا ہے، باپ کی نسل کو آگے بڑھاتا ہے۔ تو پھر یہاں باپ مدعی کیوں نہیں، ماں کیوں مدعی ہے۔ اور وہ بھی ایسی کہ اس دعا کے لئے بابا کو نور بانو سے اجازت لینی ہے۔

وہ سوچتی رہی، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ تھک کر اس نے سوچا۔

سمجھنے کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے۔ سمجھ کر اسے کیا کرنا ہے۔ اسے تو بس اولاد چاہئے اپنے بیٹے کے لئے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ وہ نور بانو کو بابا کے پاس لے جائے اور بابا کی شرط پوری کر دے۔ پھر بابا دعا کرے گا، اور اللہ نے چاہا تو اس کی مراد پوری ہو جائے گی۔

تو اس کے لئے اسے نور بانو سے بات کرنی تھی، اسے بابا کے پاس چلنے پر راضی کرنا تھا۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ بچے کے بارے میں بات کرنے پر نور بانو بھڑک جاتی تھی۔

کوئی بات نہیں، حمیدہ نے سوچا۔ ضرورت پڑی تو انگلیاں ٹیڑھی کر لے گی۔ وہ کمزور تو نہیں۔ وہ تو ایک فرمانبردار بیٹے کی ماں ہے، جو اس کی بات کبھی نہیں ٹالتا۔ تو نور بانو کی کیا ہستی ہے۔

اس نے نور بانو کو کمرے میں بلوا لیا۔ لیکن بات شروع کرنے سے پہلے ایک تجسس نے اسے جکڑ لیا۔ یہ نور بانو کو جو اتنی اہمیت ہے کہ بابا کے دعا کرنے کے لئے اس کی اجازت چاہئے، تو اس کا نور بانو کو بھی پتا تو ہوگا۔ پہلے اس سے یہ تو پوچھا جائے۔

نور بانو اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے اماں؟"

"ایک بات پوچھنی ہے تجھ سے۔"

"پوچھو اماں!"

لیکن اب حمیدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا پوچھے، اور کس طرح پوچھے؟ کیا وہ اس سے یہ پوچھے کہ اولاد کے معاملے میں اس کی اہمیت عبدالحق سے زیادہ کیوں ہوگئی ہے۔ یہ تو بے وقوفی کی بات ہوگی۔ بہتر یہی ہے کہ کام کی بات کی جائے۔

"تجھے بچے کی کوئی فکر نہیں ہے دھیے!"

"کیوں نہیں ہے اماں! لیکن میں کیا کروں؟ سویٹر تو ہے نہیں کہ بن کر تمہاری گود میں ڈال دوں۔ بچہ ہے. اللہ کی مرضی کے بغیر تو کچھ ہوگا نہیں۔"

نور بانو نے دکھ اور بے بسی سے کہا۔

حمیدہ کو اس پر ترس آنے لگا۔ کہہ تو وہ سچ ہی رہی تھی۔

''دیکھو میری دھی! اولاد نہ ہو تو سمجھ کہ اللہ ناراض ہے۔ اور اللہ ناراض ہو تو اسے منانا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔''

نور بانو نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم سمجھتی ہوں اماں! کہ میں کچھ نہیں کرتی۔ میں بہت دعا کرتی ہوں۔''

''بندے کے اپنے مانگنے سے کچھ نہ ملے تو سفارش ڈھونڈنی پڑتی ہے۔''

اس بار زبان کی فطری تیزی نور بانو کی مصلحت پر غالب آ گئی۔

''میری اولاد کی فکر تو تمہیں بھی بہت ہے اماں! بلکہ شاید مجھ سے بھی زیادہ ہی ہے۔'' وہ بولی۔

''ہاں ہے، تو اس میں بری بات کیا ہے؟'' حمیدہ نے تحمل سے نرم لہجے میں کہا۔

''تو تم مجھ سے زیادہ ہی دعا کرتی ہو گی؟''

''یہ تو مجھے نہیں پتا، پر دعا میں بہت کرتی ہوں۔''

''قبول تو نہیں ہوئی آج تک۔'' نور بانو نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اللہ تم سے ناراض ہے۔''

حمیدہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

''ہاں دھیے! بات سچی ہے۔''

''تو پھر مناؤ نا اللہ کو، کوئی سفارش ڈھونڈو نا، جو کام کر جائے۔''

اس بار حمیدہ کی برداشت جواب دے گئی۔

''میں تیری طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھی رہتی۔ ہر طرح کی کوشش کرتی ہوں۔''

''تو سفارش بھی کام نہیں آئی، اور کسی کوشش سے بھی کچھ حاصل نہیں

ہوا؟''

''صرف تیری وجہ سے۔'' حمیدہ نے غصے سے کہا۔

''تو چاہتی ہی نہیں کہ تیرے ہاں بچہ ہو۔''

حمیدہ کی اس بات نے نور بانو کو ڈرا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سچ ہے۔ ایسے ہی مدافعانہ انداز اختیار کرنا اچھا نہیں تھا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو اماں!'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''یہ تو الزام لگانا ہے۔ تمہیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا۔''

''وجہ ہے تو کہہ رہی ہوں، بے وجہ نہیں۔''

''وہ وجہ مجھے بھی تو معلوم ہو ذرا۔''

''میں تیری اولاد کے لئے کہاں کہاں نہیں گئی۔ کسی نے دم کر کے پانی دیا، کسی نے پڑھے ہوئے چنے دیئے، پر مجھے معلوم ہے، تو نے کبھی نہ پانی پیا، نہ کوئی چیز کھائی۔''

''غلط کہہ رہی ہو اماں! کھایا بھی، پیا بھی...... صرف تمہاری خاطر۔''

''لیکن باقاعدگی سے نہیں کیا۔''

''میری بات سنو اماں! میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اللہ تم سے کیوں ناراض ہے؟ تمہارا معاملہ یہ ہے کہ مدعی سست اور گواہ چست......''

حمیدہ دہل کر رہ گئی۔ یہی بات تو بابا نے کہی تھی۔

نور بانو اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کہتی رہی۔

''میری اولاد کی تمہیں مجھ سے زیادہ آرزو ہے۔ اسے کہتے ہیں۔ ماں سے زیادہ چاہے، پھپھے کٹنی کہلائے۔ اپنے حق سے بڑھ کر کچھ کرو گی تو اللہ تو ناراض ہو گا ہی۔''

ایک لمحے کو تو حمیدہ کو احساسِ جرم ہونے لگا۔ لیکن پھر اسے بابا کی بات یاد آ گئی۔

''چل ٹھیک ہے۔ مدعی تو ہے۔ میں نے تجھ سے آگے بڑھ کر کوشش کی تو اللہ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ وہ معاف کرنے والا ہے۔ میں توبہ کر لوں گی۔ پر تو

یہ تو مانتی ہے نا کہ مدعی تو ہے؟''

نوربانو حمیدہ کی اس مدافعت پر خوش ہوگئی۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔''

''تو کیا پتا، اللہ تجھ سے اس لئے ناراض ہو کہ تو مدعی ہو کر بھی کچھ نہیں کرتی۔ تیرا شوہر تجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کی بھی یہی آرزو ہے۔ پر وہ تجھ سے اس لئے کچھ نہیں کہتا کہ تیرا دل دکھے گا۔ لیکن تو اس کی آرزو پوری کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کرتی۔''

''کرتی تو ہوں۔ دعا بھی کرتی ہوں اور توبہ بھی۔'' نوربانو نے جھنجلا کر کہا۔

''تو پھر کوئی سفارش تلاش کر۔''

''کہاں سے لاؤں کوئی سفارش؟''

''میری طرح در در پھر کر تلاش کر۔''

''تمہاری ہی کب کسی نے سن لی۔'' نوربانو نے زہریلے لہجے میں کہا۔

مگر اب حمیدہ کو دلیل مل گئی تھی۔

''میں تو گواہ تھی، میرا کوئی بیچ نہیں تھا۔ میں تو پیچھے لگی تھی۔ میری کون سنتا۔ پر تو تو مدعی ہے۔ تیری تو انشاء اللہ ضرور سنی جائے گی۔''

''میں کہیں نہیں جا سکتی اماں! مجھے شرم آتی ہے۔''

''میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ تجھے میرے ساتھ جانا ہی ہوگا۔''

''کوشش کر لو اماں! میں مر جاؤں گی پر وہاں نہیں جاؤں گی۔''

''میں عبدالحق سے بات کروں گی۔''

نوربانو اتنی خوفزدہ تھی کہ اس دھمکی کا بھی اس پر اثر نہیں ہوا۔ وہ تو بس ایک بات جانتی تھی۔ یہ کہ اسے اس بابا کا سامنا نہیں کرنا ہے۔ اس کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

''وہ کہیں گے، تب بھی نہیں جاؤں گی۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

حمیدہ اسے گھورتی رہی۔ غصے سے اس کا برا حال تھا۔

''میں اب تک ایک امید پر صبر کرتی رہی۔'' اس نے کہا۔

''لیکن آج تو نے میری آس توڑ دی۔ میں نے ہمیشہ تجھے بیٹی سمجھا۔ لیکن تو کبھی بیٹی بنی نہیں۔ اب میں تجھے بتا دوں کہ میں عبدالحق کو حکم دوں گی دوسری شادی کا۔ اور تو جانتی ہے کہ وہ ٹال نہیں سکتا۔ میں اسے اولاد سے محروم نہیں رہنے دوں گی۔ اس کی نسل کو ختم نہیں ہونے دوں گی۔ میں اس کی دوسری شادی کرواؤں گی۔ تو جو کر سکتی ہے کر لے۔ تیری خالی کوکھ تجھے مبارک۔ لیکن عبدالحق کے آنگن میں اس کے بچے ضرور کھیلیں گے۔''

نوربانو کے تو پیروں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔ اتنے شدید ردعمل کی اسے توقع نہیں تھی اور وہ جانتی تھی کہ حمیدہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ تو اب یہ ہو کر رہے گا۔ دشواری یہ تھی کہ وہ خود فیصلہ کن بات کر چکی تھی، اور پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ اپنی فطرت کے خلاف، خود پر جبر کر کے وہ سر جھکا بھی لیتی۔ لیکن بابا کا سامنا کرتی تو اس کا گھٹیا پن کھل جاتا۔ وہ تو اس کے لئے مر جانے کے برابر تھا۔ اور دوسری طرف حمیدہ نے بھی ہر راستہ بند کر دیا تھا۔ کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے دل میں کوئی گنجائش رہی ہی نہیں۔ ہوتی تو وہ آخر میں کہتی...... سوچ لے۔ ابھی تیرے پاس موقع ہے۔ میرے ساتھ بابا کے پاس چلی چل۔ لیکن اس نے یہ نہیں کہا۔

وہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''تیرے آنسو دیکھ کر کبھی میں تڑپ جاتی تھی۔ پر اب ان سے کچھ نہیں ہونے والا۔'' حمیدہ نے بے رحمی سے کہا۔

''تجھے نہ تو میرا لحاظ ہے اور نہ ہی عبدالحق سے محبت ہے۔ نہ تو اچھی بیٹی ہے، نہ اچھی بیوی۔ تو پھر اچھی ماں کیسے بن سکتی ہے۔ جا...... تو میرے کمرے سے چلی جا۔ میں آج رات کو ہی عبدالحق سے بات کروں گی۔''

نوربانو ڈھیٹ بنی بیٹھی روتی رہی کہ شاید حمیدہ کا دل پسیج جائے۔

''جا...... چلی جا یہاں سے۔ میں اب تیری صورت بھی نہیں دیکھنا

چاہتی۔" حمیدہ نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

نوربانو اٹھی اور خواب گاہ میں چلی گئی۔ آنسو اس نے پونچھ ڈالے تھے۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیسی بدترین غلطی کی ہے اس نے۔ جب اس نے اللہ سے اولاد نہ ہونے کی دعا...... اور وہ بھی رمضان کی طاق راتوں میں صدقِ دل سے کی تھی، اس وقت اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کتنی بڑی بات ہے، اور اس کے کتنے بھیانک نتائج نکلیں گے۔ ہائے مجھے میرا جذبہ رقابت...... میرا احساسِ کمتری کھا گیا۔ اس نے خودترسی سے سوچا۔ اور اب تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔

اسے حمیدہ کی بات یاد آ گئی۔ وہ کبھی اچھی بیٹی نہیں بنی، نہ اپنی امی کی اور نہ اس محبت کرنے والی ماں جیسی حمیدہ کی۔ بلکہ وہ تو کبھی اچھی بہن بھی نہیں تھی۔ یہ بات حمیدہ کو...... کسی کو بھی نہیں معلوم تھی۔ اور واقعی وہ کبھی اچھی بیوی بھی نہیں بنی۔ اور حمیدہ کی یہ بات بھی سچی تھی کہ وہ کبھی اچھی ماں بھی نہیں بن سکتی۔ یہ ثابت کرنے کے لئے تو اس کی رمضان کی طاق راتوں میں کی جانے والی وہ بددعا ہی کافی تھی۔ تو اللہ اسے ماں کیوں بنائے دے گا۔

آخر خرابی کیا ہے مجھ میں؟ اس نے سوچا۔ اور جواب فوراً ہی مل گیا۔

اسے خود تو محبت کی ہوس ہے، ہوکا ہے، لیکن وہ خود کسی سے بھی محبت نہیں کرتی...... کسی سے بھی نہیں۔ عبدالحق سے بھی نہیں۔

اس بار وہ سچ مچ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کافی دیر بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو اس نے دل میں کہا...... میرے اللہ! اس بار مجھے بچا لیجئے۔ پھر میں سب سے محبت کروں گی...... بے غرض محبت!

لیکن آنے والی رات کا خوف دل میں پنجے گاڑے بیٹھا رہا۔

❁ ❁ ❁

شام کا معمول تھا کہ عبدالحق کے دفتر سے آنے کے بعد وہ سب لان میں چائے پیتے تھے۔ اس روز نوربانو کا بس چلتا تو وہ وہاں ہرگز نہ جاتی لیکن اس میں یہ ڈر تھا کہ حمیدہ رات کو کرنے والی بات شام کو ہی نہ کر بیٹھے۔ دن بھر وہ اس بارے میں سوچتی رہی تھی۔ کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس اس نے یہ

سوچا تھا کہ اپنی طبیعت خراب کر لے گی اور عبدالحق کو الجھائے رکھے گی، حمیدہ کی طرف جانے ہی نہیں دے گی۔

لیکن شام کو میدان خالی نہیں چھوڑنا تھا، اس لئے وہ لان میں چلی آئی۔

بہرحال اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس میں نظر اٹھا کر کسی کو بھی دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ چائے کی پیالی کو یوں گھور رہی تھی، جیسے اس میں کچھ ڈھونڈ رہی ہو۔

اسے یہ اندازہ بھی نہیں ہوا کہ عبدالحق بہت بجھا بجھا ہے۔ لیکن حمیدہ نے یہ بات دیکھ لی۔ عبدالحق کچھ پریشان تھا۔ بار بار اس کے ہونٹ تھرتھراتے، جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہو، لیکن رک جاتا ہو۔

"کیا بات ہے پتر! تو کچھ پریشان ہے آج۔" بالآخر حمیدہ نے پوچھ ہی لیا۔

یہ سن کر نوربانو سے بھی نہیں رہا گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر عبدالحق کو دیکھا۔ وہ واقعی پریشان لگ رہا تھا۔ وہ اور پریشان ہوگئی۔ اسے لگا کہ شاید یہ بھی اس کی وجہ سے ہے۔ آدمی جب ڈرا ہوا ہو تو ہر پریشانی کو خود سے منسوب کر لیتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہوگئی۔ وہ اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ چائے کی پیالی اٹھا کر گھونٹ لینے کا بھی اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ چائے کی پیالی اٹھا سکے گی۔ لگتا تھا کہ اس کے ہاتھ لرز رہے ہیں۔

"کچھ نہیں اماں! کوئی خاص بات نہیں۔" عبدالحق نے کہا۔ لیکن لہجے سے لگتا تھا کہ وہ کوئی بڑی بات چھپا رہا ہے۔

"کچھ تو ہے پتر!" حمیدہ نے کہا۔

"جو کہنا ہوتا ہے وہ تو کہنا ہوتا ہے۔ تو اچھا ہے، پہلے ہی بوجھ ہلکا کر دے۔"

"وہ اماں...... بات یہ ہے کہ......" عبدالحق کہتے کہتے رک گیا۔

"کہہ دے پتر! نہ کہنے سے کچھ بدلتا نہیں ہے۔" حمیدہ کے لہجے میں تھکی تھی۔

"میرا کراچی تبادلہ ہوگیا ہے اماں!" عبدالحق نے کہا۔

عبدالحق کا کہنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ایک پل کو نور بانو کو دھچکا لگا اور وہ گھبرا گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے ہنسے، قہقہے لگائے۔ ارے ...... یہ تو وہ کب سے دعا کر رہی تھی۔ اور اللہ نے کیسے موقع پر اس کی دعا قبول کی، جب اس کا سب کچھ ختم ہونے والا تھا۔ یہ تو غیبی امداد تھی اس کے لئے۔

اس کا انداز بالکل بدل گیا۔ اب وہ پُراعتماد تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر ایک ایک کو دیکھا۔ اب حمیدہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ عبدالحق تو پہلے ہی پریشان تھا۔ ایک ارجمند تھی، جس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔

بات ایسی تھی کہ شعور تک پہنچنے میں کچھ وقت لگا۔ اتنی دیر خاموشی رہی۔

پھر حمیدہ نے دھیرے سے کہا۔

"جو اللہ کی مرضی!"

"میں استعفیٰ دے سکتا ہوں اماں! ملازمت چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت تو نہیں ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"بس تم ایک بار حکم کر دو۔"

نور بانو کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ یہ کیا ......؟ پہلا حکم نوکری چھوڑنے کا ہوگا، وہ بھی فرمائشی۔ اور اس کے بعد دوسرا حکم دوسری شادی کا ہوگا۔ نوکری کی طرح پہلی بیوی بھی چھوڑ دو۔

وہ ایک ٹک حمیدہ کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے حمیدہ کے چہرے پر مضبوطی ابھری۔

"نہیں پتر! مولوی صاحب کا حکم نہیں ٹالنا۔" وہ بولی۔

"اور وہ تیرے چچا کہتے ہیں کہ یہ قوم کی ضرورت ہے۔ تو میں خود غرض تو نہیں ہوں پتر!"

"میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں اماں!" عبدالحق کی آواز لرزنے لگی۔

"کیوں نہیں جا سکتا۔ دہلی پڑھنے کے لئے نہیں گیا تھا تو ...... میرے وصال دین کے ساتھ۔" حمیدہ جیسے کہیں بہت دور سے بول رہی تھی۔

"اس کے چاچے کو ڈھونڈنے یہاں لاہور نہیں آیا تھا تو ......" حمیدہ نے نور بانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تب اور بات تھی اماں! تمہارے ساتھ بہت لوگ تھے۔"

"آدمی کے ساتھ بس ربّ ہوتا ہے اس کا۔" حمیدہ نے آہ بھر کے کہا۔

پھر ملامت بھرے لہجے میں بولی۔

"بندہ کیسے بھول جاتا ہے اپنے وقت کو۔ لال آندھی میں تو میں اکیلی تھی۔ گاؤں کے گاؤں ختم ہوگئے۔ بندہ نہ بندے کی ذات۔ اس پر اندھا پن، تب کس نے مجھے پالا تیرے آنے تک۔ وہ سب بھول گیا تو......"

عبدالحق شرمندہ ہوگیا۔ واقعی، وہ تو اب بہت دور کے قصے کہانیوں کی بات لگتی تھی، وہ بھی یاد آنے پر۔ ورنہ یاد ہی کہاں تھا وہ سب۔ آدمی واقعی بڑا ناشکرا ہے۔

"میں شرمندہ ہوں اماں! بہرحال میں تو اب تم سے دور نہیں رہنا چاہتا۔"

"دل سے دور ہو بندہ تو دوری ہے پتر!" حمیدہ نے بڑے رسان سے کہا۔

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

"ٹھیک ہے اماں! پھر ہم سب کراچی چلیں گے۔"

"وہاں کوئی ٹھکانا بھی ہے؟" نور بانو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔ لیکن کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

"میں نے عارف بھائی کو فون کیا تھا۔ وہ سب بندوبست کر لیں گے۔"

نور بانو اب پھر اذیت میں تھی۔ جان چھوٹنے کا سامان ہوا تھا۔ لیکن جان اب بھی نہیں چھوٹ رہی تھی۔ اس کے لئے تو وہ پل پل رنگ بدلتی صورتِ حال ......

"پر پتر! ہم کراچی نہیں جا سکتے۔" حمیدہ نے کہا۔ نور بانو کی پھر جان میں جان آئی۔

"کیوں اماں!"

"دیکھ نا، اب میری نکی کی پڑھائی شروع ہوئی ہے۔ اب میں یہاں سے کہیں نہیں جانے والی۔"

"لیکن اماں! ابھی داخلہ ہوئے کچھ دن ہی ہوئے ہیں۔ اور اسکول تو کراچی میں بھی ہیں۔"

نور بانو پھر سانس روک کر بیٹھ گئی۔

"تو ٹھیک ہے، تو نکی سے پوچھ لے۔"

عبدالحق ارجمند کی طرف مڑا۔

"لو......! اماں نے فیصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے۔"

"ویسے تو جو آپ لوگوں کی مرضی، میرے لئے وہ حکم ہے۔" ارجمند نے کہا۔

"لیکن مجھ سے پوچھیں تو میں یہیں پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جانا چاہتی۔ دہلی کے بعد یہی میری پھپھو کا شہر ہے۔"

عبدالحق کو صدمہ سا ہوا۔ اسے ارجمند سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ وہ ہر حال میں اس کے ساتھ جانا چاہے گی۔ لیکن لمحے بعد وہی جواب اس کے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث بن گیا۔ اس جواب کا مطلب تھا کہ ارجمند اپنے بچپن کی بات کو بھول چکی ہے۔ چلو، یہ پیچیدگی بھی دور ہوئی۔ اس نے طمانیت سے سوچا۔

نور بانو کا اس وقت جی چاہتا تھا کہ وہ ارجمند کے چہرے کو بوسوں سے بھگو دے۔ اتنا پیار کرے اسے، اتنا پیار کرے کہ بس، اس نے مسئلے کو مستقل بنیاد پر حل کر دیا تھا۔

"تو آپ گاؤں بھی نہیں جائیں گی؟" عبدالحق نے حمیدہ سے پوچھا۔

"کہا نا پتر! یہاں سے کہیں نہیں جانے والی میں۔ نکی کی پڑھائی کا

سوال ہے۔"

"تو پھر اکیلی رہیں گی یہاں؟"

"اکیلی کہاں؟ اتنے اچھے نوکر دیئے ہیں اللہ نے۔"

"لیکن اماں! کوئی مرد نہ ہو تو بڑا فرق پڑتا ہے۔"

حمیدہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

عبدالحق کسی گہری سوچ میں تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے اماں! اس کا حل بھی ہے میرے پاس۔ زبیر بھائی کو یہاں بلا لیں گے۔"

حمیدہ کو اس کی ذمہ داری پر بہت پیار آیا۔ سدا کا ذمہ دار تھا وہ۔

"لیکن گاؤں کا کیا ہوگا؟"

عبدالحق مسکرایا۔

"تم اسے اب بھی گاؤں سمجھتی ہو اماں! ویسے ہی جیسے میں چھوٹا سا بچہ ہوں تمہاری نظر میں۔ وہ تو اچھا خاصا شہر بن گیا ہے اماں! دو تو تھانے ہیں وہاں۔ اور ڈاکٹر صاحب کی بڑی عزت ہے وہاں۔ وہ وہاں کے معاملات سنبھال سکتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو اماں! میں خود وہاں جاؤں گا۔"

"اور کراچی کب جانا ہے تجھے؟"

"میرے پاس ایک ہفتے کی مہلت ہے اماں!"

"بس ٹھیک ہے۔ تو یہاں کی فکر نہ کر۔ بس مجھے تو تیری فکر ہے۔ تو وہاں اکیلا ہوگا۔"

"نہیں اماں! عارف بھائی بھی تو ہیں وہاں۔"

❁ ❁ ❁

ایک بہت بڑی تبدیلی بالکل اچانک آ گئی تھی۔ اس رات سونے کے لئے لیٹ کر وہ سب اپنے اپنے انداز میں اسی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ نیند کسی کو بھی نہیں آ رہی تھی۔

حمیدہ وہ بات بھول گئی تھی، جو وہ آج رات عبدالحق سے کرنا چاہتی تھی۔

یاد بھی ہوتی تو اس صورتِ حال میں وہ کبھی نہ کرتی۔ اس وقت تو وہ اس جدائی کے بارے میں سوچ رہی تھی، جو چپکے سے سر پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے پاس برسوں کا تو کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ لیکن اتنی سادہ سی بات وہ سمجھ سکتی تھی کہ اب وہ بوڑھی ہوگئی ہے۔ اللہ کا کرم تھا کہ اس نے بڑھاپے کو اس کے لئے کمزوری نہیں بننے دیا تھا۔ وہ کسی کی محتاج نہیں تھی۔ خود اٹھ کر وضو کرتی تھی۔ کھڑی ہو کر نماز پڑھتی تھی۔ یہ دعا اس نے ہمیشہ کی تھی کہ اللہ مرتے وقت تک اسے اس طاقت سے محروم نہ ہونے دے۔ اس کی زندگی میں ایسا کبھی نہ ہو کہ اس میں وضو کرنے کی طاقت نہ رہے یا اسے بیٹھ کر نماز پڑھنی پڑے۔ رکوع و سجود کی جو لذت کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں ہے، وہ بیٹھنے میں کہاں؟

اور ابھی تک اللہ نے اسے محروم نہیں ہونے دیا تھا۔

لیکن وہ جانتی تھی کہ ہے تو اب وہ بوڑھی ہی۔ اور اللہ نے کسی کو اس کی قوت کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔ تو قوت تو کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔ کسی کو بڑھاپے کیا جوانی میں، اور جوانی کیا، بچپن میں۔ البتہ بڑھاپے میں یہ ضرور ہوتا ہے کہ آدمی بڑھاپے میں اپنی سماعت کو موت کی آہٹ پر مرکوز کئے بیٹھا رہتا ہے۔ چھینک بھی آ جائے تو سوچتا ہے کہ کہیں بلاوا تو نہیں آ گیا۔

اسے خیال آیا کہ یہ بھی تو اللہ کی رحمت ہے۔ ورنہ لوگوں کو تو بڑھاپے میں بھی یہ خیال نہیں آتا کہ مرنا ہے، اور پھر اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ آدمی تو مرتے دم تک زندگی کی، اس کے لوازمات کی محبت میں گرفتار رہتا ہے۔ وہ آخری وقت میں بھی دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! تھوڑی سی مہلت اور دے دے، تاکہ میں یہ کرلوں، اپنے بچوں کی اولاد کو گود میں اٹھا لوں۔

یہ سوچتے ہوئے اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اس کا تو اپنا یہی حال ہے۔
ہاں، یہ اللہ کی رحمت ہے کہ وہ موت سے نہیں ڈرتی۔ نہ جانے کیسے اسے یہ یقین ہے کہ اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ اللہ اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرے گا۔ وہ یہاں سے بہتر وہاں رہے گی۔ ورنہ تو لوگ موت سے ڈرتے ہیں۔ لیکن اس ایک معاملے میں تو وہ بھی ایسی ہی ہے۔ ابھی موت سامنے آ کھڑی ہو تو وہ

تڑپ کر اللہ کو پکارے گی کہ ابھی نہیں میرے رب! بس ایک بار...... صرف ایک بار عبدالحق کے بچے کو گود میں لے کر پیار کرلوں۔ پھر ہنسی خوشی چلی آؤں گی۔

اس بات پر اسے نوربانو کی گفتگو یاد آ گئی۔ اور اپنا فیصلہ یاد آ گیا۔ نہیں، اب وہ اس پر عمل نہیں کرسکتی۔ وہ اتنی دور جا رہا ہے تو اس سے ایسی بات کیسے کی جا سکتی ہے۔

تب پہلی بار اسے اس جدائی سے خوف آیا۔ بڑھاپے میں کسی سے جدا ہونا تو ہے ہی خوفزدہ کر دینے والی بات۔ بوڑھا آدمی سوچتا ہے، یہ خیال تو لاشعور میں ہی دبا رہ جاتا ہے کہ اب کبھی اس سے مل بھی سکیں گے۔ اسے دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں۔ کیا پتا، یہ آخری ملاقات ہو۔ تو اسے چھو لیں، انگلیوں کی پوروں پر لمس کی صورت اسے محفوظ کر لیں۔ خوب دیکھیں۔ جی بھر کے دیکھیں، ایسے کہ آنکھوں کے راستے اسے دل میں اتار لیں۔

وہ جدائی سے ایسی ڈرنے والی نہیں تھی۔ جدائی اس کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اس نے تو دائمی جدائی بھی دیکھی تھی۔ اس نے شوہر بھی کھویا تھا اور اکلوتا بیٹا بھی۔ اور اس نے دیکھ لیا، اور جان لیا تھا کہ اللہ بندے سے کوئی قیمتی چیز لیتا ہے تو اس سے کہیں زیادہ قیمتی چیز دیتا بھی ہے...... صبر......! اور پھر اپنے ہی دیئے ہوئے اس صبر کے اجر میں اور بہت بڑی بڑی نعمتیں دیتا رہتا ہے، جیسے اپنا تعلق اور دوستی، اندر کی طمانیت اور آخرت کا شعور۔

لیکن شوہر اور بیٹے کو کھونے کے بعد اس کے پاس دو ہی چیزیں بچی تھیں۔ ان میں بھی ایک خیالی تھی۔ آرزو، تصور تک محدود۔ اس کے پاس عبدالحق کے سوا کیا رہا تھا، اور پھر اس کے بچے کی آرزو۔ تبھی تو آج اس نے نوربانو سے ظالمانہ حد تک بے رخی سے بات کی تھی۔ شاید غلط کیا تھا۔ شاید اسی لئے آج جدائی کا یہ حکم آ گیا۔ مگر وہ کیا کرتی۔ نوربانو کسی کوشش کے لئے آمادہ نہیں تھی۔ اور اپنی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ وہ مجبور ہوگئی تھیں۔ اور اب معاملات اس کے ہاتھ میں نہیں رہے تھے۔

معاملات تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اس نے کانوں کو چھوتے

ہوئے دل میں اللہ سے توبہ کی۔

بہرحال اس جدائی سے وہ صرف اپنے بڑھاپے کی وجہ سے نہیں ڈر رہی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ اس جدائی کی مدت نامعلوم تھی۔ وہ کئی برسوں پر بھی تو پھیل سکتی تھی۔ یہاں اس کا بڑھاپا اسے خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔ اتنے برسوں کی مہلت بھی ہوگی اس کے پاس؟

یہ سوچتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک شک نے سر ابھارا۔ کہیں وہ مایوس تو نہیں ہو رہی ہے۔ خوف کے بعد مایوسی ہی تو آتی ہے۔ اور یہ دنیا میں سب سے بری بات ہے۔ اللہ کی رحمت ہوتے ہوئے مایوس کیوں ہو آدمی۔ یہ بھی آزمائش ہوتی ہے ایک طرح کی۔

دوسروں کی دوسرے جانیں۔ اسے تو ڈرنا ہی نہیں چاہئے۔ ابھی شام کو ہی تو اس نے عبدالحق کو بتایا تھا۔ لیکن خود نہیں سمجھا تھا۔ اس سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ جدائی تو کچھ بھی نہیں۔ لال آندھی والے دن کی جدائی تو اس سے بہت بڑی تھی۔ جب اس نے عبدالحق کو رخصت کیا تو لال آندھی سر پر کھڑی تھی۔ عبدالحق اسے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ نہیں گئی۔ وہ جانتی تھی کہ عبدالحق کو تیز دوڑنا ہوگا۔ وہ ساتھ گئی تو اس کے لئے رکاوٹ بن جائے گی۔ اس سے نقصان ہی ہوگا عبدالحق کو۔

پھر کچھ امانتوں کا خیال بھی تھا اسے۔ لیکن جب موت سر پر کھڑی ہو تو امانت کی فکر کون کرتا ہے؟ اسے اپنی وہ پوری کیفیت یاد آ گئی۔ اسے ان لمحوں میں موت کا خیال نہیں تھا، امانت کی فکر تھی۔ تو یہ بھی تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ عبدالحق سے پھر ملے گی اور اس کی امانتیں اسے سونپے گی۔ یہ یقین کس نے دیا تھا اسے؟ اللہ کے سوا کون دے سکتا ہے؟

اور پھر عبدالحق کا واپس آنا اور اس سے ملنا معجزہ ہی تو تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑا معجزہ تو اس کا اپنا زندہ رہنا تھا۔ یہ تو وہی جانتی تھی کہ اللہ نے کیسے اسے زندہ رکھا تھا، کیسے اسے زندگی کا سامان عطا کرتا رہا تھا۔ جہاں گاؤں کے گاؤں ریت میں دفن ہوگئے تھے، اللہ نے اسے اس زمین پر زندہ رکھا تھا، کیسے؟

یہ اس نے دیکھا تو نہیں تھا۔ لیکن سمجھ تو سکتی تھی۔ محسوس تو کر سکتی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگی...... توبہ میرے رب! توبہ! مجھے ایمان دے میرے اللہ!

اس کا ہر ڈر، ہر خوف لٹ گیا۔ آندھی والے دن کی طرح اسے یقین تو نہیں تھا۔ لیکن وہ راضی بہ رضا ہوگئی تھی۔ اللہ کی مرضی کے آگے کس کی چلتی ہے۔ وہ جانے، جو اس نے لکھا ہے، وہی ہوگا۔ ہم دوبارہ ملے تو اس کا شکر، اور نہ ملے تو بھی اس کا شکر کہ اس میں بھی اس کی طرف سے کوئی بہتری ہی ہوگی۔

دل کو سکون آ گیا تھا۔ اور سکون آ جائے تو نیند تو آتی ہی ہے۔

❁ ❁ ❁

نور بانو بہت خوش اور بہت مطمئن تھی۔ ایسی خوشی، ایسا اطمینان اسے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ ذلت اور معزولی کے گہرے گڑھے میں گرنے والی تھی۔ لیکن اللہ نے اس وقت پر نہ صرف اسے بچا لیا تھا، بلکہ مکمل اقتدار بھی عطا کر دیا تھا۔

حمیدہ نے اسے بارہا بتایا تھا۔ لیکن آج اپنے دل میں پہلی بار اس نے یہ بات سمجھی تھی کہ وہ ناشکری ہے۔ نہ اللہ کا شکر ادا کرنے والی اور نہ ہی بندوں کی شکرگزار۔ اور اس کی وجہ بھی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ جانوروں کی سی زندگی گزارتی رہی تھی۔ وہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی عادی نہیں تھی۔ نہ اچھے وقت کو اور نہ کڑے وقت کو۔ اور جب آدمی پیچھے پلٹ کر ہی نہیں دیکھے گا تو اسے یہ کیسے یاد آئے؟ کہ اللہ نے اس پر کیسی کیسی کرم کی۔ اور کیسے کیسے کڑے وقت میں اس کی کیسی کیسی مدد فرمائی۔ اور جب اسے یہ یاد ہی نہیں ہوگا تو وہ شکر کیسے ادا کرے گا۔

اس نے پلٹ کر گہری نظر سے ماضی کو دیکھا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کی زندگی تو قصے کہانیوں جیسی ہے۔ اس پر تو بڑی عنایت رہی ہے اس کے رب کی۔ لیکن شکر تو کیا، وہ تو آج تک دل میں رب کے خلاف یہ شکایت لئے بیٹھی ہے کہ اس نے اسے اتنی معمولی شکل وصورت کے ساتھ کیوں پیدا کیا۔ اس

نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اللہ نے اس معمولی شکل و صورت کے ساتھ کیسا غیر معمولی نصیب عطا فرمایا۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ نصیب شکل و صورت کے مقابلے میں بہت بڑی چیز ہے۔

اسے عبدالحق اچھا لگا۔ اس نے عبدالحق کو چاہا۔ وہ اس وقت ہندو تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کبھی اسے پا سکتی ہے۔ اور وہ صورت شکل سے اس کے لائق تھی، نہ سیرت کے اعتبار سے۔ لیکن اللہ کا کرم کہ وہ اسے مسلمان ہو کر ملا۔ اور کتنا اچھا شوہر ثابت ہوا۔

پھر دہلی میں اس کا گھر اُجڑ گیا۔ سب لوگ مارے گئے۔ اللہ نے اسے بچایا، اور عزت کی زندگی عطا فرمائی۔ ورنہ اس عرصے میں کتنی ہی لڑکیوں نے عزت بھی گنوائی اور زندگی بھی۔ اور جو زندہ رہیں اور ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئیں۔ ارے..... اللہ نے تو کانٹوں سے بھرے اس راستے پر اس کے پیروں میں ایک معمولی سا کنکر بھی نہیں چبھنے دیا۔

وہ واقعی بہت ناشکری ہے۔

پھر اسے اللہ نے پھولوں سے سجا ہموار راستہ عطا فرمایا۔ اس پر خود اس نے اپنے لئے کانٹے بچھائے۔ رمضان کی طاق راتوں میں اس نے اپنی حاسدانہ فطرت سے مجبور ہو کر اپنی بدبختی کی دعا کی۔ اور اللہ کا کرم یہ ہے کہ اس نے اس کے پیروں کو اس کے اپنے بچھائے ہوئے کانٹوں سے بھی زخمی نہیں ہونے دیا۔ اور آج تو اللہ نے اس کی زندگی کو برباد ہونے سے بچا لیا۔

اب میں ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کروں گی۔ اس نے دل میں سوچا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ اسے جلدی نیند آ رہی تھی۔ شاید خوف سے نجات اور باطنی سکون کی وجہ سے۔ اس کیفیت میں اسے خیال آیا کہ اسے فوری طور پر شکر کے دو نفل ادا کرنے چاہئیں۔

اس نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو ایک خیال نے اسے روک دیا۔ فرض نماز تو پڑھنی نصیب نہیں ہوتی، اور شکر کے نفل ادا کرے گی۔

تو کیا ہوا؟ آج سے نماز بھی شروع کر دینی چاہئے۔ دل میں کسی نے

کہا۔

لیکن اس اعصاب شکن دن نے اسے توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ شدید اعصابی دباؤ کے بعد سکون ملے تو آدمی ڈھیر ہو جاتا ہے۔ نیند سے اس کا برا حال تھا۔

عشاء کی لمبی نماز، اس وقت تو ہمت نہیں، دماغ نے کہا۔

تو مختصر نماز پڑھ لی جائے۔ نور رکعت، دل بولا۔ اور پھر شکر کے دو نفل۔ آدھا گھنٹہ بھی نہیں لگے گا۔

اس وقت تو اس کی بھی ہمت نہیں۔ دماغ نے فیصلہ سنایا۔

چلو کوئی بات نہیں۔ اس نے سوچا۔ صبح ان کے الارم کے ساتھ اٹھوں گی اور فجر پڑھ لوں گی۔

لیکن وہ سوئی پھر بھی نہیں۔ دماغ میں سوچوں کا ہجوم تھا۔ طبیعت شکر کی طرف مائل تھی۔ یہ الگ بات کہ ابھی تک اس نے مسئلہ حل ہونے کا زبان سے بھی اللہ کا شکر ادا نہیں کیا تھا۔

اسے خیال تھا کہ انسانوں کی عنایات پر ان کا شکرگزار ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اور یوں دیکھا جائے تو اس کی سب سے زیادہ مستحق حمیدہ ہے۔ اس نے اسے سگی ماں کی طرح چاہا ہے۔ اس نے سوچا، اب وہ ہمیشہ حمیدہ کی عزت کرے گی، اس کی ہر بات مانے گی۔

لیکن یہ مزاروں پر جانا، بزرگوں کے پاس جانا، اسے یقین تھا کہ اس طرح کسی نہ کسی دن اس کی پول کھل جائے گی۔ یہ بات نہ ہوتی تو آج بات اتنی بڑھتی ہی نہیں۔ اس پر تو وہ سمجھوتہ کر نہیں سکتی۔ اور اس پر سمجھوتہ حمیدہ بھی نہیں کرے گی۔

ایک لمحے میں سب کچھ بدل گیا۔ یہ بات تو بن ہی نہیں سکتی۔ اس نے تلخی سے سوچا۔ اور ماضی میں جو بھی ہوا ہو، لیکن اب تو یہ تعلق دشمنی کا ہے، خاص طور پر حمیدہ کی آج کی دھمکی کے بعد۔ یہ طے ہے کہ حمیدہ کو جب بھی موقع ملا، وہ اس پر یہ وار ضرور کرے گی۔

ایک لمحے میں سارا تشکر تحلیل ہوگیا اور دفاعی تیاریوں کی فکر کرنے لگی۔
اب وہ دشمن بن کر ایک دشمن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ چند لمحے پہلے اس سے بہت چھوٹی باتوں پر وہ شرم سار ہو رہی تھی۔

اللہ آدمی کو بار بار موقع دیتا ہے...... دیتا رہتا ہے، اور بدنصیب اسے ضائع کرتے رہتے ہیں۔

نور بانو نے سوچا، کراچی جا کر وہ حمیدہ کے شر سے محفوظ ہو جائے گی۔
لیکن کب تک؟ اللہ کرے، وہ زندگی بھر کراچی میں رہی۔ لیکن اس کے باوجود عبدالحق حمیدہ سے ملنے تو آیا کرے گا اور وہ بھی اس کے ساتھ ہوگی۔ چلو، عام دنوں میں نہ سہی، عید بقرعید پر تو ایسا ہوگا ہی۔ تب وہ حمیدہ کو کیسے روک سکے گی۔ اس کی کوئی ترکیب کرنی ہوگی۔

ذہین تو وہ بے پناہ تھی، اور منفی معاملات میں اس کی ذہانت خوب کام کرتی تھی۔ اس نے ترکیب سوچ لی۔ اور اسے بھروسہ تھا کہ وہ کامیاب رہے گی۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے دور اندیشی سے کام لیا، اور پہلے ہی مسئلے کا حل تلاش کرلیا۔ ورنہ عین موقع پر بہت دشواری ہوتی۔

اس پر سوچتے سوچتے وہ سوگئی۔

الارم کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ نیند دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اسے یاد تھا کہ اس نے فجر کا ارادہ کیا تھا۔ ابھی وہ فجر پڑھتی، اور دوپہر میں ظہر کے بعد شکر کے دو نفل ادا کرتی۔
لیکن اس نیند میں بھی دماغ کام کر رہا تھا۔ اس نے بتا دیا کہ ابھی فجر کی اذان نہیں ہوئی ہے۔ عبدالحق تو اپنے معمول کے مطابق تہجد کے لئے اٹھا ہے۔ اسے اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ الارم کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکی کہ یہ اللہ کی رحمت ہے۔

تھوڑی دیر اور سولوں۔ فجر کے وقت اٹھ جاؤں گی۔ اس نے سوچا۔
ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں سرسراتے اس خیال سے بھی وہ ناواقف نہیں تھی کہ اب اس کی آنکھ معمول کے مطابق دوپہر سے پہلے نہیں کھلے گی۔

وہ مطمئن ہو کر دوبارہ سوگئی۔ اگلی بار اس کی آنکھ کھلی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

ارے......! یہ میں کیسے اٹھ گئی؟ سوتے ہوئے ذہن نے سوچا۔ ہاں، نماز پڑھنی ہے۔ مگر ابھی تو وقت ہے۔ زیادہ نہیں، میں بس پانچ منٹ اور سو لوں۔ اور وہ پھر سوگئی۔

اس کے بعد آنکھ کھلی تو سورج چڑھ چکا تھا۔
اس نے کچھ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اللہ نے رحمت کی تھی۔ اس جیسی سونے والی کو عین فجر کی نماز کے وقت جگا دیا تھا۔ لیکن اس نے رحمت سے منہ موڑ لیا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا، یہ بھی نہیں سمجھا کہ وہ رحمت اس کی اپنی بھلائی کے لئے تھی۔ اللہ کو نہ تو اپنے بندوں کی نماز کی ضرورت ہے، نہ ان کے شکر کی۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ وہ رحیم و کریم ہے۔ سرکشی اور نافرمانی کے باوجود اپنے بندوں پر کرم کرنا اس نے خود پر واجب کرلیا ہے۔ اس کی رحمت بے پایاں ہے۔

وہ اٹھی تو اسے نماز اور شکر کا نہیں، بس ناشتے کا خیال آیا۔

❁ ❁ ❁

ارجمند کی عجیب ملی جلی کیفیت تھی۔ بظاہر تو وہ خوش تھی۔ جب سے اس نے تبادلے کے امکان کے بارے میں سنا تھا، اس کا جی چاہتا تھا کہ آغا جی کا تبادلہ کہیں دور ہو جائے۔ وہ دور چلے جائیں گے تو وہ بڑی مشکل آزمائشوں سے بچ جائے گی۔

اللہ سے رابطے کی، اور اللہ کو راضی رکھنے کی اہمیت کو وہ کسی نہ کسی حد تک سمجھ گئی تھی۔ بڑے بڑے دانش مند لوگ بھی اس گمان میں رہتے ہیں کہ وہ سمجھ گئے ہیں، وہ تو پھر بہرحال چھوٹی سی بچی تھی۔ یہ کیسے سمجھ سکتی تھی کہ سب کچھ سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ بس یہ سمجھنا دشوار ہوتا ہے کہ سمجھاتا صرف اللہ ہی ہے۔ ورنہ عقل تو عقل مندوں کو صرف بھٹکاتی ہی ہے۔
وہ یہ تو سمجھتی تھی کہ اس پر اللہ کی بڑی رحمت ہے۔ اللہ کی رحمت نے تو

پوری کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے۔ وہ ہر وقت، ہر ایک کے ساتھ ہے۔ لیکن ہوا کی طرح اسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے، دیکھا نہیں جا سکتا۔ اب ہوتا یہ ہے کہ آدمی دنیا میں ایسا الجھا اور پھنسا ہوا ہوتا ہے کہ اس کے پاس سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ اور اللہ کی رحمت محسوس تب ہوگی، جب آدمی اپنے معاملات کے بارے میں سوچے گا۔ اور اگر فرصت مل بھی جائے، اور وہ سوچے بھی تو اوّل تو دنیا دار بن کر سوچے گا، اور دوسرے عقل سے سوچے گا۔ تو دنیا اسباب کا کارخانہ ہے۔ اور عقل محسوس کچھ نہیں کرتی، آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے کا تجزیہ کرتی ہے۔ تو پھر یوں ہوتا ہے کہ اس کا کوئی کام ہو جائے تو جس کے ذریعے کام ہوا ہو، وہ اسے سب سے پہلے نظر آتا ہے۔ ارے بھائی! اس بے مروّت آدمی کے دل میں جانے کیا آئی کہ میرا یہ کام کر دیا۔ ورنہ وہ ایسا ہے تو نہیں۔

اب دنیادار بھی دو طرح کے ہوتے ہیں، احسان شناس اور احسان ناشناس۔ احسان ناشناس لوگوں کا حافظہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ کبھی تو چند منٹ کے بعد بھی بات یاد نہیں رہتی۔ دوسرے وہ غرض کے بہت قائل ہوتے ہیں۔ کسی نے ان کا کام کر دیا تو وہ ایک لمحے کو اس کی تعریف کرتے ہیں۔ پھر اگلے ہی لمحے سوچتے ہیں کہ اس میں اس کی اپنی بھی تو کوئی غرض ہوگی۔ بے غرض کون کسی کے لئے کچھ کرتا ہے۔ سو ذرا ہی دیر میں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔

اور احسان شناس کی یادداشت اس کی احسان شناسی کی نسبت دیرپا ہوتی ہے۔ جتنا وہ احسان شناس ہوگا، اتنا ہی اس کا حافظہ قوی ہوگا۔ وہ کہے گا کہ ان صاحب نے مجھ پر بڑی مہربانی کی۔ میرا کام کر دیا۔ اور وہ اس کام کرانے والے کو یاد رکھے گا اور اس کی عزت کرتا رہے گا۔

اللہ نیکی کے بدلے نیکیاں عطا فرماتا ہے۔ اور احسان شناس بھی نیکی ہے۔ جس نے احسان شناسی کی، اس نے دنیا کے اسباب کے نظام کو تسلیم تو کیا۔ چاہے یہ نہیں سمجھا کہ یہ نظام اللہ نے قائم کیا ہے۔ اس نے بندے کا احسان تو مانا۔ یہ عمل اللہ سے رجوع کرنے کا ہے۔ غیر ارادی سہی، بے خبری میں سہی۔ تو اس کی یہ نیکی اللہ بڑھائے گا۔ احسان شناس بھی بڑھے گی اور ادراک بھی۔ یہ

عمل جاری رہے گا تو ایک دن وہ سمجھ لے گا کہ اسباب کا وہ سلسلہ اللہ کا قائم کیا ہوا ہے، اور پہلے اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

عجیب بات ہے۔ ہم لفظوں کی شکل میں دل کا استعمال بہت کثرت سے کرتے ہیں، اور عقل کا بہت کم۔ لیکن عملی زندگی میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ عقل دماغ میں موجود ایک غیر مرئی صلاحیت ہے۔ اسے آپ قوتِ تجزی کہہ لیجئے۔ وہ معاملات کی چھان پھٹک کرتی ہے، اور اس کے بعد فیصلہ کرتی ہے۔ جو لوگ دل کی باتوں پر عمل کرتے ہیں، انہیں ہم جذباتی اور غیر عملی قرار دیتے ہیں۔

ارجمند کو دل کا تجربہ بہت کم عمر میں ہوگیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ باہر کی دنیا میں اس کے پاس پھپھو کے سوا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اور جب آدمی کے پاس باہر کچھ نہ بچا ہو تو وہ اپنے اندر کی دنیا سے رجوع کرتا ہے، اور اندر کی دنیا دل کی دنیا ہے۔ ایسا تو بڑے لوگوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے، ارجمند تو بہت چھوٹی بچی تھی۔

جب ارجمند نے پہلی بار عبدالحق کو دیکھا تو وہ اسے بہت اچھا لگا...... شہزادوں جیسا۔ اور اس نے سوچ لیا کہ بس وہ اسی سے شادی کرے گی۔ اس وقت وہ شادی کا مطلب بھی نہیں سمجھتی تھی۔ پوری طرح تو وہ اب بھی نہیں جانتی تھی۔ بس اتنا سمجھتی تھی کہ شادی ہو جائے تو دو افراد زندگی بھر ایک ساتھ رہتے ہیں۔

وہ دل کی بات تھی۔ عقل اس وقت اس میں نہیں تھی۔ اس نے تو بس اسے تصور میں بسا لیا، اور اس کی تصویریں بنانے لگی۔ تصویر اس نے پھپھو کو بھی دکھائی۔ پھپھو عقل والی تھیں، دنیا میں پھنسی ہوئی۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ ایسا ممکن نہیں۔ ایک شخص آپ کے سامنے سے گزر رہا ہو تو آپ اس سے تعلق نہیں جوڑ سکتے۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ آپ کو دوبارہ اسے دیکھنا بھی نصیب ہو۔ پھر اتفاق کی بات کہ پھپھو اسے جانتی بھی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہندو ہے۔

لیکن ارجمند جسے پھپھو سے بات کرنے کا موقع بھی کم ہی ملتا تھا، اس کے پاس باتیں کرنے کے لئے خود اپنے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ سو وہ دل سے

باتیں کرنے کی عادی تھی۔ اور نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے اپنے دل کی باتوں پر بہت یقین تھا۔ دل نے اسے بتایا کہ اس کا شہزادہ بہت اچھا ہے، اور وہ اسے ملے گا بھی، تو اس نے یقین کر لیا۔ پھپھو اسے سمجھاتی رہیں۔ لیکن وہ تو بس اپنے دل کی سنتی تھی۔

پھر اسے پتا چل گیا کہ دل میں اللہ میاں رہتے ہیں۔ اور جب تک اللہ میاں دل میں ہیں، دل کی بات سچی ہوتی ہے۔ دل سچ بولتا ہے، صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ بس اس کے لئے دل کو پاک صاف رکھنا ضروری ہے۔ اور اس کے لئے آدمی کو بری باتوں سے بچنا ہوتا ہے۔ اللہ کے حکم ماننے ہوتے ہیں، نافرمانی سے بچنا ہوتا ہے، جن کاموں کو اللہ نے منع کیا ہو، وہ نہیں کرنے ہوتے۔ اس کے خلاف ہو تو اللہ میاں اس دل میں نہیں رہتے۔ اور وہ نہیں رہتے تو دل کی بات بھی سچی نہیں رہتی اور دل صحیح راستہ بھی نہیں دکھاتا۔

پھر اس نے یہ دیکھ بھی لیا کہ دل کیسا سچا تھا۔ کیسے عبدالحق اس تک پہنچا اور کیسے وہ اس تک پہنچی، اس پر پھپھو بھی حیران تھیں۔ اور وہ خود اس وقت بچی نہیں رہی تھی۔ کچھ بڑی ہوگئی تھی۔ دنیاوی معاملات کی مشکلیں اور ناممکنات پوری طرح نہ سہی، کچھ کچھ تو اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ جو کچھ ہوا، وہ بظاہر ناممکن تھا۔

لیکن سب سے بڑی بات، جس نے اس کے دل اور اللہ کے تعلق کے ایمان کو پختہ کر دیا، وہ یہ تھی کہ پھپھو کی معلومات غلط ثابت ہوئیں۔ اور اس کا دل سچا نکلا۔ جب اس نے عبدالحق کو پہلی بار دیکھا، وہ اس وقت مسلمان تھا۔

اس کے بعد اس نے اپنے دل کو، اور اس میں موجود اللہ کی آواز کو اپنی سب سے قیمتی چیز سمجھ لیا۔ عبدالحق کی محبت سے بھی قیمتی! دل اس کا راہنما تھا۔ وہ اسے بعض اوقات ایسی باتوں پر بھی ٹوک دیتا تھا، جو اس کے نزدیک بری نہیں تھیں۔ لیکن وہ دل کی بات مان کر ان سے رک جاتی تھی۔ بعد میں اسے پتا چلتا تھا کہ اگر وہ بری نہیں بھی تھیں تو اس کے لئے نقصان دہ ضرور تھیں، اور دل کی بات مان کر وہ کسی نقصان سے بچ جاتی تھی۔ اب ایسے قیمتی راہنما کو تو کسی بھی

قیمت پر نہیں چھوڑا جا سکتا ہے نا!

لیکن اب وہ بڑی ہو رہی تھی۔ وجود میں ایسے انجانے، ناقابل فہم جذبے سر اٹھانے لگے تھے۔ وہ خواب دیکھتی، جو آنکھ کھلنے پر اسے یاد نہیں ہوتے تھے۔ لیکن دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا ہوتا تھا۔ اور وہ ڈراؤنے خواب نہیں تھے، اور دل کی وہ کیفیت خوف کی بھی نہیں ہوتی تھی۔ یہ بات خواب یاد نہ رہنے کے باوجود وہ پورے یقین سے کہہ سکتی تھی۔ بلکہ معاملہ برعکس تھا۔ اس کی وہ کیفیت بہت لطیف، بہت خوب صورت ہوتی تھی۔ اس کا سبب کیا تھا، یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ البتہ وہ جاگنے کے بعد بھی کبھی کبھی آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتی کہ شاید وہ خواب پھر آ جائے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

اور کم کم، کبھی کبھی وہ ایسا خواب بھی دیکھتی تھی کہ آنکھ کھلتی تو وہ محجوب ہوتی۔ حیا سے اس کی پلکیں لرز رہی ہوتیں۔ وہاں حمیدہ سو رہی ہوتی تھی، اور کمرے میں کوئی بھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ کوشش کے باوجود نظر نہیں اٹھا پاتی تھی۔ ایک بار تو وہ اٹھ کر آئینے کے سامنے بھی گئی کہ اپنے چہرے کو دیکھے تو سہی، کوئی خاص بات ہے کیا۔ لیکن اس سے نظر اٹھائی ہی نہیں گئی۔

اور ایک بار...... صرف ایک بار ایسا ہوا کہ وہ خواب دیکھ کر اٹھی تو اس کا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ اور شرمندگی کا بہت شدید احساس اسے ستا رہا تھا۔ اس بار بھی خواب کی ایک جھلک تک اسے یاد نہیں تھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ شرمندگی کے شدید احساس کے باوجود اس کے اندر کی کیفیت میں وہی لطافت اور خوب صورتی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔

اس نے دل سے پوچھا، یہ سب کیا ہے؟ وہاں سے بے پرواہی سے جواب ملا...... کوئی خاص بات نہیں۔ ایسا سب کے ساتھ ہوتا رہتا ہے اس پر سوچنے کی ضرورت بھی نہیں۔

وہ دل کی بات ماننے والی تھی۔ وہ اللہ کو خفا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سو حد درجہ تجسس کے باوجود اس نے دل کی یہ بات بھی مان لی۔

لیکن جب وہ عبدالحق کے ساتھ تنہائی میں اس سے پڑھنے کے لئے

بیٹھی تو وہ اس کے لئے آزمائش بن گئی۔ عبدالحق کو وہ ویسے ہمیشہ دیکھا کرتی تھی۔ اسے دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ مگر پڑھنے بیٹھی تو عجیب بات ہوئی۔ اس نے عبدالحق کی طرف دیکھنا چاہا تو اسے پہلی بار ایسا لگا کہ جیسے یہ کوئی بری بات ہے۔ پھر بھی ایک بار اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ عبدالحق اس وقت اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے فوراً ہی نظر جھکا لی۔ یہ اسے اچھا نہیں لگا۔ نہ جانے کیوں اسے ایسا لگا کہ عبدالحق کو یہ بات اچھی نہیں لگے گی۔

تب تک دل نے اسے اس بات پر نہیں ٹوکا تھا۔

مگر پھر وہ چپکے چپکے عبدالحق کو دیکھنے لگی۔ یہ وہ پہلا موقع تھا، جب اسے اپنے وجود میں انجانے اور ناقابلِ فہم جذبوں کے سر اٹھانے کا احساس ہوا۔ وہ اسے دیکھتی تھی تو کچھ جی چاہتا تھا...... کیا؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اور وہی موقع تھا کہ دل نے اسے ٹوک دیا۔ بری بات...... ایسا نہیں کرتے۔ وہ دل کی صدا کی فرمانبردار تھی۔ فوراً مان گئی۔ مگر آگے جا کر یہ احساس ہوا کہ اس بار یہ اتنا آسان نہیں۔ عبدالحق کو دیکھنے کو بار بار جی چاہتا تھا۔ آنکھیں مچل مچل جاتی تھیں۔ انہیں روکنا مشکل ہو جاتا تھا، ناممکن لگنے لگتا تھا۔ عبدالحق کی آواز اسے سنائی نہیں دیتی تھی۔ اسے کسی بھی چیز کا احساس نہیں رہتا تھا۔ جسم و جاں کی ساری توانائی نظر کو اٹھنے سے روکنے میں صرف ہو جاتی تھی۔

پھر وہ مسئلہ ختم تو نہیں ہوا، لیکن آگے جا کر اتنا مشکل بھی نہیں رہا۔ دل نے اسے سمجھا دیا کہ اسے قرآن پر زیادہ توجہ دینی چاہئے۔

یہی وہ عرصہ تھا جب عبدالحق کے بیرونِ شہر تبادلے کا امکان سامنے آیا، اور اس کا جی چاہا کہ کاش وہ تبادلہ ہو ہی جائے۔

اب وہ بڑی ہو رہی تھی۔ دنیا کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔ عبدالحق کے لئے اس کی محبت ویسی ہی تھی۔ لیکن نور بانو کے حوالے سے اب محبت اسے بوجھ لگنے لگی تھی۔ وہ اس سے بہن جیسی سچی محبت کرنے والی نور بانو کا شوہر تھا۔ کیا ایسے میں اس کی عبدالحق سے محبت درست ہے؟ وہ اکثر بے بسی سے اس پر سوچتی۔ بس ایک بات اس کے حق میں جاتی تھی۔ جب اسے عبدالحق سے محبت

ہوئی تو وہ نور بانو کو جانتی بھی نہیں تھی۔ دوسرے دل نے اس سے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ اس محبت کو ختم کر دے۔ بلکہ اس کی الجھن پر دل نے کہا تھا کہ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، اور ہر کام اپنے وقت پر خود بخود ہو جاتا ہے۔ دل نے کبھی یہ نہیں کہا کہ عبدالحق اسے نہیں ملے گا۔ بلکہ دل نے ہمیشہ یقین دلایا کہ عبدالحق اسے ضرور ملے گا۔ لیکن اپنے وقت پر۔ اور وہ اس کی کوشش سے نہیں، اس کے صبر اور اللہ کے حکم سے اسے ملے گا۔

اس پر غور کرنا تو فطری تھا کہ اس صورتِ حال میں وہ اسے کیسے مل سکتا ہے۔ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی۔ لیکن ایک امکان کے سوا اسے کچھ سجھائی نہیں دیا۔ اور وہ واحد امکان ایسا تھا کہ وہ ذہن میں آیا تو تھرا کر رہ گئی۔ نہیں...... یہ تو وہ ہرگز بھی نہیں چاہتی۔ اس کے مقابلے میں تو عبدالحق کی محبت کو زبردستی اپنے دل سے نکال دینا کہیں بہتر ہے۔

اس دن سے وہ نور بانو کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کرنے لگی۔

دل نے اسے محبت ختم کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، صرف اس پر پابندیاں لگائی تھیں۔ لیکن ان پابندیوں پر عمل کرنا ہرگز آسان نہیں تھا۔ بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان پر عمل کرنا دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔

ایسے میں عبدالحق کے تبادلے کی بات سامنے آ گئی۔ جو وہ کب سے چاہتی تھی۔ اور اللہ کی قدرت اور اس کی آزمائش کہ فیصلے کا بوجھ اس پر ڈال دیا گیا۔ عبدالحق نے کہہ دیا تھا کہ اسکول تو کراچی میں بھی ہیں، اور حمیدہ نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا۔

اس کا فیصلہ تو جدائی قبول کرنے کا تھا۔ لیکن اسے حمیدہ کا خیال تھا، اس کے لئے اس عمر میں عبدالحق سے دور ہونا ظلم تھا۔ لیکن حمیدہ کے انداز سے واضح تھا کہ وہ جانا نہیں چاہتی۔ اس طرح فیصلہ اس کے لئے آسان ہو گیا۔

بڑی بات یہ تھی کہ عبدالحق نے پڑھائی کے معاملے میں اسے اس کے پیروں پر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کا پڑھانے کا طریقہ ہی ایسا تھا۔ چنانچہ ارجمند کو اس طرف سے تو کوئی فکر نہیں تھی۔ اور رہا ذاتی معاملہ، تو اس میں ایثار کرنا وہ پہلے ہی

سیکھ چکی تھی۔

بس ایک بات سے اس کا دل گھبراتا تھا۔ جدائی کا فیصلہ تو اس کے اختیار میں تھا۔ لیکن اس کے بعد اس کے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ جدائی کتنی طویل ہوگی۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ انتظار میں اس کی آنکھیں ہی پتھرا جائیں۔

ایک لمحہ کو اسے ڈر لگا۔ لیکن پھر اسے دل کی بات یاد آ گئی۔ دل نے کہا تھا ..... وہ تجھے ضرور ملے گا۔ لیکن مقررہ وقت، جب وہ وقت آئے گا تو ہر مشکل خودبخود آسان ہو جائے گی۔ سب کچھ خودبخود ہو جائے گا۔

اس کے بعد وہ بےفکر ہوگئی۔

❁ ❁ ❁

وہ ایک ہفتہ تو پَر لگا کر اُڑ گیا۔ کام ہی اتنے تھے، مصروفیت ہی اتنی تھی۔ وہاں ایک نہیں، دو ٹرانسفر ہو رہے تھے۔ گاؤں سے زبیر اپنی فیملی کے ساتھ لاہور منتقل ہو رہا تھا۔

عبدالحق کو کراچی سے زیادہ یہاں کی فکر تھی۔ سب سے ضروری کام ٹیلی فون کا کنکشن لینا تھا۔ کراچی جانے کے بعد وہ فون پر رابطہ تو رکھ سکتا تھا۔ اماں کی آواز تو سن سکتا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ حمیدہ بھی فون پر اس کی آواز سنے گی تو فاصلوں کو بھول جائے گی۔

لیکن فون کا کنکشن ملنا آسان نہیں تھا۔ مسعود صاحب نے اس سلسلے میں اس کی بہت مدد کی۔ بالآخر کنکشن مل ہی گیا۔

زبیر کو اس نے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ بینک میں اس کا اکاؤنٹ بھی کھلوا دیا تھا۔ زبیر کہتا رہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ گاؤں کے تمام معاملات تو اسی کے اختیار میں تھے۔ لیکن عبدالحق جانتا تھا کہ زبیر آمدنی کا بڑا حصہ اس کے اکاؤنٹ میں جمع کراتا ہے۔ اس لئے اس نے یہاں کے اکاؤنٹ میں زبیر کے نام کافی رقم جمع کرا دی۔

اتنے برسوں میں زبیر کافی تبدیل ہوا تھا۔ گاؤں کے معاملات کلی طور پر

سنبھالنے کے نتیجے میں اس کے اندر خوداعتمادی پیدا ہوئی تھی۔ پھر عبدالحق بھی مسلسل اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ عبدالحق کے مسلسل ٹوکنے پر اس نے عبدالحق کے لئے ایک نیا لفظ وضع کر لیا تھا..... کاکا۔ یہ عبدالحق کو بھی اچھا لگتا تھا۔

سب کچھ ہوا، لیکن زبیر کی وفاداری ناقابل شکست رہی۔ عبدالحق اور اس کے گھر کے لوگوں کے لئے وہ آج بھی ویسا ہی وفادار غلام تھا۔ ہاں، اب اسے بولنا بھی آ گیا تھا۔ اس کی زبان بھی مختلف ہوگئی تھی۔

اس رات کھانے کے بعد وہ ساتھ بیٹھے تھے کہ زبیر نے کہا۔

''آپ جانتے ہیں کاکا کہ میں لاہور آنے کی آرزو کرتا تھا۔''

''اور آپ کی آرزو پوری ہوگئی۔'' عبدالحق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں! وہ تو آپ کے قدموں میں رہنے کی آرزو تھی۔''

عبدالحق نے اسے گھور کر دیکھا۔

''میرا مطلب ہے کاکا کہ میں اماں کے قدموں میں زندگی گزارنا چاہتا تھا۔'' زبیر نے جلدی سے گھبرا کر تصحیح کی۔

''تو اماں تو یہاں موجود ہیں نا!'' عبدالحق پھر مسکرایا۔

''جی ہاں کاکا.....! زبیر نے بےبسی سے کہا۔

''اماں تو موجود ہیں، پر آپ تو نہیں ہوں گے نا!''

''تو اسی لئے تو آپ کو لاہور بلایا ہے۔ ورنہ تو گاؤں میں آپ کی موجودگی زیادہ ضروری تھی۔''

''گاؤں کی تو آپ فکر نہ کریں۔ وہاں اپنے تمام کارندے آپ سے محبت کرنے والے ہیں کاکا! وہاں سب کچھ ٹھیک رہے گا۔''

''لیکن ساجد کی تعلیم کا حرج نہ ہو۔''

''نہیں ہوگا کاکا! یہاں تو اور اچھے اسکول میں پڑھے گا وہ۔ میں تو شروع ہی سے اسے آپ کے پاس یہاں چھوڑنا چاہتا تھا۔''

عبدالحق شرمندہ ہوگیا۔ وہ یہ بات جانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ صرف نوربانو کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ ورنہ وہ تو ساجد سے بہت محبت کرتا تھا۔

اور ساجد کے لئے تو بس اتنا کہنا ہی کافی تھا کہ وہ زبیر اور رابعہ کا بیٹا تھا۔ عبدالحق سے وفاداری اور محبت تو اس کے خون میں شامل تھی۔

عبدالحق نے زبیر کو اپنے مری والے بنگلے کے متعلق بھی بتا دیا تھا اور شمریز اور نوریز سے اس کا تعارف بھی کرا دیا تھا۔ اس نے طے کیا تھا کہ یعقوب کو اپنے ساتھ کراچی لے جائے گا۔ یوں وہ گاڑی بھی اس کے پاس رہے گی۔

لاہور میں اپنے آخری دن میں عبدالحق کو ایک بڑی کامیابی یہ ملی کہ ساجد کا بھی اسکول میں داخلہ ہوگیا۔

اور اگلا دن جدائی کا تھا۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے، سوائے حمیدہ کے۔ وہ عبدالحق کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ گئی۔

''نا پتر! ایسا نہیں کرتے۔'' اس نے کہا۔

''تو تو دیکھ چکا ہے کہ ربّ کیسے بچھڑے ہوؤں کو ملا دیتا ہے۔''

''ہاں اماں! جانتا ہوں۔ پر کیا کروں، دل نہیں مانتا۔''

حمیدہ نے اس کے اور نوربانو کے امام ضامن باندھے اور سر پر ہاتھ رکھا۔

''سوہنا ربّ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔''

اس لہجے حمیدہ کے خلوص اور محبت نے نوربانو کے دل کو چھولیا۔ ایک دم نہ جانے کیا ہوا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اور پھر حمیدہ سے لپٹ گئی۔

''اماں! میرا سب کہا سنا معاف کر دینا۔ کبھی کبھی مجھے نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔''

حمیدہ اس کی پیٹھ تھپکتی رہی۔

''تو تو میری دھی ہے۔ بیٹی ہے میری۔ میں تجھ سے خفا ہی نہیں تو معاف کرنا کیسا؟''

اچانک عبدالحق کو ارجمند کا خیال آیا۔

''ارے...... یہ ارجمند کہاں ہے؟''

''میں دیکھ کر اسے لاتی ہوں۔'' نوربانو نے کہا۔

ارجمند اسٹڈی میں دبکی بیٹھی تھی۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ فیصلہ کرنا ایک بات ہے، اور اس پر عمل کرنا دوسری بات۔ فیصلہ تو زبان ہلائی اور کر دیا۔ لیکن بڑے فیصلے عمل درآمد کے وقت آدمی کے لئے آزمائش بن جاتے ہیں۔

ابھی تک اس کی آنکھیں بھیگی بھی نہیں تھیں۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ پلکوں کے پیچھے سمندر موجیں مار رہا ہے، بس ایک بہانے کا منتظر ہے۔ وہ جانتی تھی کہ جانے والوں کا سامنا کرنا اور انہیں خداحافظ کہنا اس کے بس کی بات نہیں۔

یوں کہنے کو تو اس نے بڑی بڑی جدائیاں دیکھی تھیں۔ اپنا پورا گھرانہ، گھر کا ایک ایک فرد اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا تھا۔ ماں، باپ، دادا، دادی، چچا...... سب کے سب، لیکن ان کے بچھڑنے کا علم اسے پھپھو کی زبانی ہوا تھا۔ اس نے تو ان میں سے کسی کی بھی جدائی کا منظر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے بس ایک جدائی دیکھی تھی...... پھپھو کی جدائی...... اور اس نے اس کا دل جیسے کاٹ ڈالا تھا۔ اس ایک جدائی میں پچھلی تمام جدائیاں بھی شامل ہوگئی تھیں۔

اس نے دل کو بہت تسلی دی تھی کہ یہ جدائی انشاء اللہ عارضی ہے۔ آگے کسی بہتر وقت میں ملنے کے لئے ہے۔ اس کے باوجود اس میں ہمت نہیں تھی کہ جانے والوں سے ملے، اور انہیں الوداع کہے۔

''ارے...... تم یہاں چھپی بیٹھی ہو۔''

نوربانو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اٹھی اور دل کو حوصلے کی تلقین کرتے ہوئے نوربانو کا سامنا کیا۔

''نہیں آپی! چھپی ہوتی تو آپ تلاش کیسے کرتیں مجھے؟''

نوربانو نے اسے لپٹا لیا۔

''میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں ساتھ لے جاتی۔''

''نہیں آپی! جو ہوتا ہے، اس میں اللہ کی طرف سے بہتری ہوتی ہے۔''

نوربانو نے محبت سے اس کے آنسو پونچھ دیئے۔

''چلو! چل کر ان سے بھی مل لو۔ وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔''

ارجمند نے حوصلہ مجتمع کیا، ضبط کا ایک اور بند باندھا، اور نور بانو کے ساتھ چل دی۔

عبدالحق نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ روئی روئی متورم آنکھیں۔

''کیا تم ہمیں خدا حافظ بھی نہیں کہنا چاہتی تھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں تو آپ دونوں کو پہلے ہی اللہ کی امان میں دے چکی تھی آغا جی!''

عبدالحق کو اس کی عمر کے لحاظ سے وہ جملہ بہت بڑا لگا۔ لیکن اب وہ اس کا عادی ہونے لگا تھا۔

''پھر بھی، لوگوں کو رخصت کرنا، الوداعی ملاقات کرنا اور زبان سے خدا حافظ کہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔''

''مجھے خدا حافظ نہیں، خوش آمدید کہنا اچھا لگتا ہے آغا جی!'' ارجمند نے بڑی مشکل سے کہا۔ ضبط کسی بھی لمحے جواب دے سکتا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ارجمند! اگر تم کچھ کر سکو تو......''

''آپ کا کہنا میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے آغا جی!''

''اماں کا خیال رکھنا، اپنی پڑھائی پر دھیان رکھنا اور کبھی رونا نہیں۔''

عبدالحق نے آگے بڑھ کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ ارجمند کے لئے بڑی آزمائش کا لمحہ تھا۔ اس ہاتھ کے لمس نے اس کے وجود میں پھر انجانے جذبے جگا دیئے۔ بڑی شدت سے اس کا جی چاہا کہ وہ آغا جی سے لپٹ جائے۔ ایک ثانیے میں وہ سمجھ گئی کہ اس جذبے میں معیت نہیں، معصومیت ہے۔ اس لمحے وہ چھوٹی سی بچی تھی، اور آغا جی اس کے بڑے۔ لیکن دل میں موجود محبت کا تقاضا تھا کہ وہ اس آزمائش سے سرخ رو نکلے۔

اس نے سر اٹھا کر ایک پل آغا جی کو اور پھر آپی کو دیکھا۔ پھر اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''خدا حافظ آغا جی! خدا حافظ آپی!'' اور اس کے ساتھ ہی ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ پلٹی اور روتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بھاگتی چلی گئی۔

ماحول کی اداسی اور گہری ہوگئی۔ جانے والوں کی روانگی کا وقت بھی ہو چکا تھا۔

❁ ❁ ❁

گھر سنسان لگ رہا تھا۔

ارجمند نے سوچا، کیسی حیران کر دینے والی بات ہے۔ تعداد کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ تعداد کے اعتبار سے گھر میں کوئی کمی تو نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ دیکھا جائے تو ایک اہم اضافہ ہی ہوا تھا۔ دو افراد گھر سے گئے تھے، اور تین آئے تھے۔ اس طرح گھر کی رونق میں اضافہ ہونا چاہئے تھا۔ بلکہ چھ سالہ ساجد کے آنے سے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جبکہ عبدالحق اور نور بانو کی جگہ زبیر اور رابعہ آ گئے تھے۔ لیکن گھر تھا کہ خالی خالی، اجڑا اجڑا لگ رہا تھا۔

پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ مکان اور گھر میں فرق ہوتا ہے۔ اسے تو یہ بات پہلے ہی سمجھ لینی چاہئے تھی۔ دہلی میں اس نے گھر دیکھا تھا، اور لاہور آ کر مکان۔ لاہور میں وہ جہاں رہتی تھی، وہ بڑا گھر تھا۔ لیکن نہیں، نہ تو وہ اس کے لئے گھر تھا، نہ ہی پھپھو کے لئے۔ پھپھو نے کبھی اس سے کہا نہیں۔ لیکن اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ پھپھو ایک گھر کی آرزو کرتی تھیں۔ اگر اللہ نے انہیں زندگی دی ہوتی اور پھپھا سے ان کی شادی ہوگئی ہوتی تو انہیں گھر مل جاتا۔

مکان! مکان اینٹوں اور گارے سے بنی چار دیواری کے اندر کمرے ہوتے ہیں۔ وہ خالی ہو، تب بھی مکان ہوتا ہے۔ وہاں ضرورت کی تمام چیزیں ہوں، فرنیچر ہو، کتابیں ہوں، کھانے پینے کا سامان ہو، تب بھی وہ مکان ہی ہوتا ہے۔ گھر تو وہ انسانوں کے آباد ہونے سے بنتا ہے۔ اور گھر والے چلے جائیں تو وہ پھر مکان ہو جاتا ہے۔ جیسے اجڑا ہوا دل......!

اسے یاد تھا، جب وہ پہلی بار سب لوگوں کے ساتھ گاؤں گئی تو وہ لوگ گاؤں والے مکان میں ٹھہرے۔ تھا تو وہ مکان ہی، لیکن نہ جانے کیوں سب لوگ اسے حویلی کہتے تھے۔ تو وہاں اس کا دل بہت گھبرایا تھا۔ حالانکہ وہاں گرد کا نام و نشان نہیں تھا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی، اور اپنی جگہ پر قرینے سے رکھی تھی۔

پوچھنے پر پتا چلا کہ رابعہ خالہ وہاں ہر روز آتی ہیں، اور صفائی کرتی ہیں۔ اس نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ لوگ یہاں کیوں نہیں رہتے تو رابعہ نے کہا تھا...... کاکا اور اماں کے بغیر دل ہی نہیں لگتا ہے یہاں۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ یہ لوگ دوسرے گھر میں بھی تو رہتے ہی ہیں نا...... اور وہ بھی آغا جی اور دادی اماں کے بغیر۔ تو وہاں انہیں یہ لوگ کیوں یاد نہیں آتے۔ اس نے رابعہ سے یہ بات پوچھی بھی تھی۔ لیکن سیدھی سادی رابعہ کوئی وضاحت نہ کرسکی۔ وہ تو بس یہی کہتی رہی کہ کاکا اور اماں کے بغیر حویلی میں دل نہیں لگتا۔ حویلی سنسان لگتی ہے۔

اب آغا جی اور آپی کے بغیر گھر اسے سنسان لگ رہا تھا۔ خود پر گزری تو بات سمجھ میں آئی۔ وہ گھر میں کہیں بھی جاتی، چلتی پھرتی، اسے ایک انجانی سی کمی کا احساس ستاتا۔ غور کرنے پر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ تو اس شام وہ پڑھنے کے لئے اسٹڈی میں گئی تو پرانے ایک حوالے سے بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

ارے......! یہ تو پہلے بھی ہو چکا ہے میرے ساتھ۔

آغا جی جب پہلی بار دفتر گئے تھے تو ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ یہاں اکیلی پڑھنے کے لئے بیٹھی تو اسے لگا کہ اسٹڈی ویران ہے۔ حالانکہ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ بس آغا جی موجود نہیں تھے۔ ان کی خالی کرسی کو دیکھ کر اسے لگا تھا کہ اس کے دل میں کوئی آباد گوشہ تھا، جو اچانک خالی ہوگیا ہے۔

مگر جب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔ جب اسے معلوم تھا کہ آغا جی شام کو دفتر سے آجائیں گے۔ رات کو وہ اسی کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھائیں گے۔ جبکہ اب وہ جانتی تھی کہ وہ بہت دور چلے گئے ہیں، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی واپسی کب ہوگی۔

یہ خیال آتے ہی اسے ایسا لگا کہ اس کا پورا دل ویران ہوگیا ہے۔

اب وہ سمجھ سکتی تھی۔ آدمی دوسروں کے تجربات سے کچھ سیکھ تو سکتا ہے، لیکن گہرائی کے ساتھ سمجھ صرف اسی وقت سکتا ہے، جب اس پر گزرے۔ اس کا اپنا تجربہ ہو۔ اور شاید وہ اس لئے زیادہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ پیدائشی طور پر مصورہ

تھی۔

مکان کی ایک اپنی شکل وصورت ہوتی ہے، اپنے خدوخال ہوتے ہیں، جو کبھی نہیں بدلتے۔ جیسے انسان بوڑھے ہوتے ہیں، ویسے یہ مکان بھی بوڑھے ہوتے ہیں۔ خدوخال کا تیکھا پن رخصت ہو جاتا ہے۔ صورت سے بوسیدگی جھلکنے لگتی ہے۔ لیکن بنیادی نقشہ وہی رہتا ہے۔ اور اس کا تعلق آنکھوں سے ہوتا ہے۔

لیکن گھر آراستہ ہوتا ہے۔ مکین اس کی آرائش، اس کا سنگھار ہوتے ہیں۔ مکان ظاہری جسم ہے تو گھر باطنی شخصیت۔ جسم کتنا ہی خوب صورت ہو، شخصیت کے بغیر کشش سے یکسر محروم ہوتا ہے۔ گھر مکینوں کی شخصیت مستعار لیتا ہے۔ وہ اسٹڈی کو دیکھتی ہے تو آغا جی کا سراپا نظر آتا ہے۔ نہیں، نظر نہیں آتا، محسوس ہوتا ہے۔ یہی تو باریک سا فرق ہے۔ جیسے دل کی آنکھ دیکھتی ہے۔ مکان آنکھوں کو نظر آتا ہے۔ اور گھر کے بارے میں سب کچھ محسوس کیا جاتا ہے۔ گھر کے خدوخال مکینوں سے بنتے ہیں۔ آپی کی خواب گاہ میں وہ کم ہی جاتی تھی۔ پتا نہیں کیوں، اس کمرے کی فضا میں اسے سختی کا احساس ہوتا تھا۔

وہ پورے گھر میں گھومتی پھری۔ سب کچھ وہی تھی۔ مکان تو ویسا ہی تھا لیکن گھر ویران لگ رہا تھا۔ کمی کیا تھی۔ وہ سوچتی رہی۔ آپی کی کھنکتی ہوئی ہنسی، ان کی آواز، وہ کسی کو ان کا پکارنا، نسیمہ کو ڈانٹنا، اماں سے بات کرنا، اس کی دل جوئی کرنا، اور آغا جی کے قدموں کی چاپ۔ وہ نہیں تھی۔ لیکن وہ چاہتی تو اسے اپنے دل میں سن سکتی تھی۔ لیکن وہ موجود نہیں تھی۔ اور ان کا تبسم! تبسم کی تو کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اسے کوئی سن نہیں سکتا۔ لیکن دل میں اس کے چٹکنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ان کی باتیں۔

اسے لگا کہ مکان بے روح ہوتا ہے، لیکن گھر نہیں۔ گھر تو شاید سب کچھ محسوس بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے مکینوں کی آوازیں، ان کے رویے، ان کی خوشیاں، ان کے دکھ محفوظ بھی کرتا ہے اور محسوس بھی۔ مکین خوش ہوں تو گھر ہنستا مسکراتا لگتا ہے۔ وہ اداس ہوں تو گھر بھی اداس ہو جاتا ہے۔ گھر اپنے مکینوں کی محبتیں، ان کے جذبے سنبھال کر رکھتا ہے۔ مکان کا فرش روز صاف کیا جاتا ہے

تو سب کچھ مٹ جاتا ہے۔ لیکن گھر کے صاف فرش کو غور سے دیکھو تو ہر چلنے والے کے قدموں کے برسوں کے نشان الگ چمکتے نظر آتے ہیں۔ مکان کی دیواریں رنگ و روغن سے چمک رہی ہوتی ہیں۔ لیکن گھر کی انہی دیواروں میں مکینوں کی ہر آواز محفوظ ہوتی ہے۔ مکان کی کوئی فضا نہیں ہوتی۔ لیکن گھر کی اپنی فضا ہوتی ہے۔ اس فضا، اس ماحول میں سب کچھ محفوظ ہوتا ہے۔ گھر کی دیواروں پر، ہر بے جان چیز پر مکینوں کا لمس ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔ دل کی آنکھوں سے دیکھو تو چمکتا دمکتا نظر آتا ہے۔ یعنی گھر اپنے ساز و سامان سمیت زندہ ہوتا ہے، اس میں روح بھی ہوتی ہے، اور احساس بھی، اور وہ یہ سب مکینوں سے مستعار لیتا ہے۔ مکین گھر چھوڑ جائیں تو چند ہی دنوں میں وہ اپنے ساز و سامان سمیت مر جاتا ہے۔ بس پھر مکان ہی رہ جاتا ہے...... بے روح مکان۔

یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ کیا چند گھنٹوں میں ہی پاگل ہوگئی ہیں؟ وہ گھبرا کر لان میں آ گئی۔ جھولا اسے بلا رہا تھا۔ وہ جھولے پر بیٹھی۔ بے دھیانی میں اس نے پہلو کی خالی جگہ کو چھوا۔ وہاں آپی کا لمس موجود تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھا کرتی تھی۔

اچانک ساجد دوڑتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

''میں یہاں آپ کے ساتھ بیٹھ جاؤں چھوٹی چاچی!''

اس نے چونک کر ساجد کو دیکھا۔ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا تھا، جو گہری سوچ میں ہونے کی وجہ سے اس کے شعور تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس نے بے دھیانی میں محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں نہیں ساجد! آؤ میرے پاس بیٹھو نا!''

ساجد اس کے برابر بیٹھ گیا، جہاں آپی بیٹھا کرتی تھیں۔

''آپ مجھے جھلائیں گی چھوٹی چاچی!''

اس بار بات شعور تک پہنچ گئی، اور وہ گھبرا گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ساجد سے کہا۔

''اے......! کیا کہا تم نے......؟''

''جھولا جھلانے کو کہا نا چھوٹی چاچی!''

''وہ تو مجھے معلوم ہے۔ لیکن یہ چھوٹی چاچی کیوں کہا مجھے تم نے؟''

ساجد چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں شاید یہ نہیں آرہا تھا کہ اسے یہ بات بری لگی ہے یا اچھی۔ اور چہرے پر تو اسے دونوں ہی باتیں نظر آرہی تھیں...... تھوڑی تھوڑی۔'' بس یہ مجھے اچھا لگا۔

''اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ پھر پوچھا۔

''آپ کو برا لگا ہے؟''

ارجمند نے پھر ادھر ادھر دیکھا، اور سرگوشی میں بولی۔

''برا کیسے لگ سکتا ہے؟ مجھے تو بہت اچھا لگا۔ لیکن تم نے یہ کہا کیوں؟''

''پتا نہیں، بس میرا دل چاہتا ہے۔'' ساجد نے کہا۔ پھر پوچھا۔

''یہ بری بات ہے؟''

''پہلے تو کبھی نہیں کہا تم نے۔''

''پہلے کبھی دل نہیں چاہا تھا۔'' ساجد نے معصومیت سے کہا۔ پھر اس نے اپنی بات دہرائی۔

''کیا یہ بری بات ہے؟''

''نہیں! آدمی اچھا ہو اور سچا ہو تو دل کبھی غلط نہیں ہوتا۔''

ساجد کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ ارجمند اسے سمجھا بھی نہیں رہی تھی۔ وہ تو اپنے یقین اور اعتماد کو تازہ کر رہی تھی۔

''لیکن تم مجھے کسی کے سامنے چھوٹی چاچی کبھی نہ کہنا۔'' اس نے ساجد کو سمجھایا۔

''اکیلے میں جی چاہے تو کہہ لینا۔''

''تو سب کے سامنے کیا کہوں؟''

''جو پہلے کہتے تھے...... باجی......!''

ساجد کے چہرے پر ایک لمحے کو الجھن نظر آئی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ ہنس دیا۔

"واہ......! بڑا مزہ آئے گا۔ سب کے سامنے باجی، اور اکیلے میں چھوٹی چاچی!" اس کے نزدیک جیسے وہ ایک دلچسپ اور مشکل کھیل تھا۔

"اور جو سب کے سامنے منہ سے نکل گیا تو......؟"

"تو بہت برا ہوگا...... بہت ہی برا۔" ارجمند نے کڑے لہجے میں کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہونا چاہئے۔ ایسا ہوا تو میں بہت شرمندہ ہوں گی۔ پھر میں کبھی تم سے پیار نہیں کر سکوں گی۔"

"نہیں چھوٹی چاچی! ایسا نہیں ہوگا۔ میں خیال رکھوں گا۔ اب جھولا جھلائیں نا چھوٹی چاچی!"

ارجمند پیر سے زور لگا کر پینگیں دینے لگی۔ لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ساجد نے اسے چھوٹی چاچی کیوں کہا...... اور آج ہی کیوں کہا...... اس سے پہلے تو کبھی نہیں کہا تھا۔

اس کی سمجھ میں ایک ہی بات آئی۔ یہ اللہ نے رحمت فرمائی تھی۔ اس کے نامعلوم لمبی جدائی سے دکھے ہوئے دل پر مرہم رکھ دیا تھا۔ پہلے ہمیشہ اسے اپنے اندر سے تسلی ملتی تھی...... دل کے ذریعے۔ لیکن اس بار تسلی باہر سے ملی تھی۔ شاید اس لئے کہ تسلی دینے والا دل خود دکھ میں مبتلا تھا۔ وہ دل جو ہمیشہ کہتا تھا کہ وقت آنے پر خود بخود سب کچھ مل جائے گا۔ آج خود بے یقینی میں مبتلا تھا۔ تو اس کے مہربان رب نے اسے ساجد کی زبانی یہ خوش خبری سنوا دی۔ بات تو وہی تھی کہ جو وہ چاہتی ہے، وقت آنے پر خود بخود ہو جائے گا۔

جھولے کی رفتار کم ہوگئی تھی۔ اس نے پاؤں کے دھکے سے اسے اٹھان دی۔

✿ ✿ ✿

حمیدہ اس رات سونے کے لئے لیٹی تو اس کا دل بوجھل تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ کہنا بہت آسان تھا اور گزارنا بہت مشکل۔ آخری عمر کی جدائی تو ویسے بھی نڈھال کر دیتی ہے۔ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اب ملنا بھی ہوگا یا نہیں۔ آج تو پہلی رات تھی جدائی کی، اور وہی بہت بھاری لگ رہی تھی۔ اب وہ پچھتا رہی تھی

کہ عبدالحق کے ساتھ جانے سے انکار کیوں کیا، چلی ہی جاتی۔ نکی کو وہاں اسکول میں داخلہ مل جاتا، اس کی پڑھائی بھی چلتی رہتی۔ اور عبدالحق بھی نگاہوں کے سامنے رہتا۔

لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس نے تو آخری فیصلہ نکی پر چھوڑ دیا تھا۔ اور نکی نے وہی فیصلہ سنایا، جو اس نے کیا تھا۔ لیکن نکی نے ایسا کیوں کیا؟ کیا نکی کو اس جدائی کا ڈر نہیں تھا۔

ذرا دیر میں اسے احساس ہوا کہ وہ نکی کو سمجھ سکتی ہے۔ یہ نکی کا پہلا سکول تھا۔ اسے وہ کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ پہلے سکول کی محبت تو بہت بڑی ہوتی ہے۔ اور پھر نکی ابھی جدائی کے دکھ کو کیا جانے۔

تو جو ہوا، اچھا ہی ہوا۔ اس نے سرد آہ بھر کر سوچا۔

وہ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے لیٹی رہی۔ لیکن آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اب آدمی جاگے گا تو سوچے گا بھی۔ اس نے خود کو عبدالحق کی اور وصال دین کی پرانی یادوں سے بہلانے کی کوشش کی۔ وہ خوشگوار ماضی میں چلی گئی۔

اگر وصال دین زندہ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اللہ کی مرضی...... کون جانے، اسے کھونے کا کتنا اجر اللہ نے اسے دیا ہے۔ یہ سب کچھ اجر ہی تو ہے۔ کیسے عیش و آرام سے رہ رہی ہے وہ۔ کھوئی ہوئی آنکھیں بھی واپس مل گئیں۔ عبدالحق بھی مل گیا۔ معجزہ اور کسے کہتے ہیں۔

ذہن نے ایک جست لگائی اور ماضی سے حاصل میں آ گیا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک عجیب خیال نے سر ابھارا۔ اگر عبدالحق کا کوئی بیٹا ہوتا تو اس وقت وہ اسے اپنے پاس رکھ لیتی۔ پھر اسے جدائی کا پتا بھی نہ چلتا۔ اور نور بانو بچے کو اس کے پاس چھوڑ بھی دیتی۔ اسے کون سا شوق ہے بچوں کا۔

اس خیال نے اسے چپکے سے محرومی کے اسی صحرا میں لا چھوڑا، جس میں وہ برسوں سے جھلس رہی تھی۔

اس کے بعد جو خیال اسے آیا تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ نکی دوسری طرف کروٹ لئے بے خبر سو رہی تھی۔

ارے......! یہ بات میں نے اب تک سوچی ہی نہیں۔ اسے حیرت ہو رہی تھی۔ عبدالحق کی اولاد کے لئے وہ بابا کے پاس گئی تھی، اور بابا نے کہا تھا کہ مدعی کو ساتھ نہ لے کر آ۔ اس نے نوربانو سے بات کی۔ نوربانو نے انکار کیا۔ اس نے اصرار، بات بڑھی اور نوربانو نے نہایت بدتمیزی، اور بے مروّتی سے کہہ دیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی اس کے ساتھ کہیں نہیں جائے گی۔ تب پہلی بار اسے بھی جلال آیا اور اس نے عبدالحق سے بات کرنے کی، اور پھر دوسری شادی کرانے کی دھمکی دی۔ اسے یاد تھا کہ نوربانو ڈر گئی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اس نے محض دھمکی نہیں دی تھی۔ وہ سچ مچ عبدالحق سے بات کرتی، اس سے کہتی کہ وہ نوربانو کو اس کے ساتھ جانے کا حکم دے۔ آخر کام تو نوربانو کا ہی ہے۔ اور بات نہ بنتی تو وہ عبدالحق کو دوسری شادی کا حکم دیتی۔

لیکن ہوا کیا؟ اسی شام تو عبدالحق تبادلے کی خبر لے کر آ گیا۔ اور وہ سب کچھ بھول گئی۔ اب ان دونوں کے جانے کے بعد یاد آ رہا ہے سب کچھ...... اس نے جو سوچا تھا، وہ کچھ بھی نہیں کر سکی۔ یہ تو اللہ کا حکم ہے۔

ہے ربا! تو نے بھی اسی کا ساتھ دیا، اس نے بے ساختہ شکایت کی۔ تو تو سب کچھ جانتا ہے۔

لیکن اگلے ہی لمحے وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹتے ہوئے توبہ کرنے لگی۔ اللہ میری توبہ! تیرے بھید تو ہی جانے۔ تو تو جو کچھ بھی کرتا ہے، وہی بہتر ہوتا ہے۔

اب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ نہ وہ عبدالحق کی دوسری شادی کا ارادہ کرتی، نہ یہ تبادلہ ہوتا۔ جو اللہ کو منظور نہیں ہے، وہ کیسے ہو سکتا ہے، اور جو اللہ چاہے، اسے کون روک سکتا ہے۔

مگر اللہ دلوں کا حال جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی نیت بری نہیں تھی۔ وہ تو عبدالحق کی بہتری کے لئے سوچ رہی تھی۔ اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے

کہ کس کے لئے کیا بہتر ہے۔

وہ بابا سے اپنی ملاقات یاد کرنے لگی۔ وہ بابا یقیناً اللہ کا ولی تھا۔ بابا نے بار بار ایک ہی بات کہی تھی...... مدعی کو لے کر آ۔ اور اس نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ مدعی نوربانو ہے، عبدالحق نہیں۔ یہ بات حمیدہ کی سمجھ میں اب تک نہیں آئی تھی کہ اس معاملے میں عبدالحق مدعی کیوں نہیں ہے۔ بچے سے نسل تو اس کی آگے بڑھے گی، نہ کہ نوربانو کی۔

اور بابا نے کہا تھا کہ وہ اس کے لئے تو دعا کر سکتا ہے، لیکن جو وہ چاہتی ہے......یعنی عبدالحق کے لئے اولاد...... وہ اس کے لئے دعا نہیں کر سکتا۔ اور اس کے اصرار پر اس نے جھنجلا کر کہا تھا......تو کیا تجھے خوش کرنے کے لئے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی دعا کروں.... تباہ ہو جاؤں تیری خاطر......؟

اس کا مطلب تھا کہ عبدالحق کے لئے اولاد کی دعا کرنا ایسا ہی ہے، جیسے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی دعا کہ اس پر اللہ کے غضب ناک ہونے کا ڈر ہے۔ اور یہ بات اللہ کا ایک ولی کہہ رہا تھا، جو بہت کچھ جانتا تھا۔ حمیدہ خوف سے تھرا کر رہ گئی۔

پھر جب اس نے پاؤں پکڑے اور چھوڑے نہیں تو بابا نے کہا کہ اس دعا کے لئے پہلے کسی سے اجازت لینی ہوگی۔ پھر شاید اللہ سے بھی اجازت مل جائے۔ اور اس کے بعد اس نے اس سے کہا تھا کہ اپنی بہو کو لے کر آ۔ اس نے کہا تھا کہ اجازت نوربانو سے لینی ہوگی۔ اس کے پوچھنے پر بابا نے کہا تھا، یہ بات تو سمجھ نہیں سکتی، اور میں سمجھاؤں گا بھی نہیں۔

واپس آنے کے بعد حمیدہ کو کوئی انجانی خلش ستاتی رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ آیا نہیں تھا۔ لیکن اب جبکہ عبدالحق اور نوربانو یہاں سے جا چکے تھے تو اپنی وہ خلش اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ خلش یہ تھی کہ وہ بابا کی کہی ہوئی کوئی اہم بات بھول گئی ہے۔

وہ ذہن پر زور دیتی رہی، اس ملاقات کو بار بار دہراتی رہی۔ لیکن بات

بن ہی نہیں رہی تھی۔ نیند سے محروم دماغ جھنجلانے لگا۔ لیکن وہ اس پہیلی کو بوجھنے پر تل گئی تھی۔ اگرچہ اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ مدعی اس کی پہنچ سے بہت دور جا چکا تھا۔

پھر اچانک اس کے ذہن میں بلب سا چمکا، اور بات اسے یاد آ گئی۔

ارے...... یہ بات میں بھول کیسے گئی تھی۔

اسے یاد آ گیا۔ بابا نے لرزتے ہوئے کہا تھا کہ اللہ کے ہاں سفارش بھی اس کی اجازت کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ اس پر اس نے کہا تھا کہ بابا! اجازت لے لو نا! اور بابا نے کہا تھا...... نہیں ملے گی۔

یہاں پہنچ کر اس کے سامنے جیسے کوئی بند گلی آ گئی۔ اس نے پوچھا تھا کہ اجازت کیوں نہیں ملے گی، اور بابا نے وجہ بھی بتائی تھی۔ اور وہی تو اصل بات تھا۔ اور اب وہی یاد نہیں آ رہی تھی۔

اس کا اضطراب اتنا بڑھ گیا کہ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ لیکن وہ ٹہل رہی تھی۔ وہ جیسے چالیس چوروں کے غار کے سامنے کھڑی تھی اور کھل جا سم سم اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ وہ ڈر بھی رہی تھی، لیکن یاد کرنے کی کوشش سے باز نہیں آ رہی تھی۔

پھر اللہ نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اسے یاد آ گیا۔

بابا نے کہا تھا...... اجازت نہیں ملے گی۔ کیسے مل سکتی ہے؟ اگر اللہ پہلے ہی کسی سے وعدہ کر چکا ہو۔ وہ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔ میں اس سے وعدہ توڑنے کو کہوں تو وہ مجھ سے ناراض ہوگا، مجھے چھوڑ دے گا۔

دماغ کا بوجھل پن دور ہوگیا۔ وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوگئی۔ بات صاف تھی، بس کڑیاں ملانی تھیں۔ بابا نے سب کچھ تو بتا دیا تھا۔ کسی نے عبدالحق کے ہاں اولاد نہ ہونے کی دعا کی تھی، اور وہ اللہ نے قبول کر لی تھی۔ بابا کو یہ معلوم تھا، اس لئے وہ عبدالحق کے لئے اولاد کی دعا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اللہ سے وعدہ توڑنے کے لئے کیسے کہہ سکتا تھا۔

سوال یہ تھا کہ وہ کون بدبخت ہے جس نے عبدالحق کو یہ بددعا دی۔

اس کا جواب بھی سامنے تھا۔ بابا نے کہا، کسی سے اجازت لینی ہوگی۔ پھر کہا، اسی لئے تو کہتا ہوں کہ مدعی کو لے کر آ، پھر کہا، تو اپنی بہو کو لے کر آ۔

اس کا مطلب ہے کہ بابا کو دعا کے لئے نور بانو سے اجازت لینی تھی۔ اور اس کا مطلب ہے کہ وہ بددعا نور بانو نے کی تھی۔ اور اللہ نے اسے قبول بھی کر لیا تھا۔

یہ بات شعور تک پہنچی تو حمیدہ سن ہو کر رہ گئی۔ نور بانو ایسی دعا کیسے کر سکتی ہے؟ کیوں کرے گی؟ اس کا جواب حمیدہ کے پاس نہیں تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ہوا یہی ہے۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش تھی ہی نہیں۔ یہی بات تھی۔ جبھی تو نور بانو مدعی قرار پاتی تھی، جیسے اس معاملے میں عبدالحق کا کوئی بیچ ہی نہ ہو۔ وہ مدعی ہی نہیں رہا۔

اسے غصہ آنے لگا۔ اس میں عبدالحق کا کیا قصور؟ سوال تو اس کی نسل آگے بڑھنے کا ہے۔ نور بانو کو کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ وہ تو دعا کر کے بیٹھ گئی۔ سزا تو عبدالحق کو مل رہی ہے۔ یہ تو زیادتی ہے۔

بابا نے شرط لگائی تھی کہ اگلی بار بہو کو ساتھ لے کر ہی آئے۔ لیکن اب نور بانو کو وہ نہیں لے جا سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صبح ہی بابا کے پاس جائے گی، اس سے پوچھے گی کہ عبدالحق کا کوئی قصور نہیں تو سزا اسے کیوں مل رہی ہے؟

یہ فیصلہ کر کے وہ ایسی مطمئن ہوئی کہ اسے نیند آ گئی...... پرسکون نیند۔

❁ ❁ ❁

ارجمند کی آنکھ اپنے معمول کے مطابق کھلی۔ سالن کو دھیمی آنچ پر رکھ کر اس نے تہجد پڑھی۔ واپس آ کر اس نے کھانا تیار کیا۔ پھر وہ فجر پڑھنے کے لئے گئی، وہاں سے واپس آ کر اس نے ناشتہ بنایا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے نسیمہ کے لئے دروازہ کھولا۔ سلام کرنے میں وہ ہمیشہ پہل کرتی تھی اور نسیمہ شرمندہ ہوئی تھی۔ نسیمہ نے اس کے سلام کا جواب دیا۔

اندر آتے ہوئے اس نے نسیمہ سے کہا۔

''کھانا میں نے تیار کر دیا ہے۔ آپ بھیج دیجئے گا۔''

پیچھے آتی ہوئی نسیمہ نے کہا۔

''کھانا اب کہاں بھیجنا ہے؟''

''آغا جی کے دفتر، اور کہاں؟'' ارجمند نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

''آپ کو یاد ہی نہیں، صاحب تو کراچی چلے گئے ہیں۔''

یہ سن کر ارجمند ایسی ٹھٹکی کہ جیسے ٹھوکر لگی ہو۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ نسیمہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔ اور وہ بت بنی وہیں کھڑی رہی۔

آغا جی چلے گئے، اس احساس نے دل میں جیسے ڈنک سا چبھو دیا تھا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ آنکھوں کی جلن نے اس بات کا احساس دلایا۔ اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن پیر جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔

وہ بے بس کھڑی رہی۔ یہ کیسے ہوا کہ اسے آغا جی کا جانا بھی یاد نہیں۔ اسے یاد تھا، رات وہ ہمیشہ کی طرح سوئی تھی۔ شاید اسے یہ خیال آ جاتا تو نیند بھی نہیں آتی۔ اور نیند نہیں آتی تو وہ تہجد سے محروم ہو جاتی۔ یہ تو اللہ نے رحمت فرمائی اس پر۔

وہیں کھڑے کھڑے اس نے اللہ سے دعا کی کہ اسے نیند سے کبھی محروم نہ ہونے دے۔ اسے صبر دے اور ظرف دے۔

جانے کتنی دیر وہ وہاں کھڑی رہی۔ پھر شل جسم میں جیسے جان سی پڑنے لگی۔ اس نے قدم بڑھائے۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو حمیدہ سلام پھیر رہی تھی۔

''یہ کیا دادی اماں! آپ دیر سے اٹھی ہیں آج!''

حمیدہ نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر نظریں جھکا لیں۔

''ہاں نکی! رات کو بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی۔''

وہ سمجھ گئی کہ دادی اماں آغا جی کے بارے میں سوچتی رہی ہوں گی۔

بے چاری دادی اماں!

اچانک اسے ساجد کا خیال آیا، اور اس کے ساتھ ہی زبیر اور رابعہ کا۔ کوئی گیا ہے تو کوئی آیا بھی تو ہے۔ رحمت ہے اللہ کی۔ اس نے خوش ہو کر سوچا۔ ابھی ایک لمحہ پہلے وہ اداسی سے سوچ رہی تھی کہ آج آغا جی ناشتے پر نہیں ہوں گے، اب کبھی بھی نہیں ہوں گے۔ بلاوجہ اس نے اتنا ناشتہ بنایا، اور اب اسے یاد آیا کہ ناشتہ تو اور بنانا ہوگا۔ ایک آدمی کم ہوا، اور ماشاء اللہ تین کا اضافہ ہوا۔ مگر وہ لوگ ہیں کہاں؟

''دادی اماں، چچا جان، ساجد اور چچی جان کیا دیر تک سوتے ہیں؟''

حمیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''نا نکی! وہ لوگ تو سویرے ہی اٹھ جاتے ہیں۔''

''تو پھر وہ آئے کیوں نہیں؟''

''بڑے لحاظ والے لوگ ہیں۔'' حمیدہ نے کہا۔

''وہ تو عبدالحق کے جاتے ہی وہاں چلے گئے تھے...... وہ جو مہمان خانہ ہے نا...... کیا کہتا ہے عبدالحق اسے...... اسکینی...... نہیں...... اکینسی......''

''انیکسی اماں!'' ارجمند نے جلدی سے تصحیح کی۔

''لیکن کیوں دادی! اتنا بڑا گھر چھوڑ کر وہاں جانا، جبکہ آغا جی تو انہیں اپنا بڑا بھائی سمجھتے ہیں۔''

''یہ وفادار لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں نکی!''

''ناشتہ کرنے بھی نہیں آئے۔''

''وہیں کچھ کر رہی ہوگی رابعہ۔''

ارجمند تڑپ گئی۔

''میں جا کر انہیں لاتی ہوں۔ اور آپ انہیں حکم دیجئے گا کہ وہ یہیں رہیں۔ آپ کا حکم تو کوئی نہیں ٹال سکتا نا؟''

اداسی کے باوجود حمیدہ کو ہنسی آ گئی۔ پھر اس نے کہا۔

"نسیمہ کو بھیج کر انہیں بلوا لے۔"

"نہیں اماں! میں خود جاؤں گی۔ وہ میرے چچا جان ہیں۔"

وہ انیکسی کی طرف چل دی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے دستک دی اور اندر چلی گئی۔ کمرے میں زبیر اور ساجد بیٹھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ زبیر کے انداز میں پریشانی تھی۔

"کیا بات ہے نکی! خیر تو ہے؟"

"خیر کیسی؟ آپ لوگ گھر چھوڑ کر یہاں بیٹھے ہیں۔" ارجمند نے محبت بھری خفگی سے کہا۔

"ہم یہاں بہت آرام سے ہیں نکی!"

"آپ ہوں گے، لیکن ہم آرام سے نہیں ہیں۔ یہ تو مہمان خانہ ہے۔ اور آپ کوئی مہمان ہیں، آپ کو تو آغا جی یہاں گھر کی اور ہم سب کی حفاظت کے لئے چھوڑ کر گئے ہیں۔ اور آپ ہمیں چھوڑ کر یہاں آ بیٹھے۔"

"وہ نکی! ہم یہاں......"

"آپ آغا جی کے حکم کے خلاف کر رہے ہیں۔ انہیں پتا چلا تو کتنا دکھ ہوگا انہیں۔"

اس بات پر تو زبیر تڑپ گیا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

"بس اٹھیں اور چلیں میرے ساتھ۔" ارجمند نے ساجد کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ پھر بولی۔

"چچی جان کہاں ہیں؟"

"وہ...... وہ چائے بنا رہی ہے۔"

ارجمند کچن میں پہنچی اور اس نے چولہا بجھا دیا۔

"چلیں چچی جان!"

رابعہ نے سوالیہ نظروں سے زبیر کو دیکھا، جو ارجمند کے پیچھے پیچھے وہاں آ گیا تھا۔ زبیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"واقعی ہم سے بھول ہوئی۔ کاکا کو پتا چلا تو وہ بہت خفا ہوں گے۔"

"بس چلیں میرے ساتھ!"

❁ ❁ ❁

ایک معمول ختم ہوگیا تھا، دوسرا شروع ہو رہا تھا۔ زندگی معمولات سے عبارت ہوتی ہے۔ اپنے لوگوں کے حلقے میں، گرد و پیش میں اور معمولات میں تبدیلی ہو تو زندگی میں تبدیلی آتی ہے۔

ارجمند نے ان تینوں کو ڈائننگ روم میں بٹھا دیا تھا۔ پھر وہ حمیدہ کے پاس گئی۔

"چلیں دادی اماں!"

"کہاں ...؟"

"کھانے کے کمرے میں۔ اب ناشتہ وہیں کیا کریں گے۔"

حمیدہ مسکرائی، اور اس کے ساتھ ڈائننگ روم کی طرف چل دی۔

پوریاں دیکھ کر رابعہ کا تو دل خوش ہوگیا۔ ساتھ میں آلو کی ترکاری بھی تھی اور اچار بھی۔ ارجمند گرم گرم پوریاں اتار کر نسیمہ کے ہاتھ بھجوا رہی تھی۔ رابعہ نے اس سے کہا۔

"نکی کو تو بلاؤ۔"

"وہ کہتی ہے، میں ابھی ذرا دیر میں آ رہی ہوں۔"

پھر ارجمند بھی آئی اور جلدی جلدی ناشتہ کرنے لگی۔ اسے ڈر تھا کہ اسکول کے لئے لیٹ نہ ہو جائے۔

"آپ کو ناشتہ کیسا لگا چچی جان!" اس نے رابعہ سے پوچھا۔

"بہت اچھا تھا۔ لیکن اتنا مزہ نہیں آیا، جتنا آنا چاہئے تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"کیوں......؟" ارجمند نے حیرت سے پوچھا۔

"تم تو ساتھ بیٹھی ہی نہیں۔"

"اب انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔" ارجمند نے معذرت کی۔

"آج مجھے نہ تو آغا جی کا جانا یاد تھا اور نہ ہی آپ لوگوں کی موجودگی۔"

کل سے انشاء اللہ ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کریں گے۔"

"پرنکی! تم ٹھیک سے کھا کیوں نہیں رہی؟" زبیر نے اسے ٹوکا۔

"اسکول کو دیر ہو رہی ہے نا چچا جان!"

ارجمند اسکول کے لئے تیار ہو کر آئی تو حمیدہ بھی چادر اوڑھ چکی تھی۔ اسے دیکھ کر زبیر نے کہا۔

"آپ کہیں جا رہی ہیں اماں!"

"ہاں! روز جاتی ہوں۔ نکی کو اسکول چھوڑنے اور واپس لانے کے لئے۔"

"پر اماں! گاڑی تو ہے نا!"

"او پتر! بڑی ہوتی ہوئی لڑکی کو ڈرائیور کے ساتھ اکیلے تو نہیں بھیج سکتی۔"

"ٹھیک کہتی ہیں اماں! پر اب میں جو ہوں یہاں۔ میرے پاس گاڑی بھی ہے۔ میں چھوڑ آیا کروں گا۔" زبیر کو کچھ خیال آیا تو وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر شرمندگی سے بولا۔

"یہ مناسب نہیں تو آپ کی جگہ رابعہ بھی جا سکتی ہے۔"

حمیدہ اس کی بات سمجھ گئی۔

"نہیں نہیں زبیر! تجھ سے زیادہ اعتبار والا کون ہوگا۔ تو تو چاچا ہے اس کا۔" وہ بولی۔

"پر آج تو اسے میں ہی چھوڑ کر آؤں گی۔ کل سے تو یہ کام سنبھال لینا۔" درحقیقت اسے بابا کے پاس جانا تھا۔ وہ نسیمہ کی طرف مڑی۔

"یعقوب نے گاڑی نکال لی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ اماں! یعقوب یہاں کہاں؟ وہ تو کراچی جا چکا ہے۔" نسیمہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

حمیدہ کو ایک لمحے کو دھچکا سا لگا۔ پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"تو نوریز سے کہہ دے۔"

نسیمہ جانے لگی تو زبیر نے کہا۔

"میں چلتا ہوں نا اماں!"

حمیدہ آج یہ نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔

"نا پتر! آج تو آرام کر۔ میں نے کہا نا! کل سے یہ تیری ذمہ داری ہوگی۔" پھر اس نے نسیمہ سے کہا، جو زبیر کی بات سن کر رک گئی تھی۔

"جا! جلدی سے نوریز سے کہہ، نکی کو دیر ہو رہی ہے۔"

ارجمند کو اب گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ بار بار کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ دادی اماں نے زبیر کی بات کیوں نہیں مانی۔

بالآخر نسیمہ نے آ کر اطلاع دی کہ گاڑی باہر کھڑی ہے۔ ارجمند تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ حمیدہ نے نسیمہ سے کہا۔

"تجھے بھی چلنا ہے میرے ساتھ۔"

نسیمہ نے سر ہلا دیا۔

"مجھے کچھ دیر لگے گی واپسی میں، تم لوگ پریشان نہ ہونا۔" حمیدہ نے زبیر اور رابعہ سے کہا۔

"نکی کو اسکول چھوڑ کر میں ایک ضروری کام سے کہیں جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے اماں!" زبیر نے کہا۔

❁ ❁ ❁

اس بار تو کمرے میں گھسنے سے پہلے ہی کام ہوگیا۔ دربان عورت دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ جیسے اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اس نے نسیمہ سے کہا۔

"تم یہیں کھڑی رہو۔" پھر حمیدہ سے بولی۔

"آپ میرے ساتھ آئیں۔"

حیران حمیدہ اس کے ساتھ بڑے کمرے میں داخل ہوئی۔ آج بھی وہاں وہی حال تھا کہ تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں تھی۔ دربان عورت نہ ہوتی تو حمیدہ بابا کے کمرے کے دروازے تک کبھی نہ پہنچ پاتی۔ لوگوں سے ٹکراتی، لوگوں

کو پھلانگتی وہ آگے بڑھتی رہی۔ ہجوم کی وجہ سے اتنا سا فاصلہ بہت طویل ہو گیا تھا۔

''آپ اندر جائیں۔'' دربان عورت نے کہا۔ وہ دروازے پر ہی رک گئی تھی۔

حمیدہ نے کمرے میں قدم رکھا تو اس کی عجیب کیفیت تھی۔ سینے میں دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ وہ خوفزدہ بھی تھی، کیونکہ اس نے بابا کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔ وہ اپنی بہو کو لئے بغیر آئی تھی۔

وہ نظریں جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ بغیر اجازت بیٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ اور بابا آنکھیں بند کئے اپنی ہی کسی کیفیت میں مستغرق تھا۔ ادھر خوف سے حمیدہ کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ وہ تو رات کسی کیفیت میں اس نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا، اور صبح بغیر سوچے سمجھے اس پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔ ورنہ بابا کی حکم عدولی وہ کیسے کر سکتی تھی۔

لمحے گزرتے گئے۔ اس کی ٹانگوں کی لرزش بڑھتی گئی۔ اس کا جی چاہا کہ خاموشی سے دوسرے دروازے سے باہر نکل جائے۔

اسی لمحے بابا نے کہا۔

''نہیں! اب آئی ہے تو بیٹھ جا۔ ڈرنے کی کیا بات ہے؟ بندے کو بس اللہ سے ڈرنا چاہئے۔''

وہ بیٹھ گئی۔ بابا کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ اسے دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ یہ بات اس نے کہی ہوگی۔

''لیکن ظالم خود پر ظلم کرتا ہے۔'' بابا کے ہونٹ پھر ہلے۔

''اللہ سے نہیں ڈرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری عمر خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ سب سے ڈرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ خود سے بھی ڈرتا رہتا ہے۔''

حمیدہ پر تھرتھری چڑھ گئی۔ شاید بابا اس کے بارے میں کہہ رہا ہے۔

پھر بابا نے آنکھیں کھول دیں۔

''پنچھی اُڑ گیا نا، پنجرہ چھوڑ کر؟''

حمیدہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''کون سا پنچھی بابا!؟''

''وہی جسے ساتھ لانے کو کہا تھا تجھ سے۔''

''تم تو سب جانتے ہو بابا!'' حمیدہ نے عاجزی سے کہا۔

جواب میں بابا نے اتنے غصے سے اسے گھورا کہ وہ تھرا گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے بابا کے چہرے پر نرمی چھا گئی۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''یہ زبان بہت بری چیز ہے۔ سب سے زیادہ اس کی وجہ سے ہلاکت میں پڑے گا آدمی۔ بات کرتے ہوئے پہلے کچھ دیر سوچ لیا کر۔ کوئی کچھ نہیں جانتا۔ بس اللہ ہے، جو سب کچھ جانتا ہے۔ وہ جتنا جسے چاہے، بتا دیتا ہے، کسی کو کم، کسی کو زیادہ، کسی کو بہت زیادہ۔ مرضی ہے اس کی۔ اور بندے کا کام جاننا نہیں، ماننا ہے۔ اور جب اللہ چاہے تو وہ جان بھی جاتا ہے، جیسے تو نے جان لیا۔''

میں کیا جان لیا؟ گھبرائی ہوئی حمیدہ نے سوچا۔

''اور زبان کو بالکل برا بھی نہ سمجھ لینا۔'' بابا نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''زبان بھی بہت اچھی ہے، بس ایک کام کے لئے۔ اچھی بات کے لئے اور اللہ کے ذکر کے لئے۔ اللہ نے تو کچھ بھی برا نہیں دیا ہمیں، سب اچھا ہی اچھا دیا۔ ہم بدنصیب اسے برا بنا دیتے ہیں۔ اس میں نعمت کا کیا قصور؟''

اس بار حمیدہ کی سمجھ میں کچھ آیا۔

''میں سمجھ گئی بابا! میں اللہ سے توبہ کروں گی۔ تم میرے لئے دعا کرو۔''

''اللہ پاک کرنے والا ہے مائی! بندہ سب کچھ اس پر چھوڑ دے تو بے فکری ہی بے فکری ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ پنچھی پنجرہ چھوڑ کر اُڑ گیا نا! اور تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔''

''ہاں بابا! اسی لئے تو میں اسے نہیں لا سکی۔'' حمیدہ نے افسردگی سے کہا۔

''تو نے اپنی طاقت پر، بیٹے کی فرمانبرداری پر گھمنڈ کیا تھا۔ تو سمجھتی تھی

کہ یا تو اسے یہاں آنے پر مجبور کر دے گی یا بیٹے کی دوسری شادی کرا دے گی۔ لیکن دیکھ لے، تو کچھ بھی نہیں کر سکی۔ بندہ اسی گمان میں تو مارا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ ارے اللہ سے معاملہ کیا کر۔ وہ چاہے تو کچھ بھی ہو جائے۔ وہ نہ چاہے تو کوئی منہ کا نوالہ بھی حلق سے نہیں اُتار سکتا۔''

''مجھ سے بھول ہوگئی بابا! ورنہ میں ایسی گھمنڈی تو نہیں۔'' حمیدہ نے شرمندگی سے کہا۔

''جبھی تو اللہ کی رحمت ہوئی اور تجھے سزا مل گئی ورنہ اللہ کو بھول کر گھمنڈ کرنے والوں کا تو وہ کامیابی سے، گھمنڈ اور بڑھا دیتا ہے۔'' بابا نے چھت کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں اس لئے آئی ہوں بابا کہ......''

بابا نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اللہ سب جانتا ہے، اس نے تجھے سب کچھ بتا تو دیا۔ اب کیا پریشانی ہے تجھے؟''

''نور بانو نے خود اپنے لئے اولاد نہ ہونے کی دعا کی۔ اس بات کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔'' حمیدہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''گمراہی میں آدمی بھلا سمجھ کر برا مانگتا ہے۔ یہ تو ہوتا آیا ہے، اور ہوتا رہے گا۔''

''لیکن کیوں بابا ....؟''

''شکر بڑی چیز ہے مائی! اور شکر نہ کرنا کفر ہے۔''

حمیدہ کا جسم لرزنے لگا .... کفر! نور بانو ناشکری تھی۔ یہ بات وہ جانتی تھی، اور یہ وہ اسے سمجھاتی بھی رہی تھی۔

''بندہ نعمتوں سے منہ موڑے تو نعمتیں خود بخود اس سے دور ہوتی جاتی ہیں۔ بندہ شکر ادا نہیں کرتا اور نعمتوں کو غیر اللہ سے منسوب کرتا ہے تو اللہ سے دور اور نعمتوں سے محروم ہوتا جاتا ہے۔ اپنی چال بازیوں پر بھروسہ کرنے والے کو یہ کہاں معلوم ہوتا ہے کہ سب سے مضبوط چال اللہ کی ہوتی ہے۔ اب تیری بہو

خوش ہوگی کہ اس کی مشکل آسان ہوگئی۔ وہ پریشانی سے بچ کر دو چلی گئی۔''

''تو یہ تو سچ بھی ہے بابا!'' حمیدہ کے لہجے میں ہلکی سی شکایت تھی۔

''سچ تو یہ ہے کہ اللہ نے اسے آخری موقع دیا تھا، اور بدنصیب نے اسے بھی گنوا دیا۔ صرف اپنی انا کی وجہ سے۔ وہ یہاں آتی، میرے سامنے اللہ سے رجوع کرتی، توبہ کرتی تو مجھے اسے کے لئے دعا کی اجازت ملتی۔ اور کون جانے، اللہ میری دعا قبول ہی فرما لیتا۔'' بابا کے لہجے میں بلا کی عاجزی تھی۔

''تو اب......؟''

''اب تو مہر لگ گئی۔'' بابا نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب وہ ساری عمر محروم رہے گی۔''

حمیدہ دہل گئی۔ پھر اسے وہ بات یاد آئی جو کرنے کے لئے وہ یہاں آئی تھی۔

''لیکن بابا! اس میں ....''

''تو کچھ نہ کہو، میں تجھے سب سمجھا دوں گا۔'' بابا نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

''تیرے بیٹے کا براہ راست کوئی قصور نہیں۔ لیکن ایک قصور ہے۔ دیکھ، جب دو افراد نکاح کے رشتے سے جڑتے ہیں تو کسی حد تک ان کے اعمال بھی جڑ جاتے ہیں۔ وہ شریک حیات ہوتے ہیں نا! تو ایک دوسرے کے بعض اعمال کی جزا اور سزا میں بھی وہ ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی بابا؟''

''اسی لئے تو کہتے ہیں کہ صورت، دولت ہر چیز چھوڑ کر مومن اور متقی شریک حیات منتخب کرو۔ سوچ تو سہی، اولاد میں ماں اور باپ، دونوں کی خصوصیات اور عادات آتی ہیں نا، یہ رشتہ ہی ایسا ہے۔ اب ایک ناشکرا ہے اور دوسرا شکر گزار تو بس اللہ کی رحمت ہی اولاد کو ناشکرے پن سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ جو ماں اچھی نہیں ہوگی، اس کی اولاد کیسے اچھی ہو سکتی ہے۔ ہاں اللہ چاہے تو اور بات ہے۔ اور میں نے کہا نا کہ شکر کا الٹ کفر ہے۔''

حمیدہ کو لگا کہ اس کے اردگرد اندھیرا چھا گیا ہے۔ وہ بڑی گہری مایوسی تھی۔ تو کیا میں ساری عمر عبدالحق کے بیٹے کو ترستی رہوں گی۔ اس نے سوچا۔ کیا میرے عبدالحق کی نسل یہیں ختم ہو جائے گی۔

"یہ میں نے کب کہا؟" بابا نے اسے چونکا دیا۔

"تم نے کہا نا! بابا کہ اب وہ ساری عمر محروم رہے گی۔"

"ہاں! لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تیرا بیٹا محروم رہے گا۔"

چند لمحے تو حمیدہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکی۔

"جب وہ ایک دوسرے سے جڑے ہیں بابا تو ایک کی محرومی دوسرے کی محرومی ہے۔" اس نے دکھ سے کہا۔

"میری بہو کی محومی میرے بیٹے کی بھی تو ہے۔"

"ہرگز نہیں! تیرا بیٹا اللہ والا ہے، صابر ہے، اپنی خواہش کسی پر ظاہر بھی نہیں کرتا۔ صرف اللہ سے مانگتا ہے۔ اپنے ایسے بندے کو اللہ کبھی محروم نہیں رہنے دیتا۔"

حمیدہ کے دل میں روشنی کی کرن سی پھوٹی۔

"تو میرے عبدالحق کے ہاں......"

بابا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اللہ دینے والا ہے۔ جس نے جو مانگا ہے، اسے وہی ملے گا۔"

"لیکن کیسے......؟"

"کیا ہوگیا ہے تجھے......؟ سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔" بابا نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔

"مرد کو تو چار شادیوں کی اجازت ہے۔"

اور حمیدہ کو خود پر حیرت ہونے لگی۔ واقعی! سامنے کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے تو نوربانو کو بھی دوسری شادی کرانے کی دھمکی دی تھی۔ مگر اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ محض دھمکی تھی۔ وہ اسے ڈرا کر بابا کے پاس لانا چاہتی تھی اور بس۔ لیکن اب تو عبدالحق کی دوسری شادی کرانا اس کا فرض تھا۔ اگر

نوربانو نے دعا سمجھ کر اپنے لئے بددعا کی تو اس میں عبدالحق کا کیا قصور؟ اب نوربانو ماں نہیں بن سکتی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عبدالحق کی نسل یہیں پر ختم ہو جائے۔ سیدھی سی بات ہے۔

"تو مجھے دوسری شادی کرانی ہوگی اپنے بیٹے کی؟" اس نے کہا۔ پھر ایک خیال آیا تو وہ پریشان ہوگئی۔

"لیکن بابا! کیسے کراؤں گی دوسری شادی؟ وہ دونوں تو دوسرے شہر چلے گئے۔"

"تجھے کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں۔" بابا نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔

"اللہ کو جو منظور ہے، خود ہو جائے گا۔ تجھے تو خوش خبری مل گئی نا!"

لیکن خوش خبری نے حمیدہ کو بے صبرا بنا دیا تھا۔

"تو وہ کب ہوگا بابا؟"

"اللہ جانتا ہے، کون جانے، برسوں لگیں۔"

حمیدہ کا چہرہ ست گیا۔

"برسوں......؟"

"خوش ہو جا، ڈرمت، اللہ سے دعا کیا کر۔ انشاء اللہ تیرا پوتا تیری گود میں کھیلے گا۔"

"اتنے برسوں سے انتظار کر رہی ہوں بابا! اور تم اور برسوں کی بات کر رہے ہو۔"

"ناشکرا پن مت کر۔" بابا نے پرجلال لہجے میں کہا۔

"تجھے برسوں سے کہا۔ کہا نا، تو اپنے پوتے کو کھلائے گی۔"

حمیدہ لرز گئی۔ دل میں توبہ کرنے لگی۔

"پہلے ہی کہا تھا نا کہ تو مدعی نہیں۔ تجھے اپنے بیٹے سے زیادہ اولاد کی آرزو نہیں۔ اور تیرا بیٹا تو بس ایک ہی در کو مانتا ہے، ایک ہی در سے مانگتا ہے۔ اب اللہ جانے اور وہ جانے۔ تیرا کیا پیچ اس میں۔ انتظار تو جتنا نصیب میں ہے،

کرنا ہی ہوگا۔ اپنے بیٹے کو دیکھ۔ صبر اور وقار کے ساتھ انتظار کرتا ہے۔ تیرے بے صبرے پن سے انتظار کم نہیں ہوگا۔ ہاں تجھے اور برا لگنے لگے گا۔ کام تو اپنے وقت پر ہی ہوگا۔''

''ٹھیک ہے بابا! اللہ مجھے معاف کرے۔ تم میری زندگی کے لئے دعا کرنا۔'' حمیدہ نے گھبرا کر کہا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا اور منتشر تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ہر خوش خبری تو دے دی گی اسے، تو اب اسے پریشانی کس بات کی ہے۔

پھر اچانک بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے کہا۔

''مگر ایک بات تو ہے بابا! اپنے بیٹے کی دوسری شادی تو مجھے ہی کرانی ہوگی۔ خود سے تو نہیں ہوگی نا!''

''پھر وہی بچوں کی سی بات۔'' بابا جھنجلا گیا۔

''وہ دونوں تجھ سے دور چلے گئے۔ تو کیسے کرائے گی اس کی دوسری شادی؟''

''تو پھر......؟''

''تجھے کچھ بھی نہیں کرنا ہوگا۔ تجھے تو بس پوتا چاہئے۔ وہ انشاء اللہ تجھے مل جائے گا۔ اور کیا چاہئے تجھے؟''

''مجھے کچھ نہیں کرنا تو کسی کو تو کرنا ہوگا۔'' حمیدہ کے دماغ میں وہ بات ایسی پھنسی تھی کہ اس کے دل سے ہر ڈر نکل گیا تھا۔

''اللہ کی مرضی! جس سے جو کام چاہے، لے لے۔''

''پر بابا! مجھے بتاؤ تو ..... خدا کے لئے۔''

''تو سن! میں بتاتا ہوں۔ پر پہلے یہ سمجھ لے کہ جان لینے سے آدمی کی خوشی اور اس کا لطف کم ہو جاتا ہے۔ تیری بہو خود ہی کرائے گی تیرے بیٹے کی دوسری شادی۔ وہ نادان اسے بھل کھیل سمجھ کر کھیلے گی۔''

حیرت سے حمیدہ کا منہ کھلا، اور کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔

''اور تجھے میں سختی سے تاکید کر رہا ہوں کہ تو خود کچھ بھی نہیں کرنا۔ زبان سے بھی کچھ نہ کہنا۔ سب اللہ پر چھوڑ دے، اپنے بیٹے کی طرح۔''

حمیدہ نے سر جھکا لیا۔ پھر اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ بات سمجھ میں نہیں آنے والی تھی، لیکن اس کے دل نے مان لی۔

''کون جانے، تجھے بہو وہ ملے، جو تجھے دل سے پسند ہو۔'' بابا کی آنکھیں بند تھیں اور وہ عجیب سی کیفیت میں بول رہا تھا۔

''کون جانے، وہ تیرے بیٹے کو اس کا کھویا ہوا مقام اور مرتبہ دلانے والی ہو۔ کون جانے، وہ اس کی تقدیر بدل دینے والی ہو، کون جانے...... بس اللہ ہی جانے۔''

حمیدہ کے دل میں خیال آیا۔ اللہ کا دیا اتنا کچھ ہے اس کے پاس، کچھ یہاں دیتی ہی چلے۔

بابا نے آنکھیں کھول دیں۔ اور خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''یہاں میں دکان کھولے نہیں بیٹھا ہوں۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''دعاؤں کا کاروبار نہیں کرتا ہوں میں۔ مجھے دینا والا اللہ ہے، جو تمام خزانوں کا مالک ہے۔ اور میں اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتی ہوں، جو چاہتا تو اس کے لئے پہاڑ سونے کی بن جاتے۔ لیکن جو پیٹ پر پتھر باندھ کر جہاد کرتا رہا، بس اب تو چلی جا!''

حمیدہ دوسرے دروازے کی طرف بڑھی۔

اسی لمحے بابا نے اسے پکارا۔

''ٹھہر ذرا۔ پانی تو پیتی جا۔'' اس نے مٹکے کی طرف اشارہ کیا۔

حمیدہ مٹکے کی طرف چلی گئی۔ نیچے بیٹھ کر اس نے کٹورا نیچے رکھا، مٹکے کو کھولا۔ وہ صاف شفاف پانی سے اوپر تک بھرا ہوا تھا۔ اس پانی کو دیکھ کر پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا۔ اس نے ڈونگے سے پانی نکال کر کٹورا بھرا۔ پھر مٹکے کو بند کر کے ڈونگا اس پر رکھ دیا۔

نیچے بیٹھے بیٹھے اس نے کٹورا اٹھایا، بسم اللہ پڑھی اور کٹورے کو ہونٹوں سے لگا کر ایک گھونٹ لیا۔

حیرت سے وہ سن ہوگئی۔ وہ پانی تو نہیں ہوسکتا تھا۔ زبان سے حلق تک

اسی کا ذائقہ موجود تھا۔ وہ تو دودھ تھا۔ خالص دودھ، جس میں شہد کی خوشبو بھی تھی اور ذائقہ بھی۔ اور وہ زندگی بھر خالص دودھ پینے والی قسم کھا کر کہہ سکتی تھی کہ اس نے زندگی میں کبھی اتنا خوش ذائقہ دودھ نہیں پیا تھا۔

اس نے کٹورے کی طرف دیکھا تو اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ کٹورے میں تو محض صاف شفاف پاکیزہ پانی تھا۔

اس نے پانی پر نظریں جمائے ہوئے دوسرا گھونٹ لیا۔ لیکن وہ وہی دودھ تھا، جس کا گھونٹ اس نے ایک لمحہ پہلے حلق سے اتارا تھا۔

اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ کٹورے میں اب بھی پانی تھا۔

اس نے تیسرا گھونٹ لیا اور کٹورا خالی کر کے مٹکے پر رکھ دیا۔ اسے یقین تھا کہ اس دودھ کا ذائقہ وہ کبھی نہیں بھولے گی۔

وہ کھڑی ہوئی تو اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ بابا کی طرف دیکھنے کی اسے ہمت ہی نہیں ہوئی۔ وہ لرزتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔

''کون جانے......'' بابا نے کہا۔

''بس اللہ ہی جانتا ہے۔ وہ جسے جو چاہے دے دے، چاہے تو بے حد و بے حساب دے دے۔''

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی، دروازہ بند کیا اور منتظر نسیمہ کی طرف بڑھی۔

اس کے دل میں بس ایک ہی خیال تھا۔ اس پر اللہ کی بہت بڑی عنایت ہوئی ہے۔ اللہ نے بہت کرم فرمایا ہے اس پر۔

اس کے چہرے پر نہ جانے کیا تھا کہ نسیمہ پریشان ہوگئی۔ جسم کی لرزش تو ویسے ہی نمایاں تھی۔

''کیا ہوا اماں! خیر تو ہے؟'' اس نے پوچھا۔

حمیدہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھے بغیر جواب دیا۔

''سب ٹھیک ہے نسیمہ۔ اللہ کا شکر ہے۔'' پھر وہ دل میں ......اللہ کا شکر ہے...... کی گردان کرتی رہی۔

❁ ❁ ❁

کراچی پہنچ کر نور بانو کو احساس ہوا کہ اس کی خوشی کتنی سطحی تھی۔

یہ نیا شہر تو اس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ اجنبی اور نامانوس۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ تبدیلی اس کے لئے کوئی نئی چیز ہو۔ دہلی سے نکل کر اس نے ریگستان کا سفر کیا تھا۔ پھر جو اس کا پاکستان میں پہلا ٹھکانا تھا، وہ ایک گاؤں تھا، جو کبھی ٹھاکروں کی گڑھی کہلاتا تھا، جو ٹنوں ریت کے نیچے دب گیا تھا۔ بعد میں اس نے اسے برآمد ہوتے بھی دیکھا۔

وہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ موسم تو دہلی میں بھی سخت تھے۔ ایک طرف گلابی جاڑا تو دوسری طرف آگ برساتا موسم گرما۔ لیکن یہاں صحرا میں تو موسموں کے تیور ہی اور تھے۔ دہلی تو اس کے سامنے معتدل علاقہ لگتا تھا۔

پھر زبان کی تبدیلی، رسم و رواج اور رہن سہن کی تبدیلی۔ دہلی میں پردہ کتنا سخت تھا۔ مجال ہے کہ کسی غیر مرد کو انگلی بھی نظر آ سکے۔ باہر نکلنا اوّل تو ہوتا ہی نہیں تھا۔ اور ہوتا تو اس کے لئے پالکی میں سفر ہوتا۔ جس میں پردے کا خاص اہتمام ہوتا۔ اور وہاں برقع لازمی تھا۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہاں ماڈرن لوگ نہیں رہتے تھے۔ لیکن وہ جس طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتی تھی، اس میں فیشن ایبل اور بے پردہ عورتوں اور لڑکیوں کو پرکٹی میم اور انگریزوں کی نقال کہا جاتا تھا۔ اور کہا جاتا تھا کہ یہ سب سرسید احمد خان کا کیا دھرا ہے۔

لیکن صحرا میں پہنچتے ہی صورت حال بدل گئی۔ وہاں عورتیں گھر کی بوبو نہیں تھیں، نہ وہ باورچی خانے کی شہزادی تھیں۔ وہاں تو انہیں باہر کے کام بھی کرنے ہوتے تھے۔ وہاں عورتوں کے لئے نزاکت اگر کوئی شے تھی تو وہ اندر کی چیز تھی۔ محنت کرنے میں وہ مردوں سے کم نہیں تھیں۔ وہاں باورچی خانے اور گھر کے کاموں میں باہر سے پانی لانا بھی تھا۔ اور بعض اوقات وہ میلوں چل کر جاتیں اور صرف دو گھڑے پانی کے لئے اتنی مشقت جھیلتیں۔ نازک اور کمزور عورتوں کے بس کے تو دو گھڑے تھے بھی نہیں، کہ ایک سر پر رکھ کر اور دوسرا بُغل میں دبا کر ریت پر چلنا آسان کام نہیں تھا۔ باہر مرغیوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال اور اُن کا چارہ پانی کی فکر الگ۔

اب وہ حمیدہ کی محبت اور عنایات کیسے بھول سکتی تھی۔ اسی نے تو اسے بدلے ہوئے ماحول سے، زندگی سے مطابقت پیدا کرنا سکھایا تھا۔ اسی نے تو بتایا تھا کہ پردہ محض برقع لپیٹ لینے کا نام نہیں۔ یہ کام بڑی چادر سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ پردہ تو بس اپنی زینت کو، اپنے حسن کو نہاں رکھنے کا نام ہے۔ یہ خیال رکھنے کا نام ہے کہ آپ کی کوئی نظر، آپ کا کوئی انداز، آپ کی کوئی بے حجابی کسی کے لئے ترغیب اور آزمائش کا سبب تو نہیں بن رہی ہے۔

جب پہلی بار حمیدہ نے اسے دھکیل کر بھیجا کہ وہ عبدالحق کو بلا کر لائے تو اس کا کتن حال تھا۔ لیکن فوراً ہی اس نے اس تبدیلی کو قبول کر لیا، کیونکہ وہ اسے اچھی لگی۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے نزدیک دنیا محض چار دیواری کے اندر چند سو گز زمین تھی، اور اسے بھی مزید دیواروں کے ذریعے تقسیم اور محدود کر دیا گیا تھا۔ یہ تو اس نے اس وقت دیکھا کہ آسمان کیسا لامتناہی ہے اور زمین کتنی وسیع و عریض ہے کہ حدنظر بس انسان کی بے بسی کا نام ہے۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ گھٹن میں پلی بڑھی تھی۔ اور یہ کہ گھٹن بھی انسان کو خوداعتمادی نہیں دے سکتی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ خود اعتمادی تو اسے وہاں رہ کر ہی ملی تھی۔ اور خود اعتمادی کی تحریک اسے حمیدہ نے ہی دی تھی۔ حمیدہ نے ہی اسے بیٹی کہا اور سمجھا اور حمیدہ ہی کے دم سے عبدالحق اسے ملا۔

وہ مانے یا نہ مانے، حمیدہ کے اس پر بڑے احسان ہیں۔

پھر اس نے ایک اور تبدیلی دیکھی۔ صحرا سے وہ شہر میں آئی۔ شہر لاہور! نہ جانے کیوں اسے دہلی اور لاہور میں بہت فرق نہیں لگا۔ جب وہ اور بہنیں چھوٹی تھیں اور ابا زندہ تھے تو وہ کبھی انہیں سیر کے لئے لے جاتے تھے۔ جمنا کا کنارہ، قطب مینار، شاہی قلعہ، تاریخی عمارتیں، مغلوں کی یادگاریں۔ لاہور میں ویسا ہی تھا۔ وہ سب کچھ، بس دریا کا نام بدل گیا تھا۔ یہاں دریائے راوی تھا، جمنا سے چھوٹا سہی، لیکن تھا تو دریا ہی۔ بادشاہی مسجد یہاں بھی تھی، قلعہ بھی تھا۔ تھوڑا سا زبان کا فرق تھا۔

تو وہ اسے سرے سے تبدیلی ہی نہیں لگی۔ بس یہاں وہ آزاد تھی۔ آزاد

اور بڑا اعتماد۔

لیکن کراچی میں تو داخل ہوتے ہی اسے بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوا۔ وہ احساس وہاں کی فضا میں سانس لیتے ہی ہوا تھا۔ کوئی بڑی مختلف سی چیز تھی ہوا میں، جسے وہ سمجھ نہیں سکی۔

لیکن نہیں، پہلے تو اسے لاہور میں جہاز میں بیٹھتے ہی ڈر لگا تھا۔ دیکھنے میں جہاز بس سے تھوڑا ہی مختلف تھا۔ لیکن یہ خیال کہ یہ بس چلے گی نہیں، اڑے گی، ڈرا دینے والا تھا۔ اگر وہ حمیدہ سے ڈر کر بھاگ نہ رہی ہوتی، اور اگر عبدالحق اس کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ تو یہ کرتی ہوئی اس سے اتر کر گھر واپس بھاگ جاتی۔ عبدالحق نے اس کی بیلٹ کس دی تھی، اور اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''ڈرو نہیں! میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' اس نے اسے دلاسہ دیا تھا۔

اور جب جہاز نے چلنا شروع کیا تو وہ چلنا بھی کار کے دوڑنے سے زیادہ تیز تھا۔ اس نے ڈر کے مارے کھڑکی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس کے باوجود اس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

اور وہ لمحہ جب جہاز نے زمین چھوڑی اور فضا میں اٹھنے لگا، وہ تو بہت ہی بھاری تھا۔ پہلے تو وہ اسے جھولے کی پینگ لگی، اور اس احساس نے اسے زیادہ نقصان پہنچایا۔ وہ تو اپنے تصور میں جھولے پر بیٹھی پینگ لے رہی تھی۔ لیکن جھولے کی پینگ اتنی اونچی کب جاتی ہے۔ جاتے تو جھولنے والا ڈر کر گر جائے۔

اسے ایسا ہول چڑھا کہ بس، وہ تو شکر ہے کہ الٹی کا اس کا سسٹم نہیں تھا۔ اسے تو کبھی بیماری میں بھی الٹی نہیں ہوتی تھی۔ ورنہ اسے یقیناً قے ہو جاتی۔ اس نے عبدالحق کا ہاتھ بہت سختی سے پکڑ لیا تھا۔

پھر پرواز ہموار ہوگئی تو اس نے سکون کی سانس لی۔

لیکن جہاز کے اترنے کا مرحلہ اس سے بھی سخت تھا۔ اس کے پیٹ میں کوئی گولا سا بنا اور اوپر اٹھنے لگا۔ اس کے ذہن میں اس کے لئے بس ایک ہی لفظ تھا..... ہول..... اور اسے لگا کہ جہاز نیچے اتر رہا ہے۔ اور وہ اوپر کی طرف اٹھتی جا رہی ہے، اور بالآخر اسے گر جانا ہے۔

پھر جہاز کے پہیوں نے کئی بار زمین کو چھوا، پھر اٹھے اور پھر چھوا۔ جھٹکوں سے اس کا برا حال ہوگیا۔ پھر جہاز جیسے تھما، وہ تھما تو بہر حال نہیں تھا۔ اب وہ کار کی طرح چل رہا تھا، لیکن رفتار کار سے بہت تیز تھی۔ البتہ یہ تدریج کم ہو رہی تھی۔

تب وہ پرسکون ہوگئی۔ لیکن اس نے دل میں عہد کر لیا کہ اب زندگی میں کبھی جہاز پر نہیں بیٹھے گی۔

باہر عارف ان کا منتظر تھا۔

عبدالحق اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نوربانو پچھلی سیٹ پر تھی۔ وہاں پہلی سانس لیتے ہی اسے احساس ہوگیا کہ یہاں کی ہوا بالکل مختلف ہے۔

عارف عبدالحق سے لاہور کے بارے میں پوچھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''ارجمند نہیں آئی تمہارے ساتھ؟''

''نہیں! اس کا اسکول میں داخلہ ہوگیا ہے۔ وہ وہیں پڑھنا چاہتی تھی۔'' عبدالحق نے کہا۔ پھر تاسف سے بولا۔

''اس کی وجہ سے اماں بھی نہیں آئیں۔''

''جو بھی ہوتا ہے، بہتر ہی ہوتا ہے عبدالحق!''

نوربانو کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ البتہ عبدالحق نے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' پھر چند لمحے بعد اس نے پوچھا۔

''عارف بھائی! ہمارے قیام کا بندوبست تو کر رہا ہے نا آپ نے؟''

''میں نے کہا تھا کہ نہ تم اس کی فکر نہ کرو۔ البتہ دو تین دن تمہیں ہمارے ہاں قیام کرنا ہوگا۔''

''کیوں......؟''

''میری عزت افزائی کے لئے۔'' عارف نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر ہنسنے لگا۔

''ارے بھائی! مکان کا بندوبست تو میں نے کر دیا۔ لاہور سے کوئی سامان تو تم لائے نہیں ہو۔ اب مکان کو گھر کرنے کے لئے ضروری چیزیں تو

خریدنی ہوں گی تمہیں۔''

''اوہ...! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ خیر.....!''

نوربانو اب باہر دیکھ رہی تھی۔ یہ عجیب شہر تھا۔ بستی سے جڑی ہوئی بستیاں یہاں نہیں تھیں۔ خاصے فاصلے پر اکا دکا کوئی بستی نظر آتی تو وہ بھی ایسی، کہ لگتا تھا، کچھ لوگ ویرانے میں آکر آباد ہوگئے ہیں۔ زیادہ تر جھونپڑیاں ہی نظر آتی تھیں۔ اور ان میں بھی ترتیب نہیں تھی۔ ایک یہاں ہے تو دوسری سو قدم دور۔ اور یہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کب وہ بستی ختم ہوئی اور ویرانے کا تسلسل قائم ہوگیا۔

پھر ایک بڑی بستی نظر آئی۔ لیکن وہاں نہ رونق تھی نہ چہل پہل۔ اسے کوفت ہونے لگی۔

''یہ کیسا شہر ہے؟'' وہ بڑبڑائی۔

''یہ مستقبل کا بہت بڑا اور اہم شہر ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''کمال کرتے ہیں آپ! حال تو دیکھا نہیں آپ نے اس کا، اور مستقبل دیکھ لیا۔'' نوربانو کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔

''تم نہیں سمجھو گی۔'' عبدالحق نے متانت سے کہا۔

''کیسے سمجھ سکتی ہو۔ اسے سمجھنے میں تو انگریز اور ہندو، دونوں دھوکا کھا گئے۔ اگر انہوں نے اس کی اہمیت سمجھ لی ہوتی تو آج یہ پاکستان میں نہ ہوتا۔ لیکن اللہ کو جو منظور ہوتا ہے، وہ ہوکر رہتا ہے۔ وہ جسے جو مرتبہ چاہے عطا فرما دے۔''

عارف اخلاقاً چپ تھا۔ ان کی باتوں میں دخل دینا خلافِ تہذیب ہوتا۔

عبدالحق نے یہ بات محسوس کر لی۔ اس نے اسے گفتگو میں شریک کرنے کے لئے تائید طلب لہجے میں کہا۔

''کیوں عارف بھائی! میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں''

عارف مسکرایا۔

"تم سو فیصد ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن میں اس پر حیران ہوں کہ تم نے یہ سمجھا کیسے؟"

"میں ہر لمحہ پاکستان کو سمجھنے، اس کے ممکنہ وسائل کو ڈھونڈنے اور انہیں تولنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"پھر بھی، کراچی کو دیکھے بغیر سمجھنا آسان نہیں۔"

"میری سمجھ میں آپ دونوں کی باتیں نہیں آ رہی ہیں۔" نور بانو نے کہا۔

"اور آپ تو انگریزوں اور ہندوؤں کو بے وقوف قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔" اس کا یہ خطاب عبدالحق سے تھا۔

"اور وہ بھی اس ویرانے کی وجہ سے، جسے آپ لوگ شہر کہہ رہے ہیں۔"

"تم میری بات سمجھ نہیں سکیں نور بانو!" عبدالحق نے برا مانے بغیر کہا۔

"میں نے انگریزوں اور ہندوؤں کو بے وقوف نہیں کہا۔ کہہ بھی نہیں سکتا۔ ان عیاروں نے مل کر بد نیتی سے تقسیم ہند میں آخری لمحوں میں گڑبڑ کی اور جن علاقوں کو پاکستان میں ہونا تھا، انہیں ہندوستان میں شامل کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستان منتشر تو پہلے ہی ہوگا، اپنی ابتداء ہی سے معاشی ابتری کا شکار ہو جائے۔ اور آخر میں اکھنڈ بھارت، ایسی اسکیم بنانے والوں کو بے وقوف کوئی بے وقوف ہی کہہ سکتا ہے۔ وہ تو عیار اور مکار ہیں۔ یہ تو اللہ کی شان ہے کہ اس اجاڑ اور ویران پڑے قطعہ زمین کی وقعت وہ نہ سمجھ سکے۔ تو یہ اللہ کی طرف سے بہتری ہوئی نا۔"

"مگر آپ مجھے اس کی وقعت تو سمجھا دیجئے ذرا۔"

گاڑی اب ایک بڑی آبادی کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ وہاں جھونپڑیوں کے ساتھ کچے اور پکے دونوں طرح کے مکان تھے۔ بازار بھی تھا اور وہاں رونق اور چہل پہل بھی تھی۔

"یہ ڈرگ روڈ ہے بھابی!" عارف نے کہا۔ پھر وہ عبدالحق کی طرف

مڑا۔

"تم مجھے یہ تو سمجھاؤ کہ کراچی کی اہمیت تم نے کیسے سمجھی؟"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

"بنیادی بات یہ ہے عارف بھائی! کہ پاکستان اللہ کی بہت بڑی عطا ہے۔ نعمت عظمیٰ ہے مسلمانوں کے لئے۔ ورنہ یہ بنتا نہیں، اور بنتا تو قائم نہ رہ پاتا۔ اب تو ہندو پریشان ہیں۔ انہوں نے پاکستان اس لئے بننے دیا تھا کہ ان کے خیال میں دو تین سال کے اندر وہ ناکام ریاست ثابت ہو جائے گا۔ اور مسلمان ہاتھ جوڑ کر کہیں گے کہ خدا کے لئے، ہمیں واپس لے لو۔ لیکن پاکستان ہر گزرتے دن کے ساتھ مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔"

"بات اس شہر کی ہو رہی تھی۔ اور آپ اسے کہیں کا کہیں لے گئے۔" نور بانو نے مداخلت کی۔

عبدالحق اب بھی برا نہیں مانا۔

"میں اس طرف آ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اس تقسیم کے نتیجے میں، اور خاص طور پر عین وقت پر کی جانے والی بددیانتی اور زیادتی کے نتیجے میں ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ شہید ہونے والوں سے صرف نظر کر کے سوچیں تو بھی ہندوستان سے لگ بھگ ساٹھ لاکھ مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ یہ کوئی معمولی تعداد نہیں۔ دنیا کی تاریخ میں اتنی بڑی ہجرت کی مثال نہیں ملتی۔ اور اس وقت پاکستان کی حالت ایک ایسے جہاز کی تھی، جس پر اس کی گنجائش کے مطابق مسافر موجود تھے اور جو شدید طوفان سے نبرد آزما تھا۔ ایسے میں بڑی تعداد میں اور مسافر سوار کرنے پڑ جائیں تو جہاز ڈوب جاتے ہیں۔ ہندوؤں کا خیال بھی یہی تھا۔" عبدالحق نے گہری سانس لی۔

اس دوران نور بانو اکتاہٹ کے عالم میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ پیشانی پر اور بالائی ہونٹ کے اوپر پسینے کا احساس ہوا تو اس نے رومال سے اپنا پسینہ پونچھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ ابھی ایک منٹ پہلے تو پسینہ پونچھا تھا۔ یہ پھر

اوہ   یہ بھی ایک تبدیلی ہے۔ یہاں پسینہ آ جائے تو ہوا کی موجودگی میں بھی خشک نہیں ہوتا۔ اس نے سوچا۔

''اب ذرا سوچیں، عارف بھائی، ساٹھ لاکھ افراد کی آمد، جن کی اکثریت بڑے شہروں سے آئی تھی اور بڑے شہروں میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ اور یہاں بڑے شہر تھے ہی کتنے، یہ تو بہت بڑا بحران پیدا ہو جانا تھا۔ لیکن پلاننگ تو اللہ کی تھی نا! مہاجرین کی اکثریت نے کراچی کا رخ کیا۔ حالانکہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تو قصبہ کہلانے کا مستحق بھی نہیں تھا۔ لیکن ایک بہت بڑی نعمت یعنی بے حساب زمین وہاں موجود تھی۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم!'' عارف نے کہا۔

''اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے شہروں کا توازن نہیں بگڑا۔ اور مستقبل کے ایک بے شہر کی داغ بیل پڑ گئی۔ معیشت پر دباؤ بھی نہیں پڑا۔ بلکہ الٹا معیشت کے استحکام کا سامان ہو گیا۔ یہ چھوٹی سی جگہ، جس کی ہندوستان کے نقشے میں کوئی اہمیت نہیں تھی، اس کی اہمیت نہ انگریز سمجھ سکے اور نہ ہندو۔''

نور بانو باہر کے منظر سے اکتا کر پھر عبدالحق کی باتیں سننے لگی تھی۔ بے زاری سے بولی۔

''مگر اس کی اہمیت کیا ہے؟''

عبدالحق مسکرایا۔

''میرا خیال ہے، اتنی مکمل قدرتی بندرگاہ دنیا میں شاید ہی کوئی اور ہو۔''

''تو اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ ساحلی شہر سب سے زیادہ پھلتے پھولتے ہیں۔ وہ اپنے ملک کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ اور پھر ایسا شہر جہاں قدرتی بندرگاہ ہو۔''

''یہ قدرتی بندرگاہ کیا ہوتی ہے؟''

''جہاں جہاز کنارے پر آ کر لگتے ہوں۔ ورنہ عام ساحلی شہروں میں جہازوں کو بندرگاہ سے دور کھلے سمندر میں لنگر انداز ہونا پڑتا ہے۔ پھر کشتیوں

کے ذریعے تجارتی سامان کنارے پر پہنچایا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہر چیز مہنگی پڑتی ہے۔ اور یہ کراچی کوئی چھوٹی بندرگاہ نہیں، بہت بڑی بندرگاہ ہے۔ یہاں بیک وقت درجنوں جہاز لگ سکتے ہیں۔ پورے ہندوستان میں اس جیسی ایک بندرگاہ بھی نہیں۔''

''تو بندرگاہ کے ہونے نہ ہونے سے کسی ملک پر کیا فرق پڑتا ہے؟'' نور بانو جھنجلاہٹ میں سوال پر سوال کئے جا رہی تھی۔

''بین الاقوامی تجارت کی اہمیت سمجھتی ہو؟'' عبدالحق نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''جو چیزیں ہمارے پاس ہماری ضرورت سے زیادہ ہوں، وہ ہم ان ممالک کو فروخت کرتے ہیں، جہاں ان کی کمی ہوتی ہے۔ اور جن چیزوں کی ہمارے پاس کمی ہوتی ہے، وہ ہم ان ممالک سے خریدتے ہیں، جہاں ان چیزوں کی افراط ہوتی ہے۔ اس سامانِ تجارت کو بھیجنے اور منگوانے کے لئے بحری جہاز کام آتے ہیں، اور ان کے لئے بندرگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''تو ایسے ملک بھی تو ہیں جو سمندر سے محروم ہیں۔'' نور بانو نے پتے کی بات کہی۔

''تو وہ تجارت کیسے کرتے ہیں؟''

''وہ زمینی راستوں سے تجارت کرتے ہیں، اور زیادہ تر ان ممالک سے تجارت کرنا ان کی مجبوری ہوتی ہے، جن سے ان کی سرحدیں ملتی ہوں، دور سے مال منگوانے میں بین الاقوامی پیچیدگیاں حائل ہوتی ہیں اور نقل و حمل پر بھاری اخراجات بھی ہوتے ہیں۔ یوں اشیاء مہنگی بھی پڑتی ہیں۔''

''لیکن کیوں؟'' نور بانو نے معترفانہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے تو یہ اندیشہ دور دراز لگتا ہے۔''

''ملکوں اور قوموں کے بارے میں اہم فیصلے کرتے ہوئے دور کے اندیشوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا عارف بھائی! کراچی پر بحری حملہ تو ہے ہی آسان، لیکن فضائی حملہ بھی آسان ہے۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں۔ میں محمد

بن تغلق کی فراست اور دور اندیشی کا قائل ہوں۔ صدیوں میں ہندوستان میں کتنے ہی حکمراں آئے۔ لیکن دارالحکومت دہلی ہی رہا۔ حالانکہ ہر حملہ آور نے اسے روندا۔ دلی اجڑتی رہی اور بستی رہی۔ کسی کو خیال نہیں آیا کہ یہ کوئی مناسب دارالحکومت نہیں۔ محمد بن تغلق ہی تھا جس نے دہلی کی جگہ دکن کو دارالحکومت بنانے کا سوچا۔''

''لیکن اس پر پوری طرح عمل بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اس نے فیصلہ بدل دیا۔'' عارف نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''حکومت کو کتنا مالی خسارہ اٹھانا پڑا، اور دارالحکومت وہی دہلی۔''

''میرے نزدیک اہمیت خیال کی ہے۔ اس کی بدقسمتی تھی، کچھ امراء اور سرکاری عمالوں کی سازشیں، جنہوں نے اس کے منصوبے کو روبہ عمل نہیں ہونے دیا۔ بڑے بڑے مورخین نے اسے جینئس قرار دیا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ وہ اپنے دور سے بہت آگے کا حکمراں تھا۔ آپ یہی دیکھ لیں کہ وہ پہلا آدمی تھا، جس نے کاغذی زر کے بارے میں سوچا کہ اس کے نزدیک سکے ڈھالنا دھاتوں کا ضیاع تھا۔''

''لیکن وہ اس میں بھی ناکام رہا۔'' عارف نے پھر حملہ کیا۔

''جینئس لوگوں کے ساتھ یہی تو مسئلہ ہوتا ہے۔'' عبدالحق نے متانت سے کہا۔

''وہ بعض اوقات صدیوں بعد کی بات سوچتے ہیں۔ غالب کی شاعری آج بھی تازہ ہے۔ اور شاید صدیوں بعد بھی اس کی تازگی برقرار رہے گی۔ محمد بن تغلق خود تو ناکام ہوگیا۔ لیکن آج آپ دیکھیں، پوری دنیا میں کاغذی زر کی اہمیت تسلیم کر لی گئی ہے۔ دس بیس سال بعد سکے تو شاید آثار قدیمہ ہی بن جائیں گے۔''

''یہ بات تو ٹھیک ہے تمہاری۔''

''بات دور نکل گئی عارف بھائی! ایک دوسری بات بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کراچی بہت پھیلے گا۔ آبادی بھی مستقبل میں اس کی بہت زیادہ ہوگی۔ ایسے

شہر کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اس پر دارالحکومت کا بوجھ بھی ڈال دیا جائے۔''

''تو تمہارے ذہن میں کوئی متبادل بھی ہوگا اس کا؟''

''میں اس پر سوچتا رہا ہوں۔'' عبدالحق نے پرخیال لہجے میں کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ وہ کوئی ایسا مقام ہو، جس پر بحری، زمینی اور فضائی، کوئی بھی حملہ کرنا آسان نہ ہو۔ نہ پنجاب کی طرف سے، نہ سندھ کی طرف سے اور نہ ہی کشمیر کی طرف سے۔ اور یہ بھی طے ہے کہ دارالحکومت بننے کے بعد وہ شہر پھیلے گا۔ تو یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں توسیع کی گنجائش بھی ہو۔''

''اگر بھارت کے خطے کو مدنظر رکھا جائے تو اس کی جگہ صوبہ سرحد ہی بنتی ہے۔''

''نہیں عارف بھائی! اس طرف افغانستان ہے، اور بلوچستان کی طرف ایران ہے۔ دونوں ممالک کی بھارت سے دوستی ہے۔ بلکہ افغانستان کا رویہ تو پاکستان کے ساتھ مدافعانہ ہے۔''

''تو پھر ...!''

''مجھے راولپنڈی میں گنجائش نظر آتی ہے۔ اس میں پھیلنے کی گنجائش بھی بہت ہے۔''

''تو اکنامک ڈویژن میں بیٹھ کر یہ سب سوچتے رہے تم؟''

''جی عارف بھائی!''

''سوچا بھی یا کچھ کیا بھی؟''

''کر کیا سکتے ہیں ہم۔ تجاویز فائلوں کو سونپ کر فائلیں آگے بڑھا دیتے ہیں۔''

''یہ جو صنعت کی بات کر رہے تھے تم ...''

''جی ہاں! اس کے لئے ہمیں پوری تیاری کے ساتھ طویل المیعاد منصوبے بنا کر ان پر عمل کرنا ہوگا۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں، اس میں جو کچھ قابل عمل لگتا ہے، اس کو کاغذ پر لکھ کر اس پر عمل درآمد کا تفصیلی خاکہ لفظوں میں بناتا ہوں، اور آگے بڑھا دیتا ہوں۔''

''ابھی تک کسی تجویز پر عمل بھی ہوا؟''

''نہیں......!''

''اچھا! طویل المیعاد منصوبوں سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

''معیشت کا رخ تبدیل کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے عارف بھائی! اور وہ بھی ایک نوزائیدہ ملک میں۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ایک زرعی ملک میں جب آپ صنعت کو فروغ دینا چاہیں گے تو وقت تو لگے گا۔ یہاں تو صنعت کا کوئی انفرااسٹرکچر موجود ہی نہیں ہے۔ تو یہ مرحلہ وار کام ہوگا ... قدم بہ قدم، آہستہ آہستہ۔ یہاں تو ملیں ہیں ہی نہیں۔ سب ہندوستان کے پاس چلی گئیں۔''

''یہ تو واقعی بڑا اور لمبا کام ہے۔ اتنی اہمیت بھی ہے اس کی؟'' عارف کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''یہ کئی پہلوؤں سے فائدہ مندہ ہے۔ دیکھیں، ہم خام مال برآمد کرتے ہیں، جو کہ ہماری مجبوری ہے، تو بین الاقوامی مارکیٹ میں اس کی قیمت کم ملتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خریدار ہماری کمزوری سے واقف ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ قیمت کم دیتے ہیں۔ ہم اپنی پیداوار کو یہاں رکھ کر خراب ہونے سے بہتر سمجھتے ہیں کہ اونے پونے بیچ دیں اسے۔ دوسری طرف اسی خام مال سے بنی مصنوعات کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے تو ہمیں وہ درآمد کرنا پڑتی ہیں اور وہ ہمیں مہنگی ملتی ہیں۔ یہ دہرا نقصان ہوا۔ اس کی وجہ سے درآمدات اور برآمدات کا توازن بگڑتا ہے، اور ہماری کرنسی غیر مستحکم ہوتی ہے۔''

''معاشیات سے میں بالکل نابلد ہوں۔'' عارف نے بے بسی سے کہا۔

''میں تو اس مضمون کی اہمیت سے واقف ہی نہیں تھا۔ پہلی بار مجھے اس کی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے۔ لیکن میرے لئے اسے سمجھنا آسان نہیں۔ بنیادی تصور تک سے بے خبر ہوں نا!''

''میں آسان کر کے سمجھاتا ہوں آپ کو۔'' عبدالحق کے لہجے میں بلا کا انکسار تھا۔

''میں دو مثالیں دوں گا آپ کو۔ ایک تو پٹ سن ہے۔ پوری دنیا میں اس کی جو پیداوار ہے، اس کا اسی فیصد مشرقی پاکستان میں پیدا ہوتا ہے۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی ملی بھگت بہت پرانی ہے۔ آپ دیکھ لیں، صنعتیں ان علاقوں میں قائم ہی نہیں کی گئی تھیں، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ تاکہ وہ خوش حالی سے محروم رہیں اور معاشی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جائیں۔ اب تقسیم کے بعد کی صورتِ حال دیکھئے۔ پٹ سن مشرقی پاکستان میں پیدا ہوتا ہے، اور جوٹ ملز تمام کی تمام کلکتہ اور مغربی بنگال میں ہیں۔ ہم پٹ سن برآمد کرنے پر مجبور ہیں۔ اب زرعی ملک ہونے کے ناطے پٹ سن کی مصنوعات ہماری بنیادی ضرورت بھی ہیں ... بوریاں وغیرہ۔ تو وہ ہمیں ہندوستان سے مہنگے داموں درآمد کرنی پڑتی ہیں۔ ہندوستان فائدے میں ہے، اور ہم نقصان میں۔ اب اگر ہم مشرقی پاکستان میں ہی جوٹ ملز قائم کریں، اور وہاں پٹ سن کی مصنوعات تیار کریں تو وہ مصنوعات پوری دنیا کی ضرورت ہوں گی۔ اور اجارہ داری کی وجہ سے ہم اپنی مرضی کی قیمت بھی لے سکیں گے۔ ہماری برآمدات بہتر ہوں گی اور درآمدات پر سے پٹ سن کی مصنوعات کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ یوں برآمدات اور درآمدات کا توازن ہمارے حق میں ہو جائے گا، اور روپیہ عالمی منڈی میں مستحکم ہوگا۔ اس ایک اور زاویے سے دیکھئے۔ ملیں قائم ہوں گی تو ہمارے لوگوں کے لئے روزگار کے دروازے کھلیں گے۔ بے روزگاری کم ہوگی، اور افرادی قوت بے روزگاری کی شکل میں قومی معیشت پر بوجھ بننے کے بجائے، الٹا اسے سہارا دے گی، بلکہ مستحکم کرے گی۔ یہی نہیں، ہندوستان کی معیشت کے لئے یہ دھچکا ہوگا۔ انہیں ہم سے پٹ سن نہیں ملے گا تو ان کی جوٹ کی صنعت تباہ ہو جائے گی۔ ان کا سرمایہ بھی ڈوبے گا۔ اور وہ پٹ سن کی مصنوعات ہم سے خریدنے پر مجبور ہوں گے۔

دوسری مثال میں کپاس کی دوں گا۔ اس کا تعلق برطانیہ کی معیشت سے ہے۔ آپ کو یاد......''

''ارے......! یہ کیسا بندر روڈ ہے؟'' نور بانو کی آواز نے ان دونوں کو

چونکا دیا۔

''بندر تو یہاں ایک بھی نہیں ہے۔ اور نام بندر روڈ......''

عارف کی سمجھ میں بات دیر سے آئی۔ دراصل وہ پورے انہماک سے عبدالحق کی بات سن رہا تھا۔ بات سمجھ میں آئی تو وہ ہنس دیا۔

''ارے وہ بندر نہیں بھائی! دراصل یہ روڈ بندرگاہ کی طرف جاتا ہے، اس لئے اس کا نام بندر روڈ ہے۔ پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا کہ یہاں بندر بہت ہوں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے معذرت طلب نظروں سے عبدالحق کو دیکھا۔

''تمہاری باتیں سن کر میری آنکھیں کھل رہی ہیں۔ لیکن اب ہم گھر پہنچنے والے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد تم مجھے تفصیل سے یہ سب بتانا۔''

عبدالحق نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

نوربانو کو اب ہوا میں تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ نمی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ اسے اپنے منہ میں نمک کا ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ ہوا کچھ خنک ہوگئی تھی۔ لیکن پسینہ تھا کہ اب بھی خشک نہیں ہو رہا تھا۔

وہ اس سلسلے میں استفسار کرنے ہی والی تھی کہ عبدالحق نے گہری گہری سانسیں لیں اور عارف سے بولا۔

''عارف بھائی! لگتا ہے کہ ہم سمندر کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔''

عارف نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا اس کا؟''

''ہوا میں نمی کی وجہ سے۔ منہ میں نمک کا ذائقہ آ گیا ہے۔''

نوربانو کو اس کے سوال کا جواب سوال کئے بغیر مل ہی گیا۔

''مگر تم تو پہلی بار یہاں آئے ہو۔ تمہیں کیسے معلوم؟'' عارف نے کہا۔

''لڑکپن میں ایک بار بمبئی گیا تھا میں ماسٹر جی کے ساتھ۔ میں دنیا کے بارے میں بہت سوچتا اور غور کرتا تھا۔ سمندر کے بارے میں بہت متجسس تھا میں۔ تو ماسٹر جی کی سفارش پر میرے والد مجھے سمندر دکھانے بمبئی لے گئے تھے۔

وہ یاد آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ جبھی تو ذائقے کی اس تبدیلی کو میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔''

نوربانو کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ عبدالحق کو بالکل نہیں جانتی۔ وہ تو اسے بس ایسا ہی سمجھتی تھی۔ لیکن عارف جس طرح مرعوب ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا، وہ عبدالحق کی قابلیت کا ثبوت تھا۔

اسے شرمندگی ہونے لگی۔ آسانی سے قیمتی چیز مل جائے تو آدمی کو اس کی قدر ہی نہیں ہوتی۔ وہ اسے گردانتی ہی نہیں تھی۔ اسے پتا بھی نہیں تھا کہ وہ اندر سے کیسا بھرا ہوا آدمی ہے۔ اس نے کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی اسے جاننے اور سمجھنے کی۔ اس وقت بھی عارف سے یہ گفتگو نہ ہوئی ہوتی تو اسے اندازہ ہی نہیں ہوتا۔

✿ ✿ ✿

زبیر اور رابعہ ساجد کے ساتھ نیچے منتقل ہو چکے تھے۔ عبدالحق کی جدائی اپنی جگہ، لیکن سچ تو یہ تھا کہ حمیدہ کے لئے گھر کی رونق بڑھ گئی تھی۔ رابعہ اور زبیر تو شروع ہی سے اس سے قریب تھے۔ اور ساجد اسے نانی کہتا تھا۔

اس وقت بھی ساجد اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس سے لپٹ کر۔ اور وہ اس سے حق نگر کی باتیں سن رہی تھیں، جو اس کے نزدیک اب بھی چھوٹا گاؤں تھا۔

رابعہ کمرے میں آئی۔

''ابھی میں کھانا پکانے گئی اماں! تو دیکھا کہ کھانا تو تیار ہے۔'' اس نے حمیدہ سے کہا۔ اس کے لہجے میں شکایت تھی، جیسے وہ کسی سعادت سے محروم ہوگئی ہو۔

''یہ تو روز کا معمول ہے۔'' حمیدہ نے بے پروائی سے کہا۔

''نگی اسکول جانے سے پہلے دوپہر کا کھانا پکا کر جاتی ہے۔ جب عبدالحق یہاں تھا تو اسے دفتر کھانا بھیجنا ہوتا تھا۔''

''وہ تو منجھلی بی بی بھیجتی ہوں گی نا؟''

''اس نے تو کبھی نہیں بھیجا...... میرے سمجھانے پر بھی نہیں بھیجا۔'' حمیدہ نے آہ بھر کر کہا۔

''وہ تو بارہ بجے تک پڑی سوتی رہتی تھی۔''

''پر اماں! نکی کیسے کرتی ہوگی یہ سب......؟''

''وہ بہت سویرے اٹھتی ہے۔ تہجد پڑھ کر کھانا پکاتی ہے۔ پھر ناشتہ تیار کر کے، مجھے کرا کے اسکول جاتی ہے۔'' حمیدہ کے لہجے میں فخر تھا۔ پھر وہ کچھ دیر سوچتی رہی، جیسے کچھ یاد کر رہی ہو۔

''مجھے یاد آتا ہے۔ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب عبدالحق دفتر جانے لگا تو نکی نے یہ کام سنبھال لیا۔ ہاں ناشتہ تو پہلے بھی وہی بناتی تھی۔''

''تو کاکا کے دفتر کانا بھیجنے کے لئے......''

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہاں، یہی بات ہے۔ اب میری سمجھ میں آیا۔ اسے یہ فکر تھی کہ عبدالحق کے دفتر کھانا نہیں بھیجا جاتا ہے۔ اس نے یہ ذمہ داری خود ہی اٹھا لی۔''

رابعہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر افسردگی سے بولی۔

''منجھلی بی بی کو یہ کیا ہوگیا ہے۔ ایسی تو نہیں تھیں وہ۔ پہلے تو بہت خیال رکھتی تھیں کاکا کا۔ یہ تو ان کی خوش قسمتی ہے کہ کاکا انہیں ملے۔ ورنہ کاکا کے لئے کیا کمی تھی؟''

حمیدہ کو بابا کی بات یاد آ گئی۔

''وہ ناشکری ہوگئی ہے رابعہ!''

رابعہ اب بھی کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے شاید حمیدہ کی بات سنی بھی نہیں تھی۔

''اور اولاد بھی نہیں ہوئی ابھی تک؟''

حمیدہ کو پھر بابا کی یاد آئی۔

''جب اللہ کا حکم ہوگا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اولاد بھی ہو جائے گی انشاء اللہ!''

رابعہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''سات سال تو ہو گئے اماں!'' اس کے لہجے میں دبا دبا احتجاج تھا۔

''بڑے ٹھاکر کا انتظار یاد نہیں تجھے۔''

''اللہ نہ کرے کہ کاکا کو اتنا انتظار کرنا پڑے۔'' رابعہ نے تیزی سے کہا۔ پھر بولی۔

''تمہیں بھی کوئی فکر نہیں اماں!''

''کل تک تو تھی، آج ہی تو بے فکر ہوئی ہوں۔ تو بھی فکر نہ کر رابعہ! اللہ نے چاہا تو میری گود میں کھیلے گا عبدالحق کا بچہ۔''

''انشاء اللہ اماں! پر تمہاری بے فکری میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''میری تیری فکر سے کچھ نہیں ہوتا پگلی!'' حمیدہ نے اسے سمجھایا۔

''جو اوپر والے کا حکم۔''

''پر نیچے والوں کو بھی تدبیر تو کرنی پڑتی ہے۔''

''تو یہ کرتو ہے!'' حمیدہ کی آواز لرزنے لگی۔

''میں نے کہا نا! اللہ جب چاہے گا تو سب کچھ ہو جائے گا۔''

''پر اماں! تدبیر......''

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تو کیا سمجھتی ہے۔ مجھ سے زیادہ بے تاب کون ہوگا؟ میں فکر بھی کرتی رہی اور تدبیر بھی۔ کہاں کہاں نہیں گئی میں اپنے پتر کی اولاد کے لئے......''

''پر ایک تدبیر تو رہ گئی نا اماں!'' رابعہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ گاؤں میں کبھی اتنا وقت، اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ حمیدہ سے اس بارے میں بات کرتی۔ لیکن سوچتی تو رہتی تھی وہ۔ اور اب موقع بھی تھا بات کرنے کا۔

''ہم بس اللہ سے دعا کر سکتے ہیں۔ اس سے مانگ سکتے ہیں، اور کچھ نہیں کر سکتے۔''

''پر اماں! کاکا تمہیں انکار تو نہیں کر سکتے نا!'' رابعہ نے دوسری شادی کا تذکرہ کئے بغیر دل کی بات کہی۔

"ہاں! یہ تو ہے۔ پر اللہ کا حکم کچھ اور ہے۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تجھے کچھ معلوم ہی نہیں، تو سمجھ میں کیسے آئے گا؟"

"یہ نکی تمہاری عجیب لڑکی ہے۔" رابعہ نے موضوع بدلا۔

"اتنی محنتی، نماز کی پابند، ہر ایک کی فکر، صبح تڑکے ہمیں بلانے کے لئے آ گئی اور ناشتہ کتنا اچھا بنایا۔"

"اس کی کیا بات کرتی ہے تو رابعہ! اس جیسا تو میں نے کوئی اور دیکھا ہی نہیں۔"

"اور کتنی پیاری صورت ہے ماشاء اللہ!"

ساجد حمیدہ سے لپٹا بڑے شوق سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔ حمیدہ اور رابعہ کو اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں تھا۔

"اللہ نصیب اچھے کرے اس کے۔" حمیدہ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا دینے والے انداز میں کہا۔

"اماں! عمر کتنی ہوگی نکی کی؟" رابعہ نے اچانک پوچھا۔

حمیدہ کی سمجھ میں وجہ تو نہیں آئی، لیکن نہ جانے کیوں وہ چوکنا ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ ارجمند چودہ پندرہ کی ہے۔ لیکن اس نے پتا نہیں کیوں اس کی عمر میں دو سال کا اضافہ کر کے بتایا۔

"سولہ سترہ کی ہوگی۔"

"لگتی تو اور چھوٹی ہے۔ کاش کچھ اور بڑی ہوتی۔"

"نانی...... نانی، چھوٹی چا......" ساجد بڑے جوش سے کچھ کہنے والا تھا کہ بروقت ٹھٹک گیا۔

دونوں عورتوں کو پہلی بار اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ حمیدہ نے محبت سے اسے دیکھا۔

"تو کیا کہہ رہا ہے ساجد......؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا نانی! کہ باجی بہت اچھی ہیں۔"

"پر تو کہہ کچھ اور رہا تھا۔" رابعہ نے اسے گھورا۔

"باجی تو نہیں کہا تھا تو نے۔"

ساجد گڑبڑا گیا۔

"وہ تو نانی انہیں نکی کہتی ہیں نا......!"

"تو پھر......؟"

"نکی کو اُردو میں چھوٹی کہتے ہیں نا!" ساجد نے بات بنائی۔

"اچھا! اب تو باہر جا کر کھیل کچھ دیر۔ باغ میں جھولا جھول کر آ۔" رابعہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

ساجد اٹھنا تو نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ماں کے اس لہجے سے واقف تھا۔ وہ اٹھا اور باہر چلا گیا۔

اتنی دیر میں حمیدہ اپنے چوکنے پن کو سمجھ گئی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ اس نے نکی کی عمر بڑھا کر کیوں بتائی ہے۔ یہ دل میں دبی خواہش تھی، جو اس وقت پوری شدت سے ابھر آئی تھی۔

"میں کہہ رہی تھی اماں! کہ نکی کچھ اور بڑی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔"

حمیدہ سمجھ گئی کہ رابعہ کے دل میں بھی یہی بات ہے۔

"عمر سے کیا فرق پڑتا ہے رابعہ!" اس نے رسان سے کہا۔

"اللہ کی مرضی، اس کا حکم ہو تو کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"میں پھر وہی کہوں گی اماں! کہ بندے کو حیلہ تو کرنا پڑتا ہے۔"

"کبھی بندے کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا، اور اسے مل جاتا ہے۔" حمیدہ نے کہا۔ اسے بابا کی بات یاد آ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا...... کون جانے، تجھے وہ بہو ملے، جو تجھے دل سے پسند ہو۔ اور اس نے کہا تھا...... تیری بہو خود ہی کرائے گی تیرے بیٹے کی دوسری شادی۔ اور اس نے کہا تھا...... کون جانے، اس میں برسوں لگیں۔

اب دو کڑیاں جوڑ سکتی تھی، اس کے دل میں امید کی کلیاں کھلنے لگیں۔ برسوں لگیں گے تو نکی بڑی ہوگی نا، تو یہ برسوں کا انتظار ضروری ہے نا، صبر کا پھل

بیٹھا ہوگا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ اس کی بہو نکی جیسی ہو۔ نکی چھوٹی تھی، اس لئے وہ اس کے بارے میں نہیں سوچ سکتی تھی۔ پر اسے دل سے تو وہی پسند تھی۔ اللہ چاہے گا تو برس یوں گزر جائیں گے ہوا کے جھونکے کی طرح۔ اور نکی بڑی ہو جائے گی۔

اور دنیا میں ایک نکی ہی تو تھی، جس سے نور بانو بہن جیسی...... سگی بہن جیسی محبت کرتی تھی۔ نور بانو نے خود عبدالحق سے کہا تھا کہ وہ نکی کو پڑھائے۔ ورنہ تو وہ بڑی تنگ دل تھی۔ تو کون جانے، نور بانو خود......

حمیدہ کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔ اس کے کانوں میں بابا کی آواز گونج رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں سب کچھ آ رہا تھا۔ وہ اب خوشی سے برسوں صبر کر سکتی تھی، انتظار کر سکتی تھی، بس وہ اللہ سے دعا کرتی رہے گی۔

رابعہ اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے حمیدہ کی کچھ دیر پہلے کہی ہوئی بات یاد آئی، جس پر وہ توجہ نہیں دے سکی تھی۔

''اماں! ابھی تم نے کہا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں تو سمجھوں گی کیسے؟''

حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

''تو مجھے بتا دو نا اماں! مجھے سمجھا دو۔''

حمیدہ نے ایک گہری سانس لی اور اسے بابا کے بارے میں بتانے لگی۔

کہتے ہیں، خوشی میں کسی کو شریک کر لیا جائے تو خوشی بڑھ جاتی ہے۔ حمیدہ کی خوشی بھی بڑھ گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

ساجد کمرے سے نکلا تو گھبرایا ہوا تھا۔ ایک تو اسے پچھتاوا تھا کہ اس نے بول کر گڑبڑ کر دی۔ ورنہ وہ وہاں بیٹھا رہتا، اور نہ نانی کو پتا چلتا نہ اماں کو۔ اور وہ دونوں چھوٹی چاچی کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

یہ خیال آتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس سے ایک بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ اس کے منہ سے چھوٹی چاچی نکلنے والا تھا۔ بس صحیح وقت پر اسے خیال آ گیا۔ اور اس نے خود کو روک لیا۔ ورنہ چھوٹی چاچی ناراض ہو جاتی۔

وہ باہر لان میں چلا گیا اور جھولے پر بیٹھ گیا، جہاں وہ ارجمند کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہاں بیٹھتے ہی اسے چھوٹی چاچی یاد آئی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جھولے کو اس طرح نہیں ہلا پایا تھا، جیسے چھوٹی چاچی نے چلایا تھا۔

وہ بیٹھ کر چھوٹی چاچی کے بارے میں سوچنے لگا۔ آخر اس نے انہیں چھوٹی چاچی کیوں کہا۔ جبکہ وہ چاچی کو جانتا تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ چھوٹی چاچی اس کی چاچی نہیں ہیں۔

اسے چاچا کا خیال آ گیا۔ چاچا اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ جب بھی گھر آتے تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی چیز لے کر آتے۔ اور وہ اسے کبھی گود میں، اور کبھی اپنے پاس بٹھا کر اس سے خوب باتیں کرتے۔ وہ اس سے سوال کرتے، اور وہ جواب دیتا تو وہ بہت خوش ہوتے۔ یہ تو اسے ہوش سنبھالتے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔

وہ خود بھی ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ انہی کے پاس رہتا۔ لیکن نہ جانے کیوں، چاچی اس سے چڑتی تھیں۔ چاچا بھی ان کے ہوتے ہوئے اس سے دور رہتے تھے۔ چاچی انہیں ٹوک بھی تو دیتی تھیں۔ اب چھوڑ بھی دیں اس بیچارے کو۔ آپ تو پکڑ کر بیٹھ ہی جاتے ہیں اسے۔ وہ ان سے کہتیں، لیکن دیکھتیں اسے۔ اور ان کی نظروں میں اس کے لئے ناپسندیدگی ہوتی۔ چاچا کھسیا کر ہٹ جاتے۔

اسے یاد تھا، ایک بار جب چاچا لاہور واپس آ رہے تھے تو وہ ان سے لپٹ گیا تھا۔

''میں آپ کے ساتھ چلوں گا چاچا!''

چاچا یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔

''میں تو لاہور جا رہا ہوں۔ پتا بھی ہے، لاہور بہت دور ہے۔'' وہ بولے۔

''تو کیا ہوا، میں چلوں گا آپ کے ساتھ۔''

''پھر وہاں اماں اور بابا یاد آئیں گے تو رو کر مجھے پریشان کرو گے۔''

"نہیں چاچا! میں انہیں یاد ہی نہیں کروں گا۔ اور رووٗں گا بھی نہیں۔"

"یہ تو بہت بری بات ہے۔" چاچی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"اپنی اماں کو اکیلا چھوڑ دو گے یہاں؟"

"نہیں چاچی! اماں کے پاس بابا ہوں گے نا۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"نہیں! کوئی اچھا بچہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر نہیں جاتا۔" چاچی نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے۔"

"ایسے سختی سے بات نہیں کرو نور بانو!" چاچا نے چاچی سے کہا۔

"بچوں کا دل بہت نازک ہوتا ہے۔"

"بس رہنے دیں۔ آپ کے پاس ہوتا تو اب تک آپ اس کی عادتیں تباہ کر چکے ہوتے۔"

پھر بھی اس نے ضد کی تو چاچی نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا۔

اسے یاد تھا، ان کے جانے کے بعد بھی وہ روتا رہا۔ اماں اور بابا اسے پیار کرتے رہے، سمجھاتے رہے، لیکن اس کا دل دکھا ہوا تھا۔ اپنے آنسو روکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ بھوک ہی نہیں لگ رہی تھی۔ اماں ابا کھانے کے لئے اصرار کرتے رہے۔ وہ جان چھڑانے کے لئے منہ لپیٹ کر پڑ لیا، اور یہ ظاہر کیا کہ جیسے وہ سو رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اماں اور بابا کی باتیں نہ سن پاتا۔

"یہ منجھلی بی بی کو کیا ہوگیا ہے۔ اتنا چھوٹا دل ہے ان کا۔" اماں نے کہا۔

"بے کار کی باتیں مت کر رابعہ!" بابا نے سختی سے کہا۔

"تو کیا غلط کہہ رہی ہوں میں۔ اتنا رلایا ہے میرے بچے کو۔ کھانا بھی نہیں کھایا اس نے۔ بھوکا ہی سو گیا۔"

"اس میں منجھلی بی بی کا کیا قصور؟ وہ تو اسے اچھی بات ہی سمجھا رہی تھیں۔"

"تو پیار سے سمجھاتیں نا!"

"سختی کی بات زیادہ یاد رہتی ہے بچوں کو۔"

"بس! رہنے دو۔" اماں چونک گئیں۔

"وہ تو شروع ہی سے چڑتی ہے میرے بچے سے۔ چھوٹا سا تھا، اس وقت سے۔ کاکا تو اس کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ منجھلی بی بی نے انہیں دور کر دیا میرے بچے سے۔"

"میں پھر کہتا ہوں رابعہ! ایسی باتیں نہ کرو۔ ہم تو بس وفادار نوکر ہیں۔ مالکوں کے بارے میں......"

"یہ رشتہ تو ہمارا بس کاکا سے ہے، منجھلی بی بی سے نہیں۔ اور کاکا تو ہمیں مان دیتے ہیں۔ تمہیں بڑا بھائی سمجھتے ہیں۔"

"سمجھنے سے رشتے نہیں بدل جاتے۔ آدمی کو اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہئے۔ اور میری بات دھیان سے سن۔ منجھلی بی بی اب ہمارے لئے صرف منجھلی بی بی نہیں۔ وہ کاکا کی بیوی ہیں۔ ان کے بارے میں سوچ سمجھ کر بات کیا کر۔"

"لیکن ساجد کے ابا! کاکا نے خود کہا کہ اب ہم ان کے نوکر نہیں ہیں۔ دیکھو نا، اب ہم مسلمان ہیں۔"

"تو سمجھتی کیوں نہیں پگلی!" بابا کا لہجہ نرم ہوگیا۔

"کاکا نے اس وقت جو کیا، اب میں سمجھ سکتا ہوں۔ ہم انہیں مالک نہیں کہہ سکتے۔ دیکھو نا، مالک تو بس اللہ ہے۔ اب یہ تو سوچ کہ اللہ نے ہمیں عزت دی۔ سیدھے راستے پر لایا۔ ہم اس دین میں داخل ہوئے۔ اللہ کا فضل، پر یہ راستہ تو ہم نے کاکا کی محبت میں ہی دیکھا۔ ہماری وفاداری نے ہی تو ہمیں ان کے پیچھے چلایا۔ اب مسلمان ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اس وفاداری کو، اپنے اصل تعلق کو بھول جائیں۔ یہ تو نقصان کا سودا ہوگا۔"

"میں تو بس یہ کہہ رہی تھی......"

"تو جو بھی کہہ رہی تھی، وہ غلط تھا۔"

ساجد کی سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آئی تھیں۔ لیکن وہ اتنا سمجھ گیا تھا کہ اماں کو چاچی کا روّیہ پسند نہیں، پسند بابا کو بھی نہیں، لیکن وہ اس پر بات نہیں کرنا چاہتے۔

یہ وفاداری والا معاملہ بھی عجیب تھا۔ ماں اور باپ دونوں ہی الگ الگ اسے یہ سبق پڑھایا کرتے تھے۔ وہ اسے بتاتے تھے کہ وہ دونوں چاچا کے بابا کے نوکر تھے اور اب چاچا کے نوکر ہیں۔ یہ تو چاچا کی مہربانی ہے کہ وہ انہیں عزت دیتے ہیں۔ چاچا کے اور ان کے بابا کے ان پر بڑے احسان ہیں۔ آج وہ جو کچھ بھی ہیں، اللہ کے بعد انہی کی مہربانی سے ہیں۔ وہ اسے سمجھاتے تھے کہ اسے ان سے بڑھ کر چاچا سے محبت کرنی ہے۔ اسے ہمیشہ ان کی غلامی کرنی ہے۔ ان کے حکم کے خلاف کبھی نہیں کرنا۔ اس سے کوئی غلطی ہوئی تو ان دونوں کے لئے مر جانے کے برابر ہوگا۔

وہ اب بھی نہیں سمجھ پایا تھا کہ وفاداری کیا ہوتی ہے، کیسے کی جاتی ہے، اس کے لئے کیا کیا کرنا ہوتا ہے۔ سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔ لیکن اب تصور میں وہ چاچا کو دیکھتا تو وہ اسے بہت اونچے، بہت لمبے، بڑے رعب والے لگتے، اور اسے ان سے ڈر لگنے لگتا۔ لیکن جب وہ سامنے آتے تو وہ وفاداری کا ہر سبق بھول جاتا۔ وہ اپنا ڈر بھی بھول جاتا۔ وہ بس ان سے محبت کرتا۔

ایک دن رات کے کھانے کے بعد وہ اماں اور بابا کے ساتھ بیٹھا تھا۔

نہ جانے کس بات پر اماں نے کہا۔

"میرا بیٹا دنیا میں سب سے زیادہ محبت مجھ سے کرتا ہے۔"

"نہیں رابعہ! تو غلط کہہ رہی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔" بابا نے کہا۔

"یہ سب سے زیادہ محبت مجھ سے کرتا ہے۔"

اس نوک جھونک میں بھی خوشی اور محبت تھی۔ کچھ دیر وہ ایک دوسرے سے الجھتے رہے۔ پھر بابا نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ساجد سے پوچھ لو۔"

اماں اس کی طرف مڑیں۔

"کیوں ساجد! تو دنیا میں سب سے زیادہ محبت مجھ سے کرتا ہے نا؟"

ان کے انداز میں بڑا مان تھا۔

وہ اماں کو غور سے دیکھتا رہا، پھر انکار میں سر ہلا دیا۔

اماں کا منہ اتر گیا۔ وہ اسے بے یقینی سے دیکھتی رہیں۔ انہیں صدمہ ہوا تھا۔

بابا ہنسنے لگے۔

"دیکھا...... میں کہتا تھا نا!" ان کے لہجے میں فخر تھا۔

اماں اب اسے شکایتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"تو تو سب سے زیادہ اپنے بابا سے محبت کرتا ہے؟"

اس نے اس بار بھی انکار میں سر ہلا دیا۔

اماں ہنسنے لگیں۔ بابا کھسیا گئے۔

"تو اب تو خود ہی بتا دے کہ دنیا میں تو سب سے زیادہ محبت کس سے کرتا ہے؟"

اس نے بغیر جھجکے فوراً جواب دے دیا۔

"چاچا سے......!"

اماں اور بابا کی نگاہوں میں ایک لمحے کو حیرت نظر آئی۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنسنے لگے۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔

ساجد کو حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ اب اسے ڈانٹ پڑے گی۔ وہ بھی حیران سا انہیں دیکھتا رہا۔

"دیکھا، میرا بیٹا کتنا اچھا ہے۔" بابا نے فخر سے کہا۔

"اسے پتا ہے کہ کس کی محبت سب سے ضروری ہے۔"

"یہ محبت اسے مجھ سے ملی ہے۔" اماں نے اسے لپٹا لیا۔

"اللہ کی قدرت ہے رابعہ! یہ تو اللہ کی دین ہے۔ اور ذرا سوچو تو سہی، ہماری غلامی اسے محبت کے روپ میں ملی ہے۔ اسے کہتے ہیں ترقی۔ اللہ کے دین

میں کتنی برکت ہے۔"

اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ بابا نے اسے گود میں بٹھا لیا۔

"شاباش ساجد!" انہوں نے کہا۔

"تو نے ہمارا دل خوش کر دیا ہے۔ اب ہمیشہ ایسے ہی رہنا۔ سب سے زیادہ محبت چاچا سے کرنا۔"

"پر بابا! آپ تو کہتے تھے، وفاداری....." اس نے الجھن بھرے لہجے میں کہنا چاہا۔

بابا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"محبت بہت بڑی ہوتی ہے ساجد! ہر چیز سے بڑی۔ اس میں سب کچھ شامل ہوتا ہے، عزت بھی، وفاداری بھی، احترام بھی۔"

اس کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن وفاداری کے ناقابل فہم بوجھ سے اسے نجات مل گئی۔ بس محبت ہی کافی تھی۔

چاچی کو وہ چاچا کی وجہ سے پسند کرتا تھا۔ ورنہ جب وہ ان دونوں کو ساتھ دیکھتا تو اسے وہ بے جوڑ لگتے۔ چاچا کتنے خوب صورت، کتنے بڑے اور لمبے تھے اور چاچی چھوٹی سی۔ اور ان کی صورت بھی اچھی نہیں تھی۔ اور وہ مغرور بھی تھی۔ زیادہ بات نہیں کرتی۔ اور مسکراتی وہ تھی ہی نہیں۔ جوڑ کا تصور اسے بابا اور اماں کو دیکھ کر سمجھ میں آیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھے لگتے تھے۔

پھر ایک دن وہ لوگ آئے تو ان کے ساتھ باجی بھی تھی۔ وہ اسے بہت اچھی لگیں۔ وہ ہر ایک سے محبت سے بات کرتی۔ ہر وقت مسکراتی رہتی۔ اس نے بغیر کسی کے بتائے انہیں باجی کہنا شروع کر دیا۔

لیکن اب وہ لاہور آیا، اور چاچا کراچی جا رہے تھے۔ اسے افسوس ہوتا رہا۔ کتنا اچھا ہوتا کہ وہ لوگ یہاں رہتے اور چاچا بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ پہلے تو اسے اپنا لاہور آنا اچھا ہی نہیں لگا۔ لیکن یہ گھر بھی اچھا تھا اور شہر بھی اسے اچھا لگا تھا۔

چاچا جب رخصت ہو رہے تھے تو اس وقت اس نے باجی کو چاچا کے سامنے کھڑا دیکھا۔ خودبخود اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ چاچا اور باجی ایک ساتھ اچھے لگ رہے ہیں۔ ان کی جوڑی اچھی ہے۔

اس کا جی چاہا کہ وہ باجی کو چاچی کہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ چاچی تو موجود تھی، اچھی لگے یا نہ لگے، لیکن وہ تھی تو چاچی ہی۔ اور دل باجی کو چاچی بنانے پر تلا ہوا تھا۔ ایسے میں اسے بس یہی سوجھا کہ وہ باجی کو چھوٹی چاچی کہے۔

جب چاچی چلی گئی تو اس نے ہمت کر کے باجی کو چھوٹی چاچی کہا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس طرح پکارا جانا انہیں اچھا لگا۔ لیکن انہوں نے شرط رکھ دی کہ وہ صرف اکیلے میں انہیں چھوٹی چاچی کہہ سکتا ہے، کسی اور کے سامنے نہیں۔ اس کے نزدیک وہ کوئی بڑی نہیں تھی۔ لیکن اب اسے پتا چلا کہ یہ آسان نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اماں اور نانی کے سامنے اس کے منہ سے چھوٹی چاچی نکلتے نکلتے رہ گیا تھا۔ چھوٹی چاچی کو پتا چل جائے تو شاید وہ اس سے بات کرنا بھی چھوڑ دیں۔

اس نے سوچا، اب اس معاملے میں بہت زیادہ احتیاط کرے گا۔

اچانک اسے یاد آیا کہ اماں اور نانی چھوٹی چاچی کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں اسے احساس ہونے لگا کہ وہ ضرور کوئی کام کی بات تھی۔ اس نے بول کر گڑبڑ کر دی۔ ورنہ اسے پتا چل جاتا کہ وہ کیا بات تھی۔

باہر نکلتے ہوئے بھی اس کا جی چاہا تھا کہ وہ چھپ کر ان کی بات سنے۔ لیکن اماں ہمیشہ بڑی سختی سے اس بات کو منع کرتی تھیں۔ اس لئے وہ خود پر جبر کر کے وہاں سے چلا آیا تھا۔ مگر اب اس کا دل مچلنے لگا۔

وہ دوبارہ نانی کے کمرے کی طرف گیا۔ دروازے پر رک کر اس نے سننے کی کوشش کی۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ اماں اور نانی اب کچھ اور باتیں کر رہی تھیں۔ وہ دوبارہ باہر آ گیا۔

وہ دوبارہ نانی کے کمرے کی طرف گیا۔ دروازے پر رک کر اس نے سننے کی کوشش کی۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ اماں اور نانی اب کچھ اور باتیں کر رہی

تھیں۔ وہ دوبارہ باہر آ گیا۔

✿ ✿ ✿

عبدالحق نے چارج کو کراچی پہنچنے کے دوسرے دن ہی سنبھال لیا تھا۔ ایک ہفتہ وہ عارف کے گھر رہے۔ پھر وہ اپنے گھر میں منتقل ہوگئے، جو عارف کے گھر کے بہت قریب تھا۔

اس ایک ہفتے میں اس نے عارف کے گھر کے ماحول کا مشاہدہ کیا۔ وہ اسے اچھا نہیں لگا۔ اس کی سمجھ میں عارف کا کرب آنے لگا۔ عارف طبعاً نفیس آدمی تھا۔ لیکن اس کے گھر میں بدنظمی اور بے ترتیبی تھی، جو اسے بے چین رکھتی تھی۔ اس کی بیوی اسے بالکل اچھی نہیں لگی۔ وہ صرف عملاً ہی پھوہڑ نہیں تھی، زبان کی بھی پھوہڑ تھی۔ بچوں کی تربیت بھی اس نے اچھی نہیں کی تھی۔ ان کے تعلیمی معاملات سے تو وہ بالکل ہی بے تعلق تھی۔ عبدالحق نے اب تک عارف کو گھر سے باہر ہی دیکھا تھا۔ گھر میں اسے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ کیونکہ گھر میں عارف پر بیزاری اور چڑچڑا پن طاری رہتا تھا۔

عبدالحق نے سمجھ لیا کہ عارف کی شادی بے جوڑ ہوئی ہے۔ بات اتنی نہیں تھی کہ عارف کی بیوی صورت شکل کی معمولی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھی۔ عبدالحق نے محسوس کیا کہ عارف گھر میں کم سے کم وقت گزارنا چاہتا ہے، اور اس میں اس کا قصور بھی نہیں ہے۔

لیکن نوربانو کی رضوانہ سے گاڑھی چھننے لگی تھی۔ پہلے تو عبدالحق کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ لیکن فوراً ہی اس کی افادیت اس کی سمجھ میں آ گئی۔ نوربانو کے ساتھ تو بچے بھی نہیں تھے۔ وہ تو بہت اکیلی تھی۔ اس کی دوسراہٹ کے لئے عارف کا گھر بہت بڑی نعمت تھا۔ وہ رضوانہ کے ساتھ خریداری کے لئے بازار بھی چلی جاتی۔ پھر کبھی رضوانہ اس کے گھر آ جاتی۔ اور بچوں کا آنا جانا تو لگا ہی رہتا تھا۔ پہلی بار عبدالحق نے نوربانو کو بچوں سے محبت کرتے دیکھا۔ یہ اس کے لئے خوشی کی بات تھی۔

پھر ایک دن عبدالحق کے گھر میں بیٹھ کر عارف نے وہ بات شروع کی،

جو اس روز ائیرپورٹ سے گھر آتے ہوئے ادھوری رہ گئی تھی۔

''اس روز تم ملکی معیشت کی بات کر رہے تھے۔'' عارف نے اسے یاد دلایا۔

''جی ہاں! اور بات ادھوری رہ گئی تھی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب تو مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں کیا کہہ رہا تھا۔''

''مگر مجھے یاد ہے۔'' عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم کچھ طویل المیعاد منصوبوں کی بات کر رہے تھے۔''

''جی ہاں! منصوبے بنانے کے سوا ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تم نے کہا کہ تم منصوبے بنا کر آگے بڑھا دیتے ہو، اور ان پر عمل نہیں ہوتا۔''

''آپ میری بات کر رہے ہیں۔ میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ چچا جان نے کتنا کچھ کیا، مگر سب بے سود۔ بہت اہم باتوں کو نظرانداز کر دیا گیا۔ انہوں نے کچھ محکموں کے ملازمین کو بہت معقول تنخواہیں دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ ابتدائی طور پر ان میں کسٹم، انکم ٹیکس اور پولیس کے محکموں کو شامل کیا گیا تھا۔ اس کی اہمیت بھی بتا دی گئی تھی۔ مگر وہ تجویز نہیں مانی گئی۔ اب اس کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں۔''

''کیسا نتیجہ؟ میں سمجھا نہیں۔''

''میں اور آپ، دونوں ہی اس وقت کسٹمز میں ہیں۔ میں نے دیکھ لیا کہ یہاں رشوت کتنی عام ہوگئی ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں۔''

''اب میں سمجھا، تنخواہیں بڑھانے سے کیا رشوت کا سلسلہ رک جاتا۔'' عارف نے اعتراض کیا۔

''دیکھو عبدالحق! میں کئی سال سے اس محکمے میں ہوں۔ رشوت کے معاملے کو میں سمجھتا ہوں۔ کسی شخص کو کوئی غلط کام کرانا ہوتا ہے تو وہ رشوت کی پیش کش کرتا ہے۔ اب کوئی کسی کو رشوت دے گا تو لینے والا لے گا بھی۔ اس کا

تنخواہوں کے بڑھنے سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تعلق ہے عارف بھائی! لوگ ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ترغیب کے سامنے ہار جانے والے، کچھ کمزور پڑ جانے والے اور کچھ مضبوطی سے ڈٹ جانے والے ہوتے ہیں۔ کم تنخواہ اور بڑھتی ہوئی ضرورتیں ان کے لئے جواز بن جاتی ہیں۔ ابتداء میں ایک جھجک اور شرمندگی ہوتی ہے، جو آہستہ آہستہ مٹتی جاتی ہے اور پھر آدمی رشوت کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ برائی نہیں رہتی، اور اس کے معمول میں شامل ہو جاتی ہے۔

اور ایک بات بتاؤں عارف بھائی! بات صرف اتنی نہیں کہ رشوت کا استعمال غلط کام کرانے میں ہی ہوتا ہے، اور ترغیب رشوت دینے والے کی طرف سے ہوتی ہے۔ جب رشوت کا چسکا پڑ جائے تو رشوت لینے والا، رشوت دینے والے کو مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے باہر نکل کر بڑی خاموشی سے مشاہدہ کیا ہے۔ لوگ اعتراضات لگا کر، کام میں تاخیر کر کے کلیئرنگ ایجنٹس کو رشوت دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ بعض کلیئرنگ ایجنٹس نے تو کلرکوں کے لئے ماہ بہ ماہ رشوت کا اہتمام کر رکھا ہے۔ اب بلز آف انٹری تو بہت بڑی تعداد میں ہوتی ہیں۔ تو ان لوگوں کا کام ہمارے کلرک ہاتھ کے ہاتھ کر دیتے ہیں۔"

عارف حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "تم کیا بلا ہو بھائی!" اس نے کہا۔

اور فرائض کیا ہیں۔ قاعدے اور ضابطے کیا ہیں۔ کام کس انداز میں ہونا چاہئے اور کس انداز میں ہو رہا ہے۔ ضابطوں میں کتنی گنجائش ہے۔ کون اس سے کتنا فائدہ اٹھاتا ہے۔ لوگ کیا کیا کر رہے ہیں۔ میرے ماتحتوں میں کتنے محنتی اور ایماندار ہیں، اور کتنے حرام خور اور بے ایمان ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ہر سیٹ پر رشوت کی گنجائش نہیں ہے۔ کچھ سیٹیں سوکھی کہلاتی ہیں۔ ان پر کام کرنے والے عام طور پر دیر سے دفتر آتے ہیں، اور جلدی نکل جاتے ہیں۔ اور جو رشوت والی سیٹوں پر بیٹھے ہیں، وہ وقت سے بھی پہلے دفتر آ جاتے ہیں، اور دفتر کا وقت ختم ہو جانے کے بعد بھی کام کرتے رہتے ہیں۔"

عارف کی حیرت اور بڑھ گئی تھی۔

"اور اس سب کا کیا فائدہ؟"

"اسسٹنٹ کلکٹر ہونے کی حیثیت سے میں اپنے ماتحتوں کا ذمہ دار ہوں۔ وہ غلط کرتے ہیں تو جواب دہی میری بھی ہے۔ میں یہ سب سمجھ لوں گا تو ردوبدل کروں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ اچھے اور ایماندار لوگوں کو آگے لاؤں، انہیں زیادہ اہم ذمہ داریاں سونپوں۔ میں اصلاح کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں ڈسپلن کو یقینی بناؤں گا۔ ایماندار اور محنتی لوگوں کو اس کا کچھ صلہ دلواؤں گا۔ تاکہ وہ مایوس ہو کر دوسروں کے رنگ میں نہ رنگ جائیں۔"

"اب میں سمجھا کہ تم مسعود صاحب کو اتنے پسند کیوں ہو؟" عارف نے گہری سانس لے کر کہا۔

"لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ میں یہاں برسوں سے ہوں۔ تم رشوت کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔ یہ بیماری تو اوپر ... بہت اوپر تک گئی ہوئی ہے۔"

"میں برائی سے پوری طاقت اور سچائی کے ساتھ لڑنے کا قائل ہوں۔ ختم ہونا نہ ہونا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لڑنا ہر انسان پر فرض ہے۔"

"بات کہیں اور نکل گئی۔" عارف نے چونک کر کہا۔

"تمہیں تو تم سے طویل المیعاد منصوبوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ابھی تک کوئی کام تو نہیں ہوا اس پر۔ تم آگے بڑھا دیتے ہو، اور اس کے بعد

شائیں شائیں فش۔"

"اسی پر تو یہ تنخواہوں والی بات نکلی تھی۔ طویل المیعاد منصوبے تو بڑی چیز ہوتے ہیں۔ یہاں تو چھوٹے معاملات بھی آگے نہیں بڑھ پاتے۔"

"وجہ......؟"

"بنیادی وجہ سیاسی عدم استحکام ہے۔"

"ذرا اس کی وضاحت بھی کر دو۔"

"آپ کے سامنے تو ہے سب کچھ۔ یہاں کتنی تیزی سے حکومتیں بدلتی ہیں۔ ایک فائل جس وزیر کو بھیجی جاتی ہے، وہ ابھی اس فائل کو پوری طرح پڑھ بھی نہیں پاتا کہ حکومت ختم ہو جاتی ہے۔ جس حکومت کے پاس اپنے قائم رہنے کی ضمانت بھی نہ ہو، وہ کیا کوئی فیصلہ کرے گی۔ مجھے تو نہرو کے اس بیان پر شرم آئی کہ ہم مذاکرات کس سے کریں، اور معاہدے کس سے کریں۔ یہ تو عالمی سطح پر ہماری عزت کم ہو رہی ہے۔ ایک غیر محفوظ حکومت، جسے ہر لمحہ اپنی بقا کی فکر لاحق رہتی ہو، نہ تو ملک کے داخلی مسائل حل کر سکتی ہے، نہ خارجی مسائل۔"

"اس کا سبب......؟"

"ایک تو یہ کہ ہمارا ملک ابتداء ہی سے ہنگامی صورتِ حال سے دوچار رہا۔ اس پر ستم کہ قائد اعظم کو مہلت ہی نہیں ملی۔ لیکن چھوٹا منہ بڑی بات، میں یہ ضرور کہوں گا کہ قائد اعظم سے ایک بنیادی غلطی سرزد ہوئی۔ انہیں ابتداء ہی میں نوآبادیاتی طرزِ حکومت سے قوم کو چھٹکارا دلا دینا چاہئے تھا۔ اس کے بغیر آزادی اور تعمیرِ نو، دونوں کا تصور ممکن نہیں تھا۔ گورنر جنرل کا عہدہ انگریزوں کی یادگار تھا۔ اس کا خاتمہ بہت ضروری تھا۔ خاص طور پر اس لئے کہ اس عہدے میں سیاسی قوت کا ارتکاز تھا۔ پارلیمانی نظام میں ایسا نہیں ہوتا۔ چیک اینڈ بیلنس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ گورنر جنرل تو مطلق انسان ہوتا ہے۔ اب سوچیں، قائد اعظم قیامِ پاکستان کے بعد صرف ایک سال زندہ رہے۔ اس کے بعد اقتدار کے بھوکے اور غیر مخلص سیاست دانوں نے جن کے پاس مسند اقتدار تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، سازشیں شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ کہ قائد اعظم کی وفات کے تین

سال بعد لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا، اس کے بعد سے اب تک جو کچھ ہوا، وہ آپ کے سامنے ہے۔ حکومتیں بنتی ہیں اور مہینوں میں رخصت ہو جاتی ہیں۔ سارا فساد گورنر جنرل کے عہدے کا ہے۔"

"چلو، قائد اعظم یہ کام نہ کر سکے۔ لیکن گورنر جنرل کا عہدہ تو آج بھی اہم ترین ہے۔ دس برس ہو گئے۔ اب تو آئین بھی بن گیا، تو اس عہدے سے نجات کیوں نہیں پا لی گئی؟"

"یہی تو مسئلہ ہے۔ اسی لئے تو ہر حکومت کے خلاف ریشہ دوانیاں ہوتی ہیں۔ جو آئین بنایا گیا، وہ اچھا نہیں ہے۔ جو آئین ایک آئینی حکومت کو تحفظ فراہم نہیں کر سکتا، اسے کیسے اچھا کہا جا سکتا ہے۔ آئین بنانے والوں نے قوم کو مایوس کیا۔"

"لیکن عبدالحق! گورنر جنرل کا عہدہ تو ہندوستان میں بھی رہا۔" عارف نے اعتراض کیا۔

"جی ہاں! بالکل رہا۔ لیکن انہوں نے اسے اپنایا نہیں، ماؤنٹ بیٹن ہی وہاں کا گورنر جنرل رہا۔ لیکن انہوں نے اسے محض ایک نمائشی اور بے اختیار عہدہ بنا دیا۔ پھر اسے ختم بھی کر دیا۔ آئین بننے میں تو وہاں بھی وقت لگا۔ لیکن آئین سے محرومی کے اس عرصے میں بھی ہندوستان میں گڈ گورننس رہی۔ سیاسی عدم استحکام اور انتشار نہیں رہا۔ انہوں نے جمہوریت کو اور جمہوری حکومت کو مستحکم رکھا اور اس کا تسلسل قائم رکھا۔ اور انہوں نے اپنی قوم کو ایک اچھا اور لچکدار آئین دیا۔"

"تو خرابی تو ہمارے سیاست دانوں نے ہی پیدا کی نا!"

"جی ہاں! بدقسمتی سے ہم اپنی مخلص اور مقبول قیادت سے، تحریک پاکستان کی صف اوّل کی قیادت سے محروم ہو گئے۔ کچھ کو موت نے ہم سے چھین لیا۔ ایک کو سازش کر کے شہید کر دیا گیا۔ کچھ طالع آزما سیاست دانوں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو کر بددل ہو گئے، اور کنارہ کر کے بیٹھ گئے۔ اب سیاست اس کا نام ٹھہرا کہ قوم کے مفادات سے صرفِ نظر کر کے اقتدار اور

مفادات کے لئے سودے بازی کی جائے۔ سیاست اور جمہوریت کے اصول ترک کر کے دونوں کو ہی رسوا کر دیا جائے۔

''بہر حال بات یہ ہو رہی تھی کہ معاشی استحکام کی خاطر دور تک دیکھتے اور سوچتے ہوئے ملکی معیشت کو ایک طے شدہ راستے پر ڈال کر مکمل منصوبے بندی کے تحت آگے بڑھایا جائے۔ یہ کام طویل المیعاد منصوبوں کے بغیر ممکن نہیں۔ اور طویل المیعاد منصوبوں پر عمل درآمد کے لئے سیاسی استحکام اور حکومتی تسلسل لازی ہے۔ اس سے ہم محروم ہیں۔ یہ محرومی ہمیں آگے بڑھانے کے بجائے خدانخواستہ اور پیچھے دھکیل سکتی ہے۔''

''اچھا! تم مجھے یہ بتاؤ کہ آگے تک کس انداز میں دیکھتے ہو تم ؟''

''کسی بھی ملک اور قوم کے لئے بنیادی طور پر اہم ایک مہذب اور خوش حال معاشرہ ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور ایسے معاشرے کے لئے غربت سے پاک ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ غربت آدمی کو برائیوں پر مجبور کر دیتی ہے، اور اسے ترغیبات کے لئے آسان ہدف بنا دیتی ہے۔ غربت کو دور کرنے کے لئے روزگار اور مسائل ضروری ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں تو کچھ اس طرح کی تصویر سامنے آتی ہے۔ پاکستان فی الوقت زرعی ملک ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ زمین بڑھ نہیں سکتی۔ بلکہ زمین کی پیداواری قوت بھی بتدریج کم ہوتی ہے۔ دوسری طرف پاکستان میں اضافہ آبادی کی شرح بھی کافی بلند ہے۔ اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ پندرہ سال میں پاکستان کی آبادی دگنی ہو جائے گی۔ اب ایک زرعی ملک کی حیثیت سے تصور کریں تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کی صورت میں پندرہ سال بعد صورتِ حال کتنی بھیانک ہوگی۔ غربت تو کیا، ہم تو خدانخواستہ قحط جیسی صورتِ حال سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں۔ تو اس کے لئے ہمیں ابھی سے منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔''

''مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''یہی تو سوچنا ہوتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں ناقابل کاشت اراضی بہت زیادہ ہے۔ ہمیں اس کو قابل کاشت بنانے کے لئے اقدامات کرنے ہوں

گے۔ دوسری طرف ہمیں کاشت کاری کے جدید طریقے اپنانے ہوں گے، جدید آلات کا استعمال کرنا ہوگا، پیداوار میں اضافے کے لئے اقدامات کرنے ہوں گے۔ اور صرف اس سے کام نہیں چلے گا۔ آبادی بڑھے گی تو محنت کرنے والے ہاتھ بھی بڑھیں گے۔ اگر ہم روزگار کے مواقع بڑھا سکے تو وہ فائدہ مند ثابت ہوں گے۔ لیکن اگر ہم نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا تو بے روزگاری اور غربت میں اضافہ ہوگا۔ اس کے لئے موثر ترین ذریعہ صنعت کو فروغ دینا ہے۔ اس کے بارے میں میں آپ کو بتایا تھا......''

''ہاں! مجھے یاد ہے۔ خام مال کے مقابلے میں مصنوعات کی برآمد فائدہ مند ہے۔'' عارف نے کہا۔

''جی ہاں! صنعت کے فروغ سے ایک طرف تو زرمبادلہ کا توازن ہمارے حق میں بہتر ہوگا اور ملک کی معیشت کو مستحکم کرے گا تو دوسری طرف روزگار کے مواقع بڑھیں گے۔ یوں تو عارف بھائی، خدمات بھی روزگار کا ذریعہ ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت غیر پیداواری ہے۔''

''یہ بات تو میری سمجھ میں بالکل بھی نہیں آئی۔'' عارف نے کہا۔

''سیدھی سی بات ہے عارف بھائی! کسان محنت کرتا ہے تو پیداوار ہوتی ہے۔ صنعتی مزدور محنت کرے گا تو پروڈکشن ہوگی۔ لیکن وکیل، پلمبر، الیکٹریشن اور دوسرے لوگ جو دوسروں کو خدمات فراہم کرتے ہیں، وہ پروگریسیو نہیں ہیں۔ یہ لوگ خوش حال معاشرے میں ہی پھلتے پھولتے ہیں۔ تو جو پیداواری صلاحیت رکھنے والے ہیں، وہ حقیقی قومی آمدنی بڑھاتے ہیں۔ جبکہ خدمات میں یہ بات نہیں۔ ایک دکاندار، جو درآمد کردہ اشیاء فروخت کر رہا ہے، وہ ملکی معیشت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا رہا ہے۔ لیکن یہ خدمات بھی ضروری اور اہم ہیں۔ مگر پیداواری صلاحیتیں ترقی پذیر ہوں تو معیشت متوازن رہتی ہے۔ اور پیداوار کم ہو جائے تو توازن بگڑنے لگتا ہے۔''

''میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔ لیکن منصوبہ بندی کیا ہوتی ہے؟''

''میں نے پچھلی بار آپ سے کہا تھا نا کہ پاکستان میں تو فی الحال

صنعت ہے ہی نہیں۔ صنعت کیا، یہاں تو اس کا بنیادی ڈھانچہ بھی موجود نہیں ہے۔ اب ہم پندرہ سال بعد کی ممکنہ تصویر سامنے رکھ کر سوچتے ہیں، تو پہلی چیز زرعی اصلاحات ہیں۔ زمین کی پیداواری صلاحیت بڑھانا، ناقابل کاشت اراضی کو قابل کاشت بنانا، کاشت کے سلسلے میں کاشت کاروں کی راہنمائی، تاکہ غذائی اجناس کے معاملے میں خود کفالت حاصل کی جائے اور اس کے بعد وہ فصلیں کاشت کی جائیں، جن سے ہماری صنعت کو خام مال حاصل ہو۔ اس سب کے لئے مربوط پلاننگ ضروری ہے۔ یہ ریاست کو طے کرنا ہوگا کہ کہاں کتنی زمین پر کون سی فصل کاشت کی جائے۔ اس کے لئے کاشت کار کو تحفظ فراہم کرنا ضروری ہوگا۔

''دوسرے مرحلے میں صنعت کے لئے انفرااسٹرکچر قائم کرنا ہوگا۔ یہ طویل اور صبر آزما کام ہے، جو ترتیب اور تسلسل کے ساتھ کرنا ہوگا۔ اور برسوں پر محیط ہوگا۔ اور ابتداء میں اس کے لئے بہت قربانیاں دینی ہوں گی۔ پھر اس کا پھل ہمیں زندگی بھر ملتا رہے گا۔ یہ ایسا ہی ہے، جیسے آم کا درخت لگانا۔''

''قربانیاں کیسی؟''

''بھاری سرمایہ کاری کرنا ہوگی۔ انڈسٹری کے لئے بھاری مشینری درآمد کرنی ہوگی۔ اس کے لئے کثیر زرِ مبادلہ درکار ہوگا۔ درآمدات اور برآمدات کا توازن بگڑے گا۔ روپے کی قیمت مستحکم رکھنا دشوار ہو جائے گا۔ مہنگائی بھی ممکن نہ ہوسکتی ہے۔ پوری قوم کو یہ قربانی دینی ہوگی۔ لیکن خدانخواستہ تسلسل میں فرق آیا تو سب کچھ ضائع ہو جائے گا۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں سیاسی اور حکومتی استحکام کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔

اب عارف بھائی! یہ سب کچھ کر بھی لیا جائے تو پندرہ برس بعد کی آبادی کے لئے کم از کم معاشی استحکام اور خوش حالی کے لحاظ سے کم پڑ جائے گا۔ اس کے لئے کاٹیج انڈسٹری کے فروغ کے لئے کام کرنا ہوگا۔ یوں کوئی بھی فرد، حتیٰ کہ خواتین خانہ بھی بے کار نہیں رہیں گی۔ میں نے عرض کیا تھا نا کہ سب سے پہلے میسر وسائل کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پھر ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا

ہے۔ ہمارے ہاں وسائل میں ایک بہت بڑی چیز یہ ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے لوگ ہنرمند بھی ہیں اور محنتی بھی۔ یہاں ہاتھ سے جو کام کیا جاتا ہے، وہ بیرونِ ملک ہاتھوں ہاتھ لئے جانے والا کام ہے۔ کاٹیج انڈسٹری کے ذریعے ہر شخص کو کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں، اس سے ہمیں کثیر زرِ مبادلہ بھی حاصل ہوسکتا ہے۔''

عارف چند لمحے سوچتا رہا۔ درحقیقت وہ عبدالحق سے بہت مرعوب ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے استادِ محترم کے علاوہ تمام لوگ ایسے ہی دیکھے تھے، جو صرف اپنے اور اپنے مفادات کے بارے میں سوچتے تھے۔

''لیکن یہ سب کچھ تو تم سوچتے ہو، اور منصوبہ بندی کر کے آگے بڑھا دیتے ہو۔'' اس نے کہا۔

''اس کا حاصل کیا ہے۔تم نے خود بتایا کہ آج تک تمہاری کسی تجویز پر عمل نہیں کیا گیا۔''

''پہلی بات تو یہ عارف بھائی! کہ یہاں اکیلا میں ہی نہیں ہوں، میری کیا حیثیت اور کیا بساط؟ بہت لوگ ایسے موجود ہیں، جو درحقیقت اس ملک کا سرمایہ ہیں۔ صاحب علم لوگ اور عمل کرانے کی صلاحیت سے مالا مال۔ میں تو ابھی چچا جان جیسے لوگوں سے سیکھ رہا ہوں۔ وہ لوگ مخلص بھی ہیں اور جرأت مند بھی۔ وہ اپنی بات اونچی سے اونچی سطح پر بھی کہنے سے نہیں چوکتے۔''

''لیکن سیاسی استحکام، جسے تم ضروری قرار دیتے ہو، اس کے تو دور دور تک آثار نہیں۔ اور اس کے بغیر کچھ ہو نہیں سکتا۔''

''میں وہی بات کرنے والا تھا عارف بھائی! میرے نزدیک یہ پاکستان معجزہ ہے، اللہ کی رحمت ہے، اور یہ بے سبب بھی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ پاکستان سے کوئی بڑا کام لیں گے۔ دیکھیں نا! اللہ نے نہ چاہا ہوتا تو یہ اب تک ختم ہو چکا ہوتا۔ تو یہ ملک قائم رہے گا۔ اور اس ملک اور قوم کو کوئی بڑا کام کرنا ہے تو اللہ اسے طاقت بھی دے گا، اور استحکام بھی۔ مجھے یقین ہے، یہاں سیاسی استحکام بھی آئے گا، مضبوط حکومتیں بھی قائم ہوں گی اور طویل المیعاد منصوبوں پر

کام بھی ہوگا۔ شاید مستقبل میں امت مسلمہ کا دفاع بھی پاکستان ہی کرے گا۔''

عارف اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر ایمان کی چمک تھی۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ یہاں اس محکمے میں تمہارا تبادلہ تمہیں ضائع کرنے کے مترادف ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں عارف بھائی! ہر نیا تجربہ آدمی کو کچھ نیا سکھانے، کچھ آگے بڑھانے کے لئے ہوتا ہے۔''

''تم بہت اچھے ہو عبدالحق! لیکن یہاں کا تجربہ کچھ اچھا اور حوصلہ افزا نہیں ہوگا تمہارے لئے۔''

''جو اللہ کی مرضی عارف بھائی! میں تو یہ یقین رکھتا ہوں کہ ہر کام میں اللہ کی طرف سے بہتری ہی ہوتی ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ، یہاں دل بھی لگا تمہارا؟'' عارف نے موضوع بدلا۔

''اللہ کا شکر ہے، آپ کی وجہ سے یہ مرحلہ بہت آسان ہوگیا۔''

''لیکن سب لوگ یاد تو آتے ہوں گے؟''

''یہ تو قدرتی بات ہے عارف بھائی! لیکن جدائی میرے لئے نئی چیز نہیں ہے۔ اللہ نے مجھے اس کا ظرف دیا ہے۔''

✿ ✿ ✿

ارجمند کی بہت عجیب سی کیفیت تھی۔ یہ کیفیت اس پر آغا جی اور آپی کے کراچی جانے کے بعد غیر محسوس انداز میں شروع ہوئی تھی۔ اور بتدریج بڑھتی گئی تھی۔ مگر اب اس کے خدوخال بہت واضح ہوگئے تھے۔

اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ خوفزدہ ہے۔ آغا جی اس کے لئے شاید عافیت کی، تحفظ کی علامت تھے۔ اب وہ دور چلے گئے تھے تو اسے عدم تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ احساس بے حقیقت ہے۔ یہاں دادی اماں تھیں، جنہیں ہر وقت اس کے تحفظ کی فکر رہتی تھی۔ انہوں نے کبھی اسے ڈرائیور کے ساتھ اکیلے اسکول نہیں جانے دیا تھا۔ کبھی ایسی نوعیت آتی تو وہ خود اس کے

ساتھ جاتیں اور اسکول سے گھر لے جانے کے لئے بھی آتیں۔ لیکن ایسا اب تک صرف ایک بار ہوا تھا۔

پھر چچا جان اور چچی جان تھے۔ ان کے رویے سے تو اسے شرمندگی ہوتی تھی۔ وہ بڑے تھے۔ مگر اسے اتنی عزت دیتے تھے، جیسے وہ ان سے بڑی ہو۔ وہ اس بارے میں سوچ کر الجھتی، مگر اس کی وجہ کبھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ اس کی طرف دیکھتے تو ان کی نگاہوں سے ایسی بے پناہ محبت چھلکتی کہ وہ بھیگ بھیگ جاتی۔ وہ اس کی ہر طرح سے فکر کرتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتے۔ کبھی کبھی اسے ایسا لگتا کہ شاید ان کے نزدیک وہ کانچ کی بنی کوئی نازک گڑیا ہے، جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ سکتی ہے۔ ایسی محبت اسے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔

اسے اسکول پہنچانے اور گھر واپس لانے کی ذمہ داری چچا جان نے سنبھال لی تھی۔

پھر ساجد تھا، جو آغا جی کے حوالے سے اسے چھوٹی چاچی کہتا تھا۔ ارجمند نے دیکھا تھا کہ وہ آغا جی سے عشق کرتا ہے۔ اسی لئے تو وہ اسے زیادہ عزیز ہوگیا تھا۔ پھر وہ ان کے جانے کے بعد اسے چھوٹی چاچی کہنے لگا۔ اسے بہت اچھا لگتا تھا، ورنہ تو وہ اسے کبھی اس طرح پکارنے کی اجازت ہی نہ دیتی۔ اس میں خطرہ ہی اتنا بڑا تھا۔ کسی کے سامنے وہ کہہ دیتا تو شاید وہ کبھی کسی کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل بھی نہ رہتی۔ لیکن اچھا اتنا لگتا تھا کہ وہ اسے منع نہیں کر سکی۔ البتہ اس نے اسے خبردار کر دیا کہ کسی کے سامنے وہ اسے اس طرح نہ پکارے۔ اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھی آخر وہ بچہ ہی تھا۔ بچوں کو اتنا ہوش کہاں رہتا ہے۔ لیکن اب تک ساجد نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔

ساجد کے اور اس کے درمیان اتنی گہری محبت صرف اور صرف آغا جی کے حوالے سے تھی۔ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر ان کے متعلق باتیں کرتے۔ اس دن ارجمند کے دل میں اس کی محبت اور بڑھ گئی۔ جب اس نے بڑی معصومیت سے بتایا کہ وہ اللہ سے ہر روز دعا کرتا ہے کہ وہ چھوٹی چاچی کو سچ مچ اس کی چاچی بنا دیں۔ اس

کے باوجود ارجمند نے بھی اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ بھی اس کی چاچی بننا چاہتی ہے۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ساجد یہ بات جانتا ہے۔ کیسے؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔

بہرحال، یہ طے تھا کہ ساجد نہ ہوتا تو شاید آغا جی کی جدائی اس کے لئے آسان نہ ہوتی۔

تو اس سب کے باوجود یہ حال تھا کہ ہر وقت اس کے دل میں یہ دھڑکا رہتا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ خوفزدہ رہتی، خود کو غیر محفوظ سمجھتی۔ جب وہ کیفیت ختم ہوتی تو وہ اس کے بارے میں سوچ کر جھنجلاتی۔ کیونکہ اس کے پاس خوفزدہ ہونے کا کوئی معمولی سا جواز بھی نہیں تھا۔ اسے خیال آتا کہ یہ تو ناشکرا پن ہے۔

ایک دن وہ اسٹڈی میں بند ہو کر بیٹھ گئی کہ آج یہ مسئلہ حل کرنا ہے۔ تحفظ ملنے کے بعد یہ عدم تحفظ کیسا؟ اس نے سمجھ لیا کہ اس کے لئے اسے اپنے ماضی میں جھانکنا ہوگا۔

دہلی میں وہ بھرے پرے گھر میں تھی۔ امی، بابا، دادا، دادی، چاچا، پھپھو...... سبھی اس کی دل داری کرتے تھے۔ وہاں سوائے محبت اور تحفظ کے کچھ اور تھا ہی نہیں۔ پھر وہ وقت بھی اس نے دیکھا کہ سب خوفزدہ تھے۔ وہ گھر چھوڑ کر نکلے اور اس جگہ گئے، جسے کیمپ کہا جاتا تھا۔ اس کی سمجھ میں اپنے دہلی والے گھر میں یہ کبھی نہیں آیا کہ سب لوگ کیوں خوفزدہ ہیں۔ لیکن کیمپ میں پہنچ کر وہ سمجھنے لگی۔ وہاں ہزاروں لوگ تھے۔ کئی کئی وقت کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ پینے کو پانی ملتا تو گندا اور بدبودار۔ ابتداء میں تو پہلا گھونٹ لیتے ہی اسے الٹی ہو جاتی تھی۔ مگر پھر وہ اسی پانی کو پینے لگی۔ اس سے کم از کم پیاس تو بجھتی تھی۔

وہ چھوٹی تھی، سمجھتی کچھ نہیں تھی، لیکن سنتی تو سب کچھ تھی۔ کیمپ میں شور مچ جاتا کہ حملہ ہوگیا ہے تو افراتفری مچ جاتی۔ خوف ناک آوازیں سنائی دیتیں، جن کے بارے میں کہا جاتا کہ گولیاں چل رہی ہیں۔ ایسے میں امی اسے ڈھانپ لیتیں۔ وہ گھراتی تو امی کہتیں، گھبراؤ نہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ وہ سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔

وہاں گھر والا بستر بھی نہیں تھا۔ امی فرش پر چادر بچھا دیتیں اور اس پر

اسے لٹا دیتیں۔ اس کا جسم دکھنے لگتا۔ اس پر بھوک اور پیاس۔ وہ گھبرا کر کہتی۔

"امی! گھر چلیں نا! اپنے گھر۔"

"اب وہ ہمارا گھر نہیں ہے۔" امی کہتیں۔

"تو اب ہمارا گھر یہ ہے؟" وہ حقارت سے کہتی۔

"نہیں! یہ تو کیمپ ہے۔"

"تو ہمارا گھر کہاں ہے؟"

"ہمارا گھر پاکستان میں ہے۔"

"تو پاکستان چلیں!"

"اسی کے لئے تو یہاں بیٹھے ٹرین کا انتظار کر رہے ہیں۔ ٹرین آئے گی اور ہم اس میں بیٹھ کر پاکستان جائیں گے۔"

"ٹرین کیسی ہوتی ہے امی!"

"آئے گی تو خود ہی دیکھ لینا۔"

"ٹرین کب آئے گی؟"

"یہ تو کسی کو نہیں معلوم بیٹا! تم اللہ سے دعا کیا کرو۔"

مگر ٹرین آ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ دن بھر ایک چبوترے پر بیٹھی ادھر ادھر دیکھتی رہتی۔ وہ چبوترا کیمپ میں ان کا گھر تھا، اور دادا جی کہتے تھے کہ وہ بڑی نعمت ہے۔ وہ حیرت سے سوچتی، کتنے دن ہوگئے، امی نے نہ اس کا منہ دھلایا، نہ بال بنائے اور نہ ہی کپڑے بدلوائے۔ کیا کیمپ میں لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں؟ پھر اس نے دوسروں کو دیکھا۔ سبھی کا برا حال تھا۔ بابا اور چاچا کا شیو بڑھ گیا تھا۔ اب وہ ان کے رخسار سے اپنا رخسار نہیں مل سکتی تھی۔ دادا کی داڑھی جھاڑ جھنکاڑ ہوگئی تھی۔ سب کے کپڑے میلے اور بال چکٹ ہو رہے تھے۔

پھر وہ ان سب باتوں کی عادی ہوگئی۔ جیسے اس نے سمجھ لیا کہ جب بھوک پیٹ کے اندر بیٹھ کر نکیلے دانتوں سے کاٹتی اور تیز پنجوں سے کھرچتی ہو تو کسی اور چیز کی پرواہ نہیں رہتی۔

ابتداء میں وہ روتی تھی۔ پھر آنسو خشک ہوگئے، اور اس کا رونا محض

بسور نے تک محدود ہوگیا۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ آنسوؤں کے لئے جسم میں پانی موجود ہونا ضروری ہے۔

پھر ایک دن بابا نے کہا کہ اسٹیشن جانا ہے۔ ٹرین آنے والی ہے۔ سب لوگ کیمپ سے نکلے اور اسٹیشن چلے گئے۔ بھوکے ہونے کے باوجود سب خوش تھے۔ وہ پاکستان جانے والے تھے۔

اسے اب بھی یہ سوچ کر گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ وہ ٹرین میں کیسے دھکم پیل کے عالم میں سوار ہوئے تھے۔ عجیب افراتفری تھی وہاں۔ ہر شخص دوسرے کو دھکیل کر خود اندر گھس جانا چاہتا تھا۔

اندر اور مصیبت تھی۔ پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ سانس لینے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ گرمی ایسی تھی کہ دم گھٹ رہا تھا۔ اسے یاد تھا کہ ٹرین میں اس نے سوچا کہ اس سے تو کیمپ ہی بہتر تھا۔

ٹرین چلی تو کچھ ہوا آئی، اور گرمی کم ہوئی۔ مگر پھر اسے بھوک نے ستایا اور بلکنے لگی۔ پچھلے دو دن میں ان نے صرف دو بسکٹ کھائے تھے۔ اس کے بلکنے پر دادی تڑپ گئیں۔ انہوں نے اپنے چھالیا کے بٹوے سے وال سے بھی چھوٹا ایک دانہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''لے میری شہزادی! یہ کھالے۔''

پھپھو نے تڑپ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''کیا کرتی ہیں امی! اتنی سی بچی ہے۔''

دادی نے نرمی سے ان کا ہاتھ ہٹا دیا۔

''یہ دو دن کی بھوکی ہے۔ سو جائے گی تو بھوک کا پتا بھی نہیں چلے گا۔ بس خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں۔ وہاں تو انشاء اللہ سب کچھ مل جائے گا۔''

دادی نے وہ ننھی سی چیز اس کی طرف بڑھائی تو اس نے معصومیت سے کہا۔

''مجھے بہت بھوک لگی ہے دادی اماں! بہت ساری چیز دیں۔''

دادی کی آواز ایسی ہوگئی، جیسے وہ رو رہی ہوں۔

''تم کھا کر تو دیکھو میری شہزادی! پھر کہو گی تو اور دے دوں گی...

بہت ساری۔''

مگر وہ کھاتے ہی تو بے سدھ ہوگئی۔ اسے ہوش ہی نہیں رہا۔

اس کی آنکھ کھلی۔ مگر وہ ایسا تھا، جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ پھپھو نے اسے کھچڑی کھلائی تھی۔ اس کے بعد وہ پھر سوگئی تھی۔

اس کے بعد آنکھ کھلی تو وہ ایک اجنبی جگہ تھی، ایک گندا سا کچا گھر، جہاں صفائی بھی ہیں ہوئی تھی۔ پھپھو وہاں موجود تھیں۔ اس نے پھپھو سے پوچھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے پھپھو!''

''اب میں تمہیں کیا بتاؤں گڑیا!'' پھپھو نے بے بسی سے کہا۔

''کیا یہ پاکستان ہے پھپھو!'' اپنے لہجے کی مایوسی اسے آج بھی یاد تھی۔

پھپھو یہ سن کر تڑپ گئیں۔

''یہ ایک چھوٹا سا گھر ہے بیٹا! مگر ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ اور گڑیا! پاکستان تو بہت بڑا، بہت خوب صورت ہے۔''

پھر اس نے امی، بابا، دادی، دادا اور چاچا، سب کے بارے میں پوچھا۔ پھپھو کے پاس اس کے ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا۔

''ان سب کو اللہ میاں نے اپنے پاس بلا لیا ہے۔''

''کہاں بلا لیا ہے پھپھو!''

''آسمان پر۔''

وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی۔

''آسمان تو بہت دور ہے نا پھپھو!''

''ہاں گڑیا! بہت...... بہت دور۔''

''تو وہاں سے واپس آنے میں تو انہیں بہت دن لگیں گے؟''

''نہیں گڑیا! وہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔''

''تو وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے؟'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''نہیں گڑیا!''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی

"میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی پھپھو!"

پھپھو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں تو تمہارے پاس ہوں نا!"

"نہیں پھپھو! مجھے تو سب لوگ چاہئیں...... سب لوگ۔"

"اب تو وہ کبھی واپس نہیں آ سکتے بیٹا!" پھپھو نے کہا اور رونے لگیں۔

وہ پھپھو کو پیار کر کے چپ کرانے لگی۔

"آپ روئیں نہیں اچھی پھپھو! اب تو ہم پاکستان آ گئے ہیں نا! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اسے ٹرین میں دادی کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی تھی۔

پھپھو یہ سن کر اور زیادہ رونے لگیں۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

"پھپھو! وہ لوگ تو واپس نہیں آ سکتے، تو ہم دونوں بھی اللہ میاں کے پاس چلیں۔ وہاں سب مل جائیں گے۔"

پھپھو رونا بھول گئیں۔

"نہیں گڑیا! اللہ میاں کے ہاں کوئی خود سے نہیں جا سکتا۔ بس وہی جا سکتا ہے، جسے اللہ میاں بلائیں۔"

"یہ تو بڑی مشکل ہو گئی۔" اس نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"اچھا! میں اللہ میاں سے دعا کروں گی کہ وہ ہمیں بھی بلا لیں۔"

"نہیں گڑیا! ایسا کبھی نہ کرنا۔ یہ بات اللہ میاں کو پسند نہیں۔ وہ اس پر ناراض ہوتے ہیں۔"

تب وہ بے بسی سے رونے لگی۔

"تم یہاں روؤ گی گڑیا! تو آسمان پر سب لوگوں کو تکلیف ہو گی۔ وہ بھی روئیں گے۔"

وہ روتے روتے چپ ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود وہ انہیں یاد کر کے بار بار روتی رہی، بہت دنوں تک روتی رہی۔ اب اسے یہ یاد نہیں تھا کہ اسے صبر کب آیا، اور کب اس کا رونا موقوف ہوا۔

پھر ایک گندا سا آدمی آیا، جو اسے بہت ہی برا لگا۔ لیکن پھپھو بڑی عزت سے اسے رشید صاحب کہہ رہی تھیں۔ اس بات پر اسے پھپھو پر غصہ آتا رہا، لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ شکر ہے، اس سے جلدی جان چھوٹ گئی۔ وہ انہیں بوا کے گھر لے گیا تھا۔ اس کے بعد وہ وہیں رہیں۔

یہاں تک یادوں میں کہیں کہیں خلا بنتے تھے۔ لیکن بوا کے گھر کی تو ہر بات اس کے ذہن میں تازہ تھی۔ وہ بڑا اور اچھا گھر تھا۔ وہاں ہر چیز آرام دہ اور قیمتی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں اسے وہ گندا لگتا تھا۔ ایک بار اس نے یہ بات پھپھو سے کہی تو وہ کچھ دیر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔

"بچی ہو نا! جو جانتی نہیں، سمجھتی نہیں، وہ بھی تمہیں نظر آ جاتا ہے۔"

اس کے باوجود ارجمند کو وہ گھر نعمت لگتا تھا۔ کبھی وہ سوچتی کہ پاکستان میں جس گھر میں اس کی آنکھ کھلی تھی، اگر اسے وہیں رہنا پڑتا تو کیا ہوتا۔ اس کے مقابلے میں تو بوا کا گھر جنت ہی تھا۔ اور وہاں اسے تکلیف ہی کیا تھی؟ بس یہی کہ وہ وہاں پنجرے میں قید چڑیا کی طرح تھی۔ باہر نکلنے کو جی مچلتا۔ مگر وہ آزادانہ نہیں نکل سکتی تھی۔

لیکن پھپھو وہاں کبھی خوش نہیں رہیں۔ اداس تو وہ ہمیشہ ہی رہتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی تو اداسی کی حد ہو جاتی، اور انہیں چپ سی لگ جاتی۔ ایسے میں وہ ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتی۔ وہ اس گھر کو جہنم کہتی تھیں۔

ارجمند کو وہ گھر آج بھی اچھا لگتا تھا۔ اس کی وجہ تھی۔ وہاں سے اسے بہت کچھ ملا تھا۔ نانا بھی اسے وہیں ملے تھے اور پھپا جان بھی۔ آغا جی کو بھی اس نے وہیں دیکھا تھا، یعنی زندگی کی سب سے بڑی اور قیمتی چیز...... آغا جی کی محبت بھی اسے وہیں ملی تھی۔ اور وہیں سے وہ ان کے پاس پہنچی تھی۔ وہیں پھپھو نے اسے قرآن پڑھایا اور نماز سکھائی تھی۔ اسے تو وہ گھر اللہ کی نعمت لگتا تھا۔

آخر کے عرصے میں، بوا کے مرنے کے بعد ایک دن اس نے پھپھو کو اس کیفیت میں دیکھا تو کہا۔

"آپ ایسے اداس نہ ہوا کریں پھپھو! دیکھیں نا، یہاں آپ کا حکم چلتا

ہے۔ ہر چیز کی آپ مالک ہیں۔"

"جہنم کا داروغہ بنا کسے اچھا لگتا ہے؟" پھپھو نے جھنجلا کر کہا۔

اسے بہت برا لگا۔

"ایسے نہ کہیں پھپھو!"

"تم کیا جانو، تمہیں کیا پتا کہ یہاں کتنے زخم کھائے ہیں میں نے۔"

"زخم......؟" وہ بری طرح سہم گئی۔

"آپ کو زخم لگے ہیں؟ آپ نے مجھے دکھائے ہی نہیں۔"

وہ اپنی اداسی بھول کر، کھلکھلا کے ہنس دیں۔ انہوں نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

"تم سمجھ نہیں سکتیں کہ اللہ کی کیسی رحمت ہے تم پر۔ اس نے کہاں کہاں تمہیں کیسے کیسے بچایا ہے۔ تم بے خبری کی جنت میں ہو۔ تمہیں تو کچھ پتا ہی نہیں۔"

وہ حیرت سے انہیں دیکھتی رہی۔

"آپ زخموں کی بات کر رہی تھیں۔"

"وہ جسم کے زخموں سے زیادہ گہرے زخم ہیں۔ اور کسی کو نظر بھی نہیں آتے۔ وہ روح کے زخم ہیں گڑیا!"

اس نے ان کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

"مجھے دیکھیں پھپھو! سب لوگوں کو اللہ نے بلا لیا۔ مجھے اب بھی وہ سب یاد آتے ہیں۔ لیکن میں صرف آپ کے ساتھ خوش رہتی ہوں۔"

"تم کیا جانو، میں تو جی ہی تمہارے لئے رہی ہوں، اور کیسے جبر کر کے جی رہی ہوں، یہ تم سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ اس جینے کے مقابلے میں مر جانا بہت آسان تھا میرے لئے۔ میری خوشی کیا، میرے تو جینے کا سبب بھی صرف تم ہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم نے ان سب لوگوں کے اللہ کے پاس جانے کا منظر نہیں دیکھا۔ دیکھ لیتیں تو زندگی بھر کے لئے مسکرانا بھول جاتیں، اور جو کچھ مجھ پر گزری، وہ تم صرف دیکھ لیتی تو......" وہ کہتے کہتے رک گئیں۔

"چھوڑو اس بات کو، میری شہزادی! اللہ تم پر مہربان ہے، وہ ہمیشہ تم پر

مہربان رہے۔ تم کبھی نہیں جان سکو گی کہ اس نے تمہیں کیسے کیسے دکھوں سے بچا لیا ہے۔ تم کبھی نہیں جان سکتیں اور تمہارے لئے اسے نہ جاننے میں ہی بہتری ہے۔ بس شکر ادا کرتی رہا کرو۔"

پھپھو کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ ٹھرا کر رہ گئی۔ عام طور پر ایسی بات سن کر آدمی کو تجسس ہوتا ہے، وہ جاننا چاہتا ہے۔ لیکن وہ ڈر گئی۔ اس نے دل میں سوچا۔ میں وہ سب کچھ نہیں جاننا چاہتی، جس سے اللہ نے مجھے بچا لیا ہے۔

آگے کچھ یاد کرنا ضروری نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ عدم تحفظ کا احساس ایمان کی کمی کی دلیل ہے۔ اسے حیرت تھی کہ آج تک اس نے اپنے اس بہت پیچھے کے وقت کو کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ کبھی نہیں دہرایا تھا۔ لیکن شاید پہلے اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ جبکہ اب اس نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔ پھپھو بہت اچھی تھیں۔ مگر بوا کے گھر کو وہ جہنم کہتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ حفاظت کرنے والا تو بس اللہ ہے۔ کبھی وہ نانا سے کہتی تھیں، کیسی رحمت ہے اللہ کی کہ وہ اس جہنم میں ہمیں رزقِ حلال عطا فرماتا ہے۔ ہماری ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ اور جب سے انہوں نے سلائی کا کام شروع کیا تھا، انہوں نے اپنے برتن، اپنا کھانے پینے کا سامان الگ کر لیا تھا۔ کبھی اس کا گوشت کھانے کو دل چاہتا اور دال پکی ہوتی تو وہ اسے کہتیں۔ یہ دال اس گھر کے گوشت سے اچھی ہے۔ کھا کر تو دیکھو۔ جب ہمارے پیسے آ جائیں گے تو میں تمہیں بہت مزے کا گوشت پکا کر کھلاؤں گی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس گھر کا کھانا پھپھو کے نزدیک حرام تھا۔ لیکن سلائی کے کام سے پہلے، بوا کی زندگی میں تو وہ وہیں سے کھاتی اور کھلاتی تھیں۔ تب شاید وہ مجبوری تھی۔ اور اسے یاد تھا کہ پھپھو کبھی رغبت سے نہیں کھاتی تھیں۔

ایک لمحے کو ارجمند نے سوچا کہ بوا کے گھر کا کھانا پھپھو کو حرام کیوں لگتا تھا۔ مگر فوراً ہی اس نے اس تجسس کو جھٹک دیا۔ پھپھو کی وہ بات اسے یاد آ گئی۔ انہوں نے کہا تھا...... اللہ کا شکر ہے کہ تم نے ان سب لوگوں کے اللہ کے ہاں جانے کا منظر نہیں دیکھا۔ دیکھ لیتیں تو زندگی بھر کے لئے مسکرانا بھول جاتیں۔ اور جو کچھ مجھ پر گزری، وہ تم صرف دیکھ لیتی تو۔ اس کے بعد انہوں نے بات

پوری نہیں کی تھی۔ پھر چند لمحے بعد انہوں نے کہا تھا...... اللہ تم پر مہربان ہے۔ وہ ہمیشہ تم پر مہربان رہے۔ تم کبھی نہیں جان سکو گی کہ اس نے تمہیں کیسے کیسے دکھوں سے بچا لیا ہے۔ تم کبھی نہیں جان سکتیں اور تمہارے لئے نہ جاننے ہی میں بہتری ہے۔ بس شکر ادا کرتی رہا کرو۔

اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ راہنما جملے تھے۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ کچھ دل کو پھاڑ دینے والے، روح پر گہرے زخم لگانے والے معاملات تھے، جن سے اللہ نے اسے بے خبر رکھا تھا۔ پھپھو کو وہ سب معلوم تھا تو وہ کتنی زخمی، کتنی دکھی تھیں۔ تو جس دکھ سے اللہ نے اسے بچا لیا، وہ اس کی کھوج کیوں کرے؟ اسے تو بس شکر ادا کرتے رہنا چاہئے۔

اب اتنا پیچھے تک جا کر دیکھنے کے بعد وہ سمجھ سکتی تھی کہ اللہ جو ازل سے ابد تک، ہر لمحے کو جانتا ہے، ایک وہی تو ہے، جو اپنے بندوں کی ہر ضرورت سے باخبر ہے، اور وہی ضرورت پوری کرنے والا ہے۔ وہی بچانے والا اور دعائیں قبول کرنے والا ہے۔ وہ بندوں کو نعمتیں عطا فرماتا رہتا ہے، ان پر عنایات کرتا رہتا ہے، ان ضرورتیں پوری کرتا رہتا ہے، اور بندوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔

اس نے سوچا، شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ لیکن شکر ادا کرنا ممکن نہیں۔ دل نے کہا، کوشش تو کرتا رہے بندہ، کیسی کوشش؟ دو رکعت نفل برائے شکر، پھر اللہ کی معلوم اور نامعلوم نعمتوں، عنایتوں، اس کی عطا کی ہوئی ہر امداد اور ہر تحفظ پر اس کا شکر ادا کر کے اس سے پوری زندگی کے لئے شکر کی توفیق اور شکرگزاری مانگی جائے۔ اور وہ بھی ہر روز۔

یہ سوچ کر دل کو قرار سا آ گیا۔ لیکن فوراً ہی دل میں ایک اور خیال ابھرا۔ ماضی میں جھانکنے کے بعد یہ بات تو سمجھ میں آ گئی تھی کہ اللہ اپنے بندوں کی وہ ضرورتیں تک پوری فرماتا ہے، جن کی انہیں خبر بھی نہیں ہوتی۔ تو کیوں نہ وہ ہر روز دو نفل برائے حاجت پڑھ کر اللہ سے اپنی معلوم، نامعلوم حاجتوں کے لئے دعا بھی کر لیا کرے۔ دعا بندگی ہے، اور اللہ اس سے خوش ہوتا ہے۔ وہ بغیر مانگے حاجت روائی فرمانے والا انشاء اللہ اس کے بعد نہ اسے کبھی محتاج ہونے

دے گا اور نہ ہی عدم تحفظ کے احساس کا شکار۔ باقی رہ گئی تقدیر تو بندے کے سامنے اس کی قبول کرنے اور اللہ سے دعا کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

یہ ارادہ کر کے اس کا وجود طمانیت سے بھر گیا۔ فوراً ہی اسے عبدالحق کا خیال آیا۔ کتنا اچھا ہوتا، اگر آغا جی یہاں ہوتے۔ وہ اس پر ان سے گفتگو کرتی۔ شاید وہ کوئی اور اچھی بات سمجھا دیتے۔ پچھلی بار دعا کے ہی موضوع پر ان سے کتنی اچھی گفتگو ہوئی تھی، اور اس نے ان سے کتنا کچھ سیکھا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد اس نے اپنے اس معمول کا آغاز کیا۔ شکر کی نماز کے بعد شکر ادا کرتے ہوئے اس نے اس راہنمائی پر بھی اللہ کا شکر ادا کیا، جس کا صرف ارادہ کرنے ہی سے اسے طمانیت حاصل ہوئی تھی۔

پھر اس نے نمازِ حاجات پڑھی اور اللہ سے اپنی اور تمام متعلقین کی دنیا، دین اور آخرت کی تمام حاجتوں کی قضا کے لئے اور ہر طرح کے تحفظ کے لئے دعا کی۔ پھر اسے ایک اور خیال آیا تو اس نے اللہ سے دعا کی کہ وہ اپنی رحمت سے ان چار رکعتوں کو اس کا عمر بھر کا معمول بنا دے۔

اسے یہ خیال آیا تھا کہ حاجت کی نماز تو دن کا آغاز کرتے ہوئے ادا کرنی چاہئے۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ فجر کے بعد کسی سجدے کی اجازت نہیں۔ اور اشراق کے وقت اسے اسکول جانا ہوتا تھا۔ اس لئے عشاء کے بعد کا وقت ہی مناسب تھا۔ ویسے بھی مغرب کے بعد تاریخ بدل جاتی ہے۔

وہ نماز پڑھ کر اٹھی تو عدم تحفظ کا وہ احساس پوری طرح دور ہو چکا تھا۔ وہ خوشی سے مسکرا دی۔ اس کا دل شکر سے معمور ہو گیا۔

بستر پر لیٹی تو اسے پھر عبدالحق کا خیال آیا۔ اس نے سوچا۔ وہ اللہ سے آغا جی کی جلد از جلد واپسی کی دعا تو ضرور کرے گی۔ باقی سب کچھ، تو اللہ کی مرضی سے ہی ہوگا۔ اللہ انہیں اور آپی کو اپنی امان میں رکھیں۔ جب اللہ چاہیں گے، تبھی ان کی واپسی ہوگی۔ اور کون جانے، وہ چند روز میں ہی واپس آ جائیں۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ برسوں کی جدائی ہے۔

❁ ❁ ❁